Academic Discipline for Quranic Higher Education & M.Phil Islamic Studies

تخصص علوم وحکمت قرآن / ایم فل اسلامک اسٹڈیز (علوم القرآن) کے لیے مقررہ نصاب کے مطابق

فقہُ القرآن

جلد پنجم

حدود و تعزیرات اور قصاص

مؤلفہ

مولانا عُمر احمد عثمانیؒ

حکمتِ قرآن اِنسٹیٹیوٹ

جملہ حقوق محفوظ ہیں

فقہ القرآن

جلد پنجم

حدود و تعزیرات اور قصاص

مؤلفہ: عُمر احمد عثمانیؒ

پہلا ایڈیشن: 2021ء

کمپوزنگ: عبد اللہ جروار

کمپیوٹر لے آؤٹ: ندیم احمد سولنگی

مطبع: آزاد کمیونیکیشنز، کراچی

ناشر: حکمت قرآن انسٹیٹیوٹ، کراچی

ملنے کا پتہ

حکمتِ قرآن انسٹیٹیوٹ

جامع مسجد ربانی، ہائی وے کالونی، سیکٹرC-18، اسکیم-33، نزد جمالی پل سپر ہائی وے کراچی

فون: 0313-2707097

www.hikmatequran.org hikmatequraninstitute@gmail.com hikmatequrankhi HikmateQuran HikmateQuranInstitute

سرنامہ

فقہ القرآن کی اس جلد میں حد قذف بیان کرتے ہوئے افک نامی افسانے کی تردید کی گئی ہے، اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی زوجہ ٔمطہرہ ام المؤمنین سیدہ کائنات حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے دامن پر گرائے ہوئے چھینٹوں کو صاف کیا گیا ہے۔ نیز قصاص کی بحث میں خلیفہ ٔمظلوم شہید اعظم خلیفہ ٔثالث امیر المؤمنین حضرت عثمان غنی ذوالنورین رضی اللہ عنہکے المناک قتل کے قصاص نہ لئے جانے اور تاریخ اسلام میں پہلی مرتبہ قانون کی بالاتری برقرار نہ رہنے پر مفصل گفتگو کی گئی ہے اس لئے ناچیز مؤلف فقہ القرآن کی اس جلد کو حضرت سیدہ کائناتؓ اور حضرت ذوالنورینؓ کے حضور بطور نذرانہ ٔعقیدت و اخلاص پیش کرتا ہے۔

عمر احمد عثمانی

انتساب

میں قرآن کریم کی اس خدمت کو جو میری نسبت سے انتہائی حقیر اور قرآن کریم کی نسبت سے نہایت ہی عظیم المرتبت ہے حسب سابق فقہ القرآن کی اس جلد کو بھی اپنے جد امجد

حکیم الامۃ مجدد الملۃ مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ

اور اپنے والد ماجد

حضرت شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد عثمانی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

نیز محدث العصر حضرت الاستاذ الشیخ مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ شارح موطا و بخاری کے اسماءِ گرامی سے معنون کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں جن کی دعاؤں اور توجہات عالیہ نے مجھے قرآن کریم کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

عمر احمد عثمانی

فہرست

فقہُ القرآن (جلد پنجم)

حدود تعزیرات اور قصاص

سرنامہ 3
انتساب 4
عرضِ مؤلف 19
تعارف کتاب 22

کتاب الحدود 24
دوسوال: 25
جہالت اور لا علمی 26
پشیمانی اور ندامت 26
جرائم حدود کی شہادت نہ دینا افضل ہے 28
حد کا مجرم عادی ہونا چاہیے 29
حضرت عمرؓ کا واقعہ 29
مجبوری کے ماتحت جرائم 30
مجرم کی ذہنی وجسمانی حالت 30
ناگوار فریضہ 31
صحابہ کی طرف سے پردہ پوشی کی تلقین 31
مجرم کو انکار کی تلقین 32
ہمارا رجحان 33
اسلامی حکومت 33

حد زنا 35
زنا 35

باب حدالقذف 38
گالی گلوچ 38
تعزیر 38
افسانہ افک 39
جھوٹی تہمتیں دھرنا 39
شان نزول کی روایات 41
شان نزول کی روایت 41
تنقید حدیث: 45
شان نزول کی دوسری روایت 66

کتاب السرقہ 69
قطع ید 70
دو قابلِ غور نکتے: 74
چور اگر گرفتاری سے پہلے توبہ کرلے 74
باب قطع الطریق 77
باب القصاص والجنایات 79
قصاص امم سابقہ میں 80
دیت کی موجودہ صورت 84
القصاص 84
قتل عمد 86
آزاد آدمی غلام کے بدلے میں 87
ذمی کے بدلے میں مسلم 87
مستأمن کے بدلے میں 88

قصاص میں کوئی امتیاز نہیں.......................... 89
بیٹے کے بدلے باپ 89
احادیث کا شان نزول 90
اپنے غلام مدبّر اور مکاتب کے بدلے 91
دوسرے کے غلام کے بدلے 91
اگر قصاص کا وارث بیٹا ہو 92
مقتول کے ورثاء اگر نابالغ ہوں 92
پانی میں ڈبو کر مارڈالنا 92
قصاص میں سزائے موت کا طریقہ 93
کسی نے ہل سے کسی کو قتل کر دیا 94
مختلف اسباب سے موت واقع ہونا 94
جنگ میں کوئی مسلمان قتل ہوجائے 95
کوئی مسلمانوں پر تلوار سونت لے 95
قصاص فیمادون النفس 95
پہنچے یا کہنی یا بغل سے ہاتھ کاٹ دینا.......................... 96
آنکھ اگر نکال دی جائے 97
دانت توڑ دینا.......................... 97
ہڈی توڑ دینے میں قصاص نہیں 98
مادون النفس میں شبہ عمد نہیں ہوتا:.......................... 98
عورت اور مرد، آزاد اور غلام اور دو غلاموں میں قصاص........ 98
کافر اور مسلم میں قصاص 99
نصف بازو سے ہاتھ کاٹ دینایا زخم جائفہ پہنچانا: 99
کسی لونجے یا ناقص الید شخص نے اچھے آدمی کا ہاتھ کاٹ دیا 99
قتل عمد میں قصاص حقِ حکومت ہے 100
ذٰلِكَ تَخۡفِيفٌ مِّن رَّبِّكُمۡ وَرَحۡمَةٌ 101
حضرت ابن عباسؓ کی روایت.......................... 101
اگر ورثاءمیں کوئی معاف کردے.......................... 102
اگرکوئی جماعت کسی کو قتل کردے 103
کسی ایک آدمی نے جماعت کو قتل کردیا.......................... 103
قاتل اگر اپنی موت سے مرجائے 103
اگر دو آدمیوں نے کسی کا ہاتھ کاٹ دیا.......................... 103
کسی نے کسی کو گولی ماری اور اس کے ساتھ دوسرا آدمی بھی مرگیا.......................... 104

قصاص عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ..................105

شانِ ید الٰہی.......................... 109
قصاص عثمانؓ کی پیشگوئی 109
دوسری پیشن گوئیاں.......................... 110
مزید شہادت 111
حضرت علیؓ کی پوزیشن.......................... 112
ایک سنہری اصول 114
سبائی تحریک.......................... 115
شہادت فاروق اعظمؓ.......................... 116
عہد عثمانیؓ.......................... 116
عثمانی فتوحات کی وسعت.......................... 117
خلافت عثمانی میں قانون کی عظمت.......................... 117
حضرت عثمانؓ کے خلاف تحریک 117
یہودیوں کی خفیہ تنظیم.......................... 118
اسلام کے خلاف یہودی تحریک 120
یہودی عہد نبوی میں 121
یہودی اور خلافتِ صدیق اکبرؓ 122
یہودی اور شہادت عمرؓ.......................... 122
یہودی اور شہادتِ عثمان 122
قاتلینِ عثمان 122
تحریک ابن سبا اور القوۃ الحفیہ : 126

کتاب الدیات..................129

(۱) قتلِ عمد : 129
(۲) قتلِ شبہُ عمد: 129
(۳) قتلِ خطاءفی القصد : 129
(۴) قتلِ خطاءفی الفعل :.......................... 129
(۵) قتل قائم مقام خطاء:.......................... 129
سب جرائم یکساں نہیں.......................... 130
شبہ عمد کی دیت کیاہے.......................... 131
قتل خطاءمیں دیت 131
دیت عاقلہ پر 132
دیت کی مقدار.......................... 134

کفارہ 137

عورت کی دیت 138

کافر کی دیت 139

اعضاء میں دیت 139

زخموں کے بارے میں 140

حمل ساقط کر دینا 140

اگر حمل ساقط ہوا اور ماں بھی مرگئی 140

باب البغاۃ 140

ایک ضروری توضیح 143

خلیفہ کی ممانعت کے باوجود مفسدین سے قتال 143

باغیوں کی تحصیل و وصول 146

باب الخوارج 146

عہد نبوی اور خلفائے راشدین کے باغیوں کی تفصیل 146

خوارج رسول اکرم 147

خوارج صدیق اکبرؓ کے زمانہ میں 150

خوارج فاروق اعظمؓ کے دور میں 154

خوارج عثمان ذوالنورینؓ 156

خوارج کون تھے ؟ 156

خوارج حضرت علی 156

کتاب التعزیر 158

شراب کی تعزیر 159

شراب کا حکم 159

کیا شراب حرام ہے 160

شراب نوشی پر حد : 161

تعزیر کا مقصد 162

حد نہیں بلکہ تعزیر ہے 163

احکام مرتد 163

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ: 166

باب الرجم 180

رجم اصل حد یا تعزیر؟ 180

کوڑوں کی سزا 183

عرضِ مؤلف

ایک حقیر و ناکارہ ضعیف البنیان خاکپائے صاحبان علم و عرفان اس رب ذوالمنن کی بارگاہ میں سپاس گذاری کے لئے پیرایۂ بیان کہاں سے لائے جس نے اس ذرۂ ناچیز کو یہ توفیق عطا فرمائی کہ وہ اس کے دین حنیف کی خدمت کے لئے فقہ القرآن جیسی کتاب کی چوتھی جلد ہدیۂ ناظرین کرنے کی سعادت حاصل کر سکا۔

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل
نسیم صبح تیری مہربانی

یہ حق تعالیٰ کا کرم بے پایاں ہی تو ہے جس کا میں کسی طرح بھی شکر ادا نہیں کر سکتا کہ اس نے فقہ القرآن کو وہ مقبولیت عطا فرمائی جو میرے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں تھی کہ لوگوں کو اصرار پیہم ہے کہ فقہ القرآن کی مجلدات کا عربی اور انگریزی زبانوں میں ترجمہ ہونا چاہیے۔ کتنے ہی لوگوں نے زبانی اور تحریری اعتراف کیا کہ ہم فقہ القرآن کو پڑھنے کے بعد نئے سرے سے مسلمان ہوئے ورنہ اس سے پہلے تاریخ و سیرت کی کتابوں کے مطالعہ سے ہمارا ایمان بالکل ہی متزلزل ہو گیا تھا۔ اور اگرچہ زبان و قلم سے اظہار کی جرأت نہیں تھی لیکن قلبی شکوک و شبہات کی وجہ سے معاذ اللہ نظر آتا تھا کہ خدانخواستہ حضور اکرم ﷺ بھی دوسرے دنیادار فاتحین سے کچھ مختلف نہیں تھے۔ جنہوں نے دوسرے انقلابیوں کی طرح (خاکم بدہن) جزیرہ نمائے عرب میں ایک انقلاب کی داغ بیل ڈالی اور اس انقلاب میں کامیابی سے ہمکنار ہونے کے بعد انہوں نے بھی وہی کچھ کیا جو دوسرے دنیادار کرتے ہیں۔ یعنی وہ بھی دادِ عیش دینے کے لئے زمانہ کے ایک خاص وقت میں جزیرۂ عرب میں پیدا ہو گئے تھے۔ فقہ القرآن نے ان شکوک و شبہات کے سیاہ بادلوں کو یوں صاف کر دیا کہ ہم دولتِ ایمان سے از سر نو مشرف ہوئے۔

ایک عالم و فاضل بزرگ اور شیخ طریقت نے یوں دادِ تحسین و آفرین دی کہ "عثمانی صاحب آپ نے تو اپنی مغفرت کا پورا سامان کر لیا۔ آپ نے ازواج مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہن کی سیرتوں خصوصاً سیدہ کائنات ام المؤمنین سیدہ حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی سیرتوں سے اس گرد و غبار کو بالکل صاف کر دیا جو معاندین اسلام نے ان کے خلاف ایک منظم سازش کے ماتحت اڑایا تھا۔ جزاکم اللہ تعالیٰ خیر الجزاء۔"

یہ بھی حق تعالیٰ کا کرم بے پایاں ہی تو ہے کہ فقہ القرآن کی اشاعت کے بعد بہت سے محققین علمائے حق کو یہ جرأت و جسارت ہونے لگی ہے کہ وہ بھی کھل کر سامنے آنے لگے ہیں اور اسی نہج پر دادِ تحقیق دینے لگے ہیں۔ فقہ القرآن جلد دوم میں میں نے نکاح اور رخصتی کے وقت حضرت عائشہ صدیقہؓ کی عمر کے متعلق سیر حاصل بحث کی تھی۔ اس پر جہاں ہمارے کچھ علماء کرام نے نا بھوں چڑھائی وہیں بے شمار اہل علم بزرگوں نے میری ہمت افزائی بھی فرمائی چنانچہ اس بحث کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ کچھ درد مند دوستوں نے فرمائش کی کہ اس حصّہ کا انگریزی میں ترجمہ ہونا چاہیئے۔ مجھے خوشی ہے کہ میرے ایک دوست اس کا ترجمہ فرما رہے ہیں جو عنقریب ہدیہ ناظرین کیا جاسکے گا۔

اس سلسلہ میں بڑی اہم اور مسرور کن خبر یہ بھی ہے کہ حال ہی میں جناب مولانا حکیم نیاز احمد صاحب اور مولانا الیف اللہ صاحب عثمانی پانی پتی سرگودھا (فاضل دیوبند) اور مولانا عظمت اللہ صاحب تفہیمی (فاضل دیوبند) مہتمم مدرسہ تفہیم القرآن جھنگ کی مشترکہ کوششوں سے ایک نہایت مہتمم بالشان کتاب سامنے آئی یہ حضرات شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ ان کی اس کتاب کا نام "کشف الغمہ عن عمر امِّ الْاُمَّہ" ہے۔ کتاب بڑی تقطیع کے چھ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس کتاب میں ان حضرات نے ان تمام روایات کا استیعاب کر کے جن سے حضرت عائشہ صدیقہؓ کی صِغرسنی پر استدلال کیا جاتا تھا، محدثین کے اصول پر تنقید فرمائی ہے اور ایک ایک راوی کے متعلق اسماء الرجال کی کتابوں سے پوسٹ مارٹم کر کے ثابت فرمایا ہے کہ ۱۴۳ھ تک بخاری شریف کے ہشام بن

عروہ والی اس روایت کا کوئی وجود نہیں تھا جو اس سلسلہ میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ اور جو متعدد سندوں سے صحیح بخاری میں جگہ پا گئی ہے۔

محترم مولانا حکیم نیاز احمد اپنے ابتدائیہ میں لکھتے ہیں کہ:

"پہلے خیال تھا کہ اس شائع نہ کیا جائے کیون کہ اس سے احادیث کی صحت پر حرف آئے گا اور منکرین حدیث کو تقویت ملے گی۔ مختلف علماء سے تبادلہ خیال کیا گیا اکثر کی رائے یہی تھی۔ لہٰذہ کتاب کے مسودے میں بار بار ترمیم کرنی پڑی۔

روایت کو پرکھنے کا راستہ بھی خود ہی پیدا کیا۔ منقول ذخائر میں اس کے لئے مواد بہت ہی کم ملا۔ جن ہم عصر علماء سے مشورہ لیا ان میں سے بعض نے فرمایا کہ جب سابق علماء نے کچھ نہیں لکھا تو آپ کو گڑے مردے نکالنے کی کیا ضرورت وغیرہ وغیرہ۔

۔۔۔ شروع میں تو اپنے اطمینان قلب کے لئے اس تاریخی روایت کو دیکھا اور پرکھا۔ مگر اب جب اس روایت پر محنت کرکے دیکھا اور شرح صدر ہو گیا تو ارادہ کر لیا کہ اہل علم کے سامنے اپنی اس کاوش کو پیش کیا جائے۔ عند الامتحان یکرم الرجل او یہان۔ الخ

بہرحال اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے اس عظیم دور کا یہ بڑا ہی خوش آئند موڑ ہے جو علمی میدان میں نمودار ہوا ہے کہ اب قدیم الخیال علمائے کرام بھی تحقیق کی طرف مائل ہونے لگے ہیں۔ یہ احساس کس قدر خوش آئند و خوش گوار ہے کہ اس تحقیق کی وادیء پرخار و پرخطر میں یہ فقیر اب تنہا نہیں ہے بلکہ اس کے ہم نفس یہ فقیر اب تنہا نہیں ہے بلکہ اس کے ہم نفس اور ہم نوا اور بھی اچھے اچھے لوگ ہیں۔ اللھم زد فزد

فقہ القرآن کی تیسری جلد حقوق و فرائض سے متعلق تھی جس میں حقوقِ نسواں کی بحث بھی آنی تھی۔ اس جلد کے شائع ہونے پر قانون داں پڑھے لکھے طبقوں نے اس کا جہاں شاندار طریقہ پر خیر مقدم کیا وہیں بعض علمائے کرام اور مفتیان عظام نے سخت اختلاف و مزاحمت کا اظہار کیا اخبارات میں موافق و مخالف بیانات سے ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ علمائے کرام کی طرف سے دلیل کا جواب دلیل سے دینے کے بجائے حسب عادت سب و شتم اور فتاویٰ کا بازار گرم ہو گیا۔ طرح طرح کے الزامات لگائے گئے اور طرح طرح کے القابات سے نوازا گیا۔

متانت و سنجیدگی سے فروتر غوغا آرائی کا جواب دینا نہ میرے بس کی بات تھی نہ یہ اہل علم کے طریقہ سے کوئی مناسبت رکھتا تھا۔ البتہ ایک پروفیسر صاحب کے مضمون کا نوٹس لینا پڑا جو روزنامہ جسارت کراچی کی چودہ قسطوں پر شائع ہوا تھا کیونکہ ان کے مضمون کا انداز بیان کسی حد تک گوارا تھا۔ الحمد للہ ہمارا جوابی مضمون بھی اس روزنامہ جسارت کراچی کی اشاعتوں میں شائع ہوا۔ اور توفیق الٰہی شامل حال رہی تو کتابی صورت میں بھی انشاء اللہ شائع ہو گا۔

بحیثیت مجموعی اس جلد نے علمی حلقوں میں بہت اچھا اثر چھوڑا حتیٰ کہ فیڈرل شریعت کورٹ کے اجلاسوں میں بھی فقہ القرآن کی صدائے بازگشت بار بار سنی گئی اور جابجا اس کے حوالے دیئے گئے۔ چنانچہ انصار برنی ایڈووکیٹ کراچی کی پیٹیشن میں کم از کم پانچ مرتبہ فقہ القرآن کا نام لیا گیا اور اس کے حوالے دیئے گئے۔ اس پیٹیشن میں جہاں میرے والد ماجد حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کی مایہ ناز تصنیف اعلاء السنن کے حوالے دیئے گئے وہیں پانچ مرتبہ اس ناچیز کی کتاب کا نام بھی لیا گیا۔ یہ فخر و سعادت میرے لئے کچھ کم نہیں۔

ملاحظہ ہو پی۔ ایل۔ ڈی 1983ء فیڈرل شریعت کورٹ 73)

بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بست است

کتاب کی یہ مقبولیت حق تعالیٰ کا کرم بے پایاں ہے جس کا میں حقیقتاً شکر ادا نہیں کر سکتا۔

اللھم اسبغ علینا نعمك ظاھرۃ و باطنۃ و تب علینا انك انت التواب الرحیم۔ و تقبل منا انك انت السمیع العلیم۔

ہمارے علمائے کرام اور مفتیان عظام عورتوں کو ان کے جائز حقوق دینے کے لئے تیار نہیں۔ انہیں شکایت ہے کہ میں نے عورتوں کو سروس کرنے کی کھلی چھٹی دیدی ہے۔ حالانکہ یہ چھٹی میں نے نہیں دی بلکہ خالق کائنات نے خود ہی دی ہوئی ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا ۖ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۚ (النساء:۳۲)

"مردوں کا حصہ اس میں ہے جو وہ کمائیں اور عورتوں کا اس میں حصہ ہے جو وہ کمائیں۔"

اگر اکتساب رزق کی عورتوں کو اجازت ہی نہیں تو اپنی کمائی میں عورتوں کا حصہ کہاں سے ہو گا۔

ہم اپنے بچپن میں اپنے بزرگوں سے سنا کرتے تھے کہ عورتوں کو زیادہ پڑھانا لکھانا نہیں چاہیے۔ انہیں صرف قرآن شریف پڑھا دو یا بہت سے بہت بہشتی زیور پڑھا دو۔ لیکن انہیں ہرگز اتنا نہ پڑھاؤ کہ وہ خط لکھ سکیں۔

یقیناً ہمارے یہ بزرگ ہم سے زیادہ سمجھدار تھے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ اگر عورتیں لکھ پڑھ گئیں تو پھر انہیں اپنے حقوق کا شعور پیدا ہو جائے گا اور ہم انہیں دبا کر نہیں رکھ سکیں گے۔ یہ ایسا ہی تھا جیسا کہ ہمارے رؤساء اور جاگیردار اپنی ریاستوں میں کالج تو بڑی چیز ہے اسکول تک کھولنے کے روادار

نہیں تھے کہ رعایا پڑھ لکھ کر ہاتھوں سے نکل جائے گی۔ اور وہ پھر اپنے حقوق مانگنے لگے گی۔ لہٰذہ یہی بہتر ہے کہ انہیں جاہل رکھا جائے۔

لیکن دوسری قوموں کو دیکھا دیکھی ہم نے یہ غلطی تو کرلی کہ عورتوں کو تعلیم دلوائی لڑکیوں کے اسکول اور کالج کھول لئے اور اب تو عورتوں کی الگ یونیورسٹیاں تک قائم کرنے کی باتیں ہو رہی ہیں عورتوں کو لکھا پڑھا کر ان کا شعور ہم نے خود ہی بیدار کر دیا اور انہیں اپنے شعور کا احساس دلا دیا۔ اب اگر عورتیں گھروں میں باندیاں بنکر بلکہ پاؤں کی جوتی بن کر رہنے کے لئے تیار نہیں ہو رہیں تو ہم ان کی راہوں میں تنکے کی دیواریں کھڑی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور غلط قسم کی تاویلات سے ان کے احساس و شعور کو دبانا چاہتے ہیں۔

ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی کہ جب کسی انسان میں اپنے حقوق کا شعور بیدار ہو جاتا ہے تو اسے دبایا نہیں جاسکتا۔ اگر آپ بلاوجہ اسے زبردستی دبائیں گے اس کا ردِ عمل اتنا ہی شدید ہو گا۔ اور اگر ان میں بغاوت کے جذبات بھڑکات اٹھے تو وہ حدود کو بھی پار کر جائیں گی اور ہمارا حشر وہی ہو گا جو یورپین اقوام کا ہمارے سامنے ہے۔

یورپ کے سامنے وحی کی روشنی نہیں تھی۔ انہیں اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کی رہنمائی حاصل نہیں تھی۔ انہوں نے اپنی عقل اور تجربہ کی روشنی میں آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ لہٰذہ افراط و تفریط کا شکار ہوئے اور خاندانی ادارات کا تیا پانچا کر بیٹھے چنانچہ ان کے دانشور اور حکماء آج نوحہ کناں ہیں کہ یہ ہم نے کیا کرلیا۔ کاش ہم پھر پیچھے کی طرف لوٹ سکیں۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ مسلمانوں کے پاس وحی کی روشنی میں موجود ہے۔ انہیں اپنے رسول اکرم ﷺ کی رہنمائی حاصل ہے جس نے آزدی اور پابندی کی حدود متعین کر دی ہیں اور پورے اعتدلال اور توازن کے ساتھ حدبندی کر دی ہے۔ اسلام نے عورتوں کو جتنی حریت اور آزادی عطا فرمائی ہے وہ عورتوں کو دیجئے اور غلط تاویلات سے ناجائز قدغنیں نہ لگائیے ورنہ اگر اسلام اور مذہب کے نام سے ان کے حقوق کو دبانے کی کوشش کی گئی تو وہ مذہب ہی سے باغی ہو جائیں گی اور پھر ہمارا حشر بھی وہی ہو گا جو آج یورپ کا ہو رہا ہے۔

ایک مہربان دوست فرماتے ہیں کہ:

"موجودہ صورتحال یہ ہے کہ جو عورتیں گھر سے باہر جاتی ہیں وہ نیم عریاں لباس پہن کر جاتی ہیں تاکہ ان کے جسم کی پوری نمائش ہو سکے۔ مردوں سے دوستیاں بھی کرتی ہیں اور تنہائی میں ملاقاتیں بھی۔ اور تفریح بھی۔ کیا فرماتے ہیں وہ علماء جو ان تمام غیر اسلامی باتوں کی اجازت دینے کو تیار ہیں پانچ فی صد عورتیں بھی نوکریاں کرنے والیوں میں سے ایسی نہیں ہیں کہ جو بیوہ، بیکس، لاوارث اور فاقہ زدہ ہوں۔ کیا اللہ نے جو پردہ اور حیا کے احکامات قرآن کریم میں دیئے تھے ان کو یہ علماء منسوخ سمجھتے ہیں؟"

(ماہنامہ فاران بابتہ ماہ اگست ۱۹۸۳ء ص ۷۸)

حقائق و واقعات سے اغماض کی شاید اس سے بہتر مثال نہ مل سکے۔ واقعہ یہ ہے کہ نوکریاں کرنے والیوں میں زیادہ تر ایسی ہی عورتیں ہیں جن کے باپ مر گئے۔ بیوہ ماں اور چھوٹے چھوٹے بہن بھائی چھوڑ گئے۔ معاشرہ ان کا بوجھ اُٹھانے کے لئے تیار نہیں۔ اگر وہ نوکریاں نہ کریں تو پورا گھرانا فاقوں مر جائے۔ بیشمار لڑکیاں کنواری بیٹھی ہیں، ان کی عمریں ڈھلی جا رہی ہیں۔ کیونکہ ان کے والدین کے پاس لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپے جہیز دینے کے لئے نہیں۔ وہ ملازمتیں کر کے اپنا جہیز تیار کر رہی ہیں۔ قوم کو اور زعماء و علماء کو اس کا قطعاً احساس نہیں کہ اس نازک صورتحال کا کوئی علاج سوچے اور اس حریص اور لالچی سوسائٹی کے خلاف کوئی تحریک چلائے اور اس کے ضمیر کو جھنجھوڑے جس نے شادی جیسے مقدس بندھن کو بھی ایک کاروبار بنا ڈالا ہے۔ موصوف کو معلوم ہونا چاہیے کہ رف اندازے کے مطابق صرف ایک کراچی شہر میں بارہ ہزار جوان، خوبرد اور تعلیم یافتہ لڑکیاں کنواری بیٹھی ہیں کیونکہ ان کے والدین کے پاس جہیز دینے کے لئے خطیر رقم نہیں ہے۔

آپ کو حیرت ہو گی کہ ایک ذمہ دار گورنمنٹ آفیسر میرے پاس یہ شکایت لے کر آئے کہ آپ نے فقہ القرآن میں تعداد ازدواج کے خلاف بڑا زور قلم دکھایا ہے۔ لیکن اس وقت کراچی میں بے شمار لڑکیاں ایسی بیٹھی ہیں جن کی عمریں بڑھتی جا رہی ہیں وہ ادھیڑ ہو چکی ہیں اب انہیں کنوارے لڑکے تو قبول کرنے سے رہے۔ ان کے لئے ضرورت ہے کہ جو لوگ صاحبِ حیثیت ہیں وہ ان لڑکیوں سے دوسری شادی کرلیں تاکہ وہ معاشرہ میں اپنی جگہ بنا سکیں۔ اس وقت تعداد ازدواج کے خلاف نہیں بلکہ اس کے حق میں مہم چلانے کی ضرورت ہے۔ اللہ کے لئے آپ تعداد ازدواج کے حق میں کچھ لکھئے۔ میں اس صورت حالات پر اور کیاں کہوں۔ بس اللہ ہمارے معاشرے پر اپنا رحم فرمائے اور ہمارے علمائے و زعماء کو صحیح صورت حال کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

حقیر و ناکارہ

عمر احمد عثمانی

تعارف کتاب

از جناب خالد ایم اسحٰق ایڈوکیٹ سپریم کورٹ پاکستان

فقہ القرآن کی سابق تین جلدوں کے تعارف لکھنے کی سعادت راقم الحروف کو حاصل رہی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ "حدود و قصاص" کے مباحث پر مشتمل اس جلد کا تعارف لکھنے کے لیے کوئی جامع قدیم وجدید شخصیت نصیب ہو جائے، تو بہت اچھا ہو۔ اللہ کے فضل وکرم سے میری یہ آرزو پوری ہوئی اور محترم خالد اسحاق صاحب اس کے لیے تیار ہو گئے۔

خالد اسحاق صاحب ملک کے نامور قانون داں ہیں۔ عربی جاننے کی بنا پر اسلامی قانون کے اصل مآخذ پر بھی ان کی نگاہ ہے۔ اپنی اسی جامعیت اور دستور اسلامی پر گہری نگاہ کے باعث انہیں بین الاقوامی شہرت حاصل ہے۔ان کی ذاتی لائبریری غالباً پاکستان کی سب سے گراں قدر لائبریری ہے۔فقہ القرآن کی تصنیف میں بھی اس لائبریری کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔کاش خالد صاحب کے انتہائی وسیع مطالعہ پر مبنی ان کا گہرا تفکر جو ابھی تک علم سینہ کی شکل میں ہے، اگر علم سفینہ کی شکل اختیار کر لے تو ملت اسلامیہ متعدد بیش قیمت اور معنویت سے پُر کتابوں سے استفادہ کا شرف حاصل کر سکتی ہے۔

یارب ایں آرزوئے من چہ خوش است

(طاہر المکی)

مولانا عمر احمد عثمانی کی ذات اپنی علمی و دینی خدمات کی وجہ سے کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اگر انہیں مولانا ظفر احمد عثمانی کی ولدیت کا شرف حاصل ہے، تو اس شرف کو خود مولانا نے اپنی دینی خدمات کے ذریعہ اور اجاگر کیا ہے۔

زیر نظر کتاب موضوع "فقہ القرآن "میں مولانا کی پانچویں کاوش ہے،اس سلسلہ کی پہلی کتابیں خصوصاً "الرجم" اور "حقوق نسواں "علمی حلقوں میں خاصی شہرت پا چکی ہیں۔ ان دونوں کتابوں کی خصوصیت یہ رہی ہے کہ دونوں کے موضوعات کا عمر احمد صاحب نے قرآن کی روشنی میں از سر نو جائزہ لیا ہے۔ سالہا سال کیا صدیوں کے تقدس کے غلافوں نے صاحب تصنیف کی تنقیدی نگاہ کو نہیں روکا، جہاں بھی مولانا نے تاریخ وفقہ کو قرآن سے ٹکراتے پایا ہے، وہاں اس مسئلہ کو بہت ہی محنت، کے ساتھ دیکھا و پرکھا ہے۔اور جو کچھ صحیح سمجھا ہے اسے کھول کر بیان کیا ہے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ بعض نکات پر اور صاحبان علم کو مولانا کے نتائج سے اختلاف بھی ہو۔ لیکن اس بات کو بھی ماننا پڑے گا کہ جہاں بھی مولانا نے مروجہ فقہ سے اختلاف کیا ہے وہاں متعدد ٹھوس دلائل پیش کئے ہیں۔ اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ائمہ کے بہت سے ایسے اقوال بھی سامنے لائے ہیں جو متداول فقہ میں فراموش کر دیئے گئے تھے، یہاں تک کہ بہت سے اذہان میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ فقہ اسلامی کی کل کائنات اتنی ہی ہے جتنی متداول فقہ کی کتابوں میں نظر آتی ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ جو کام عمر احمد صاحب نے کیا ہے وہ موجودہ حالات کا عین تقاضا ہے۔ گزشتہ کم وپیش پانچ سو سال میں فقہ و دستوری مسائل کے سلسلہ میں مسلمانان عالم کی سوچ جمود کا شکار رہی۔ بہت سے وسیع علاقوں میں اسلامی ناموں والے ایسے بادشاہوں کا دور دورہ رہا جنھوں نے بجائے اسلامی اجتہاد کے اسلامی قانون کو زندگی کے کئی شعبوں سے ہٹا دینے کو زیادہ مفید پایا۔ مسلمان ریاستوں میں بہت سے ایسے قوانین رائج کئے جانے لگے جو شریعت کے ساتھ ساتھ رائج تھے اور قضاۃ کے اختیار سے باہر تھے۔ اس طریقہ سے ان شاہوں نے اپنی قوت کو اخلاق وشریعت کے بندھنوں سے آزاد کرا لیا۔ نیک نیت فقیہوں نے بھی فلاح کی راہ یہ دیکھی کہ بجائے اس کے کہ بادشاہوں کے بدکردار اور بے اخلاق کارندوں کے ہاتھوں فقہی ورثہ کا حلیہ بگڑے یہی بہتر ہے کہ اس قیمتی ورثہ کو لے کر الگ ہو جایا جائے اور اچھے وقتوں کا انتظار کیا جائے جب اس فقہ کو دوبارہ بعینہ نافذ کیا جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ ابتلا کے زمانہ میں اس کے علاوہ ان نیک لوگوں کے پاس کوئی اور راہ کھلی نہ

ہو، لیکن اگر ایک شریعت مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے ایک گراں قدر ڈھال ہے وہاں اس کا اصل مصرف ایک ایسی تلوار کا تھا جس کے ذریعہ حق و باطل کے اصلی فرق کو اجاگر کیا جاتا ہے، اور اسلام اور ملت اسلامیہ کے نمو کی راہیں کھولی جاتی ہیں، یہ کام مدتوں نہ ہوا۔

صدیوں سے حجروں میں مقید، تصوف سے متاثر ذہنوں کے مشہور فقہی کتابوں پر حاشئے قوۃ سے محروم قصبوں میں مقید امت کے افراد کے ذاتی مسائل کے حل میں تو کارگر ہو سکتے تھے، لیکن حصول آزادی کے بعد نفاذ اسلام کی بنیادی کوششوں میں مفید ثابت نہ ہوئے۔ دنیا میں سینکڑوں تبدیلیاں بڑھتی ہوئی تیز رفتاری سے روپذیر ہو رہی ہیں، خیر و شر کی مسلسل جنگ میں کئی نئے ہتھیار زیر استعمال ہیں جن کے بارے میں آج سے سو سال پہلے سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ علاوہ ازیں تیز رفتار سفر اور ابلاغ عامہ کی کثرت نے دنیا کو سکیڑ کر رکھ دیا ہے۔ آج کے اہم مسائل گزرے ہوئے ادوار سے یکسر مختلف ہیں، کم سے کم زمانی و مکانی اعتبار سے ان حالات میں فقہی مسائل کی ایک نئی تبویب درکار ہے اور بہت سے میدانوں میں جرأت مندانہ اجتہاد کی بھی ضرورت ہے۔ کچھ ایسے ہی محرکات کے زیر اثر یہ کتاب لکھی گئی ہے۔

پاکستان اور اس کے علاوہ اور ممالک میں بھی نفاذ شریعت کا عمل جاری ہے۔ اس سلسلہ میں بہت سے پیچیدہ مسائل توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ اس میں ایک تو یہ ہے کہ کیا حدود کی سزاؤں میں کسی قسم کے اضافے یا تخفیف کی گنجائش ہے یا نہیں۔ عمر احمد صاحب اس سوال سے متعلق ایک خاص رائے رکھتے ہیں جس کا ذکر انہوں نے ابتدائے کتاب ہی میں کیا ہے اور اس کے جواز میں عقلاً اور نقلاً قوی دلائل پیش کئے ہیں، نیز لفظ "نکالاً" کے تعلق سے جو استدلال عمر احمد صاحب نے کیا ہے وہ قابلِ غور ہے۔ اور مستقبل میں ہماری فقہی تفہیم پر بھرپور انداز سے اثر انداز ہو سکتا ہے کیونکہ حد اگر آخری سزا ہے تو حالات کے مطابق سزا میں تخفیف ہو سکتی ہے۔

حد زنا کی توجیہ میں دیئے ہوئے دلائل پر اضافہ ممکن ہے۔ نظریہ آتا ہے کہ جن جرائم کی سزا قرآن میں مقرر کی گئی ہے، وہ جرائم ہیں جن کی وجہ سے معاشرے کی بنیادیں ہل جاتی ہیں، مثلاً چوری تو ایک یا دو کی ہوتی ہے لیکن راتوں کی نیند سینکڑوں کی اڑ جاتی ہے، باہمی اعتماد کم ہو جاتا ہے اور یہی اعتماد تو بنیاد ہے اخلاق و تمدن کی یہی کچھ صورت زنا کی ہے۔ خاندان و کنبہ اسلامی معاشرے میں کلیدی حیثیت کے حامل ہیں۔ زنا، یا شک زنا یا تشہیر زنا باہمی اعتماد و حسن ظن کو مٹا دیتے ہیں، سارے معاشرے کی بنیادیں کھوکھلی ہو جاتی ہیں اور تمام سوسائٹی تباہی کی طرف سرکنا شروع کر دیتی ہے۔

اس کتاب کا ایک مستحسن پہلو، واقعۂ افک کے سلسلہ میں عمر احمد صاحب کی تحقیق ہے۔ علم حدیث کے تمام اصولوں کو بروکار لاتے ہوئے اس کرب انگیز قصے کی تحقیق کی ہے جو حقیقت میں صاحب کتاب کے لیے توشۂ آخرت کی حیثیت رکھتی ہے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ ہم علم حدیث کے سنہرے اصولوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے تاریخی ورثہ کو از سر نو جانچیں۔ عین ممکن ہے کہ ہمیں بہت سی ایسی روایات سے چھٹکارا مل جائے جو لاتعداد نیک نیت مسلمانوں کے لیے نہ اٹھاسکنے والا بوجھ بنی ہوئی ہیں۔

یوں بھی نہیں کہ اس کتاب میں صرف اختلافی مسائل پر گفتگو ہے حقیقت میں جرم و سزا کے موضوع پر یہ ایک بہت جامع کتاب ہے۔ جس میں وہ تمام موضوعات بھی آجاتے ہیں جو اس فقہ اسلامی کی اس صنف سے متعلق ہیں، فرق یہ ہے کہ اقوال ائمہ کی اہمیت بہر کیف ثانوی ہے۔ قرآن معیار اوّل سنت معیار دوم اور اسکے بعد قدر و منزلت کی واضح دلیل کی ہے کسی اونچے نام کی نہیں۔ یہ کتاب پڑھنے والوں پر احسان اور عمر احمد صاحب کے لیے باعثِ تحسین ہے۔

کتاب الحدود

"حُدُودٌ،حد" کی جمع ہے اس مادہ کے اصلی معنی روکنے اور منع کرنے کے ہیں۔ "حدالرجل عن الامر" آدمی کو اس معاملہ سے روک دیا، منع کر دیا "حددتُ فلاناً عن الشر" میں نے فلاں کو شر سے روک دیا "الحدود" رکاوٹ اور روک "ھذا امرحدود" یہ امر ممنوع ہے "الحدید"(لوہا) کیونکہ وہ اپنی سختی کی وجہ سے (خصوصاً دشمن سے) روک بن جاتا ہے، تیز دھار حَدَّ اس نے دھار کو تیز کیا۔ کیونکہ آلات حرب کی دھار کی تیزی جنگ میں دشمن سے بچاؤ اور رکاوٹ کا سبب بنتی ہے (تاج العروس ومحیط)

بہر حال حدٌ کے معنی روکنے کے ہیں، چند جرائم کی سزائیں حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں خود متعین فرمادی ہیں جن کا مقصد ان جرائم کو روکنا ہے۔ اس لیے ان کو حدٌ کہا جاتا ہے واضح رہے کہ قرآن کریم نے بعض جرائم کی جو سزائیں مقرر فرمادی ہیں وہ انتہائی (maximum) یعنی زیادہ سے زیادہ سزائیں ہیں۔ لازم نہیں ہے کہ ہر موقعہ پر یہی سزائیں دی جائیں۔ عدالت جرم کی نوعیت و کیفیت اور مجرم کے حالات و کوائف پر نظر کرتے ہوئے ان سے کم سزائیں بھی دے سکتی ہے۔ البتہ عام حالات میں انتہائی اور زیادہ سے زیادہ جو دی جاسکتی ہیں وہ وہی ہیں جو قرآن نے مقرر فرمادی ہیں۔ ہاں اگر حالات قابو سے باہر ہو جائیں اور ان سزاؤں سے بھی جرائم کو روکا نہ جاسکے تو ہنگامی طور پر تعزیراً ان سزاؤں میں تشدید کی جاسکتی ہے۔

ظاہر ہے کہ جرائم کی نوعیت اپنے خصوصی حالات و کوائف کے ماتحت ہمیشہ یکساں نہیں ہوتی، بعض جرائم حالات سے مجبور ہو کر بھی کئے جاتے ہیں، مجرم کی عمر، تعلیم وتربیت، مالی حالات، معاشرہ کے حالات اور دیگر احوال وکوائف سے جرائم کی شدت میں زیادتی اور کمی کی جاسکتی ہے اور تمام حالات میں یکساں سزائیں نہیں دی جاسکتیں، اگر قرآنی حدود کو کم سے کم سزا تصور کیا جائے تو آخر جرم کی نوعیت اگر شدید ترین ہو تو پھر کیا سزا دی جائے گی۔ لہٰذہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ سزائیں زیادہ سے زیادہ اور آخری سزائیں ہیں۔ جو عام حالات میں دی جاسکتی ہیں اور اگر جرائم کی نوعیت شدید قسم کی نہ ہو تو عدالت کو یہ اختیار ہونا چاہیے کہ وہ سزا میں حالات کے مطابق کمی کر دے۔ ایک ہی لاٹھی سے تمام مجرموں کو نہیں ہانکا جاسکتا۔ سرقہ یعنی چوری کی سزا کے سلسلہ میں قرآن کریم نے "جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا" کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سزا۔ ایک تو ان کے جرم کی جزا یعنی بدلہ اور اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے دوسرے لوگوں کے لیے سامانِ عبرت بھی ہے۔ وہ سزا جس سے دوسروں کو بھی عبرت دلانا مقصود ہو، انتہائی اور آخری سزا ہوا کرتی ہے۔ سورۃ بقرہ میں اصحاب سبت کے واقعہ میں بھی یہی نَكَالٌ کا لفظ استعمال ہوا ہے:

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ۝٦٥ فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝٦٦ (البقرہ۶۶)

"اور جن لوگوں نے تم میں سے سبت (ہفتہ کے دن) کے سلسلہ میں زیادتی کی تھی، ان کا حال تمہیں معلوم ہو چکا ہے کہ ہم نے ان سے کہہ دیا تھا کہ تم ذلیل بندر بن جاؤ۔ ہم نے اسے اس زمانہ کے لوگوں اور بعد میں آنے والوں کے لیے عبرت اور تقویٰ شعار لوگوں کے لیے نصیحت بنادیا۔"

ظاہر ہے کہ اصحاب سبت کو پہلی مرتبہ سبت کی بے حرمتی کرنے پر یہ سزا نہیں دی گئی تھی وہ اس کے عادی ہو چکے تھے۔ اور مسلسل اس بے حرمتی کا ارتکاب کئے چلے جارہے تھے، لوگوں نے انہیں منع بھی کیا تھا ہر طرح سمجھانے کی کوشش کی جاچکی تھی۔ جب ان کی اصلاح کی کوئی امید باقی نہ رہی تو حق تعالیٰ نے انہیں یہ سزا دی جسے قرآن کریم نے نَكَالٌ (عبرت) سے تعبیر فرمایا ہے۔ اسی طرح فرعون کے سلسلہ میں یہ لفظ آیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے تبلیغ فرمائی خدا اسے ڈرایا، بڑے بڑے معجزات دکھلائے مگر وہ برابر

جھٹلاتا رہا اور نافرمانی کرتا رہا۔

ثُمَّ اَدۡبَرَ یَسۡعٰی ﴿۲۲﴾ فَحَشَرَ فَنَادٰی ﴿۲۳﴾ فَقَالَ اَنَا رَبُّکُمُ الۡاَعۡلٰی ﴿۲۴﴾
فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الۡاٰخِرَةِ وَالۡاُوۡلٰی ﴿۲۵﴾ (النازعات:۲۳تا۲۵)

"پھر وہ پیٹھ پھیر کر چل دیا اور (موسیٰ کو شکست دینے کی) کوشش کرتا رہا چنانچہ اس نے (ملک کے مشہور جادوگروں کو) جمع کیا اور پھر یہ اعلان کیا چنانچہ کہا کہ میں ہی تمہارا سب سے برتر پروردگار ہوں۔ آخر خدا نے اسے پکڑ لیا اگلی پچھلی خطاؤں کی عبرتناک سزا کے لیے۔

فرعون نے سالہا سال تک موسیٰ علیہ السلام کو جھٹلایا، ہر طرح آپ کا مقابلہ کیا، بار بار قوم فرعون پر مختلف انواع کے عذاب نازل ہوتے رہے جن کی تفصیل خود قرآن کریم نے دے دی ہے، آخر میں اسے پکڑ لیا گیا اور دریائے قلزم میں مع اپنی فوج کے غرق کر دیا گیا۔ اس آخری اور شدید ترین سزا کو (نَکال) فرمایا گیا ہے اس سے سمجھا جا سکتا ہے کہ (نکال) وہ آخری سزا ہوا کرتی ہے جو اس وقت دی جاتی ہے جب پانی بالکل ہی سر سے گزر جائے۔ سرقہ کی حد کے سلسلے میں بھی یہی لفظ استعمال ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آخری اور انتہائی سزا ہوتی ہے جب مجرم کی بازیافت کی کوئی امید باقی نہ رہے لہٰذہ مقررہ حدود وہ آخری اور انتہائی سزائیں ہیں جو ان جرائم پر دی جاسکتی ہیں۔ بہر حال سول کے قانون میں یہ انتہائی سزائیں ہیں لیکن ہنگامی حالات میں اگر یہ سزائیں بھی کافی ثابت نہ ہوں تو حکومتِ وقت جیسا کہ ہنگامی حالات میں سول قانون کو معطل کر کے فوجی قانون (مارشل لاء) نافذ کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے اسی طرح وہ ان احکام میں مزید شدت بھی کر سکتی ہے لیکن یہ مستقل قانون نہیں ہو گا۔ ہنگامی حالات جب رفع ہو جائیں تو اصل اور عام قانون پھر سے نافذ ہو جائے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی زنا کی حد پر ملک بدر کرنے کا اضافہ فرمایا تھا۔ جس کی توضیح ائمہ احناف نے اسے ہنگامی تعزیز کہہ کر کی ہے۔

دو سوال:

حدود کے سلسلے میں دو مسئلے غور طلب ہیں۔ اول تو یہ کہ کیا اسلام میں مقررہ حدود کی یہ حیثیت ہے کہ جہاں مجرم سے جرم صادر ہوا اس پر ضرور ہی حد جاری کر دی جائے؟ اور اس میں کسی نرمی یا رعایت کی گنجائش ہی نہ ہو؟

دوم یہ کہ اس کا ثبوت کیا ہے کہ قرآن کریم کی مقررہ حدود زائد سے زائد انتہائی سزائیں ہیں، ان میں کمی بھی کی جاسکتی ہے۔ موضوع کی اہمیت کے پیش نظر اس پر مزید گفتگو کی ضرورت ہے تا کہ موضوع تشنہ نہ رہ جائے۔ یہ حقیقت ہے کہ پورے ذخیرۂ احادیث میں ہمیں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ جرم کی شدت کو ملحوظ رکھتے ہوئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یا خلفائے راشدین نے کسی مجرم کو زنا کے جرم میں بجائے سو کوڑوں کے ایک سو ایک کوڑے مار دیئے ہوں۔ یا قذف کے جرم میں بجائے اسی کوڑوں کے اکیاسی کوڑے مار دیئے ہوں۔ مقررہ حدود پر ہمیں اضافہ کہیں نہیں ملتا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ تمام اسلامی احکام مثلاً نماز، روزہ، وغیرہ ہر مرد ہر عورت ہر آزاد ہر غلام پر یکساں نافذ ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ مرد پر پانچ وقت کی نمازیں فرض ہوں اور عورت پر تین وقت کی یا آزاد آدمی پر ایک مہینے (رمضان) کے روزے فرض ہوتے ہوں اور ایک غلام و کنیز پر پندرہ دن کے روزے فرض ہوتے ہوں۔ لیکن جرائم کی سزا میں آزاد آدمی کو اگر سو کوڑے مارنے کا حکم تو غلام اور باندی کو پچاس کوڑے مارنے کا حکم ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ تعلیم و تربیت کے پورے مواقع جو ایک آزاد آدمی کو حاصل ہوتے ہیں، غلام اور باندی کو حاصل نہیں ہوتے۔ نہ انہیں فیصلہ کرنے کی آزادی حاصل ہوتی ہے، انہیں اپنے آقا اور مالک کی مرضی کے مطابق ہی عمل کرنا پڑتا ہے، پھر معاشرے میں انکاوہ اسٹیٹس بھی نہیں ہوتا جو آزاد آدمیوں کا ہوتا ہے۔ اس لیے ان کی خودی بالکل دبی ہوئی اور کچلی ہوتی ہے۔ ان میں عزت نفس کا وہ شعور بھی نہیں ہوتا جو معاشرہ میں آزاد آدمیوں کو حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذہ بسا اوقات وہ اپنے آپ کو محفوظ رکھنے پر قدرت بھی نہیں رکھتے۔

اس کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں کہ ایک آزاد عورت کے مقابلہ میں کنیز اپنی عفت و عصمت کی حفاظت پر قطعاً قدرت نہیں رکھتی۔ یہی حال غلاموں کا ہے، غلاموں کے سلسلے میں تو قرآن کریم نے حضرت یوسف علیہ السلام کی مثال ہمارے سامنے پیش کر دی ہے کہ وزیر خزانہ کی بیوی نے انہیں ورغلانے کی کوشش کی اور حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے کو لغزش سے بچانے کی کوشش کی تو اس نے اپنی ساتھنوں سے برملا کہا:

وَلَقَدۡ رَاوَدۡتُّهٗ عَنۡ نَّفۡسِهٖ فَاسۡتَعۡصَمَ ؕ وَلَئِنۡ لَّمۡ یَفۡعَلۡ مَاۤ اٰمُرُهٗ لَیُسۡجَنَنَّ وَلَیَکُوۡنًا مِّنَ الصّٰغِرِیۡنَ ﴿۳۲﴾ (سورۃ یوسف ۳۲)

"میں نے اسے اپنے نفس کی حفاظت سے ورغلانا چاہا تھا تو اس نے اپنی عصمت بچالی، لیکن اگر اس نے وہ کچھ نہ کیا جس کا میں حکم دے رہی ہوں تو وہ یقیناً قید کر دیا جائے گا اور ضرور ذلیل خوار ہو گا۔"

چنانچہ جو کچھ زلیخا نے کہا تھا وہ کر کے دکھا دیا اور بارہ سال تک حضرت یوسف علیہ السلام کو جیل میں رہنا پڑا، ہر غلام یوسف نہیں ہوتا اور نہ ہر غلام سے اس کی توقع کی جاسکتی ہے۔ کنیزوں کا حال تو اس سے بھی بدتر تھا۔ قرآن کریم نے ان کی اس مجبوری کو مد نظر رکھتے ہوئے خود ہی ان کی سزا میں تخفیف فر

مادی، اور ان کی سزا نصف کر دی۔ اس پر قیاس کرتے ہوئے کیا گھروں میں کام کاج کرنے والی خدمت گار عورتوں کے لیے یہی رعایت نہیں ہونی چاہیے؟ ہمارا خیال ہے کہ وہ یقیناً اس تخفیف ورعایت کی مستحق ہیں۔

جہالت اور لاعلمی

ایسے ہی وہ لوگ بھی اس رعایت کے مستحق ہیں جو تعلیم وتربیت کی کمی کی وجہ سے یا معاشرہ میں موجودہ اُونچ نیچ موجود ہونے کی وجہ سے اس رعایت کے مستحق ہوں۔ چنانچہ ہثیم بن بدر نے حرقوص سے روایت کی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس ایک عورت آئی اور اس نے شکایت کی کہ میرے شوہر نے میری باندی کے ساتھ زنا کیا ہے، شوہر نے کہا کہ وہ سچ کہہ رہی ہے لیکن خود میری بیوی اور اس کا مال میرے لیے حلال ہے، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس سے فرمایا جاؤ مگر آئندہ ایسا نہ کرنا۔ گویا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جہالت کی وجہ سے اس سے حد ساقط کر دی۔ اس روایت کو ابن حزم نے محلیٰ (ج ا ص ۸۸۱) میں امام محمدؒ نے کتاب الآثار میں (ص ۹۱) بیان کیا ہے۔

(اعلاء السنن ج ۱۱ ص ۶۲۳ تا ۶۲۴)

نیز امام شافعی، عبد الرزاق اور بیہقی نے ایک اور واقعہ بیان کیا ہے کہ عبد الرحمن بن حاطب رضی اللہ عنہ نے اپنے تمام غلاموں اور باندیوں کو جو نماز اور روزہ کے پابند تھے، آزاد کر دیا تھا۔ ان میں ثوبیہ نام کی ایک کنیز بھی نماز روزہ کی پابند تھی وہ بھی آزاد ہو گئی۔ وہ عجمی کنیز تھی کچھ دین کی زیادہ سمجھ بھی نہیں رکھتی تھی، حضرت عبد الرحمن بن حاطب رضی اللہ عنہ کے بیٹے یحیٰ جو اس روایت کے راوی ہیں کہتے ہیں کہ انہیں ثوبیہ کے حمل نے پریشان کر دیا۔ وہ زنا سے حاملہ ہوئی تھی اور کنواری بھی نہیں تھی۔ وہ پریشانی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور سارا واقعہ ان سے بیان کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا کہ: "تم کبھی بھی کوئی اچھی بات لے کر نہیں آتے۔" گویا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی پردہ پوشی نہ کرنے کو ناپسند کیا اور وہ بھی اس سے گھبرا گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ثوبیہ کو طلب کیا اور اس سے پوچھا تم حاملہ ہو گئی ہو؟ اس نے کہاں ہاں۔ مرغوش سے حاملہ ہو گئی ہوں۔ اس نے مجھے دو درہم دیئے تھے۔ وہ اس کا علانیہ اقرار کر رہی تھی اور قطعاً نہیں چھپا رہی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس اس وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ موجود تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سب سے کہا کہ مجھے معاملہ میں مشورہ دو۔ تو حضرت علی اور حضرت عبد الرحمن رضی اللہ عنہما نے کہا کہ اس پر حد واقع ہو گئی ہے۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا۔ عثمان رضی اللہ عنہ تم اپنی رائے بتاؤ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ کے دونوں بھائی آپ کو مشورہ دے چکے ہیں، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: نہیں تم اپنا مشورہ دو۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا میری رائے تو یہ ہے کہ چونکہ وہ اعلانیہ اقرار کر رہی ہے گویا وہ جانتی ہی نہیں کہ اس کا نتیجہ کیا ہو گا۔ اور وہ اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتی لیکن حد تو اسی پر نافذ ہوتی ہے جو اس کا علم رکھتا ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہا کہ عثمان تم نے سچ کہا۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے واقعی حد اسی پر واجب ہوتی ہے جو اس کا علم رکھتا ہو۔ (کنز العمال ج ۳ ص ۸۷ اعلاء السنن ج ۱۱ ص ۱۱۵)

ان واقعات سے ظاہر ہے کہ جہالت اور لاعلمی ایسے عوامل ہیں جن کی وجہ سے حدود ساقط کی جاسکتی ہیں۔

پشیمانی اور ندامت

ہمیں ایسی متعدد حدیثیں بھی ملتی ہیں جن میں حضور اکرم ﷺ نے یہ دیکھتے ہوئے کہ مجرم اپنے جرم پر پشیمان اور نادم ہے اور اس سے یہ توقع نہیں ہے کہ وہ دوبارہ اس جرم کا ارتکاب کرے گا آپؐ نے مجرم کو تنبیہ فرما کر چھوڑ دیا، اور کوئی حد جاری نہیں فرمائی۔ اگر حد ایسی سزا ہوتی کہ وہ متعین ہی ہوتی اس میں مجرم پر حد نافذ کرنا ہی ضروری ہوتا، اور اس میں کوئی کمی بیشی نہ کی جاسکتی تو حضور اکرم ﷺ کے متعلق یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ یوں اللہ کی حد کو ساقط فرما کر مجرم کو معافی دے دیتے۔

چنانچہ حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اکرم ﷺ مسجد میں تشریف فرما تھے اور ہم بھی آپ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ یکا یک ایک آدمی آیا اور اس نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! میں نے حد کا ارتکاب کر دیا ہے۔ لہٰذہ آپ مجھ پر حد قائم فرمادیجیے۔ رسول ﷺ اس کے متعلق خاموش رہے۔ اس نے دوبارہ وہی بات دہرائی تو حضور ﷺ اس کے متعلق پھر بھی خاموش رہے، اتنے میں نماز کی اقامت ہو گئی جب رسول اللہ ﷺ نماز سے فارغ ہو گئے۔ تو وہ شخص آپ کے پیچھے پیچھے ہو لیا اور میں بھی اس کے پیچھے ہو لیا کہ دیکھوں حضور ﷺ اسے کیا جواب دیتے ہیں تو آپ نے اس سے فرمایا بتاؤ تو۔ جب تم اپنے گھر سے نکلے، کیا تم نے وضو نہیں کیا تھا۔ اور اچھی طرح وضو نہیں کیا تھا؟ اس نے عرض کیا: بے شک اے اللہ کے رسول! پھر آپ نے فرمایا یقیناً اللہ نے تمہاری حد کو بخش دیا (معاف کر دیا) ہے۔ یا یوں فرمایا کہ اللہ نے تیرے گناہ کو معاف فرمادیا ہے۔ یہ روایت ابوداؤد کی ہے اور بعینہ یہی الفاظ صحیح مسلم میں ہیں۔ اور صحیح بخاری میں بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ایسی ہی روایت مروی ہے۔

(جمع الفوائد ج ۱ ص ۲۵ کتاب الصلوٰۃ وفضلہا)

یہ روایت اور اس کے الفاظ صحیح مسلم کے ہیں۔ بعینہ ایک ایسی ہی روایت صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ نیز ابو امامہ رضی اللہ عنہ کی روایت کو امام ابو داؤد نے بھی اپنی سنن میں جو صحاح ستہ کی مشہور کتاب ہے، نقل فرمایا ہے۔ اسے ضعیف روایت بھی نہیں کہا جاسکتا۔ اس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف یہ کہ حد نافذ نہیں فرماتے بلکہ ساتھ ہی اس کے جرم کی معافی کی بھی بشارت دے رہے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا ایک لازمی اور متعین سزا کے متعلق یہ طرز عمل اختیار کیا جاسکتا ہے؟ یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ یہ واقعہ قرآنی حد نازل ہونے سے پہلے کا نہیں ہے بلکہ بعد کا واقعہ ہے کیونکہ مجرم صحابی، اعتراف کررہے ہیں کہ میں حد کا مرتکب ہوگیا ہوں مجھ پر حد قائم کر دیجئے جو اس کا ثبوت ہے کہ قرآنی حدود نازل ہو چکی تھیں۔ جب ہی تو وہ صحابی حد قائم کرنے کی درخواست فرما رہے ہیں۔

ہمارے نزدیک اس کی صرف یہی توجیہ ہو سکتی ہے کہ مجرم کا یہ غالباً پہلا جرم تھا اور وہ اپنے اس ارتکابِ جرم پر نادم اور پشیمان تھا۔ چنانچہ وہ اعتراف جرم کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور سزا کے لیے اپنے آپ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا۔

ایک ایسی ہی روایت مسند بزار میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک صحابی کسی عورت سے محبت کرتے تھے۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے اور کسی اہم ضرورت سے آپ سے جانے کی اجازت چاہی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی وہ چلے گئے۔ اس وقت بارش برس رہی تھی، یکایک ان صحابی کو وہی عورت ایک حوض میں غسل کرتی نظر آئی وہ بے تاب ہوگئے اور اپنے پر قابو نہ رکھ سکے، تو جب وہ مجامعت کے لیے بیٹھے جیسے ایک مرد اپنی عورت کے سامنے بیٹھتا ہے، تو پوری کوشش کے باوجود ان کو ایستادگی ہی نہ ہو سکی، اور وہ کچھ کر نہ سکے آخر کھڑے ہوگئے۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر سارا واقعہ آپ سے بیان کر دیا۔ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا۔ جاؤ۔ نماز کی چار رکعتیں پڑھ لو۔ اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی۔

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَیِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ (ھود آیت ۱۱۴)

”دن کے دونوں کناروں پر اور رات کے کچھ حصوں میں نماز قائم کرو، یقیناً نیکیاں برائیوں کے اثرات کو زائل کر دیتی ہیں۔“

اس قصہ میں جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں یہ صحابی خوف و خشیت الٰہی کے ماتحت اگرچہ زنا کرنے کے مرتکب نہیں ہو سکے، اور حق تعالیٰ نے انہیں محفوظ رکھا لیکن وہ ارادہ تو کر چکے تھے۔ اپنے ارادہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اقدامات بھی کر چکے تھے۔ وہ اگر حد کے مستحق نہیں تو تعزیر کے مستحق تو یقیناً تھے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اتنا فرمانے پر اکتفا فرمایا کہ جاؤ چار رکعتیں نماز پڑھ لو۔ (جمع الفوائد ج ۲ ص ۶۹)

ہمارے نزدیک اس کی توجیہ بھی یہی ہے کہ غالباً ان صحابی کا یہ پہلا جرم تھا جو ان سے بے تابی کے ماتحت سرزد ہو گیا اور ساتھ ہی وہ اس پر سخت نادم اور پشیمان تھے، جب ہی تو وہ سارا واقعہ بے کم و کاست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کر دیتے اور خود کو سزا کے لیے پیش کر دیتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر اور توبہ کیا ہوگی؟ ساتھ ہی یہ بھی کہ ان کے دل میں حق تعالیٰ کا خوف اور خشیت پورے کمال کے ساتھ موجود تھی کہ تمام اسباب و دواعی کی موجودگی میں وہ ارتکاب جرم پر قدرت حاصل نہ کر سکے۔ انہیں اس عورت سے محبت تھی۔ منظر شہوت آگیا تھا۔ محبوبہ بھی آمادہ تھی۔ وہ اپنے اُوپر قدرت دے چکی تھی، مگر محض خشیت الٰہی کے غلبہ کی وجہ سے وہ ارتکاب جرم پر قادر نہ ہو سکے تھے۔ ان سے زیادہ اس رعایت کا اور کون مستحق ہو سکتا تھا۔

اسی نوعیت کا ایک واقعہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے صحیح بخاری میں، صحیح مسلم، سنن ابو داؤد، اور جامع ترمذی میں نقل کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک صحابی حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ مدینہ منورہ کے ایک کنارے پر میں ایک عورت سے ملا اور میں نے اس کے ساتھ بجز مجامعت کے سب ہی کچھ کیا۔ اب میں حاضر ہوں میرے متعلق جو آپ کا جی چاہے فیصلہ فرمایئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا کہ اگر تو اپنی پردہ پوشی کر لیتا تو حق تعالیٰ نے تو تیری پردہ پوشی فرمائی تھی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ آدمی کھڑا ہوا اور چلا گیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے پیچھے پیچھے ایک آدمی کو روانہ کیا جو اسے بلا لایا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے سامنے یہی آیت تلاوت فرمائی ”وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَیِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِیْنَ ﴿۱۱۴﴾ حاضرین میں سے ایک صحابی نے عرض کیا اے اللہ کے نبی یہ حکم خصوصیت کے ساتھ اسی شخص کے لیے ہے؟ تو آپ نے فرمایا نہیں سب کے لیے ہے۔ (جمع الفوائد ج ۲ ص ۶۹)

یہاں بھی ملاحظہ فرمایئے ان صحابی نے بجز زنا کے اور کیا کچھ نہیں کیا تھا، اگر زنا کی حد نہیں تو کیا وہ کسی تعزیر کے بھی مستحق نہیں تھے؟ لیکن رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بھی کچھ نہیں فرمایا بلکہ اقامت صلوٰۃ ہی کا حکم دیا ہے۔ اس کی توجیہ بھی اس کے سوا اور کیا کی جاسکتی ہے کہ آپ نے اس کی توبہ انابت اور غالباً پہلا جرم ہونے کی بناء پر صرف اقامت صلوٰۃ کے حکم پر اکتفاء فرمایا۔

کیا اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ مجرم کے حالات و کوائف اس کی شرمندگی اور پشیمانی کو مد نظر رکھتے ہوئے سزا کو معاف بھی کیا جاسکتا ہے، اس میں کمی اور تخفیف بھی کی جاسکتی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ جہاں جرم ثابت ہو جائے وہاں آنکھیں بند کر کے ضرور ہی سزا نافذ کر دی جائے، ان واقعات کو سامنے رکھتے ہوئے یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ حدود میں سزائیں لازمی اور متعین نہیں ہیں کہ عدالتوں کو ان کا پابند بنادیا جائے کہ وہ لازماً ان سزاؤں کو نافذ کریں۔

اسی طرح ایک اور واقعہ امام ترمذیؒ نے حضرت ابو الیسر سے نقل کیا ہے کہ میرے پاس ایک عورت کھجوریں خریدنے آئی۔ میں نے اسے کھجوریں دکھائیں اور اس سے کہا کہ گھر میں اس سے بھی اچھی کھجوریں رکھی ہیں۔ وہ میرے ساتھ گھر کے اندر چلی آئی۔ میں اس پر جھک پڑا اور خوب بوسے لیے۔ پھر میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور ان سے سارا واقعہ بیان کیا انہوں نے فرمایا۔ پردہ پوشی سے کام لو، پھر میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس گیا اور ان سے واقعہ بیان کیا انہوں نے بھی یہی فرمایا کہ اپنے جرم کی پردہ پوشی کرو اور حق تعالیٰ کے سامنے توبہ کرو، لیکن مجھ سے صبر نہیں ہوا، میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ سے سارا واقعہ بیان کیا تو آپ نے فرمایا، "تم نے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے ایک غازی کی بیوی کے ساتھ خوب نیابت کا فریضہ انجام دیا!" حتیٰ کہ میرے دل میں یہ تمنا پیدا ہونے لگی کہ کاش میں اب سے پہلے مسلمان ہی نہ ہوا ہوتا اور اب ہی مسلمان ہوا ہوتا۔ میں نے سمجھ لیا کہ بس تو تو قطعاً جہنمی ہو گیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیر تک سر جھکائے رکھا حتیٰ کہ آپ پر وحی نازل ہوئی: اقم الصلوٰۃ (آخر آیت تک) آپ نے میرے سامنے یہ آیت تلاوت فرمائی تو آپ کے اصحاب نے عرض کیا کہ یہ حکم اسی کے لیے خاص ہے یا سب لوگوں کے لیے عام ہے آپ نے فرمایا۔ نہیں سب لوگوں کے لیے عام ہے۔ (بحوالہ جمع الفوائد ج ۲ ص ۶۹)

اس روایت اور اس سے پچھلی روایت میں اس بات کی بھی صراحت ہو گئی کہ یہ رعایت ان دو اشخاص کے لیے مخصوص نہیں تھی بلکہ قیامت تک آنے والا ہر شخص جو ان کی طرح اپنے فعل پر نادم اور پشیمان ہو اور اپنے کیے کی سزا بھگتنے کے لیے آمادہ ہو اس کا یہی حکم ہے۔

جرائم حدود کی شہادت نہ دینا افضل ہے

اسی سلسلہ میں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ ایک طرف تو مقدمات کے لیے شہادت ادا کرنے کا حکم ہے، چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ (الطلاق: ۲)

"شہادت کو اللہ کے لیے قائم کرو۔"

وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ (البقرہ: ۲۸۲)

"اور شہادت کو نہ چھپاؤ اور جو شہادت کو چھپاتا ہے تو اسی کا دل گنہگار ہے۔"

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ (البقرہ: ۱۴۰)

"اس سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا کہ اللہ کی طرف سے شہادت اس کے پاس موجود ہو اور وہ اسے چھپائے۔"

لیکن دوسری طرف ہمارے فقہا کرام نے عمل نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور عمل صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو دیکھتے ہوئے یہ تصریحات فرمائی ہیں کہ حدود میں شہادت نہ دینا ہی افضل ہے۔ اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے شیخ الاسلام علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"اگر یہ کہا جائے کہ زنا کے جرم کو قتل سے بھی زیادہ کیوں اہمیت دیدی گئی کہ ثبوت قتل کے لیے دو گواہوں کی شہادت اور ایک مرتبہ کے اقرار ہی کو کافی سمجھ لیا گیا۔ لیکن زنا میں چار گواہوں کی شہادت سے کم شہادتوں کو اور ایک ہی مرتبہ کے اقرار کو کافی نہیں سمجھا گیا بلکہ چار شہادتوں اور چار مرتبہ کے اقرار کو ضروری قرار دے دیا گیا ہے حالانکہ حق تعالیٰ تو مسلمانوں میں فواحش کے پھیلنے کو قطعاً پسند نہیں فرماتے؟

تو بات یہ ہے کہ زنا میں چار شہادتوں کو اس لیے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ حق تعالیٰ زنا کے مجرمین کی پردہ پوشی چاہتے ہیں، کیونکہ اس جرم کا ستر اور اخفاء ہی حق تعالیٰ کو پسند ہے۔ حق تعالیٰ نہیں چاہتے کہ سوسائٹی میں فواحش کی اشاعت ہو۔

محقق ابن الہمامؒ فتح القدیر میں فرمایا ہے کہ:

"چونکہ حق تعالیٰ کے نزدیک ان جرائم کی پردہ پوشی پسندیدہ امر ہے اس لیے زنا کی شہادت دینا خلافِ اولیٰ ہو گا۔ لیکن یہ فیصلہ مجرم کی نسبت سے کرنا ہو گا ایسا مجرم جو اس جرم کا عادی نہیں اور نہ اسے کوئی معمولی بات سمجھتا ہے۔ اس کے سلسلے میں شہادت نہ دینا ہی افضل ہے۔ لیکن جب صورت حال اس کی عام اشاعت تک پہنچ جائے اور لوگ اسے ایک معمولی بات سمجھنے لگیں بلکہ کچھ لوگ اس جرم پر فخر کرنا بھی شروع کر دیں، تو اس حالات میں زنا کی شہادت ادا کرنا اور مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانا اس کے چھپانے سے افضل ہو گا۔ کیونکہ حق تعالیٰ کا منشا اور مقصد یہ ہے کہ اس کی زمین معاصی اور فواحش سے پاک وصاف رہے۔ اگر یہ مقصد مفید خطاب (نصائح و تنبیہات) سے حاصل ہو سکتا ہے کہ اس کے نتیجہ میں جرم کرنے والوں کی طرف سے توبہ اور ندامت کا اظہار ہو جائے تو اسے ہی اختیار کیا جائے گا۔ اور انہیں تنبیہ کر کے چھوڑ دینا چاہیے لیکن جب زنا کی گرم بازاری ہو جائے اور لوگ اسے معمولی

بات سمجھنے لگیں اور اس کے پھیلنے کا خطرہ ہو تو اسوقت اللہ کی زمین کو تنبیہ اور توبہ کے ذریعہ سے پاک رکھنا ممکن نہیں رہے گا۔ لہٰذہ پھر اللہ کی زمین کو پاک رکھنے کا دوسرا ذریعہ یعنی حدود کو قائم اور نافذ کرنا ضروری ہو جائے گا۔

(فتح القدیر ج۵ ص۵ مختصراً)

عبدالرزاق اور بیہقی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث میں نقل کیا ہے کہ حق تعالیٰ نے زنا میں چار گواہ اس لیے رکھے ہیں کہ وہ پردہ پوشی چاہتا ہے۔ اس کے ذریعہ سے فواحش سے تمہاری پردہ پوشی فرمائی ہے۔ لہٰذہ اللہ نے جو پردہ ڈال دیا ہے اس کے پیچھے کسی کو جھانکنا نہیں چاہیے، یاد رکھو اگر حق تعالیٰ چاہتے تو ایک ہی گواہ مقرر کر دیتے جو سچا ہو۔ (کنز العمال ج۲ ص۶۸)

اس سے ہمارے اس قول کی تائید ہو جاتی ہے کہ چار گواہوں کی شرط رکھنے سے مقصد پردہ پوشی ہے (کہ ایسے مقدمات آسانی سے عام طور پر عدالتوں میں پیش نہ ہو سکیں) اس تائید و موافقت پر ہم حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ (اعلاء السنن ج۱۱ ص ۵۰۵ تا ۵۰۶)

ان تصریحات سے ثابت ہے کہ حدود کے سلسلے میں مسلمانوں کو یہی تعلیم دی گئی ہے وہ جہاں تک ہو سکے مجرموں کو حدود سے بچانے کی کوشش کریں۔ شیخ الاسلام علامہ عثمانی اور فقہائے حنفیہ میں سے محقق ابن الہمام رحمتہ اللہ علیہما کا خیال یہ ہے کہ خود حق تعالیٰ کا منشاء بھی یہی ہے۔ اور اسی لیے حق تعالیٰ نے حدود کے جرائم کے ثبوت کے لیے بڑی کڑی شرطیں رکھی ہیں۔ زنا کا جرم حالانکہ قتل سے زیادہ شدید نہیں ہے اور قتل کا جرم دو گواہوں اور ایک مرتبہ کے اقرار سے ثابت ہو جاتا ہے مگر زنا کے لیے حق تعالیٰ نے چار گواہ یا مجرم کا چار مرتبہ اقرار ضروری قرار دیا ہے۔

حد کا مجرم عادی ہونا چاہیے

قاضی کو حدود کے سلسلے میں اس کا لحاظ بھی رکھنا چاہیے کہ مجرم عادی ہے یا اس سے پہلی مرتبہ ہی یہ جرم سرزد ہوا ہے۔ اگر وہ عادی مجرم ہے اور یہ جرم یکے بعد دیگرے اس سے سرزد ہوتا رہا ہے تو اس پر حد جاری کرنی چاہیے، اور اگر وہ عادی مجرم نہیں، اس سے پہلی مرتبہ ہی یہ جرم سرزد ہوا ہے تو اس کے ساتھ حتی الامکان رعایت برتنی چاہیے۔

حضرت عمرؓ کا واقعہ

امام ابن حزم نے "المحلی" میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ ان کے سامنے ایک چور پیش ہوا اور اس نے کہا کہ امیر المومنین میں نے اس سے پہلے کبھی چوری نہیں کی (یہ میرا پہلا جرم ہے) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ عمرؓ کے پروردگار کی قسم تو جھوٹ بول رہا ہے پہلے ہی گناہ پر حق تعالیٰ کبھی نہیں پکڑتے۔

ابن وہب نے عبد اللہ بن سمعان سے اسی واقعہ کو نقل کیا ہے اس میں یہ بھی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اے امیر المومنین! حق تعالیٰ اس سے کہیں زیادہ حلیم اور بردبار ہیں کہ وہ اپنے بندہ کو پہلے گناہ ہی میں پکڑ لیں۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے ہاتھ کو کاٹ دینے کا حکم دیدیا۔ جب ہاتھ کٹ گیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر اس کے پاس گئے اور اس سے کہا کہ میں تجھے اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ اب تک تو نے کتنی مرتبہ چوری کی ہے؟ اس نے اقرار کیا کہ اکیس مرتبہ (المحلی ج۱۱ ص۸۵۱)

علامہ ابن حزم نے ایسی ہی ایک روایت حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے بھی نقل کی ہے اور کہا ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی یہ دونوں روایتیں ضعیف ہیں۔ ان میں ایک مرسل اور دوسری بھی مرسل اور ناقابل اعتبار ہے البتہ اس سلسلہ میں حضرت عمرؓ والی روایت سند کے اعتبار سے صحیح ہے۔

اس پر شیخ الاسلام علامہ عثمانیؒ فرماتے ہیں:

"میری گزارش یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کی روایت سے ان دونوں مرسل روایات کی تائید ہو گئی جو حضرت ابو بکر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما سے منقول ہیں اور مرسل ہونا ہم حنفیہ کے نزدیک ضعف کی دلیل نہیں ہے (حنفیہ کے ہاں مرسل روایات مقبول ہوتی ہیں) (اعلاء السنن ج۱۱ ص ۶۷۱ تا ۶۷۲)

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حدود الٰہی پہلے ہی جرم پر نافذ نہیں کرنی چاہیئے بلکہ یہ زائد سے زائد آخری سزائیں ہیں جو عادی مجرموں کو دی جانی چاہیں۔

ان روایات میں مجرم کا یہ کہنا کہ میں نے اس سے پہلے کبھی چوری نہیں کی اور یہ میرا پہلا ہی جرم ہے اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کا یہ فرمانا کہ تو جھوٹ بول رہا ہے، اس بات کو ثابت کر رہا ہے کہ پہلے ہی جرم پر سزا نہیں دی جانی چاہیے کیونکہ اگر پہلے ہی جرم پر بھی سزا دی جانی چاہیے تھی تو مجرم خود بھی اس کا اظہار نہ کرتا اور یہ حضرات بھی بجائے اس کی تکذیب کرنے کے صاف صاف فرماتے کہ اس سے کیا ہوتا ہے ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ تو نے جرم کیا ہے پہلی مرتبہ کیا ہو یا دوسری مرتبہ، تو ہر حال میں سزا کا مستحق ہے۔ لیکن یہ سب حضرات ایسا نہیں فرماتے گویا وہ اس بات کو تسلیم کر رہے ہیں کہ واقعی اگر تیرا پہلا جرم ہوتا تو ہم سزا نہ دیتے لیکن تو اپنے اس قول میں جھوٹا ہے لہٰذہ سزا کا مستحق ہے۔

مجبوری کے ماتحت جرائم

بعض جرائم کسی مجبوری کے ماتحت بھی سرزد ہوتے ہیں۔ مجبوری کے ماتحت جو جرم سرزد ہو اس کی حیثیت یقیناً وہ نہیں ہوتی جو طمع اور حرص یا عادت کے ماتحت سرزد ہونے والے جرائم کی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قحط سالی کے زمانہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قطع ید کی سزا کو معطل فرمادیا تھا۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل نے بسند ھارون بن اسمعیل عن علی بن مبارك عن یحیٰ بن ابی کثیر عن حسان بن ازھر نقل کیا ہے کہ ابن حدیر نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کھجوروں کا پھل چرالینے اور قحط سالی کے زمانہ میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ اس کو ابراہیم بن یعقوب جوزجانی نے اپنی جامع میں بھی نقل کیا ہے۔ ابراہیم کہتے ہیں کہ میں نے امام احمدؒ سے اس کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ "غدق " کھجور کے پھل کو کہتے ہیں اور "عامِ سَنَةٍ " سے مراد قحط سالی کا زمانہ ہے۔ تو میں نے امام احمدؒ سے پوچھا کہ کیا آپ اس کے قائل ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا "ہاں میری جان کی قسم۔" (التلخیص الحبیر ج۴ ص۳۵۸)

شیخ السلام علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام احمد بن حنبلؒ کا اس سے استدلال فرمانا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ اثر ان کے نزدیک ثابت ہے۔ اگرچہ مجھے حسان بن ازہر کا حال اسماء الرجال کی کتابوں میں نہیں ملا۔ نیز ابن حدیر بھی غیر معروف شخصیت ہیں، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد عبدالرزاق اور ابن شیبہ نے بھی نقل کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: (کنزالعمال ج۳ ص۱۱۵)
(اعلاء السنن ج۱۱ ص۱۲/۷)

ایسا ہی ایک واقعہ زنا کے سلسلہ میں بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا گیا ہے۔ جسے سفیان ثوری نے اعمش سے بواسطہ ابن المسیب نقل کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک عورت کو لایا گیا جسے ایک بے آب و گیاہ میدان میں ایک چرواہا ملا۔ عورت بہت پیاسی تھی۔ اس نے چرواہے سے پینے کے لیے پانی مانگا اس نے پانی پلانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ اگر تو مجھے اپنے اوپر قدرت دے دے کہ میں تجھ سے جماع کرلوں تو میں تجھے پانی پلادوں گا، عورت نے اسے بہت اللہ کی قسمیں دیں مگر وہ نہ مانا، جب وہ پیاس سے بہت مجبور ہو گئی تو اس نے اسے اپنے اوپر قابو دے دیا۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے ضرورت اور مجبوری کے ماتحت حد ساقط فرمادی، اس واقعہ کو عبدالرزاق نے بیان کیا ہے ملاحظہ ہو۔

(کنزالعمال ج۳ ص۸۶) اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ (اعلاء السنن ج۱۱ ص۶۷۱)

بہرحال ان روایات و آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ ضرورت اور مجبوری کے ماتحت اگر کوئی جرم سرزد ہو جائے تو سزائے حد جاری نہیں کی جانی چاہیے۔

مجرم کی ذہنی و جسمانی حالت

اسی طرح مجرم کی صحت اور جسمانی اور ذہنی حالت کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ حدود کا مقصد جرائم کا انسداد ہے مجرم کو جان سے مار ڈالنا نہیں ہے۔ چنانچہ انصار میں سے ایک صحابی کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ وہ سخت بیمار ہو گئے حتیٰ کہ اتنے لاغر ہو گئے کہ ہڈی چمڑا الگ ہو گیا۔ اس حالت میں کوئی انصاری لڑکی ان کے گھر آئی، اسے دیکھ کر ان پر شہوت سوار ہو گئی اور انہوں نے مجامعت کرلی۔ جب ان کی مزاج پرسی کے لیے کچھ لوگ آئے انہوں نے ان سے یہ واقعہ بیان کر کے درخواست کی کہ آنحضرت ﷺ سے میرے متعلق فتویٰ پوچھو، کیونکہ میں نے اس لڑکی سے جو ہمارے گھر آئی تھی میں نے اس سے مجامعت کرلی ہے۔ لوگوں نے حضور ﷺ کی خدمت میں یہ واقعہ بیان کیا اور بتایا کہ ہم نے اتنی بیماری جو اسے ہے کسی کو نہیں دیکھی۔ اگر ہم اسے آپ کی خدمت میں اٹھا کر لائیں تو اسکی ہڈیوں کی جوڑ جوڑ الگ ہو جائیں گے، اس کا ہڈی چمڑا الگ ہو چکا ہے، تو آنحضرت ﷺ نے ان سے فرمایا کہ سو باریک شاخیں لے کر انہیں ایک مرتبہ اس سے چھوا دو۔ اس روایت کو ابو داؤد نے نقل کیا ہے اس پر کوئی تنقید نہیں فرمائی۔

(ابو داؤد ج۲ ص۶۲۲)

اسی طرح کی ایک روایت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے ابن حزم نے المحلی میں بیان کی ہے اور کہا ہے کہ سہل بن سعد کی حدیث درست ہے اس سے استدلال کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد پھر کہا کہ ہم نے اس کی سند کو عمدہ سند پایا ہے جس سے حجت قائم ہو سکتی ہے۔

(المحلی ج۱۱ ص۱۷۵) (بحوالہ اعلاء السنن ص۶۱۷ تا ۶۱۸)

حضور اکرم ﷺ نے ان صحابی کی بیماری اور جسمانی حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے سزا میں اس قدر تخفیف فرمادی جو درحقیقت قرآن کریم ہی سے ایک استدلال تھا۔ حضرت ایوب علیہ السلام کے تذکرۂ جلیلہ میں جب وہ کسی بات پر اپنی بیوی رضی اللہ عنہا سے ناراض ہو کر یہ قسم کھا بیٹھے کہ تندرست ہونے کے بعد وہ ان کو سو کوڑے ماریں گے۔ ان کی بیوی نہایت نیک، خدمت گذار اور صابر خاتون تھیں۔ انہوں نے بیماری و آزاری میں محنت مزدوری کر کے اٹھارہ سال تک حضرت ایوب علیہ السلام کی تیمارداری اور خدمت کی تھی۔ جب آزمائش کا زمانہ گذر گیا اور حضرت ایوب علیہ السلام تندرست ہو گئے تو انہیں اپنی قسم یاد آئی۔ سورہ ص میں اسی واقعہ کے سلسلے میں حق تعالیٰ نے ان سے ارشاد فرمایا تھا۔

وَ خُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَ لَا تَحْنَثْ ؕ اِنَّا وَجَدْنٰهُ

صَابِرًا ؕ نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴿۴۴﴾

"اپنے ہاتھ میں ایک شاخ لو (جس میں سو تنکے ہوں) اس سے انہیں مار دو اور اپنی قسم پوری کر لو یقیناً ہم نے ایوب کو بڑا صابر پایا۔ کتنے اچھے بندے تھے اور یقیناً وہ اللہ کی طرف رجوع ہونے والے تھے۔"

جو سزا حق تعالیٰ نے حضرت ایوب علیہ السلام کی زوجہ مطہرہ کے لئے تجویز فرمائی تھی بعینہ وہی سزا آنحضرت ﷺ نے ان انصاری صحابی کے لیے تجویز فرمادی۔ اس روایت سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مجرم کی جسمانی حالت کے پیش نظر سزا میں بڑی حد تک تخفیف فرمادی تھی۔ لہٰذہ حدود کی سزا میں ایسے حالات میں تخفیف کی جاسکتی ہے۔

ناگوار فریضہ

حضور اکرم ﷺ اور حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے متعلق یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے حدود قائم کرنے میں قطعاً کبھی سرگرمی نہیں دکھائی بلکہ انہیں ایک ناگوار فریضہ سمجھ کر ہی ادا فرمایا ہے اور ہر ممکن کوشش فرمائی ہے کہ مسلمانوں کو حدود کا نشانہ بننے سے بچایا جائے۔ چنانچہ حضور اکرم ﷺ کا مشہور ارشاد ہے کہ:

اِدْرَؤُا الْحُدُوْدَ بِالشُّبُهَاتِ

"حدود کو شبہات کی بنا پر ساقط کر دو۔"

چنانچہ مصنف ابن ابی شیبہ، ترمذی، مستدرک حاکم، سنن بیہقی اور جامع صغیر میں حضرت عائشہؓ سے آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد مروی ہے کہ جہاں تک تم سے ہو سکے مسلمانوں سے حدود کو ساقط کرو۔ اگر مسلمان کے لیے خلاصی کی کوئی راہ نکال سکو تو اسے رہا کرو۔ کیوں کہ امام معاف کرنے میں غلطی کر جائے یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ سزا دینے میں غلطی کر جائے۔

یہی مضمون حضرت عبد اللہ بن مسعود، حضرت عبد اللہ بن عباس، حضرت علی، حضرت ابو ہریرہ، حضرت عمر بن الخطاب اور حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے ملاحظہ ہو: (اعلاء السنن ج ۱۱ ص ۵۲۱ تا ۵۲۳)

زنا کے سلسلہ میں حضرت ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ کا مشہور واقعہ ہے جنہیں آپ کے حکم سے سنگسار کیا گیا تھا، ان کے واقعہ میں حضرت ہزال (ماعز اسلمی کے آقا) کا بیان ہے کہ جب ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ کو رجم کرنے کے لیے (مدینہ کے سنگستان) حرہ کی طرف لے جایا گیا اور ماعزؓ کو پتھر لگے تو وہ چلانے لگے اور وہاں سے نکل کر بھاگنے لگے، عبد اللہ بن انیس صحابی کے سامنے آئے تو چونکہ سنگسار کرنے والے کچھ نہ کر سکے تھے تو عبد اللہ بن انیس نے اونٹ کی ہڈی انہیں ماری اور انہیں قتل کر دیا۔ پھر وہ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے اس کا تذکرہ کیا تو آپ نے فرمایا تم نے انہیں چھوڑ کیوں نہ دیا؟ ممکن ہے وہ توبہ کر لیتے اور اللہ ان کی توبہ قبول کر لیتا۔ اسے ابو داؤد نے نقل کیا ہے اور اس پر کوئی تنقید نہیں فرمائی۔ (ابو داؤد ج ۲ ص ۲۵۸)

التلخیص الجبیر (ج ۲ ص ۳۵۲) میں ہے کہ اس کی سند عمدہ ہے، نیز زیلعی میں ج ۲ ص ۷۷ (میں بھی یہ ٹکڑا نقل کیا گیا ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ نے اس میں یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ ہشام نے بتایا کہ یزید بن نعیم نے اپنے والد سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے جب انہیں (یعنی نعیم کو جن کا لقب ہزال تھا) دیکھا تو فرمایا اللہ کی قسم اے ہزال اگر تم اپنے کپڑے میں اسے چھپا لیتے (یعنی اس کی پردہ پوشی کر لیتے) (تو تمہارے لیے اس سے بہتر ہوتا جو تم نے کیا ہے، تنقیح میں ہے کہ اس کی سند درست ہے۔

(اعلاء السنن ج ۱۱ ص ۶۰۷ تا ۶۰۸)

اس واقعہ میں آپ کا حضرت عبد اللہ بن انیس رضی اللہ عنہ یہ فرمانا کہ: "تم نے اسے چھوڑ کیوں نہ دیا ممکن ہے وہ توبہ کر لیتا اور اللہ اس کی توبہ قبول کر لیتا۔" اور ہزال رضی اللہ عنہ سے یہ فرمانا کہ: اے ہزال اگر تم اسے اپنے کپڑے میں چھپا لیتے تو تمہارے لیے بہتر ہوتا جو تم نے کیا ہے" اس سے یہی بات ظاہر ہوتی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ کو رجم کرنے کا حکم خوشی سے نہیں دیا تھا۔ بلکہ ایک ناگوار فریضہ سمجھ کر دیا تھا۔

نیز عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ ان قاذورات (فواحش) سے جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے اجتناب برتو۔ پھر جس سے کوئی لغزش ہو جائے تو وہ اسے چھپائے، اللہ بھی اس کی پردہ پوشی فرمائے گا اور اللہ سے توبہ کرے، البتہ جو اپنا چہرہ ہمارے سامنے کرے گا تو ہم اس پر اللہ کی کتاب (کا حکم) نافذ کر دیں گے۔ اسے حاکم نے مستدرک میں اور بیہقی نے سنن میں نقل کیا ہے ملاحظہ ہو۔

(الجامع الصغیر ج ۱ ص ۸) (اعلاء السنن ج ۱۱، ص ۵۱۲)

نیز عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً منقول ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: "حدود کی اپنے آپس ہی میں معافی تلافی کر لیا کرو۔ حد کا کوئی مقدمہ میرے سامنے پیش ہو گا تو مجھے اس پر فیصلہ کرنا پڑے گا۔" یہ حدیث حسن ہے (اعلاء السنن ج ۱۱ ص ۵۳۶)

صحابہ کی طرف سے پردہ پوشی کی تلقین

آنحضرت ﷺ کی اسی تعلیم و تربیت کا یہ نتیجہ تھا کہ حضرات صحابہ کرام برابر کوشش فرماتے تھے کہ مجرم اپنی پردہ پوشی کریں۔ اور خود ہی توبہ کر

لیں اور معاملہ حکومت تک نہ پہنچنے پائے۔ چنانچہ حبیب ابن ابی فضالہ بیان کرتے ہیں کہ صالح بن کریز نے ان سے بیان کیا کہ وہ اپنی کنیز کو لے کر حکم بن ایوب کے پاس گئے، میں وہاں بیٹھا تھا کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ تشریف لے آئے وہ بیٹھ گئے، تو انہوں نے پوچھا اے صالح! تمہارے ساتھ جو کنیز ہے اس کا کیا معاملہ ہے؟ میں نے کہا کہ ہماری اس کنیز نے زنا کا ارتکاب کیا ہے، میں چاہتا ہوں کہ اس کا معاملہ امام کے سامنے پیش کروں تا کہ وہ اس پر حد جاری کر دیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "ایسا نہ کرو، اپنی اس کنیز کو واپس کر دو، اور اللہ کا خوف کرو، اس کی پردہ پوشی کرو۔" میں نے کہا کہ میں ایسا نہیں کر سکتا، میں تو اس کا معاملہ امام کے سامنے پیش کر کے رہوں گا، تو حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا ایسا نہ کرو، میری بات مان لو، صالح کہتے ہیں کہ وہ برابر مجھ سے یہی کہتے رہے حتیٰ کہ میں نے ان سے کہا کہ میں اس شرط پر اسے واپس بھیج سکتا ہوں کہ اس پر جو مجھے گناہ ہو گا تو آپ اس کے ذمہ دار ہوں گے، تو حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "ہاں میں ذمہ داری لیتا ہوں۔" چنانچہ میں نے اسے گھر بھیج دیا، اس روایت کو ابن حزم نے (محلی ج ۱۱ ص ۱۶۵) میں بیان کیا ہے۔

(اعلاء السنن ج ۱۱ ص ۵۸۸ تا ۵۸۹)

مجرم کو انکار کی تلقین

حتیٰ کہ معاملہ عدالت میں پہنچ جاتا تب بھی وہ حضرات مجرم کو برسر عدالت تلقین کرنے سے نہیں چوکتے تھے تا کہ مجرم کی جان بچ جائے اور حد جاری نہ ہو سکے، چنانچہ ابن حزم نے موسیٰ بن معاویہ کی سند سے یزید زعافری سے روایت کی ہے کہ ایک مرد اور عورت مراد کے کھنڈرات میں پائے گئے مرد نے عورت کو لہولہان کر دیا تھا۔ وہ دونوں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کیے گئے، مرد نے کہا یہ میری چچازاد بہن ہے، میں نے اس سے نکاح کر لیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عورت سے پوچھا تو کیا کہتی ہے؟ لوگوں نے عورت سے کہا کہ ہاں کہہ دے، چنانچہ عورت نے ہاں کہہ دیا۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان دونوں سے حد ساقط کر دی۔ (محلی ج ۱۱ ص ۲۴۲)

ابوالحسن بکالی نے بھی ادریس بن یزید اودی کی سند سے اس واقعہ کو بیان کیا ہے جیسا کہ (کنز العمال ج ۳ ص ۹۷) میں بیان ہوا ہے۔

شیخ الاسلام علامہ ظفر احمد صاحب عثمانیؒ نے اسی مضمون کی متعدد روایات نقل فرمائی ہیں جن میں سے ہم صرف چند روایات نقل کرتے ہیں۔

ابن جریج کا بیان ہے کہ میں نے عطاء بن ابی رباح (مشہور تابعی) کو کہتے ہوئے سنا کہ جو حضرات (صحابہ) گزر چکے ہیں ان کے سامنے چور کو لایا جاتا تھا تو وہ اس سے کہتے تھے، کیا تو نے چوری کی ہے؟ کہہ دے کہ نہیں اور انہوں نے خصوصیت سے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا نام لیا اور اسے عبدالرزاق نے اپنی مصنف میں بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہو

(التلخیص الجبیر ج ۲ ص ۳۵۷) اعلاء السنن ج ۱۱ ص ۵۴۲)

نیز معمر نے طاؤس سے، انہوں نے عکرمہ بن خالد سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک شخص کو لایا گیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے پوچھا کہ تو نے چوری کی ہے؟ کہہ دے کہ نہیں، چنانچہ اس نے کہہ دیا کہ "نہیں" تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے چھوڑ دیا، اسے عبد الرزاق نے اپنی مصنف میں بیان کیا ہے۔ دیکھئے (التلخیص الجبیر ج ۲ ص ۳۵۷) اس کے رجال (روای) صحیحین کے راوی ہیں البتہ عکرمہ ابن خالد کا سماع حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں۔ (اعلاء السنن ج ۱۱ ص ۵۴۲)

نیز حماد نے ابراہیم (نخعی) سے نقل کیا ہے کہ ابومسعود انصاری صحابیؓ کی خدمت میں ایک عورت پیش ہوئی جس نے ایک اونٹ چرا لیا تھا، تو حضرت ابومسعود رضی اللہ عنہ نے اس سے پوچھا: "کیا تو نے چوری کی ہے؟ کہہ دے کہ "نہیں" سفیان ثوری نے اسے اپنی جامع میں بیان کیا ہے۔

(ملاحظہ ہو التلخیص الجبیر بحوالہ سابق)

اس اثر کو نقل فرما کر علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"میں کہتا ہوں کہ اس کی سند، استدلال کرنے کے قابل ہے۔ اس کے باوجود کہ ابرہیم (نخعی) کی ملاقات ابومسعود انصاریؓ سے ثابت نہیں کیونکہ یہ انقطاع ہمارے نزدیک مضر نہیں۔ یہ اس وجہ سے کہ کر ابراہیم نخعی کی مراسیل صحیح ہی ہوتی ہیں جیسا کہ کتاب الحج میں گزر چکا ہے۔"

(اعلاء السنن ج ۱۱ ص ۵۴۳)

نیز یہ روایت بھی کہ ہمیں ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے خبر دی کہ ہم سے ابراہیم بن محمد بن المنتشر نے اپنے والد سے حدیث بیان کی انہوں نے یزید بن کبشہ سے کہ حضرت ابو درداءؓ کے سامنے ایک حبشی کنیز پیش کی گئی کہ اس نے چوری کی ہے۔ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ ان دنوں دمشق میں قضا پر متعین تھے۔ انہوں نے کہا: اے سلامہ! کیا تو نے چوری کی ہے؟ کہہ دے کہ: "نہیں" اس نے کہہ دیا کہ: "نہیں" لوگوں نے کہا: "اے ابو درداء تم اسے تلقین کر رہے ہو؟ (یعنی جواب سکھا رہے ہو) حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہاں تم میرے پاس ایک ایسی عورت کو لائے ہو جو بے چاری نہیں جانتی کہ تم اس کے متعلق کیا ارادہ کر رہے ہو کہ میں اسکا ہاتھ کاٹ دوں۔ اسے امام محمد نے کتاب الآثار ص ۹۳ میں نقل کیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اسکی سند ایسی ہے جس سے حجت پکڑی جا سکتی ہے۔ اور راوی اس کے سب ثقہ ہیں۔

(اعلاء السنن ج ۱۱ ص ۵۴۲)

نیز ابن ابی شیبہ نے ابو المتوکل کی سند سے روایت کی ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی خدمت میں ایک چور کو پیش کیا گیا، وہ ان دنوں امیر تھے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس سے پوچھا کیا تو نے چوری کی ہے ؟ کہہ دے کہ "نہیں" دو یا تین مرتبہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس سے یہی کہا۔ ملاحظہ ہو۔ (التلخیص الجبیر ج ۲ ص ۳۵۷)

ان تمام روایات میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ حضرات صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو بر سر عدالت جب کہ ان کے سامنے ان کے مقدمات پیش ہیں، خود تلقین فرمارہے ہیں کہ تم جواب میں انکار کر دو، یعنی تاکہ ہم تم پر حد جاری نہ کر سکیں، حالانکہ قاضی کو عدالت میں دیگر جرائم میں اس قسم کی تلقین کرنے کی قطعاً اجازت نہیں ہے جس سے صاف نظر آتا ہے کہ ان حضرات کا مقصد حدود کو نافذ کرنے کے بجائے ملزموں کو رہائی دلانا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ہم مجرموں پر حد جاری کریں۔

صرف صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے ایسی کوششیں نہیں فرمائیں بلکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی متعدد موقعوں پر نقل کیا گیا ہے کہ آپ نے مجرموں کو معاف فرمادیا اور حدود وغیرہ جاری نہیں فرمائی یا حد میں کافی تخفیف فرمادی۔ اس قسم کی روایات جو زیادہ تر صحیحین یا صحاح ستہ کی ہیں ہم شروع میں پیش کر چکے ہیں۔

اس پوری تفصیل سے آپ نے دیکھ لیا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے حدود کے معاملات کو کس نظر سے دیکھا ہے۔ ہمیں ان حضرات کی طرف سے ان جرائم کے اثبات اور حدود قائم کرنے میں کوئی بھی سرگرمی اور ذوق و شوق نظر نہیں آتا۔ ان کے ہاتھوں میں جن مجرمین پر حدود قائم کی گئی ہیں۔ صاف نظر آتا ہے کہ انہوں نے بادل ناخواستہ ہی حدیں قائم فرمائی ہیں۔ ان کی طرف سے کسی ایک واقعہ میں بھی ہمیں نظر نہیں آتا کہ انہوں نے کسی ذوق و شوق اور اشتیاق کا اظہار فرمایا ہو۔

ہمارا رجحان

لیکن ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے علمائے کرام اور ہمارے عوام کا رجحان یہی ہے کہ وہ اسی کو اسلامی حکومت سمجھتے ہیں جس میں حدود کا نفاذ زیادہ سے زیادہ ہوتا ہو۔ چنانچہ جب مسلمان مملکتوں کا تذکرہ چھڑتا ہے تو ہم بے تکلف ہر مملکت کو مسلمان ملک کہنے پر اصرار کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت کسی ایک کو بھی نہیں کہتے، لے دے کر بڑی مشکل سے ہم سعودی عرب کی حکومت کو اسلامی حکومت کے لقب سے یاد کرتے ہیں کیونکہ وہاں اسلامی حدود نافذ ہیں، ہماری موجودہ مارشل لاء حکومت نے حدود کے نفاذ کا اعلان کیا تو ہمارے علماء کی طرف سے اس کی زبردست حمایت کے اعلان کیے گیے اور بعض حلقوں کی طرف سے بر ملا اظہار کیا گیا کہ اب ہماری حکومت اسلامی بن گئی۔

اسلامی حکومت

قرآن کریم نے حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تعریف و توصیف فرمانے کے بعد اسلامی حکومت کے جو خدوخال بیان فرمائے ہیں ان میں سر فہرست اقامتِ صلوٰۃ و ایتائے زکوٰۃ کو رکھا ہے۔ سورۃ حج میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (الحج: ۴۱)

"جنہیں اگر ہم نے زمین میں تمکن عطا فرمادیا تو وہ صلوٰۃ قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیک کاموں کو فروغ دیں گے اور برائیوں کو روکیں گے۔"

اس آیت مقدسہ میں اسلامی حکومت کی چار خصوصیات بتائی گئی ہیں۔ سب سے اہم اور سب سے پہلی خصوصیت اقامتِ صلوٰۃ بیان کی گئی ہے۔ صلوٰۃ پڑھنا نہیں بلکہ صلوٰۃ کو قائم کرنا۔ اسلام میں صلوٰۃ ایک ایسا جامع لفظ ہے جس میں پورا اسلامی نظام آجاتا ہے۔ یہ وہ نگینہ ہے جس میں پوری مملکت سموئی ہوئی ہے۔ اس میں پورا اسلامی نظام جھلمل جھلمل کر رہا ہے۔ یہاں تفصیل کا موقعہ نہیں مختصراً اتنا سمجھئے کہ مساواتِ انسانی اور عدلِ عمرانی اس کی پہلی منزل ہے۔ ہمارے ملی شاعر نے شاید لاشعوری طور پر ہی کہہ دیا ہے:

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز

اسلام کا مطالبہ یہ ہے کہ مصاف زندگی میں بندہ اور بندہ نواز کا فرق مٹ جائے۔ صرف مسجد میں پانچ منٹ کا مظاہرہ بے معنی ہے۔ فکر و عمل کی مکمل ہم آہنگی اور یک جہتی اقامتِ صلوٰۃ کا دوسرا سبق ہے۔ ڈسپلن اور مکمل اطاعت اس کا تیسرا سبق ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان مقاصد کی نمود ہماری پوری زندگی میں ہونی چاہیے یہ نہیں کہ اس کی نمائش صرف ہماری مسجدوں تک محدود ہو کر رہ جائے۔ جب تک عملی زندگی میں قدم قدم پر مقاصدِ صلوٰۃ کا مظاہرہ نہ ہو اور ہم اسکے مطابق اپنی پوری زندگی نہ ڈھال لیں اقامتِ صلوٰۃ کا فریضہ ادا نہیں ہوتا۔ مگر ہم نے اقاموا الصلوٰۃ کے معنے یہ کر لیے ہیں کہ وہ نماز پڑھیں گے۔ چنانچہ اس پر بڑا زور دیا جاتا ہے کہ نمازیں پڑھی جائیں جو کام کرنے کے تھے انہیں ہم نے کرنے کے بجائے پڑھنا بنالیا ہے اور ہم بالکل

مطمئن ہیں کہ ہم دین کے تقاضوں کو صحیح صحیح پورا کر رہے ہیں، یہی کچھ ہم نے قرآن کریم کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ حق تعالیٰ نے یہ کتابِ عظیم اس لیے نازل فرمائی تھی کہ ہم اس کے مطابق عمل کریں اور اپنی زندگیوں کو اس کے مطابق ڈھال لیں مگر ہم نے عمل سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے اسے پڑھنے کی ایک کتاب بنالیا ہے۔ خیال تو فرمایئے کہ سربراہ مملکت کی طرف سے آپ کے پاس کوئی ہدایت نامہ آئے کہ فلاں فلاں کام اس طرح انجام دے دو۔ لیکن ہم ان ہدایات پر عمل کرنے کے بجائے روزانہ اس ہدایت نامے کو آنکھوں سے لگا کر اور چوم کر چاٹ کر بڑی ترتیل و تجوید سے اس کی تلاوت کر لیا کریں۔ تو کیا ہم اس طرح اس ہدایت نامہ کے ساتھ مذاق نہیں کرتے۔ یہی صورت ہم نے اٰتُوا الزَّکٰوۃَ کے ساتھ کی ہوئی ہے۔ بجائے قوم کے نادار اور معذور افراد کی نشو و نما کا سامان بہم پہنچانے اور انہیں اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کے چند سکے ان کی جھولی میں ڈالنے کو ہم نے سمجھ لیا ہے کہ ہم نے ایتاء زکوٰۃ کا فریضہ ادا کر دیا ہے۔

تیسری اور چوتھی خصوصیت کے ساتھ بھی ہم نے یہی مذاق کیا ہوا ہے۔ بنیادی چیز حریت و مساوات انسانی اور عدل عمرانی کو قائم کرنے کے بجائے محض چند رسمیں ادا کر دینے کو ہم اسلامی نظام سمجھ لیا ہے۔

یاد رکھیئے جب تک آپ عدلِ عمرانی قائم نہیں کرتے اور امیر و غریب کا فرق ختم نہیں کرتے تو اسلامی نظام کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

قرآن کریم نے "نَهَوا عَنِ الْمُنكَرِ" کو چوتھے درجہ میں رکھا ہے مگر ہم نے اسے اول درجہ دے دیا ہے۔ قیام حدود کا تعلق نہی عن المنکر سے ہو سکتا ہے۔ لہٰذہ اس کا چوتھا درجہ تھا۔ لیکن اقامت الصلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا پہلا اور دوسرا درجہ تھا جو ہماری نگاہوں سے قطعاً او جھل ہو گیا ہے، سب سے پہلے کرنے کا کام مساواتِ انسانی اور عدلِ عمرانی کا قیام ہے۔ پہلے تو آپ ایسے حالات پیدا کیجئے کہ لوگوں کے لیے چوری کرنے کا جواز ہی نہ رہے، ایسے حالات پیدا کیجئے کہ لوگوں کی جنسی خواہشات جائز طور پوری ہو سکیں۔ ایسے حالات پیدا کیجئے کہ لوگوں کی عزت و آبرو محفوظ ہو جائے اور کوئی اس پر ہاتھ نہ ڈال سکے اس کے بعد حدود کا نفاذ کیجئے۔

لیکن موجودہ حالات میں جبکہ لوگ نان شبینہ کو محتاج ہوں، مہنگائی گرانی، چور بازاری عام ہو، جوان لڑکیوں کا نکاح جوئے شیر لانے سے کم نہ ہو[1] عزت و ناموس کوڑیوں کے مول بازاروں میں نیلام ہو رہی ہو۔ آپ حدود نافذ کر کے اپنے دل کو جھوٹا اطمینان تو دلا سکتے ہیں کہ ہم نے اسلامی نظام قائم کر دیا مگر حقیقت کا اس سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہو سکتا۔

---

(1) یہ ہمارے معاشرے کا کتنا بڑا المیہ ہے کہ صرف کراچی شہر میں نوجوان، تعلیم یافتہ، خوبرو لڑکیاں بن بیاہی بیٹھی ہیں، انہیں بر نصیب نہیں ہو رہا کیونکہ ان کے ماں باپ کے پاس لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ نہیں ہے جس سے وہ اپنی بچیوں کا معمولی جہیز تیار کر سکیں ان حالات میں اگر بے راہ روی کی صورتیں ظہور پذیر ہوں تو کیا تعجب ہے۔ کیا ان حالات میں حدود کا نفاذ عدلِ عمرانی کا تقاضا ہے ؟ (مولف)۔

حد زنا

زنا

اسلام کی نظر میں زنا انتہائی شدید جرم ہے۔ مال، جان اور آبرو ہر انسان کی متاع حیات ہوتی ہے۔ ہر شریف آدمی کے نزدیک ان کی ترتیب بھی یہی ہے۔ مال عزیز ترین متاع حیات ہے لیکن اسے جان کی حفاظت کے لیے قربان کیا جاسکتا ہے کیونکہ جان مال سے زیادہ قیمتی چیز ہے لیکن عزت وآبرو کی حفاظت کے لیے جان کا نذرانہ پیش کیا جاسکتا ہے اور پیش کیا جاتا ہے کیونکہ سب سے اعلی متاع حیات انسان کی عزت وآبرو ہی ہوتی ہے۔ زنا کا جرم انسان کی عزت وآبرو پر حملہ ہوتا ہے اس سے آدمی دوسرے کی عزت وآبرو پر ڈاکہ ڈالتاہے اور اسے لوٹ لیتاہے جو انتہائی گھناؤ ناجرم ہے۔ اسلام نے اس کی سزا بھی اتنی ہی شدید رکھی ہے جتنا جرم شدید ہے۔ چنانچہ سورۃ النور میں ہے:

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَّ لَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۝ (النور آیت ۲)

"ہر زناکار عورت اور زناکار مرد ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو اور تمہیں ان دونوں پر کوئی ترس نہ آنا چاہیے اللہ کے دین میں۔ اگر واقعی اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہو، اور ان دونوں کی اس سزا کا مسلمانوں میں سے ایک گروہ مشاہدہ کرے۔"

یعنی یہ سزا مجمع عام میں دی جائے کہیں چھپ چھپا کر نہ دیجائے کیونکہ یہ مقصد صرف ان لوگوں کو سزا دینا ہی نہیں ہے بلکہ لوگوں کے لیے عبرت وموعظت کا سامان مہیا کرنا بھی ہے۔ عبرت وموعظت اسی وقت ہو سکتی ہے جب یہ سزا سب لوگوں کے سامنے مجمع عام میں دی جائے اسلام چاہتاہے کہ اس جرم کی جڑ ہی کٹ جائے اور کسی کو آئندہ اس شنیع جرم کے ارتکاب کی جسارت ہی نہ ہوسکے۔

الزانیۃ والزانی (ہر زناکار مرد اور زناکار عورت) بالکل واضح الفاظ ہیں ان دونوں پر الف ولام استغراق کا ہو یا جنس کا، ہر اس شخص کو اپنے تحت لے آتا ہے جس سے زنا کا ارتکاب ہوا ہو جو ان آدمی زنا کرے، ادھیڑ آدمی زنا کرے بوڑھا آدمی زنا کرے، کنوارا آدمی زنا کرے یا شادی شدہ آدمی زنا کرے سب کو زانی ہی کہا جاتا ہے۔ اسی طرح ہر عورت جوان، اُدھیڑ، بوڑھی، کنواری اور شادی شدہ جو بھی زنا کی مرتکب ہو وہ "زانیۃ" ہی کہلاتی ہے۔ قرآن کریم نے ہر زناکار عورت اور ہر زناکار مرد کی سزا بیان فرمادی ہے۔ اور اس میں سوائے شادی شدہ کنیز کے جو زنا کی مرتکب ہو (اور جس کی سزا (النساء:۲۵) بیان کی گئی ہے) کسی قسم کی کوئی تخصیص نہیں فرمائی گئی، نہ کسی قسم کا کوئی استثناء فرمایا گیا لہٰذہ قرآن کریم کی رو سے ہر زناکار کی سزا (سوائے شادی شدہ لونڈی) کے خواہ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ ہر دو صورتوں میں سو درّے مارنا ہے۔ زنا کی سزا کے سلسلے میں قرآن کریم میں جتنی آیتیں آئی ہیں ان سے اگرچہ رجم کی سزا کا ثبوت نہیں ملتا۔ لیکن تمام فقہاء اہل سنت اس پر متفق ہیں کہ زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والا مرد اگر کنوارے ہوں تو ایک سو درّے کی سزا دی جائے گی۔ لیکن اگر وہ شادی شدہ ہوں تو انہیں رجم (سنگسار) کیا جائے گا تا آنکہ وہ مر جائیں۔ البتہ خوارج، معتزلہ، بعض زیدی شیعہ، اور بعض مغاربہ (مالکیہ) نے رجم کا انکار کیا ہے۔ (نظام التجریم والعقاب فی لاسلام ج ا ص ۱۸۲۔ اس کتاب کی اہمیت اور اسکے مزید کچھ حوالے آگے آرہے ہیں وفتح الباری ج ۱۵ ص ۱۲۷ (ونیل الاوطار باب الرجم)

ہم ان حضرات کی تائید نہیں کرتے جو رجم کا قطعاً انکار کر دیتے ہیں لیکن ہمارے نزدیک یہ دعویٰ بھی بے بنیاد ہے کہ رجم قرآنی حد ہے۔ ہم رجم کو تسلیم کرتے ہیں لیکن قرآنی حد کی حیثیت سے نہیں بلکہ تعزیر کی حیثیت سے مملکت اسلامی زنا کی سزا رجم یا رجم سے بھی زیادہ بطور تعزیر کے دینا چاہے تو وہ دے سکتی ہے۔ تاہم رجم ہمارے نزدیک قرآنی حد نہیں ہے کیونکہ قرآن مجید

میں زنا کے متعلق:

(۱) پہلی آیت تو وہی سورۃ النور کی مشہور آیت ہے،

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ (النور:۲)

"ہر زنا کار عورت و مرد کو اس میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو۔"

اس میں اَلزَّانِيَةُ وَ الزَّانِيْ کلمہ عام ہے جس میں ہر زناکار شامل ہے خواہ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ پھر دونوں پر الف لام استغراقیا جنس کا لگا ہوا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کا عموم اور بھی صریح ہو گیا ہے جسے اصول فقہ کے مطابق خاص نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ خاص کر لینے کے معنی اس کے عموم کو منسوخ کر دینے کے ہیں جو خبر واحد سے جائز نہیں۔

(۲) اسی سے اگلی آیت میں ہے:

اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً وَّ الزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ ۚ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ (النور:۳)

"اور زنا کار مرد نہ نکاح کرے مگر زنا کار یا مشرک عورت سے اور زنا کار عورت سے سوائے زنا کار یا مشرک مرد کے کوئی نکاح نہ کرے۔ مسلمانوں پر یہ حرام کر دیا گیا ہے۔"

اس آیت میں بھی الزانیۃ اور الزانی کلمہ عام ہے اور دونوں پر الف لام استغراقیا جنس کا لگا ہوا ہے جس کی وجہ سے اس کا عموم دو آتشہ ہو گیا ہے۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ کوئی زناکار مرد بجز زناکار اور مشرک عورت کے کسی دوسری عورت سے نکاح نہیں کر سکتا۔ ایسے ہی زناکار عورت سے بجز زنار کار اور مشرک مرد کے کوئی دوسرا مرد نکاح نہیں کر سکتا۔ یعنی زناکار مرد اور عورت زنا کے بعد اس کی صلاحیت اور اہلیت رکھتے ہیں کہ وہ کسی سے نکاح کر سکیں، اس سے معلوم ہوا کہ زنا کی سزا سو کوڑے مارنا ہیں، سنگسار کر کے قتل کر دینا نہیں ہے۔ کیونکہ سنگساری کر کے قتل کر دینے کے بعد اسکا امکان ہی نہیں رہتا کہ کوئی زناکار مرد و عورت کسی سے نکاح کر سکیں۔

تیسری آیت نساء میں باندیوں کے متعلق آئی ہے کہ اگر وہ زنا کی مرتکب ہوں۔

فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ (النساء:۲۵)

"تو جب وہ شادی شدہ ہوں تو اگر وہ زنا کا ارتکاب کریں تو ان پر اس کا نصف واجب ہے جو شادی شدہ آزاد عورتوں پر ہوا کرتی ہے۔"

اس آیت کریمہ میں بتایا جا رہا ہے کہ محصنہ (آزاد شادی شدہ عورتوں) کو جتنی سزا دی جاتی ہے اس سے آدھی سزا کنیزوں کو دی جائے گی یعنی محصنۃ عورتوں (شادی شدہ آزاد عورتوں) کی سزا ایسی ہوتی ہے جسے آدھا کیا جا سکتا ہے، ظاہر ہے کہ رجم کی سزا کو تو آدھا کیا ہی نہیں جا سکتا، لا محالہ ان کی سزا سو درّے ہی ہونی چاہیے کہ ان کے نصف یعنی پچاس درّے ان کنیزوں کو لگائے جا سکیں، چنانچہ تمام فقہائے امت متفقہ طور پر کنیزوں کے متعلق یہی فرماتے ہیں کہ ان کی سزا پچاس درّے ہوتی ہے۔ لہٰذہ یہ آیت بھی رجم کی نفی فرما رہی ہے۔ اس آیت کے مطابق محصنٰت کی سزا ایسی ہونی چاہیے جسے آدھا کرنا ممکن ہو۔

مُحصنٰت کے ہمارے علمائے کرام کے نزدیک بھی تین معنے ہو سکتے ہیں (۱) شادی شدہ عورتیں (۲) پاک دامن عورتیں (۳) خاندانی وجاہت کی وجہ سے محفوظ و مامون عورتیں۔ اس آیت میں اس کے معنے پاکدامن عورتیں تو ہو نہیں سکتے کیوں کہ یہ عورتیں سزا یاب ہیں۔ لا محالہ اس کے معنے یا تو شادی شدہ ہوں گے یا خاندانی صاحبِ وجاہت عورتوں کے ہوں گے جو اپنی ذاتی شرافت و وجاہت سے محفوظ و مصئون ہوں۔ اگر شادی شدہ عورتوں کے معنے ہوں تو ثابت ہوا کہ ان کی سزا قرآن سے رجم نہیں ہے بلکہ سو کوڑے ہے، کیونکہ اسی کو نصف کرنا ممکن ہے۔ اگر تیسرے معنے یعنی خاندانی صاحب وجاہت عورتوں کے لیے جائیں تب بھی خاندانی صاحب وجاہت عورتیں کنواری بھی ہوتی ہیں اور شادی شدہ بھی۔ ایسا تو نہیں ہے کہ خاندانی وجاہت صرف آزاد کنواری عورتوں ہی کو حاصل ہوتی ہو۔ اور شادی شدہ آزاد خاندانی عورتیں اس سے محروم ہوتی ہوں، لہٰذہ اس آیت سے پھر بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ کنواری اور شادی شدہ آزاد خاندانی عورتوں کی دونوں کی سزا سو کوڑے مارنا ہے رجم نہیں ہے۔ کیونکہ سو کوڑوں ہی کو نصف کر لینا ممکن ہے، رجم کی سزا کو نصف کر لینا ممکن نہیں ہے۔

(۴) عذاب عربی زبان میں اس اذیت اور تکلیف کو کہتے ہیں جو بطور سزا کے کسی کو دی جائے یہ اذیت اور تکلیف مار پیٹ کی شکل میں ہوتی ہے، قتل کی صورت میں نہیں ہوتی۔ عذاب کی بنیادی معنوں میں تین باتیں شامل ہوتی ہیں (۱) پانی کی خوشگواری اور شیرینی جو پیاس کو روک دے (۲) اذیت اور تکلیف جو زندگی کے آرام میں حائل ہو جاتی ہے۔ اور (۳) بندش، منع کرنا اور رکاوٹ۔

ابن فارس نے لکھا ہے کہ: خلیل نے بیان کیا ہے کہ عَذَّبْتُهٗ تَعْذِيْباً کے معنے ہیں میں نے اس کا دودھ چھڑا دیا۔ یہ امتناع کے باب سے ہے یعنی کھانے پینے سے روک دینا۔ اس کے دوسرے معنے جو پہلے معنے سے کوئی مشابہت نہیں رکھتے، عذاب ہیں، کہا جاتا ہے عذبتہ تعذیباً لوگ کہتے ہیں کہ اصل عذاب مارنا پیٹنا ہوتا ہے۔ زہیر کا شعر ہے:

وخلفها سائق يحدو و اذا خشيت
منه العذاب تمدّت الصّلبَ والعنقاء

"اس کے پیچھے اس کو ہانکنے والا حدی پڑھ رہا ہے۔ جب اسے اس کی مار پیٹ کا اندیشہ ہوتا ہے تو کمر کی ہڈی اور گردن کو دراز کر لیتی ہے۔"

(ابن فارس ج ۳ ص ۲۶۰ مطبوعہ دار حیائے الکتب العربیہ عیسیٰ البابی الحلبی، مصر)

امام راغب نے کہا ہے کہ " عَذَّبْتُه " کے معنی ہیں، میں نے اسے زندگی کی لذت اور خوشگواریوں سے محروم کر دیا۔ جیسے "مَرَّضْتُهٗ" کے معنے ہیں میں نے اس سے مرض کو دور کر دیا "قَذَّیْتُهٗ" معنے ہیں میں نے اسکی آنکھ سے تنکا نکال دیا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ تعذیبٌ کے معنے ہیں، کسی کو درے کے سرے (عَذَبَۃٌ) سے متواتر مارنا چنانچہ بعض علمائے لغت نے (تعذیبٌ) کے معنے مارنا پیٹنا ہی لکھے ہیں۔

(مفردات القران مع ترجمہ و حواشی شیخ الحدیث مولانا محمد عبدہ فیروز پوری مطبوعہ اہلحدیث اکیڈمی لاہور)

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا کہ عذابٌ کے لیے معنے زندگی کی وہ اذیت اور تکلیف ہے جو بطور سزا کے کسی کو دی جائے بلکہ بعض اہل لغت نے اس کے معنے مارنا پیٹنا ہی لکھے ہیں۔ بعض علمائے لغت نے تو کہا ہے کہ اسکے معنے کوڑے (درّے) کے سرے سے متواتر مارنے کے ہوتے ہیں۔ اس کی تائید خود سورۂ نور کی اس مشہور آیت سے بھی ہوتی ہے جس میں زانیہ اور زانی کو سو کوڑے مارنے کا حکم دے کر فرمایا گیا ہے:

وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (النور:۲)

"اور ان کے اس عذاب کوڑوں کی سزا میں مسلمانوں کے ایک گروہ کو حاضر رہنا چاہیے۔"

اس آیت میں کوڑوں ہی کی سزا کو عذاب کہا گیا ہے۔

اس تمہید کے بعد لعان کے سلسلہ میں سورۂ نور ہی میں جہاں یہ فرمایا گیا ہے کہ اگر کوئی مرد اپنی بیوی پر زنا کی تہمت لگائے اور گواہ پیش نہ کر سکے تو دونوں میاں بیوی (لعان کریں یعنی) پانچ پانچ قسمیں کھائیں اسی سلسلے میں ہے:

وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍ بِاللّٰهِ (النور: ۸)

"اور عورت اپنے سے عذاب کو اس طرح ٹلا سکتی ہے کہ وہ چار شہادتیں دے۔"

لعان کرنے والی یہ عورت شادی شدہ ہے اور عذاب (یعنی کوڑوں کی سزا یا مار پیٹ کی سزا) کو پانچ قسمیں کھا کر ٹال رہی ہے۔ جیسا کہ ہم نے علمائے لغت کی تصریحات سے ثابت کیا ہے عذاب کبھی بھی قتل کی صورت میں نہیں ہوتا۔ قرآن یہاں شادی شدہ عورت کی سزا کو عذاب فرما رہا ہے جو مار پیٹ یا کوڑے مارنے ہی کی صورت میں ہوتا ہے۔ قرآنی سزائے زنا اگر رجم ہوتی تو قرآن کریم یہاں وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ نہ فرماتا بلکہ کچھ اور فرماتا مثلاً:

وَیَدْرَأُعنھا الرجم، یا، ویدرأعنھا القتل

(۵) ازواج مطہرات کو خطاب فرماتے ہوئے سورۃ احزاب میں آیا ہے۔

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ

"اے پیغمبر کی بیبیو! جو تم میں سے کھلی بے حیائی کا ارتکاب کرے گی تو اسے دوگنی سزا دی جائے گی۔"

یہاں ازواج مطہرات شادی شدہ ہیں اور ان کو دھمکی دی جا رہی ہے کہ "معاذ اللہ معاذ اللہ" اگر وہ کھلی بے حیائی کی مرتکب ہوں گی تو انہیں دوگنی سزا دی جائے گی۔ لہٰذہ اس آیت کریمہ کی رو سے شادی شدہ عورت کی سزا زنا میں ایسی ہونی ضروری ہے جسے دوگنا کیا جا سکے۔ رجم کی سزا کو تو دوگنا نہیں کیا جا سکتا۔ لا محالہ کوڑوں ہی کی سزا متعین ہے جسے دوگنا کرنا ممکن ہے۔ علاوہ ازیں اس آیت کریمہ میں بھی سزائے زنا کو قرآن کریم عذاب ہی سے تعبیر کر رہا ہے جو قتل کی صورت میں نہیں ہو سکتا۔ عذاب کے معنے زندگی کی لذت اور خوشگواریوں سے محروم کر دینا، مارنا پیٹنا، کوڑوں سے مسلسل مارنا ہوتے ہیں جیسا کہ اوپر گزر چکا۔

قرآن مجید کی یہ تمام آیات کریمہ اسی طرف اشارہ کر رہی ہیں کہ زنا کی سزا سو کوڑے مارنا ہے۔ رجم نہیں ہے چنانچہ متقدمین میں سے خوارج، معتزلہ، بعض زیدی شیعہ اور بعض مغاربہ (مالکیہ) نے رجم کا انکار کیا تھا اور متاخرین میں سے حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ کشمیری شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند، مولانا بدر عالم صاحب میرٹھیؒ، علمائے اہل حدیث کے سرخیل مولانا وحید الزمانؒ صاحب مترجم مؤطا۔ مصر کے مشہور فاضل علامہ ابو زہرہ علامہ علی منصور مصنف نظام التجریم والعقاب فی الاسلام، مصر کے جلیل القدر فقیہہ اور عالم استاد مصطفی زرقاء شیخ الازہر علامہ شیخ محمود شلتوت، عالم عرب کے مشہور علماء مثلاً علامہ شیخ علی خفیف اور علامہ شیخ عبدالوہاب خَلَف مولانا عبید اللہ سندھی، علامہ موسیٰ جار اللہ ترکی رحمۃ اللہ علیہم بھی رجم کو حد نہیں بلکہ تعزیر مانتے ہیں۔

ہم نے یہاں محض مختصراً اشارات پر اکتفاء کیا ہے تفصیل کے لیے ہماری کتاب " رجم حد ہے یا تعزیر " ملاحظہ فرمائیں جس کے دو سو سے زائد صفحات میں ہم نے اس پر مفصل و مدلل گفتگو کی ہے۔ کچھ بحث ہم نے اسی جلد چہارم کے باب الرجم میں بھی کی ہے۔ اسے بھی ملاحظہ فرمائیں۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ رجم چوں کہ حد نہیں بلکہ تعزیر ہے اس لیے حاکم وقت یا عدالت کو اس کا اختیار ہے کہ وہ معاشرہ اور مجرم کے حالات دیکھتے ہوئے سیاستہً تشدید کر سکتی ہے اور وہ تشدید قتل اور رجم کی صورت میں بھی

کی جاسکتی ہے۔ھذا ما رایتہ واللہ اعلم۔ یہاں ہم نے محض ربط قائم کر نے کے لیے چند اشارات پر اکتفا کیا ہے۔ ہم اس موضوع پر تفصیلی بحث اپنی کتاب "رجم اصل حد ہے یا تعزیر؟" میں کر چکے ہیں اس میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے رجم کے موضوع پر کچھ بحث ہم اس کتاب کے "باب التعزیر" میں بھی کریں گے اسے بھی ایک نظر دیکھ لیا جائے۔

باب حد القذف

قذف کسی مرد یا عورت پر زنا کی تہمت لگانے کو کہتے ہیں، اگر کوئی آدمی کسی آزاد، عاقل، بالغ، مسلمان اور پاک دامن آدمی پر، مرد یا عورت پر زنا کی تہمت لگا دے تو قرآن کریم نے اس کے لیے سزا میں اسی / ۸۰ کوڑے مقرر فرمائے ہیں، اسے حد قذف کہتے ہیں، لیکن قذف کی یہ اصطلاح فقہاء کی ہے۔ قرآن کریم نے قذف کے لفظ کو اس معنے میں استعمال نہیں کیا۔ قرآن کریم نے پاک دامن عورتوں کو زنا کی تہمت کے لیے (رَمْیُ الْمُحْصَنٰت یعنی پاک دامن عورتوں کو زنا کا نشانہ تہمت بنانے کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ سورۃ النور میں ہے:

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (النور:۴تا۵)

"جو لوگ پاک دامن عورتوں کو زنا کی تہمت لگاتے ہیں پھر چار گواہ پیش نہیں کرتے تو انہیں اسی / ۸۰ کوڑے مارو اور ان کی شہادت کبھی بھی قبول نہ کرو اور یہ لوگ فاسق ہیں بجز ان لوگوں کے جو اس کے بعد توبہ کر لیں اور اپنے اعمال درست کر لیں تو بلا شبہ اللہ بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔"

قرآن کریم میں "یرمون المحصنٰت "(محصنٰت کو تہمت لگاتے ہیں) کے الفاظ آئے ہیں اور محصنات باندیوں کو نہیں کہتے۔ باندیوں کے سلسلہ میں سورۃ النساء میں ہے:

فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ (النساء:۲۵)

"پھر اگر وہ بدکاری کی مرتکب ہوں تو ان پر اس سزا کا نصف ہے جو آزاد پاک دامن عورتوں کو دی جاتی ہے (یعنی پچاس کوڑے)"

اس سے معلوم ہو گیا کہ محصنات سے مراد قرآن کریم میں آزاد عورتیں ہوتی ہیں۔ اب چونکہ باندیاں نہیں ہوتیں۔ یہ سلسلہ ہی اسلام نے ختم کر دیا ہے۔ اب اس شرط کی ضرورت بھی نہیں رہی۔ البتہ عاقل و بالغ نیز مسلمان اور پاک دامن کی شرط ضروری ہے۔ کیونکہ تہمت کی وجہ سے ایک شریف آدمی کو سوسائٹی میں جو عار لاحق ہوتی ہے۔ یہ حد اسی کی سزا ہے، لیکن ایک مجنون اور نابالغ، نیز کافر اور بدکردار آدمی کو اگر تہمت لگائی جائے تو ان کو کوئی عار لاحق ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذہ ان شرائط کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ دوسری شرط یہ بھی ہے کہ جس شخص پر تہمت لگائی گئی ہے۔ وہ حد کا مطالبہ کرے اور عدالت میں اس کے لیے باقاعدہ مرافعہ داخل کرے، بغیر کسی مطالبہ کے حد جاری نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ یہ حد اسی شخص کا حق ہے جس پر تہمت لگائی گئی ہے۔ یہ حق اللہ نہیں ہے۔

لہٰذہ اس کی طرف سے حد کا مطالبہ کیا جانا ضروری ہے۔ اسی / ۸۰ کوڑے جو حد قذف میں مارے جائیں گے ان میں وہ تمام قیود اسی طرح ملحوظ رکھنی چاہیں جن کا ذکر زنا کی حد میں آچکا ہے۔ یعنی کوڑے جسم کے مختلف حصوں پر مارے جائیں کسی ایک جگہ پر نہ مارے جائیں، نیز چہرہ اور نازک اعضاً پر نہ مارے جائیں، ننگا کر کے نہ مارے جائیں جو کپڑے وہ پہنے ہوئے ہے۔ وہ پہنے رہے البتہ روئی بھرا ہوا کوئی کپڑا یا فرما گر وہ پہنے ہوئے ہو تو اسے البتہ اتروایا جاسکتا ہے۔

گالی گلوچ

عام طور پر آپس کے لڑائی جھگڑے اور گالم گلوچ میں اس قسم کے الفاظ زبان سے نکل جاتے ہیں جن سے دوسروں پر زنا کی تہمت لگ جاتی ہے اور حد واجب ہو جاتی ہے۔ حالانکہ کہنے والے کا مقصد تہمت لگانا نہیں ہوتا ایسی بے احتیاطیوں سے مکمل پرہیز لازمی ہے۔ مثال کے طور پر کسی کو یہ کہہ دینا کہ تم اپنے باپ کی اولاد نہیں ہو۔ کسی کو نطفۂ بے تحقیق کہہ دینا۔ حرام زادہ یا حرامی کہہ دینا۔ زانیہ کی اولاد کہہ دینا۔ یہ تمام الفاظ تہمت کے الفاظ ہیں۔ ان سے قذف لازم آجاتا ہے اور جس شخص کے متعلق ایسا کہا گیا ہے اگر وہ مطالبہ کرے تو حد واجب ہو جاتی ہے، بہر حال ایسی تمام گالیاں جن سے کسی کے والدین پر زنا کی تہمت کا مطلب نکلتا ہو، ان سے حد قذف واجب ہو جاتی ہے بشرطیکہ وہ شخص جسے گالی دی گئی ہے حد کا مطالبہ کرے۔

تعزیر

نیز ایسی گالیاں جن سے کسی کے والدین پر زنا کی تہمت کا مطلب تو نہیں نکلتا البتہ اسے اذیت پہنچتی ہے اور عار لاحق ہوتی ہے، مثلاً کسی کو چور، ڈاکو

کہہ دینا یا کسی کو کافر، فاسق وفاجر، خبیث، دیوث وغیرہ کہہ دینا تو اس قسم کی گالیوں میں حد تو واجب نہیں ہو گی البتہ اگر وہ شخص جسے اس قسم کی گالیاں دی گئی ہیں عدالت میں مرافعہ کرے تو حاکم مجاز گالی دینے والے پر تعزیر جاری کر سکتا ہے۔ یعنی گالی کی مناسبت سے اس کے لیے اپنی صوابدید کے مطابق سزا تجویز کر سکتا ہے۔ فقہاء نے اتنی ہی رعایت رکھی ہے کہ وہ ہر صورت میں حد شرعی سے زیادہ نہ ہونی چاہیے، اس سے کم ہی ہونی چاہیے۔ چنانچہ امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ کم از کم تین کوڑے اور زیادہ سے زیادہ انتالیس کوڑے مارے جا سکتے ہیں کیونکہ کم سے کم حد قذف چالیس کوڑے ہوتی ہے۔ یعنی اگر زنا کی تہمت لگانے والا آزاد آدمی نہ ہو بلکہ غلام یا باندی ہو تو اسے آزاد آدمی کی نصف سزا یعنی چالیس کوڑے مارے جاتے ہیں، تو کم سے کم تہمت زنا کی شرعی حد چالیس کوڑے ہوئی لہٰذہ حاکم مجاز چالیس سے ایک کوڑا کم یعنی انتالیس کوڑوں تک سزا دے سکتا ہے۔ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ قذف کی اصل سزا تو اسی کوڑے مقرر کی گئی ہے۔ لہٰذہ تعزیر میں حاکم مجاز پچھتر کوڑوں تک سزا دے سکتا ہے ہم سمجھتے ہیں کہ تعزیر میں گالی کی نوعیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے حاکم مجاز اپنی صواب دید کے مطابق سزا دے سکتا ہے۔ اس میں اسے کسی سزا کا پابند نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ یہ بہتر ہے کہ اس کی اپنی مقرر کردہ سزا کم سے کم قرآنی سزا سے متجاوز نہ ہو۔ لیکن اگر حالات کا یہ تقاضا ہو کہ زیادہ سزا دی جائے تو ایسا بھی کیا جا سکتا ہے۔

افسانہ افک

جھوٹی تہمتیں دھرنا

قرآنی تعلیمات کی رو سے تہمت کی برائی کی بڑی اہمیت ہے۔ تہمت ہر اس بری بات کو کہتے ہیں جو کسی کی طرف جھوٹ منسوب کر دی جائے۔ تہمتیں صرف زنا کے متعلق ہی نہیں ہوتیں بلکہ اس کا میدان بڑا وسیع ہے، جو تہمتیں زنا کے متعلق لگائی جاتی ہیں وہ اپنی اہمیت الگ رکھتی ہیں اس کے لیے قرآن کریم نے "والذین یرمون المحصنات" کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں (یعنی جو پاک دامن عورتوں کو نشانۂ تہمت بناتے ہیں) اس کے لیے قرآن کریم نے باقاعدہ حد مقرر فرمائی ہے کہ جو لوگ اس جرم کا ارتکاب کریں اور اس پر چار گواہ پیش نہ کر سکیں انہیں اسّی کوڑے مارے جائیں لیکن تہمت صرف ایک زنا ہی کی تو نہیں اس کے علاوہ اور بھی تو بہت سی تہمتیں ہوتی ہیں اور اپنے وزن میں بعض مرتبہ زنا سے بھی زیادہ وزنی ہوتی ہیں تو کیا قرآن کریم نے زنا کے علاوہ دوسری تمام تہمتوں کا کوئی نوٹس ہی نہیں لیا۔ کسی بھلے آدمی پر چوری کی تہمت دھر دینا، شراب نوشی کا اتہام لگا دینا، رقص وسرود کی تہمت دھر دینا، بددیانتی اور خیانت یا پبلک فنڈز میں خرد برد کی تہمتیں لگا دینا۔ کسی کے دین وایمان میں نقص نکالنے کے لیے کسی کے عقیدے میں کیڑے ڈالنا، مثلاً کسی کو وہابی مشہور کر دینا، کسی پر منکر سنت اور منکر رسالت کے خطابات چسپاں کر دینا، کسی پر جھوٹی روایتیں گڑھنے اور آنحضرت ﷺ کی طرف انہیں منسوب کرنے کی تہمتیں دھرنا۔ ہزار طرح کی جھوٹی تہمتیں ہوتی ہیں اور جو مسلمانوں کے معاشرہ میں عام ہیں بلکہ اچھے خاصے تعلیم یافتہ طبقوں تک میں ان کی ذہنی عیاشیوں کا مشغلہ ہیں۔ کیا یہ ساری باتیں قرآن کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ یقیناً ایسا نہیں ہے قرآن کریم میں ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ ؕ لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ ؕ بَلْ هُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ ؕ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ ۚ وَ الَّذِیْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۱﴾ لَوْ لَاۤ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَیْرًا ۙ وَّ قَالُوْا هٰذَاۤ اِفْكٌ مُّبِیْنٌ ﴿۱۲﴾ (النور: ۱۱ تا ۱۲)

" یقیناً جو لوگ جھوٹی تہمت بنا کر لائے ہیں وہ تمہارا ہی ایک گروہ ہے۔ تم اسے اپنے لیے برا نہ سمجھو۔ بلکہ وہ تمہارے لیے بہتر ہی ہو گا۔ ان میں سے ہر آدمی کے لیے وہ گناہ ہو گا، جو اس نے کمایا ہے اور ان میں سے جو شخص تہمت کے بڑے حصہ کا ذمہ دار ہو گا اس کے لیے بڑا عذاب ہو گا۔ ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ جب تم ایسی جھوٹی بات کو سنو تو مسلمان مرد اور عورتیں اپنے نفسوں کے متعلق نیک گمان ہی کریں اور کہہ دیں کہ یہ تو کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ (اس لیے کسی طرح قابل اعتبار نہیں)۔ "

ان آیات کریمہ میں بتایا گیا ہے کہ جھوٹی باتیں گھڑ گھڑ کر لوگوں کے متعلق مشہور کر دینا انتہائی گناہ کا باعث ہے۔ خود مسلمانوں ہی میں ایسے لوگ بھی ہو سکتے ہیں جن کا مشغلہ ہی یہ ہو کہ وہ مسلمان مردوں اور عورتوں کو جھوٹی تہمتیں لگا کر بدنام کرنا چاہیں، چنانچہ خود حضور اکرم ﷺ کے عہد مبارک میں ایسے منافق موجود تھے جو خود کو سچا مسلمان کہتے تھے لیکن ان کا یہی مشغلہ تھا کہ وہ مسلمان مردوں اور عورتوں پر طرح طرح کی تہمتیں دھرتے اور انہیں معاشرہ میں بدنام کرتے تھے۔ تو ایسے لوگ بھی قرآن کریم کے نزدیک مجرم اور مستوجب عذاب آخرت ہونے کے علاوہ اس دنیا میں بھی سزا کے مستحق ہیں۔

ان آیات کریمہ میں جیسا کہ ظاہر ہے کہ کسی خاص شخص کا نام نہیں لیا

گیا ہے، یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ کسی شخص پر کوئی جھوٹی تہمت یا جھوٹا بہتان لگایا گیا تھا۔ نہ ہی یہ بتایا گیا ہے کہ تہمت لگانے والے کون لوگ تھے اور کس کس نے تہمت لگانے کا یہ فعل شنیع اختیار کیا تھا، صرف اتنا بتایا گیا ہے کہ جن لوگوں نے جھوٹی تہمت دھری ہے وہ ایک گروہ اور ایک جماعت ہے جو تم ہی میں سے ہیں۔ ان میں کوئی شخص ایسا بھی ہے جو ان سب کا سرغنہ ہے۔ لیکن اس سرغنہ کا نام بھی نہیں بتایا گیا۔ بلکہ ایک عام قانون کے انداز میں ساری گفتگو چل رہی ہے جس چیز کو قرآن کریم نے خود متعین نہیں فرمایا ہمیں بھی اس کو متعین کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ قرآن کریم نے ہمیں جو ہدایت دی ہے ہم اس سے مناسب رہنمائی حاصل کریں اور اس نے ہمیں جو قانون دیا ہے اسے اپنے معاشرہ میں جاری کریں لیکن برا ہو انسان کی کنج و کرید کے جذبہ کا کہ وہ کبھی نچلا نہیں بیٹھتا بلکہ ہر بات کو کسی نہ کسی خاص واقعہ پر چسپاں کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں جب قرآن کریم سے اسے کوئی خاص واقعہ یا کسی خاص آدمی کا نام نہیں ملا تو اس نے وضع احادیث کی نت نئی ٹکسالوں سے رجوع کیا اور جھوٹے وضاعین نے اس ضمن میں جو خرافات گھڑی تھیں انہیں اپنی مستند ترین حدیث اور تفسیر کی کتابوں کی زینت بنا دیا۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ، بہرحال اس موضوع پر ہم آگے تفصیل کے ساتھ روشنی ڈال رہے ہیں فی الحال آپ اتنا ہی سمجھ لیجئے کہ قرآن کریم نے کسی خاص شخص کا نام نہیں لیا ہے۔

واضح رہے کہ زنا کی تہمت کے لیے قرآن کریم "وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ" کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں وہ بات اور اس کی سزا کا بیان (النور:۴تا۵) میں ختم ہو چکا ہے "اِنَّ الَّذِیْنَ جَآءُوْا بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ" سے نیا سلسلہ بیان شروع ہو رہا ہے اور اس سے مراد تہمت زنا کا بیان نہیں ہے بلکہ زنا کے علاوہ دوسری تہمتیں مراد ہیں۔ یہ تہمتیں اخلاقی بھی ہو سکتی ہیں اور نظریاتی بھی ہو سکتی ہیں۔ افک کے معنے عربی زبان میں زنا کی تہمت لگانے کے نہیں ہیں۔ اَفَكَ یَافِكُ کے معنے جھوٹ بولنا، جھوٹی بات بنانا ہیں۔

(تاج العروس)

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنے کسی چیز کو الٹ دینا، اس کی جہت سے پھیر دینا ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں عصائے موسوی کے متعلق ہے:

فَاِذَا هِیَ تَلْقَفُ مَا یَاْفِكُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ (الاعراف:۱۱۷)

"تو یکایک وہ ان تمام چیزوں کو نیست و نابود کر دیتا ہے (نگل لیتا ہے) جنہیں وہ (یعنی جادوگر) جھوٹ موٹ بناتے تھے۔"

سورۃ شعراء میں ہے:

تَنَزَّلُ عَلٰی كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِیْمٍ ﴿۲۲۲﴾ لا (الشعراء:۲۲۲)

"وہ (یعنی شیاطین) ہر جھوٹے گناہگار پر نازل ہوتے ہیں۔"

سورۃ الصّٰفّٰت میں ہے:

اَئِفْكًا اٰلِهَةً دُوْنَ اللّٰهِ تُرِیْدُوْنَ ﴿۸۶﴾ (الصّٰفّٰت:۸۶)

"کیا جھوٹ موٹ اللہ کے سوا دوسرے معبودوں کا ارادہ کرتے ہو۔"

سورۂ مائدہ میں حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم کا ذکر فرما کر فرمایا گیا ہے:

ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰی یُؤْفَكُوْنَ ﴿۷۵﴾ (المائدہ:۷۵)

"پھر دیکھئے وہ کدھر بہکائے جا رہے ہیں۔"

لٰہذہ افکؓ کے معنے جھوٹ اور گھڑی ہوئی بات کے ہیں۔ ایسی بات جو اصل میں کچھ ہو اور اسے الٹ کر کچھ سے کچھ کر دیا جائے افك کہلاتی ہے۔ اس آیت کریمہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ جو لوگ کسی پر زنا کے علاوہ اور کسی بات کی جھوٹی تہمت لگائیں وہ بھی مجرم ہیں۔ اس قسم کے اتہامات سے بلا شبہ تمہیں اذیت پہنچتی ہے لیکن اس میں بھی انجام کے لحاظ سے تمہارے لیے کوئی خیر کا پہلو نکل سکتا ہے لٰہذہ تم اسے اپنے لیے شر نہیں بلکہ خیر کا باعث ہی سمجھو لیکن جو لوگ اس جرم کا ارتکاب کرتے ہیں وہ خدا کے عذاب سے نہیں بچ سکتے جس کا اس میں جتنا حصہ ہو گا اسے اتنا ہی عذاب ملے گا۔ اور جو شخص اس قسم کے کسی بہتان کا ذمہ دار ہو گا اسے بہت بڑا عذاب ملے گا۔ مسلمان مردوں اور عورتوں کو چاہیے کہ جب وہ اس قسم کے بہتان سنیں تو اپنے معاشرہ کے افراد کے متعلق حسن ظن ہی سے کام لیں اور صاف کہہ دیں کہ یہ تو کھلا جھوٹ ہے۔ ہم اس پر کان دھرنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ اگر اس قسم کا کوئی بہتان لگاتے ہیں تو وہ اس پر چار گواہ کیوں پیش نہیں کرتے، اگر وہ چار گواہ پیش نہیں کرتے۔ تو اس کے معنے یہ ہیں کہ خود وہ بہتان لگانے والے ہی جھوٹے ہیں چنانچہ اللہ کے نزدیک وہی جھوٹے ہیں۔ اے مسلمانو! اگر تم پر دنیا اور آخرت میں اللہ کا فضل اور احسان نہ ہوتا تو آپس میں اس قسم کی بہتان طرازیوں کی وجہ سے تم سخت عذاب میں مبتلا ہو جاتے جبکہ تم اس قسم کی تہمتوں کو مزے لے کر زبانیں مروڑ مروڑ کر بیان کرتے ہو اور اپنے منہ سے وہ باتیں نکالتے ہو جن کا تمہیں کوئی علم نہیں ہوتا کیا تم اس قسم کی اتہام طرازیوں کو ایک معمولی بات سمجھتے ہو؟ ہرگز نہیں خدا کے نزدیک یہ بہت بڑا جرم ہے تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ جب اس قسم کے اتہامات کو سنو تو صاف صاف کہہ دو کہ ہمارے لیے جائز نہیں ہے کہ ہم ایسی باتیں منہ سے نکالیں۔ سبحان اللہ! بغیر تحقیق کے کسی پر الزام لگانا تو بہت بڑا بہتان ہے خدا تمہیں نصیحت کرتا ہے کہ آئندہ کبھی بہتان طرازیوں میں کوئی حصہ نہ لو اگر تم اہلِ ایمان ہو تو اس سے ہمیشہ بچتے رہو۔

بہر حال زنا کی تہمت میں جیسا کہ تہمت لگانے والے کو چار گواہ اپنی شہادت میں پیش کرنے پڑتے ہیں ایسے ہی تہمتِ زنا کے علاوہ دوسری تمام تہمتوں میں بھی اپنی صداقت کے لیے چار گواہ پیش کرنے ہوں گے۔ تہمت ہر حال میں تہمت ہے زنا کی تہمت ہو یا غیر زنا کی۔ اگر وہ گواہ چار پیش نہ کرسکے تو اس کو جھوٹا سمجھا جائے گا۔ اور قرآن کریم نے اگرچہ اس کے لیے کوئی متعین حد مقرر نہیں فرمائی مگر حاکم مجاز کو چاہیے کہ اگر وہ شخص جس پر کوئی تہمت لگائی گئی ہے فریاد کرے تو تہمت لگانے والے پر تعزیر جاری کی جائے۔ یہ تعزیر اسی تفصیل کے ساتھ ہو گی جس طرح گالی دینے کے معاملہ میں ہم تفصیل سے کتاب الحدود میں ذکر کرچکے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک کم سے کم تین اور زیادہ سے زیادہ انتالیس کوڑے اور امام یوسفؒ کے نزدیک زیادہ سے زیادہ پچھتر کوڑے مارے جاسکتے ہیں اور ہم نے اپنی رائے یہ لکھی تھی کہ حاکم مجاز کو کسی خاص تعداد کا پابند نہ کیا جائے بلکہ حالات کے تقاضے کے مطابق اسے فیصلہ کرنا چاہیے۔ البتہ بہتر یہی ہے کہ اس کی تعزیر اسی / ۸۰ کوڑے سے زیادہ نہ ہو جو ایک شرعی حد ہے اور قرآن کریم سے ثابت ہے۔

یہاں یہ سوال اٹھانا کہ چونکہ ان آیات میں فرمایا گیا ہے کہ وہ اپنی جھوٹی تہمت کے سلسلہ میں چار گواہ کیوں پیش نہیں کرتے۔ جب وہ چار گواہ پیش نہیں کرتے تو وہ خود ہی جھوٹے ہیں۔ اور چار گواہ زنا کی تہمت ہی میں ضروری ہوتے ہیں ورنہ عام معاملات میں چار گواہ ضروری نہیں ہوتے بلکہ دو گواہ کافی ہوتے ہیں اس لیے لازماً ان آیات کا تعلق بھی زنا ہی کی تہمت سے ہونا چاہیے ایک ادائے محض ہے، جس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ قرآن کریم میں ایسی کوئی آیت نہیں ہے جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہو کہ چار گواہوں کی شرط صرف زنا کی تہمت ہی میں ہوسکتی ہے اور کہیں نہیں ہوسکتی۔ قرآن کریم سے زنا کی تہمت میں چار گواہوں کی شرط ثابت ہونے سے یہ بات کیسے ثابت ہوگئی کہ کسی اور تہمت میں چار گواہوں کی شرط لگانا ممنوع ہے اور قرآن کریم نے اس سے منع فرمادیا ہے۔ ہمارے خیال میں تہمت کے سلسلہ میں خواہ وہ زنا سے متعلق ہو یا غیر زنا سے متعلق ہو چار گواہوں کی شرط ضروری ہے زنا کی تہمت میں چار گواہوں کیشرط کا بیان پہلے آچکا ہے اور غیر زنا کی صورت میں ان آیات میں دوسری مرتبہ آرہا ہے۔

شان نزول کی روایات

اب ہم ان آیات کی اس تفسیر سے بحث کرتے ہیں جو شان نزول کی روایات کے باعث ہماری تفسیروں اور کتب احادیث میں نہایت اہمیت حاصل کرگئی ہیں حالانکہ شان نزول کی روایات کی وہ اہمیت ہرگز نہیں ہوتی جو ان کو دے دی گئی ہے۔ اصول تفسیر میں یہ بات علمائے کے نزدیک متفق علیہ ہے کہ:

العبرۃ لعموم الالفاظ لا لخصوص المورد۔

"الفاظ کی عمومیت کا اعتبار ہے کسی خصوصی شان نزول کا اعتبار نہیں ہے۔"

قرآن کریم ایک ضابطۂ ہدایت ہے اس میں امت مسلمہ کی عام مصالح کے لیے قوانین دیئے گئے ہیں۔ معلوم نہیں یہ کیسے سمجھ لیا گیا ہے کہ جب کوئی خاص واقعہ ہی پیش آجائے تو قرآن کی آیات نازل ہوتی ہے، خاص واقعہ کے بغیر کوئی آیت نازل ہی نہیں ہوسکتی۔ اور یہ کہ قرآن کریم کی ہر آیت کو اس کے شان نزول کی روشنی ہی میں سمجھا جاسکتا ہے حالانکہ یہ بات اصولی طور پر غلط ہے قوانین کبھی بھی واقعات کے پابند نہیں ہوتے۔

شان نزول کی روایت

لیکن صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں تفصیل کے ساتھ ایک روایت بیان ہوئی ہے جس کو صحیح بخاری کتاب المغازی باب حدیث الافک عن عائشہؓ وام رومان وکتاب التفسیر وکتاب الشہادات وکتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ اور صحیح مسلم کتاب التوبۃ میں بیان کیا گیا ہے۔ حدیث یوں شروع ہوتی ہے۔ ہم سے یحیٰ ابن بکیر نے حدیث بیان کی کہ ہم سے لیث نے یونس سے حدیث بیان کی انہوں نے ابن شہاب سے کہا کہ مجھے عروہ ابن زبیرؓ نے اور سعید ابن المسیب نے اور علقمہ ابن وقاص نے اور عبید اللہ ابن عبد اللہ ابن عتبہ اور ابن مسعود نے عائشہؓ زوجہ نبی کریم ﷺ کی حدیث کے متعلق خبر دی جب ان کے بارہ میں اہل افک نے کہا جو کچھ کہا اور اللہ نے انہیں اس سے بری قرار دیا جو کچھ انہوں نے کہا تھا۔ ہر ایک نے حدیث کا ایک ٹکڑا بیان کیا ہے اور حدیث کا کچھ حصہ دوسرے لوگوں کی حدیث کی تصدیق کرتا ہے اگرچہ ان میں سے بعض نے حدیث کو دوسرے بعض سے زیادہ محفوظ رکھا ہے بہر حال جو کچھ مجھ سے عروہ نے حضرت عائشہ سے بیان کیا ہے یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب سفر کا ارادہ فرماتے تو اپنی بیویوں میں قرعہ ڈالتے تھے جس کے نام قرعہ نکلتا اسے آپ اپنے ساتھ لے جاتے۔ جنگ بنی مصطلق کو جاتے وقت جب قرعہ ڈالا گیا تو حضرت عائشہؓ کا نام نکلا۔ حضرت عائشہؓ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ روانہ ہوئیں کیونکہ پردہ کا حکم نازل ہوچکا تھا لہٰذہ کچھ آدمی انہیں ہودج میں بٹھا کر سواری پر چڑھاتے اتارتے تھے۔ جب لڑائی ختم ہوگئی تو رسول اللہ ﷺ واپس مدینہ منورہ روانہ ہوئے۔ مدینہ کے قریب آپ نے ایک مقام پر نزول کیا وہاں سے رات کے وقت آپ نے کوچ کا حکم صادر فرمایا جب حضرت عائشہ

صدیقہؓ کو کوچ کا علم ہوا تو وہ قضائے حاجت کے لیے روانہ ہوئیں اور اسلامی لشکر سے کافی دور چلی گئیں، قضائے حاجت سے فارغ ہونے کے بعد جب وہ اپنی سواری کے قریب پہنچیں تو انہوں نے اپنے سینہ پر ہاتھ پھیرا، کیا دیکھتی ہیں کہ ان کا ہار جو یمنی خزف کا بنا ہوا تھا غائب ہے۔ وہ سمجھیں کہ کہیں ٹوٹ کر گر گیا ہے لہٰذہ اسکو تلاش کرنے کے لیے وہ واپس اسی جگہ گئیں جہاں انہوں نے قضائے حاجت کی تھی انہوں ہار تلاش کیا تلاش کرتے کرتے انہیں کافی دیر ہوگئی۔ اسی اثنا میں اسلامی فوج اس منزل سے روانہ ہوگئی۔ اس زمانہ میں عورتیں بہت کم کھانا کھاتی تھیں ان پر گوشت بہت کم ہوتا تھا لہٰذہ ہلکی پھلکی ہوتی تھیں مزید برآں حضرت عائشہ ایک کمسن لڑکی تھیں لہٰذہ بہت ہلکی پھلکی تھیں۔ ان لوگوں نے جو حضرت عائشہ صدیقہؓ کا ہودج چڑھاتے اتارتے تھے، ہودج اٹھاتے وقت اس کو ہلکا نہ جانا۔ وہ یہ سمجھے کہ حضرت عائشہ اس میں موجود ہیں۔ لہٰذہ انہوں نے ہودج اونٹ پر رکھ دیا اور اونٹ کو لے کر روانہ ہوگئے۔ حضرت عائشہؓ صدیقہ کو ہار اسلامی لشکر کے روانہ ہونے کے بعد ملا۔ ہار کو لے کر وہ اپنی منزل پر آئیں تو دیکھا وہاں کوئی بھی نہیں، وہ اپنی جگہ پر اس خیال سے بیٹھ گئیں کہ جب مسلمانوں کو ان کے گم ہونے کا علم ہوگا تو انہیں ڈھونڈنے اسی جگہ آئیں گے کچھ دیر بعد انہیں نیند آئی اور وہ سو گئیں۔

حضرت صفوان بن معطل سلمیؓ جو بعد میں ذکوانی مشہور ہو گئے اسلامی لشکر کے پیچھے رہا کرتے تھے، وہ صبح کے وقت حضرت عائشہؓ کے قریب پہنچے۔ کیوں کہ انہوں نے پردہ کے حکم سے پہلے حضرت عائشہ کو دیکھا تھا۔ لہٰذہ دیکھتے ہی حضرت عائشہؓ کو پہچان گئے اور کہا: اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ ان کلمات کی آواز سے حضرت عائشہؓ جاگ گئیں اور فوراً اپنی چادر سے اپنا منہ چھپا لیا ان دونوں نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کی اور نہ حضرت عائشہ نے سوائے استرجاع (اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ) کے ان کی زبان سے کوئی اور بات سنی۔ حضرت صفوان اپنے اونٹ سے اترے۔ پھر ان کو بٹھا کر اس کے ہاتھ پیر باندھے، حضرت عائشہؓ اونٹ پر سوار ہو گئیں۔ حضرت صفوانؓ اونٹ کی نکیل پکڑ کر پیدل چلتے رہے یہاں تک کہ دوپہر کے وقت جب کہ سخت گرمی پڑ رہی تھی اسلامی لشکر سے جا ملے مسلمان وہاں ایک جگہ ٹھہرے ہوئے تھے جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ اسلامی لشکر میں عبد اللہ بن ابی اور منافقین کا ایک گروہ شامل تھا ان لوگوں کو موقع ملا انہوں نے حضرت عائشہؓ پر تہمت لگائی اس تہمت کا اصل بانی منافقین کا سرغنہ عبد اللہ ابن ابی منافق تھا۔

اسلامی لشکر مدینہ منورہ پہنچا۔ مدینہ منورہ پہنچتے ہی حضرت عائشہ صدیقہؓ بیمار ہو گئیں، بیماری نے طول کھینچا یہاں تک کہ ایک مہینہ گزر گیا اس عرصہ میں عبد اللہ ابن ابیّ اپنی مجلس میں بیٹھ کر اس تہمت کا ذکر کرتا۔ دوسرے منافقین بھی اس کی مجلس میں بیٹھ کر یہی تذکرہ کرتے اور وہ سنتا رہتا، غرض یہ بات پھیلتے پھیلتے ایک انصاری کو پہنچی اس نے سنتے ہی فوراً کہا کہ اے اللہ تو پاک ہے ہمارے لیے یہ زیبا نہیں کہ ہم یہ بات منہ سے نکالیں، اے اللہ تو پاک ہے یقیناً یہ بہتان عظیم ہے۔ منافقین کے علاوہ مومنین میں سے بھی تین آدمی اس بہتان میں شریک ہو گئے یعنی حضرت حسان ابن ثابتؓ، مسطح ابن اثاثہؓ اور حمنہ بنت جحشؓ، لوگوں میں اس تہمت کا چرچا ہونے لگا وہ اس میں غور و فکر کرتے تھے۔ لیکن حضرت عائشہ صدیقہؓ کو اس تہمت کا اب تک علم نہ تھا سوائے اس کے کہ وہ اپنی بیماری میں رسول اللہ ﷺ کا وہ لطف و کرم نہیں دیکھتی تھیں جو اس سے پہلے اپنی بیماری میں دیکھا کرتی تھیں۔ انہیں اس بات سے شک ہوتا تھا (کہ غالباً رسول اللہ ﷺ کچھ خفا ہیں) رسول اللہ ﷺ ان کے پاس تشریف لاتے سلام کرتے اور یہ پوچھتے: "تم کیسی ہو؟" پھر واپس چلے جاتے کم سنی کی وجہ سے حضرت عائشہ صدیقہؓ کو بھلے برے کا زیادہ شعور نہیں تھا (وہ نہ سمجھ سکیں کہ آخر کیا بات ہے؟)

جب حضرت عائشہ صدیقہؓ کو بیماری سے افاقہ ہوا تو وہ ایک رات کو قضائے حاجت کے لیے نکلیں گھروں میں اس وقت تک بیت الخلا نہیں بنائے گئے تھے۔ عورتیں صرف رات کے وقت قضائے حاجت کے لیے باہر جایا کرتی تھیں۔ قدیم عربوں سے یہی دستور چلا آرہا تھا، گھروں کے پاس بیت الخلاء بنانے سے انہیں تکلیف ہوتی تھی۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے ساتھ حضرت ام مسطحؓ بھی قضائے حاجت کے لیے نکلیں۔ حضرت ام مسطحؓ ابورہم بن عبد المطلب بن عبد مناف کی بیٹی تھیں ان کی والدہ جو صخرا ابن عامر کی بیٹی تھیں حضرت ابو بکرؓ کی خالہ تھیں۔ حضرت ام مسطحؓ کے شوہر کا نام اثاثہ ابن عباد ابن عبد المطلب تھا ان کے بیٹے کا نام مسطحؓ تھا۔ اسی بیٹے کے نام پر ان کی کنیت ام مسطحؓ تھی۔ قضائے حاجت کے بعد حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت ام مسطحؓ واپس روانہ ہوئیں۔ راستہ میں حضرت ام مسطحؓ کا پاؤں چادر میں الجھ کر پھسل گیا۔ وہ کہنے لگیں "مسطح ہلاک ہو" حضرت عائشہ نے فرمایا: "تم بری بات کہہ رہی ہو وہ تو بدری صحابی ہے" انہوں نے کہا: "اری دیوانی! کیا تو نے نہیں سنا کہ مسطحؓ نے کیا کہا ہے۔" حضرت عائشہ نے پوچھا: "مسطح نے کیا کہا ہے۔" حضرت ام مسطحؓ نے تہمت کا سارا حال سنایا۔ یہ سن کر حضرت عائشہ صدیقہ کی بیماری بڑھنی شروع ہو گئی جب وہ گھر پہنچیں تو رسول اللہ ﷺ تشریف لائے آپ نے سلام کیا پھر پوچھا تم کیسی ہو؟" حضرت عائشہ نے رسول اللہ ﷺ سے اپنے والدین کے ہاں جانے کی اجازت مانگی تاکہ ان سے اس خبر کا مزید حال معلوم کریں۔ رسول اللہ ﷺ نے اجازت دے دی اور ایک لڑکا ان کے ساتھ کر دیا۔

حضرت عائشہؓ اپنے والدین کے ہاں پہنچیں۔ اپنی والدہ حضرت ام رومانؓ سے پوچھا کہ لوگ (میرے متعلق) کیا کہہ رہے ہیں۔ حضرت ام رومان نے جواب دیا: اے بیٹی گھبراؤ نہیں ایسی عورتیں بہت کم ہیں جو خوبصورت ہوں محبت کرنے والے شوہر کے پاس ہوں۔ پھر ان کی سوکنیں بھی ہوں اور انہیں تہمت نہ لگائی جائے۔ حضرت عائشہؓ نے کہا: "سبحان اللہ کیا لوگ واقعی یہ بات کہہ رہے ہیں" اتنے میں ایک انصاری عورت آئی اور کہنے لگی، اللہ فلاں شخص کے ساتھ برائی کرے۔ حضرت ام رومانؓ نے کہا: "تم نے یہ کیا بات کہی" اس نے کہا کہ میرا بیٹا بھی تہمت لگانے والوں میں شامل ہے۔ حضرت ام رومان نے پوچھا: "آخر کیا قصہ ہے؟" (اس کی کیا تفصیل ہے؟)۔ اس عورت نے پورا قصہ بیان کیا جب وہ بیان کر چکی تو حضرت عائشہ صدیقہ نے پوچھا: "کیا رسول اللہ صلی اللہ وسلم نے بھی یہ بات سنی ہے؟" اس نے کہا: "ہاں" حضرت عائشہ نے پوچھا" کیا ابو بکرؓ نے بھی یہ بات سنی ہے؟۔ اس نے کہا: "ہاں" یہ سن کر حضرت عائشہ صدیقہ بے ہوش ہو کر اپنی والدہ پر گر پڑیں۔ ہوش آیا تو لرزہ کا بخار چڑھا ہوا تھا۔ حضرت ام رومانؓ نے ان پر رضائی وغیرہ ڈالدی اور انہیں اچھی طرح اس میں چھپادیا۔ اسی اثنا میں رسول اللہ ﷺ تشریف لائے آپ نے پوچھا: "ان کا کیا حال ہے؟" حضرت ام رومانؓ نے کہا انہیں سخت لرزہ کا بخار چڑھا ہوا ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "شاید تہمت کی خبر سن کر بخار آگیا ہے؟" حضرت ام رومانؓ نے کہا: "ہاں" حضرت ام رومان کہتی ہیں پھر آپ چلے گئے اور مجھے کوئی جواب نہ دیا، (جب بخار سے ذرا افاقہ ہوا تو) حضرت عائشہ رونے لگیں رات بھر روتی رہیں۔ نہ آنسو تھمتے تھے نہ نیند آتی تھی۔ روتے روتے صبح ہو گئی۔ حضرت صفوانؓ کو جب اس تہمت کا علم ہوا تو کہنے لگے اللہ کی قسم میں کبھی کسی عورت کے پاس نہیں گیا۔

اس واقعہ سے رسول اللہ ﷺ بھی پریشان تھے۔ (لوگوں کا منہ بندہ کرنے کی خاطر) آپ نے حضرت عائشہؓ کے چال چلن کے متعلق تحقیقات شروع کی۔ پہلے آپ نے اپنی بیوی حضرت زینبؓ سے دریافت کیا، حضرت زینبؓ نے کہا: "اے اللہ کے رسول! میں اپنی آنکھ اور کانوں کو بچاتی ہوں۔ (میں نے ان میں نہ کوئی برائی دیکھی نہ سنی) اللہ کی قسم میں بجز بھلائی کے کچھ نہیں جانتی"۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ کی تمام بیویوں میں صرف زینبؓ میری برابری کی مدعی تھیں لیکن ان کے زہد تقویٰ نے انہیں (میری برائی کرنے سے) بچالیا باوجود اس کے کہ ان کی بہن (حمنہ بنت جحش) تہمت لگانے والوں میں شامل تھیں (لیکن انہوں نے اپنی بہن کی بات کو صحیح نہ سمجھا) حمنہؓ حضرت زینبؓ سے جھگڑنے لگیں اور ہلاک ہونے والی جماعت میں شامل ہو کر وہ بھی ہلاک ہوئیں۔ (یعنی تہمت لگا کر گناہ کا ارتکاب کیا اور سزا پائی)۔

پھر رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی ابن ابی طالبؓ اور اسامہ ابن زیدؓ کو بلایا اور اپنی بیوی حضرت عائشہ صدیقہؓ کی علیحدگی کے سلسلہ میں ان سے مشورہ لیا۔ حضرت اسامہؓ نے کہا: "وہ آپ کی بیوی ہیں (بھلا ان سے یہ کام کیسے ہو سکتا ہے) آپ بدستور انہیں اپنے پاس ہی رکھیئے۔ ہم بجز بھلائی کے ان کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔" حضرت علیؓ بھی حضرت عائشہ صدیقہؓ کے معاملہ میں سلامت رہے (کسی قسم کا شبہ نہیں کیا) البتہ (وہ رسول اللہ ﷺ کا غم غلط کرنے کے لیے) یہ عرض کیا: "اے اللہ کے رسول! اللہ نے آپ پر کوئی تنگی نہیں کی آپ کے لیے ان کے علاوہ بہت عورتیں ہیں (لیکن پہلے) آپ خادمہ سے تو پوچھیں وہ آپ کو صحیح بات بتائیں گی رسول اللہ ﷺ نے خادمہ کو جن کا نام بریرہؓ تھا بلوایا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا: "کیا تم نے عائشہؓ کی کبھی کوئی ایسی حرکت دیکھی ہے جو تمہیں شک میں ڈالتی ہو؟ حضرت بریرہؓ نے کہا اس ذات کی قسم جس نے آپ کو سچا نبی بنا کر بھیجا ہے میں نے ایسی کوئی بات نہیں دیکھی جس کی وجہ سے میں عائشہؓ کو تہمت لگا سکوں وہ تو اتنی (بھولی) کمسن لڑکی ہیں کہ آٹا گوندھ کر سو جاتی ہیں، پلی ہوئی بکری آکر اسے کھا جاتی ہے۔ ایک شخص نے (دوسری روایات میں ہے کہ یہ حضرت علی تھے مترجم) انہیں دھمکا کر کہا کہ: "سچ سچ بیان کرو۔" حضرت بریرہؓ نے کہا: "سبحان اللہ میں تو عائشہ کو اس طرح بے عیب جانتی ہوں جس طرح جوہری خالص سرخ سونے کی ڈلی کو بے عیب جانتا ہے۔" اسی دن رسول اللہ ﷺ منبر پر تشریف لے گئے آپ نے فرمایا۔ کون ہے جو اس شخص کے مقابلہ میں میری مدد کر سکے جس نے میری بیوی کے معاملہ میں مجھے سخت صدمہ پہنچایا ہے۔ اللہ کی قسم میں اپنی بیوی میں سوائے بھلائی کے اور کچھ نہیں جانتا اور جس شخص کا نام اس سلسلہ میں انہوں نے لیا ہے اس کے متعلق بھی سوائے بھلائی کے میں کوئی اور گمان نہیں کر سکتا۔ وہ میری عدم موجودگی میں کبھی میرے گھر نہیں آیا۔ یہ سن کر بنو عبد اشہل کے بھائی حضرت سعد بن معاذؓ کھڑے ہوئے اور کہا: "یا رسول اللہ میں آپ کی مدد کروں گا" اگر وہ اُوس قبیلہ کا آدمی ہے تو میں اس کی گردن اڑادوں گا اور اگر ہمارے بھائی خزرج قبیلہ کا آدمی ہے تو جو حکم آپ دیں گے ہم اس کی تعمیل کریں گے۔ یہ سن کر قبیلۂ خزرج کے سردار حضرت سعد ابن عبادہ کھڑے ہوئے (یہ وہی سعد بن عبادہ ہیں جن کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ یہ صدیق اکبرؓ کے مقابلے میں خلافت کے مدعی تھے۔ اور یہ کہ انہوں نے صدیق اکبرؓ سے بیعت بھی نہیں کی مترجم) یہ بہت اچھے آدمی تھے لیکن اس موقعہ پر پھسل گئے۔ قومی حمیت اور غرور نے انہیں ابھارا، کہنے لگے: "تم جھوٹے ہو واللہ تم خزرجی کو قتل نہیں کر سکتے اور نہ اسکے

مارنے پر قادر ہو سکو گے۔ اگر وہ تمہاری قوم سے ہو گا تو تم اس کے قتل کو پسند نہیں کرو گے۔" یہ سن کر حضرت اسید ابن حضیرؓ کھڑے ہوئے یہ حضرت سعد ابن معاذؓ کے چچازاد بھائی تھے۔ حضرت اسیدؓ نے حضرت سعد ابن عبادہ سے کہا: "تم جھوٹے ہو اللہ کی قسم ہم اسے مار ڈالیں گے۔ تم منافق ہو کہ منافقوں کیطرف سے جھگڑتے ہو۔" اس پر اوس اور خزرج دونوں قبیلے اتنا بھڑکے کہ لڑنے پر آمادہ ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ ابھی ممبر پر ہی تھے۔ آپ ان کو چپ کراتے رہے یہاں تک کہ بالآخر وہ چپ ہو گئے۔

ان دونوں قبیلوں کے اختلاف کی وجہ سے اس دن رسول اللہ ﷺ نے کوئی عملی قدم نہ اٹھایا۔ اس دن بھی حضرت عائشہ صدیقہؓ مسلسل روتی رہیں۔ نہ آنسو تھمتے تھے نہ نیند آتی تھی۔ دوسری رات بھی اسی طرح گزر گئی ان کے والدین نے ان کے پاس بیٹھے بیٹھے صبح کر دی۔ حضرت عائشہؓ کو روتے ہوئے اب دو راتیں ایک دن ہو گیا تھا۔ اس عرصہ میں نہ ان کے آنسو تھمتے نہ ان کی آنکھ لگی۔ وہ اور ان کے والدین ڈر رہے تھے کہ ان کے رونے سے کہیں ان کا کلیجہ نہ پھٹ جائے ان کی والدہ بھی ان کے پاس بیٹھی ہوئی رو رہی تھیں اسی اثناء میں ایک انصاری عورت اندر آنے کی اجازت مانگی۔ انہوں نے اجازت دی وہ عورت نے اندر آکر بیٹھ گئی اور ان کے ساتھ رونے لگی یہ لوگ اسی حال میں تھے کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور سلام کر کے حضرت عائشہؓ کے پاس بیٹھ گئے۔ تہمت کے بعد اس دن پہلی مرتبہ آپ حضرت عائشہؓ کے پاس بیٹھے۔ ایک مہینہ تک مسلسل آپ نے حضرت عائشہؓ کے معاملہ میں وحی کا انتظار کیا لیکن ابھی تک وحی نازل نہ ہوئی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے بیٹھتے وقت کلمہ شہادت پڑھا پھر حمد و تشہد کے بعد فرمایا۔ اے عائشہ تمہارے متعلق ایسی ایسی خبر سننے میں آئی ہے اگر تم بری ہو تو اللہ عنقریب تمہاری بریت کی خبر دے دے گا۔ اور اگر تم سے گناہ ہو گیا تو اللہ سے اپنی بخشش کی دعا کرو اس کی طرف رجوع کرو، کیونکہ بندہ جب گناہ کا اقرار کر کے توبہ کرتا ہے تو اللہ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے۔"

اگرچہ رسول اللہ ﷺ کو یقین تھا کہ حضرت عائشہؓ بری ہیں جیسا کہ آپ خطبہ میں فرما چکے تھے تاہم آپ نے یہ کلمات صرف اس لیے کہے کہ ساری امت کے لیے نصیحت و موعظت کا کام دیں۔ اپنے یقین کی بنیاد پر نہ آپ نے بریت کا اعلان فرمایا۔ نہ مجرموں کو سزا دی تاکہ کسی شخص کو بدظنی کا موقعہ نہ ملے۔

جب رسول اللہ ﷺ نے اپنی بات ختم کی تو حضرت عائشہؓ کے آنسو بالکل خشک ہو گئے آنسو کا ایک قطرہ بھی نہ ٹپکا۔ حضرت عائشہؓ نے اپنے والد حضرت ابو بکرؓ سے کہا کہ: "آپ میری طرف سے رسول اللہ ﷺ کو جواب دیجئے۔" حضرت ابو بکرؓ نے کہا: "اللہ کی قسم میں نہیں جانتا کہ میں رسول اللہ ﷺ کو کیا جواب دوں۔" پھر حضرت عائشہ نے اپنی والدہ سے کہا کہ: "آپ رسول اللہ ﷺ کی بات کا جواب دیجئے۔" انہوں اللہ کہا کہ: "اللہ کی قسم مجھے نہیں معلوم کہ میں رسول اللہ ﷺ کو کیا جواب دوں۔ یہ جواب سن کر حضرت عائشہ صدیقہؓ نے جو ایک نو عمر لڑکی تھیں اور اس وقت تک زیادہ قرآن بھی پڑھی ہوئی نہیں تھیں جواب دینے کا ارادہ کیا۔ حضرت عائشہؓ نے کہا" اللہ کی قسم میں جانتی ہوں کہ تم لوگوں نے یہ بات سنی ہے اور وہ تمہارے دلوں میں جم گئی ہے اور تم نے اسے مان لیا ہے اب اگر میں یہ کہوں کہ میں بری ہوں تو مجھے سچا نہ سمجھو گے اور اگر میں تم سے اس امر کا اقرار کر لوں حالانکہ اللہ جانتا ہے کہ میں اس سے بری ہوں تو تم مجھے سچا سمجھو گے۔ اللہ کی قسم میں اپنی اور تم لوگوں کی مثال یوسف علیہ السلام کے باپ کے مثل سمجھتی ہوں کہ جبکہ انہوں نے یہ کہا تھا:

فَصَبْرٌ جَمِيلٌ ۖ وَاللَّهُ الْمُسْتَعَانُ عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ ﴿١٨﴾

"میں بھی (ان کی طرح) خوبصورتی کے ساتھ صبر کرتی ہوں اور جو کچھ لوگ کہہ رہے ہیں اس پر اللہ ہی میرا مددگار ہے۔"

یہ کہہ کر حضرت عائشہؓ منہ پھیر کر اپنے بچھونے پر لیٹ گئیں وہ فرماتی ہیں کہ اللہ کو علم تھا کہ میں بری ہوں (لہٰذہ مجھے امید تھی کہ) اللہ ضرور میری بریت بیان کرے گا۔ لیکن اللہ کی قسم میں یہ نہیں جانتی تھی کہ اللہ میری شان میں ایسی وحی نازل کرے گا جس کی تلاوت کی جائے گی۔ میں اپنی دانست میں اپنی شان کو اتنا بلند نہیں سمجھتی تھی کہ اللہ تعالیٰ میرے معاملہ میں کلام فرمائے گا۔ مجھے تو بس یہ امید تھی اللہ تعالیٰ رسول اللہ ﷺ کو خواب میں میرا بری ہونا ظاہر کر دے گا۔ اللہ کی قسم رسول اللہ ﷺ ابھی اپنی جگہ سے اٹھنے بھی نہ پائے تھے اور نہ گھر کا کوئی آدمی باہر جانے پایا تھا کہ آپ پر وحی نازل ہونے لگی اور جو شدت آپ پر بوقت نزول وحی ہوا کرتی تھی وہ شروع ہو گئی۔ سردی کا دن ہونے کے باوجود وحی کے بوجھ سے آپ کے جسم اطہر سے پسینہ موتیوں کی طرح ٹپک رہا تھا کچھ دیر بعد رسول اللہ ﷺ پر سے وہ شدت دور ہوئی آپ ہنستے ہوئے اٹھے اور فرمایا اے عائشہؓ اللہ کا شکر ادا کرو اللہ بزرگ و برتر نے تمہیں بری کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ جَاءُوا بِالْإِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنكُمْ ۚ لَا تَحْسَبُوهُ شَرًّا لَّكُم ۖ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُم مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْإِثْمِ ۚ وَالَّذِي تَوَلَّىٰ كِبْرَهُ مِنْهُمْ لَهُ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١١﴾ (النور:11)

"ان آیات کے سننے کے بعد حضرت عائشہ صدیقہ مطہرہؓ کی والدہ ماجدہ نے حضرت عائشہ مطہرہؓ سے کہا کہ اٹھو اور کھڑی ہو کر رسول

اللہ ﷺ کا شکریہ ادا کرو، حضرت عائشہ صدیقہ مطہرہؓ نے جواب دیا، اللہ کی قسم میں کسی کی طرف اٹھ کر نہ جاؤں گی اور نہ اللہ کے سوا کسی کا شکر ادا کروں گی۔"

(صحیح بخاری کتاب المغازی باب حدیث الافک عن عائشۃ وام رومانؓ وکتاب التفسیر وکتاب الشہادات وکتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ و صحیح مسلم کتاب التوبہ)

(خط کشیدہ الفاظ صرف صحیح مسلم میں ہیں۔ کثرت گریہ سے جگر پھٹنے کا اندیشہ حضرت عائشہؓ کو ہوا یہ صرف صحیح مسلم میں ہے۔ انصاری کے الفاظ "یہ بہتان عظیم ہے" یہ صرف صحیح بخاری کتاب الاعتصام میں ہیں۔)

تنقید حدیث:

یہ حدیث جیسا کہ حوالہ سے ظاہر ہے صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں آگئی ہے۔ لیکن صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے پورے پورے احترام کے باوجود ہمیں بہت افسوس ہے یہ حدیث ہمارے نزدیک محل نظر ہے۔ سب سے پہلی بات جو اس حدیث کے خلاف جاتی ہے وہ اس حدیث کی یہ بنیادی بات ہے کہ اس میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب سفر کا ارادہ فرماتے تو اپنی بیویوں میں قرعہ ڈالا کرتے تھے جس کے نام کا قرعہ نکلتا اسے آپ اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ جنگ بنی مصطلق کو جاتے وقت جب قرعہ ڈالا گیا تو حضرت عائشہ صدیقہؓ کا نام نکلا۔ الخ

ہمارے نزدیک قرعہ اندازی سے فیصلے کرنا ہی قرآن کریم کے خلاف ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے متعلق یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ آپ قرآن کریم سراسر خلاف قرعہ اندازی فرماتے ہوں اور اس طرح فیصلے فرماتے ہوں گے۔

سورۃ مائدہ میں ہے:

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَأَنْ تَسْتَقْسِمُوا بِالْأَزْلَامِ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ (المائدہ:۳)

"(اے پیروانِ دعوت ایمانی!) تم پر حرام کیا گیا ہے مردار اور خون اور سور کا گوشت اور وہ جانور جس پر غیر اللہ کا نام پکارا جائے اور جو جانور گلا گھونٹنے سے مر گیا ہو اور جو چوٹ لگنے سے مر گیا ہو اور جو اوپر سے گر کر اور سینگ لگ کر مر گیا ہو اور جسے کسی درندہ نے پھاڑ کھایا ہو البتہ جسے تم نے ذبح کر لیا ہو وہ حلال ہے ایسے ہی وہ جانور جو بتوں کے استھانوں پر ذبح کئے گئے ہوں اور یہ بھی حرام ہے کہ تم گوشت یا کوئی اور چیز آپس میں پانسہ کے تیروں سے تقسیم کرو یہ تمہارے لیے سخت گناہ کا باعث اور فسق ہے۔"

نیز سورۃ مائدہ ہی میں ذرا آگے چل کر فرمایا گیا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٩٠﴾

(المائدہ:۹۰)

"اے پیروان دعوت ایمانی! حقیقت یہی ہے کہ شراب اور جوا اور بت اور پانسہ کے تیر ناپاک شیطانی عمل ہیں سو ان سے بچتے رہو تاکہ تم فلاح پاسکو۔"

ان دونوں آیات کریمہ میں معاملات کے فیصلے پانسہ کے تیروں (الازلام) کے ذریعے سے کرنے کو منع فرمایا گیا ہے۔ آیت نمبر (المائدہ:۳) میں تو بات "حرمت علیکم" کے الفاظ سے شروع فرمائی گئی ہے اور آخر میں "ذالکم فسق" سے بتا دیا گیا ہے کہ یہ فعل حرام ہے اور سخت گناہ اور حق تعالیٰ کی انتہائی ناراضگی کا باعث ہے اور آیت نمبر (المائدہ:۹۰) میں "رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ" فرما کر یہ گندی چیزیں اور شیطانی اعمال ہیں۔ لہٰذا "فَاجْتَنِبُوْهُ" ان سے احتراز کرنے اور الگ رہنے کا حکم دے دیا گیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ الازلام چیز کیا ہے جس سے اس قدر تاکید کے ساتھ ممانعت فرمائی جارہی ہے تو الزَّلَمُ تیر کی اس لکڑی کو کہتے ہیں جس کے پچھلے سرے پر پَر نہ لگائے گئے ہوں۔ جمع اَزْلَامٌ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنے دبلا پتلا اور سپاٹ یعنی ہموار اور چکنا ہونے کے ہیں۔ پھر اَزْلَامٌ سے مراد وہ تیر تھے جن سے قریش زمانۂ جاہلیت میں فال نکالا لیتے یا قرعہ ڈالتے تھے تفصیل یہ ہے کہ تین مذکورہ بالا قسم کے تیر تھیلے میں ڈال دیئے جاتے ان میں سے ایک تیر پر افعل (کر)، دوسرے پر لا تفعل (نہ کر) لکھ دیتے، تیسرا خالی رہنے دیتے۔ جب کوئی شخص کسی معاملہ کا ارادہ کرتا تو خانہ کعبہ کے پجاریوں کے پاس آتا اور ان سے کہتا کہ میرے لیے یہ کام کرنے یا نہ کرنے کے بارہ میں فال نکالو چنانچہ وہ اپنے قاعدہ کے مطابق تیر نکالتے اور تیر کی تحریر کے مطابق فال دیکھ کر اسے بتا دیتے اگر خالی تیر آتا تو دوبارہ فال نکالتے بعض لوگ خود بھی اپنے اس قسم کے تیر رکھتے اور جہاں ضرورت پڑتی ان سے فال نکال لیتے۔ (تاج العروس و محیط المحیط)

اسی قسم کے تیروں سے قرعہ اندازی بھی ہوتی اور (جوئے کے) جانوروں کا گوشت تقسیم کیا جاتا تھا (المائدہ:۳) قرآن کریم نے ان سب باتوں سے منع فرمادیا۔ اس لیے کہ اس سے انسان اپنے اختیار کو چھوڑ کر جبر کا راستہ اختیار کرلیتا ہے اور بجائے اس کے کہ وہ اپنی فہم و بصیرت سے کسی بات کا

فیصلہ کرے، اپنے آپ کو اتفاقات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے۔ اس سے وہ مقامِ انسانیت سے گر جاتا ہے۔ قرآن کریم انسان کی عقل و بصیرت کی ترتیب کرتا اور اسے حریت و آزادی کی تعلیم دیتا ہے، اس لیے اس نے تمام باتوں سے منع کر دیا ہے جس سے اس کی عقل و خرد دب جائے اور حریت فکر و نظر سلب ہو جائے۔ وہ انسان کو پوری پوری آزادی دیتا ہے کہ وہ حدود اللہ یعنی قوانینِ خداوندی اور ہدایاتِ قرآنی کے اندر رہتے ہوئے اپنے انفرادی اور اجتماعی امور کے فیصلے اپنی عقل و فکر سے کرے، یہ تھی قرآن کریم کی تعلیم۔ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ اپنی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں

"بعض مفسرین نے ازلام سے تقسیم کے تیر مراد لیے ہیں جو زمانہ جاہلیت میں لحم ذبیحہ وغیرہ کے بانٹنے میں استعمال ہوتے تھے اور وہ ایک صورت قمار یعنی جوئے کی تھی جیسے آج کل چٹھی ڈالنے کی رسم ہے لیکن حافظ عماد الدین ابن کثیر وغیرہ محققین کے نزدیک راجح یہ ہے کہ ازلام سے مراد تیر ہیں جن سے مشرکین مکہ کسی اشکال اور تردد کے وقت اپنے ارادوں اور کاموں کا فیصلہ کرتے تھے۔ یہ تیر خانہ کعبہ میں قریش کے سب سے بڑے بت ہبل کے پاس رکھے تھے۔ ان میں سے کسی پر امرنی ربی لکھا "میرے پروردگار نے مجھے حکم دیا"۔ کسی پر نہانی ربی تحریر تھا "میرے پروردگار نے مجھے منع کر دیا ہے" جب کسی کام میں تذبذب ہوا تو تیر نکال کر دیکھ لیے اگر "امرنی ربی" والا تیر نکل آیا تو کام شروع کر دیا اور اسکے خلاف نکلا تو رک گئے۔ علی ہذا القیاس۔ گویا بتوں سے یہ ایک قسم کا مشورہ اور استعانت تھی چونکہ اس رسم کا مبنیٰ خالص جہل، شرک، اوہام پرستی اور افترا علی اللہ پر تھا اس لیے قرآن کریم نے متعدد مواقع میں نہایت تغلیظ اور تشدید کے ساتھ اس کی حرمت کو ظاہر فرمایا ہے۔ (قرآن کریم ترجمہ حضرت شیخ الہند و تفسیر حضرت عثمانی ص ۱۳۸)

یعنی ازلام سے مراد وہ تیر نہیں ہیں جو زمانہ جاہلیت میں ذبیحہ کا گوشت تقسیم کرنے کے لیے استعمال ہوتے تھے کیونکہ وہ تو قمار یعنی جوئے کی ایک شکل تھی اور اس کے متعلق آیت کریمہ میں المیسر کا لفظ آرہا ہے لہٰذا ازلام سے بھی اسی کو مراد لینا صحیح نہیں ہوگا۔ اس لیے علامہ ابن کثیر وغیرہ محققین کے نزدیک راجح یہ ہے کہ ازلام سے مراد وہ تیر ہیں جن سے مشرکین مکہ کسی اشکال اور تردد کے وقت اپنے ارادوں اور کاموں کا فیصلہ کرتے تھے یعنی وہ عقل و بصیرت سے غور فکر کر کے کسی نتیجہ پر پہنچنے کے بجائے ازلام کا آسان راستہ اختیار کر لیتے تھے جو کچھ تیروں سے نکل آیا اسی کو اختیار کر لیا یہ طریقہ بہت آسان تھا۔ غور و فکر اور عقل و بصیرت سے کسی بات کا فیصلہ کرنا تن آسانوں کے لیے بڑا دقت طلب اور بڑی محنت کی بات تھی اس لیے لوگوں نے اسی کو اختیار کر لیا تھا۔

یاد رکھیئے کہ کام اور اس کے اعمال کوئی اہمیت نہیں رکھتے، اہمیت دراصل اس نظریہ اور تصور کی ہوتی ہے جو کسی عمل کی پشت پر کار فرما ہوتا ہے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ کس ذہنیت کے ماتحت فلاں شخص فلاں کام کر رہا ہے۔ ایک ذہنیت تو یہ ہوتی ہے کہ آدمی کسی کام پر عقلی طور پر مطمئن ہونے کے بعد ہی اقدام کرتا ہے۔ وہ تقلیدی طور پر کسی اتفاقی حادثہ سے متاثر ہو کر کسی قسم کا کوئی عملی قدم نہیں اٹھاتا۔ وہ ہر بات کو جانچ پرکھ کر، ناپ تول کر، اس کے فوائد اور مضرتوں کو عقل و بصیرت کی ہدایت و رہنمائی سے سمجھ کر ہی اختیار کرتا ہے۔ درحقیقت یہ ذہنیت مشکل پسند اور صبر آزما ہوتی ہے۔ دوسری ذہنیت اس کے برخلاف تن آسانی اور سہل پسندی کی ہوتی ہے کہ آدمی غور و فکر سے کام لینا پسند نہیں کرتا بلکہ غور و فکر کرنے کے بجائے یہ دیکھتا ہے، کہ اب تک کیا ہوتا آرہا ہے، باپ دادا سے جو کچھ ہوتا آرہا ہے، آنکھیں بند کر کے اسی کی پیروی کرتا چلا جارہا ہے یا اگر کہیں ٹھٹک کر کوئی فیصلہ کرنا ہی پڑ گیا تو فال، نچھتر، قرعہ وغیرہ کا سہارا لے لیتا ہے کہ ترکش سے تیر نکالے یا دیوان حافظ اور مثنوی مولانا روم کا کوئی صفحہ کھول لیا اور پڑھ لیا کہ کیا لکھا ہے، چند پڑیوں کو بند کر کے ڈال دیا اور ان میں سے ایک پڑیا اٹھالی۔ کھول کر دیکھ لیا کہ کیا لکھا ہوا ہے جو کچھ لکھا ہوا نکلا اسی کے مطابق عمل کر لیا۔ غور فکر کرنے، موافق و مخالف نکات پر سوچنے سمجھنے کی زحمت سے بچ گئے۔ یہ دوسری روش زندگی ان لوگوں کی ہوتی ہے جو تن آسان اور سہل پسند واقع ہوئے ہوں۔ اسلام چاہتا ہے کہ آدمی جو کچھ بھی کرے وہ خوب سوچ سمجھ کر مفادات اور مضرتوں کو خوب ناپ تول کر موافق اور مخالف نکات پر خوب غور و فکر کر کے اختیار کرے، کوئی کام تقلیداً یا اندھادھند اتفاقات سے متاثر ہو کر نہ کر لے۔ حق تعالیٰ نے انسان کو با اختیار اور صاحب ارادہ بنا کر پیدا کیا ہے وہ یہی مطالبہ کرتا ہے کہ اپنے اختیار و ارادہ سے کام لو اور خوب سوچ سمجھ کر قدم اٹھاؤ۔ تمہیں کسی قسم کے جبر کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ وہ احکامِ خداوندی اور آیات الٰہی کی پیروی بھی اندھادھند نہیں کرانا چاہتا، وہ اللہ کے نیک بندوں کے اوصاف بیان کرتے ہوئے بتاتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ﴿۷۳﴾ (الفرقان: ۷۳)

"وہ اللہ کے بندے ایسے ہوتے ہیں کہ جب انہیں ان کے پروردگار کی آیات سے نصیحت کی جاتی ہے تو وہ ان آیتوں پر بھی بہرے اور اندھے ہو کر نہیں گر پڑتے۔"

وہ ہر بات میں علم و بصیرت کی پیروی کرنے اور سوچ سمجھ کر عملی قدم اٹھانے کی تاکید فرماتا ہے۔

وَ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ﴿۳۶﴾ (بنی اسرائیل:۳۶)

"اور اس بات کی ہر گز پیروی نہ کر جس کا تجھے کوئی علم نہیں ہے یقینا کان آنکھ، اور دل ان میں سے ہر ایک کی بابت اس شخص سے باز پرس کی جائے گی۔"

کہ تم نے فلاں قدم اٹھاتے ہوئے آنکھ، کان اور دل سے دیکھ، سن اور سمجھ بھی لیا تھا یا یوں ہی اندھا دھند قدم اٹھالیا تھا اس کی تو دعوت ہی یہ ہے کہ:

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَ فُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۫ (السبا:۴۶)

"(اے پیغمبر اسلام) آپ کہہ دیجئے کہ میں تو تمہیں صرف ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ دو، دو ایک ایک ہو کر اللہ کے لیے کھڑے ہو جاؤ پھر ذرا سوچ سمجھ لو۔

علم ویقین کے بہت بڑے ذرائع سمع وبصر اور فواد ہی ہیں آدمی بے شمار باتوں کا علم خود دیکھ کر، لوگوں سے سن کر اور عقل وبصیرت سے غور وفکر کر کے ہی حاصل کرتا ہے اور قرآن کریم نے انسان کی ان تینوں قوتوں کو جابجا بڑی ہی اہمیت دی ہے۔ سورۃ مومنون میں ہے:

وَ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۸﴾ (المومنون:۷۸)

"اور اللہ ہی تو ہے جس نے تمہارے لیے کان، آنکھیں اور دل پیدا کیے ہیں اف! تم کس قدر کم شکر گزاری کرتے ہو۔"

بہر حال قرآنی تعلیمات کے مطابق ایک مسلمان کا جو نقشہ ہونا چاہیے وہ ان آیات کریمہ اور ان جیسی دیگر سینکڑوں آیات کریمہ کے آئینہ میں صاف صاف دیکھا جاسکتا ہے جس میں تفکر و تدبر، تفقہ اور تعقل پر زور دیا گیا ہے۔ اس نقشہ کو ذہن میں رکھئے اور پھر ان شبیہوں کو ذہن میں لائیے جو دیوانِ حافظ، مثنوی مولانا روم کھولے بیٹھے ہیں یا چند پرچیوں پر کچھ نام لکھ کر لوٹا گھمارہے ہیں یا قرعے نکال رہے ہیں اور ایمان داری کے ساتھ بتائیے کہ یہ تصوریں اس قرآنی نقشہ پر ذرا بھی فٹ بیٹھتی ہیں جو قرآن کریم نے ایک مرد مومن کا پیش فرمایا ہے؟ ہمیں افسوس ہے کہ یہ شبیہیں اس نقشہ پر قطعاً فٹ نہیں بیٹھتیں جو قرآن کریم نے اللہ کے بندوں کا پیش فرمایا ہے۔ چہ جائے کہ خود آنحضرت ﷺ کی شبیہہ کو اس نقشہ پر فٹ کرنے کی سعی نا مشکور کی جائے حیرت ہوتی ہے کہ ہمارے عہد کے ایک عالم اور مفکر یعنی مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب اپنی تفسیر تفہیم القرآن میں رقم طراز ہیں۔

(۱) مشرکانہ فال گیر (یعنی کوئی مومنانہ فال گیر بھی ہوتی ہے۔ (مولف)

جس میں کسی دیوی یا دیوتا سے قسمت کا فیصلہ پوچھا جاتا ہے یا غیب کی خبر دریافت کی جاتی ہے یا باہمی نزاعات کا تصفیہ کرایا جاتا ہے۔ مشرکین مکہ نے اس غرض کے لیے کعبہ کے اندر ہبل دیوتا کے بت کو مخصوص کر رکھا تھا، اس کے استھان میں سات تیر رکھے ہوئے تھے جن پر مختلف الفاظ اور فقرے کندہ تھے کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا سوال ہو یا کھوئی چیز کا پتہ پوچھنا ہو یا خون کے مقدمہ کا فیصلہ مطلوب ہو۔ غرض کوئی بھی کام ہو اس کے لیے ہبل کے پانسہ دار (صاحب القداح) کے پاس پہنچ جاتے اس کا نذرانہ پیش کرتے اور ہبل سے دعا مانگتے کہ ہمارے معاملہ کا فیصلہ کر دے پھر پانسہ دار ان تیروں کے ذریعہ فال نکالتا اور جو تیر بھی نکل آتا اس پر لکھے ہوئے لفظ کو ہبل کا فیصلہ سمجھا جاتا۔

(۲) توہم پرستانہ فال گیری جس میں زندگی کے معاملات کا فیصلہ عقل وفکر سے کرنے کے بجائے کسی وہمی یا خیالی چیز یا کسی اتفاقی شے کے ذریعہ کیا جاتا یا قسمت کا حال ایسے ذرائع سے معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی جن کا وسیلۂ علم غیب ہونا کسی علمی طریق سے ثابت نہیں ہے۔ رمل، نجوم، جفر مختلف قسم کے شگون اور نچھتر اور فال گیری کے بے شمار طریقے اس صنف میں داخل ہیں۔

(۳) جوئے کی قسم کے وہ سارے کھیل اور کام جن میں اشیاء کی تقسیم کا مدار حقوق اور خدمات اور عقلی فیصلوں پر رکھنے کے بجائے محض کسی اتفاقی امر پر رکھ دیا جائے۔ مثلاً یہ کہ لاٹری میں اتفاقاً فلاں شخص کا نام نکل آیا ہے لہٰذہ ہزار ہا آدمیوں کی جیب سے نکلا ہوا روپیہ اس ایک شخص کی جیب میں چلا جائے یا یہ کہ علمی حیثیت سے تو ایک معمہ کے حل کے بہت سے صحیح حل ہیں مگر انعام وہ شخص پائے گا جو کسی معقول کوشش کی بنا پر نہیں بلکہ محض اتفاق سے اس حل کے مطابق نکل آیا ہو جو صاحبِ معمہ کے صندوق میں بند ہے۔

ان تین اقسام کو حرام کر دینے کے بعد قرعہ اندازی کی صرف وہ سادہ صورت اسلام میں جائز رکھی گئی ہے جس میں دو برابر کے جائز کاموں یا دو برابر کے حقوق کے درمیان فیصلہ کرنا ہو مثلاً ایک چیز پر دو آدمیوں کا حق ہر حیثیت سے بالکل برابر ہے اور فیصلہ کرنے والے کے لیے ان میں سے کسی کو ترجیح دینے کی کوئی معقول وجہ موجود نہیں ہے اور خود ان دونوں میں سے بھی کوئی اپنا حق چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہے اس صورت میں ان کی رضامندی سے قرعہ اندازی پر فیصلہ کا مدار رکھا جاسکتا ہے یا مثلاً دو کام یکساں درست ہیں اور عقلی حیثیت سے آدمی ان دونوں کے درمیان مذبذب ہو گیا ہے کہ ان میں سے کس کو اختیار کرے اس صورت میں ضرورت ہو تو قرعہ اندازی کی جاسکتی

ہے۔ نبی ﷺ بالعموم ایسے مواقع پر یہ طریقہ اختیار فرماتے تھے جبکہ دو برابر کے حق داروں کے درمیان ایک کو ترجیح دینے کی ضرورت پیش آجاتی تھی اور آپ کو اندیشہ ہوتا تھا کہ اگر آپ خود ایک کو ترجیح دیں گے تو دوسرے کو ملال ہوگا۔ (تفہیم القرآن ج ا ص ۴۴۲ تا ۴۴۳)

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی صاحب نے جو تین صورتیں حرام قرار دی ہیں ان میں جیسا کہ ظاہر ہے اور مولانا مرحوم نے خود بھی اعتراف فرمایا ہے تیسری صورت تو جوئے اور قمار یعنی میسر کی ہے اسے ازلام میں شامل کرلینا صحیح نہیں ہے کیونکہ آیت نمبر (المائدہ: ۹۰) میں المیسر کا لفظ صراحۃً آگیا ہے جس سے جوئے کی تمام صورتیں خود بخود حرام ہو گئی ہیں۔ اب ازلام سے بھی جوئے کی صورتیں مراد لینا صحیح نہیں ہوگا جو چیز پہلے ہی حرام ہو چکی اسی کو دو بارہ اسی آیت میں حرام قرار دینا غیر مفید تکرار ہے لہٰذہ ازلام سے مراد پہلی دو صورتیں ہی ہوں گی چنانچہ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ مرحوم نے اسی وجہ سے ازلام کا مصداق پہلی دو صورتیں ہی قرار دی ہیں۔

اور اسی کو حافظ عماد الدین ابن کثیر اور دیگر محققین کے حوالہ سے راجح قرار دیا ہے۔ اب رہ گئی چوتھی صورت جسے مولانا ابو اعلیٰ مودودی صاحب نے قرعہ اندازی کی جائز صورت قرار دیا ہے وہ ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو وہ بعینہ وہی دوسری صورت ہے جسے مولانا مودودی نے حرام قرار دیا ہے یعنی زندگی کے معاملات کا فیصلہ عقل و فکر سے کرنے کے بجائے کسی وہمی یا خیالی چیز یا کسی اتفاقی شئے کے ذریعہ کیا جاتا ہے یا قسمت کا حال ایسے ذرائع سے معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جن کا وسیلہ غیب ہونا کسی علمی طریق سے ثابت نہیں ہے۔

سفر میں کسی بیوی کو ساتھ لے جانے کے لیے قرعہ اندازی کرنا قطعاً اسی صورت میں آتا ہے۔ یہاں آپ حضرت عائشہ صدیقہؓ کو اپنے ہمراہ سفر میں لے جانے کے لیے فیصلہ کسی عقلی و فکری معقول وجہ سے نہیں فرماتے مثلاً اس وجہ سے نہیں کہ وہ زیادہ سمجھ دار ہیں، زیادہ فقیہ ہیں، حضور اکرم ﷺ کی زیادہ مزاج شناس ہیں اور ان کی وجہ سے سفر میں آرام اور اطمینان کی زیادہ توقع ہے بلکہ محض وہمی خیالی یا اتفاقی شئے سے فرماتے ہیں کہ ان کا نام قرعہ میں نکل آیا ہے جو قطعاً قرآن کریم کی رو سے ممنوع ہے لہٰذہ اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ آنحضرت ﷺ اس طرح کے فیصلے فرمانے کے عادی رہے ہوں پھر عجیب بات ہے کہ حج اور عمرہ کے علاوہ دیگر اسفار میں جہاں اس قرعہ اندازی کا تذکرہ ملتا ہے جہاں تک میری تلاش و جستجو کا تعلق ہے صرف تین ایسے اسفار ہیں جن میں آپ نے قرعہ اندازی فرمائی ہے ایک تو غزوہ بنی مصطلق کا سفر جس سے واقعہ افک کا تعلق جوڑا گیا ہے، دوسرے ایک سفر کا واقعہ جس میں آیت تیمم نازل ہوئی، تیسرے ایک اور سفر کا واقعہ جس میں حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا بھی سفر میں ہمراہ ہیں اور وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ان کی سواری کا اونٹ بدل لیتی ہیں کیونکہ دورانِ سفر آنحضرت ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اونٹ کے قریب رہا کرتے تھے۔ لیکن ان تینوں سفروں میں حضرت عائشہ ضرور ساتھ ہیں۔ تو کیا قرعہ اندازی میں ہر مرتبہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کا نام ہی نکلا کرتا تھا۔ تیسرے واقعہ میں اگرچہ حضرت حفصہؓ بھی ہیں مگر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بھی ساتھ ہی موجود ہیں تو ایسی قرعہ اندازی سے کیا فائدہ تھا جس میں ہر مرتبہ ایک ہی نام نکالا جاتا تھا[1]۔

اول تو سفر میں آنحضرت ﷺ کا کسی نہ کسی زوجہ محترمہ کو ساتھ لیے بغیر نہ جانا ہی محل تامل ہے۔ آپ نے زیادہ تر سفر جنگ و جدال اور جہاد کے سلسلہ میں فرمائے ہیں۔ صرف ایک مرتبہ عمرہ کے لیے اور ایک مرتبہ حج کے لیے سفر فرمانا ثابت ہے عمرہ اور حج کے سفر میں تو ازواج مطہرات کا ساتھ لے کر جانا سمجھ میں آتا ہے لیکن جنگی اسفار میں مستورات کو ساتھ لے کر جانا سمجھ میں نہیں آتا تاہم اگر تسلیم بھی کرلیا جائے کہ آپ مستورات کو بھی ساتھ لے کر چلتے تھے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یقیناً اس کا کوئی مقصد تو ہوتا ہوگا۔ بلاوجہ تو نعوذباللہ آپ انہیں ساتھ لیے پھرنے سے رہے۔ یقیناً اس میں آپ نے کوئی خاص مصلحت سمجھی ہوگی کہ مستورات کو بھی ساتھ لیا جائے مثلاً تبلیغ و ارشاد یا ازواج مطہرات کی تعلیم و تربیت کیونکہ سفر میں مختلف آبادیوں پر گزر ہوتا تھا۔ وہاں مردوں کے علاوہ عورتوں سے بھی سابقہ پڑتا تھا لہٰذہ یہ ازواج مطہرات عورتوں کو تبلیغ و ارشاد فرمائیں گی یا خود کچھ مسائل جو سفر میں پیش آئیں گے سیکھیں گی نیز اگر جنگ ہوئی تو زخمیوں کی مرہم پٹی کریں گی

---

(1) جسٹس کیانی مرحوم نے ایک مرتبہ مرحوم فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے صدارتی انتخاب میں بلا مقابلہ کامیابی پر طنز کرتے ہوئے لکھا تھا کہ کچھ دن ہوئے ہم چند احباب انگلینڈ گئے اور وہاں ایک ہوٹل کے کمرہ میں ہم لوگوں نے قیام کیا ہم پانچ چھ آدمی تھے۔ روزانہ ہوٹل کا بے مرچ کا کھانا کھاتے کھاتے اکتا گئے جی چاہا کہ کیوں نہ اپنے کمرہ میں مرغ خود پکالیا جائے چنانچہ بازار سے زندہ مرغ خرید لائے کیونکہ گوشت میں یہ اندیشہ تھا کہ باقاعدہ ذبیحہ کا گوشت نہ ہو، مگر اب سوال یہ حل طلب تھا کہ اسے ذبح کہاں کریں اور کون ذبح کرے پہلا سوال تو ہم نے یوں حل کرلیا کہ باتھ روم میں چپکے سے ذبح کرلیا جائے رہا دوسرا سوال تو کوئی شخص بھی ذبح کرنے پر تیار نہیں تھا میں نے کہا کہ لاؤ قرعہ ڈال لیں جس کا نام نکل آئے وہی یہ فرض انجام دے چنانچہ میں نے چھ پرچیاں بنائیں اور ایک صاحب سے جن کا نام محمد ایوب تھا میں نے درخواست کی کہ کوئی پرچی اٹھالیں۔ انہوں نے ایک پرچی اٹھا کر کھولی تو اس میں محمد ایوب ہی لکھا تھا وہ جونسی پرچی بھی اٹھاتے محمد ایوب ہی نکلنا تھا تو کیا معاذاللہ آنحضرت ﷺ بھی کوئی ایسا ہی گھپلا فرمایا کرتے تھے۔

زخمیوں کو میدان جنگ سے اٹھا کر لائیں گی، ان کو پانی پلائیں گی وغیرہ وغیرہ یہ تمام مصلحتیں ایسی ہیں کہ عقل و فکر کی بنا پر کسی ایک کو دوسری ازواج پر ترجیح دی جاسکتی تھی مثلاً کسی کا فقیہہ اور عالم ہونا۔ زیادہ سمجھ دار ہونا، جوان اور چاق و چوبند ہونا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ آنحضرت ﷺ ان عقلی وفکری ترجیحات سے قطعاً نہیں بلکہ محض قرعہ اندازی سے ترجیح کے فیصلے فرمایا کرتے تھے۔ ان حضرات نے غالباً یہ سمجھ رکھا ہے یا وہ دوسروں کو یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ مستورات کو ان اسفار میں ساتھ لے کر جانے کا کوئی بلند مقصد یعنی تبلیغی یا تعلیمی نہیں تھا بلکہ کوئی ایسا پست اور فروتر مقصد تھا جس میں ہر بیوی برابر اور مساوی درجہ رکھتی تھی۔ چنانچہ مولانا مودودی مرحوم نے تحریر فرمایا ہے کہ دو برابر کے جائز کاموں یا دو برابر کے حقوق کے درمیان فیصلہ کرنا ہو۔ مثلاً ایک چیز پر دو آدمیوں کا حق ہر حیثیت سے بالکل برابر ہے اور فیصلہ کرنے والے کے لیے ان میں سے کسی کو ترجیح دینے کی کوئی معقول وجہ موجود نہیں ہے۔ نبی کریم ﷺ بالعموم ایسے مواقع پر یہ طریقہ اختیار فرماتے تھے جبکہ دو برابر کے حق داروں کے درمیان ایک کو ترجیح دینے کی ضرورت پیش آجاتی تھی اور آپ کو اندیشہ ہوتا تھا کہ اگر آپ خود ایک کو ترجیح دیں گے تو دوسرے کو ملال ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ازواج مطہرات سب اپنی اپنی صلاحیتوں اور اہلیتوں کے اعتبار سے تو قطعاً برابر اور یکساں نہیں تھیں، کوئی زیادہ سمجھ دار اور فقیہہ تھی مثلاً حضرت عائشہؓ، کوئی زیادہ بردبار اور معاملہ فہم تھی مثلاً حضرت ام سلمہؓ، کوئی زیادہ جفاکش اور متحمل مزاج تھی، مثلاً حضرت حفصہؓ اور کوئی زیادہ ایثار پیشہ اور سخی تھی مثلاً حضرت زینب وغیرہ وغیرہ۔ لہٰذہ اس تصور سے کہ سب ایک درجہ کی تھیں اور ان میں سے کسی کو دوسری پر ترجیح نہیں دی جاسکتی تھی دراصل یہ باور کرانا مقصود ہے کہ مستورات کو ساتھ لے کر چلنے کا مقصد کوئی اعلیٰ مقصد تھا ہی نہیں بلکہ نہایت ہی اسفل مقصد یعنی صرف جنسی آسودگی تھا جو ہر زوجہ مطہرہ سے حاصل ہوسکتا تھا۔ اور اس مقصد کے حصول میں سب برابر اور یکساں تھیں جن میں آپ کسی کو عقلی اور فکری انداز سے ترجیح نہیں دے سکتے تھے لہٰذا آپ قرعے ڈال لیا کرتے تھے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون، ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ کے متعلق اس قسم کا تصور رکھنا انتہائی جہالت بلکہ بڑی بیہودہ جسارت ہے اس لیے ہم آنحضرت ﷺ کے متعلق قرعہ اندازی کے اس تصور کی ہرگز تائید نہیں کرسکتے۔ ہم بتا چکے ہیں کہ قرعہ اندازی کا یہ طریقہ قطعاً مشرکانہ اور توہم پرستانہ تھا اور قرآن کریم نے اس کو قطعاً حرام قرار دیا ہے لہٰذہ آنحضرت ﷺ کے بارے میں یہ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ آپ ایسا کرتے ہوں چہ جائیکہ بقول مولانا مودودی بالعموم فرماتے ہوں۔ ہمیں خوشی ہے کہ یہ کوئی ہماری ذاتی اپج نہیں ہے بلکہ بقول قسطلانیؒ حنفیہ اور مالکیہ کا مذہب بھی یہی ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ۔

والمشھور عن المالیکہ والحنفیہ عدم اعتبار القرعہ۔

(ارشاد الساری لشرح صحیح البخاری للعلامۃ القسطلانی، ج۸ ص۱۱۸)

یعنی فقہائے مالکیہ اور حنفیہ سے مشہور یہی ہے کہ قرعہ اندازی کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ ان کے ساتھ ساتھ علامہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں شرح صحیح بخاری میں یہی تحریر فرمایا ہے انہوں نے ذرا تفصیل سے اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے وہ فرماتے ہیں:

زاد ابن سعد من وجہ آخر عن القاسم عن عائشۃ رضی اللہ عنہا فکان اذا خرج سھم غیری عرف فیہ الکراھیۃ واستدل بہ علی مشروعیۃ القرعۃ فی القسمۃ بین الشرکاء وغیرذالك کما تقدم فی اواخر الشھادات والمشھور عن الحنفیۃ والمالکیۃ عدم اعتبار القرعۃ قال عیاض ھو مشھور عن مالك واصحابہ لانہ من باب الحظر القمار وحکی عن الحنفیۃ آہ وقد قالو بہ فی مسئلۃ الباب واحتج من منع من المالکیۃ بان بعض النسوۃ قد تکون انفع فی السفر من غیرھا فلو خرجت القرعۃ للتی لا نفع بھا فی السفر لاضر بحال الرجل وکذابالعکس قد یکون بعض النساء اقوام ببیت الرجل من الاخری (فتح الباری ج۱۱ ص۳۲۲)

"ابن سعد نے دوسری سند سے قاسم عن عائشہؓ اتنا اضافہ کیا ہے کہ حضرت عائشہ نے فرمایا کہ جب قرعہ میں میرے علاوہ کسی دوسری زوجہ مطہرہ کا تیر نکل آتا تھا تو آنحضرت ﷺ کے چہرہ اقدس سے ناگواری نمایاں نظر آتی تھی۔ اس حدیث سے قرعہ اندازی کے جواز پر شرکاء میں چیزوں کے تقسیم وغیرہ کے بارہ میں استدلال کیا گیا ہے جیسا کہ کتاب الشہادات کے اواخر میں گزر چکا ہے لیکن حنفیہ اور مالکیہ سے قرعہ اندازی کا معتبر نہ ہونا ہی مشہور ہے قاضی عیاض نے فرمایا ہے کہ امام مالکؒ سے یہی مشہور ہے کیونکہ یہ ممنوعات اور جوئے کے ذیل میں آتا ہے اور حنفیہ سے بھی ایسا ہی نقل کیا گیا ہے الخ، ان فقہاء نے قرعہ کے مسئلہ میں ایسا ہی فرمایا ہے مالکیہ میں سے جن حضرات نے اس سے منع فرمایا ہے انہوں نے یہ دلیل دی ہے کہ بعض عورتیں سفر میں دوسری عورتوں سے زیادہ مفید ہوسکتی ہیں تو اگر قرعہ اس عورت کے نام کا نکل آیا جس کا سفر میں کوئی فائدہ نہیں ہے تو یہ بات مرد کے لیے نقصان رساں ہو گی، اسی طرح اس کے برعکس بعض عورتیں آدمی کے گھر کا بہترین انتظام کرنے والی ہوتی ہیں بہ نسبت دوسری عورتوں کے۔

بہرحال علامہ قسطلانی اور ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہما کی تصریحات کے مطابق فقہائے حنفیہ اور فقہائے مالکیہ کے نزدیک قرعہ اندازی کا کوئی اعتبار

نہیں ہے اور حضرات فقہائے مالکیہ نے جو اس کے خلاف دلیل دی ہے اس سے بھی ہمارے اس شبہ کی تائید ہوتی ہے کہ ساری عورتیں یکساں نہیں ہوتیں، بعض بیویاں ایسی ہو سکتی ہیں جن کا اپنے شوہر کے ساتھ سفر میں ساتھ جانا شوہر کے لیے فائدہ مند ہو سکتا ہے اور بعض کا فائدہ مند نہیں ہو سکتا اسی طرح اس کے برعکس بعض عورتوں میں انتظامی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے بعض میں کم ہوتی ہے، لہٰذہ بعض بیویوں کو گھر کی دیکھ بھال کے لیے گھر پر چھوڑنا زیادہ مفید ہو سکتا ہے۔ بعض کا گھر پر چھوڑنا زیادہ مفید نہیں ہو سکتا۔ اس لیے قرعہ اندازی کر کے فیصلہ کرنا عام مصلحتوں کو نظر انداز کر دینے کے مترادف ہے۔ اسی وجہ سے قرآن کریم نے قرعہ اندازی فال گیری کے طریقوں کی مخالفت فرمائی ہے اور اسے حرام قرار دیا ہے۔ ابن سعد کے بیان کے مطابق اس روایت میں جو بخاری نے آنحضرت ﷺ کے متعلق بیان کی ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ قول بھی نقل ہوا ہے کہ قرعہ میں اگر حضرت عائشہؓ کے علاوہ کسی اور زوجہ مطہرہ کا نام نکل آتا تھا تو آنحضرت ﷺ کے چہرہ مبارک پر ناگواری کے آثار نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے تھے۔ سوال یہ ہے کہ ناگواری ہوتی تھی تو آپ ﷺ قرعہ اندازی فرماتے ہی کیوں تھے۔ قرعہ اندازی فرمانے کی آپ پر کوئی پابندی تو نہیں تھی۔ قرآن کریم میں کوئی ایسی آیت نہیں ہے جس میں آپ کو اس کا حکم دیا گیا ہو، جو فقہائے کرام اس قرعہ اندازی کے موید ہیں وہ بھی اس پر متفق ہیں کہ آپ کو پورا پورا اختیار تھا کہ جس بیوی کو آپ چاہتے اپنے ساتھ سفر میں لے جا سکتے تھے۔ پھر اس فضول تکلف کی ضرورت ہی کیا تھی۔ دوسرا سوال یہ ہے قرعہ اندازی کے ذریعہ فیصلہ فرما کر کسی بیوی کو ساتھ لے جانے کا تذکرہ روایات میں صرف تین مرتبہ آتا ہے اور تینوں مرتبہ حضرت عائشہ صدیقہؓ ضرور ساتھ ہیں دو مرتبہ تن تنہا اور تیسری مرتبہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ۔ تو یہ کیسی قرعہ اندازی ہوا کرتی تھی کہ ہر مرتبہ حضرت عائشہؓ کا نام ہی نکلتا تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی بتایا گیا ہے کہ حضرت عائشہؓ کے علاوہ کسی اور زوجہ محترمہ کا نام قرعہ میں نکلتا تھا تو آپ کو ناگواری ہوتی بھی تھی لیکن کسی ایسے سفر کا کہیں بھی تذکرہ نہیں ملتا جس میں حضرت عائشہؓ کا نام نہ نکلا ہو بلکہ تنہا کسی اور زوجہ مطہرہ کا نام نکل آیا ہو۔ یہ ساری باتیں ایسی ہیں جو ہماری فہم سے بالا ہیں، اس بنا پر ہماری قطعی رائے ہے کہ یہ مفروضہ ہی غلط ہے کہ آپ ﷺ قرعہ اندازی فرمایا کرتے تھے۔ ہم پوری تفصیل کے ساتھ بتا چکے ہیں کہ قرعہ اندازی قرآن کریم کے قطعاً خلاف یعنی بالکل حرام فسق، گندہ کام اور شیطانی عمل ہے لہٰذہ یہ ممکن ہی نہیں کہ آنحضرت ﷺ اس کا ارتکاب فرماتے ہوں۔ اصول حدیث میں یہ بات طے شدہ ہے کہ قرآن کریم کے خلاف جو بھی روایت ہو وہ قابل قبول نہیں ہوتی۔ کیوں آنحضرت ﷺ کے متعلق یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ آپ کہ خدانخواستہ قرآن کریم کے خلاف کوئی عمل فرماتے ہوں بہر حال یہ روایت ایک تو اس وجہ سے قابل قبول نہیں ہے کہ یہ قرآن کریم کے خلاف ہے۔

دوسری بات: جو نہایت اہم ہے وہ یہ ہے کہ روایت محمد ابن مسلم ابن شہاب زہری کی ہے جن کے متعلق ہم بار بار لکھ چکے ہیں کہ امام زہریؒ کو ہمارے محدثین کتنا ہی بڑا امام حدیث کیوں نہ تصور کرتے ہوں مگر یہ حقیقت اپنی جگہ نہایت اہم ہے کہ موصوف پر تشیع کا شبہ کیا جاتا رہا ہے چنانچہ جتنی حدیثیں ایسی آگئی ہیں کہ ان سے حضرت عائشہ صدیقہؓ رضی اللہ عنہا، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے متعلق کوئی قابل اعتراض بات نکلتی ہو اس میں امام زہری کا ہاتھ ضرور ہوتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کے ایک صاحبزادہ کے متعلق کہ ان کا نام عبد العزیٰ رکھا گیا تھا۔ اس کے خالق بھی یہی محترم بزرگ ہیں، یہی حضرت اس روایت کے بھی خالق ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی وفات کے وقت قرآن مجید کسی چیز پر لکھا ہوا نہیں تھا نیز ابن شہاب زہری ہی اس روایت کے بھی خالق ہیں کہ سورۃ النجم کی تلاوت کے وقت آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک پر ابلیس لعین کے زیر اثر "تِلْكَ الْغَرَانِيقُ الْعُلیٰ" کے کلمات جاری ہو گئے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے متعلق وہ روایت بھی ان حضرات ہی کا کارنامہ ہے کہ نکاح کے وقت ان کی عمر چھ سال اور رخصتی کے وقت ان کی عمر نو سال تھی۔ رجم کی آیت کے متعلق حضرت عمرؓ کے خطبہ کو نقل کرنے والے بھی یہی حضرت ہیں کہ رجم کی آیت قرآن میں نازل ہوئی تھی اور بعد میں وہ آیت قرآن کریم سے خارج کر دی گئی، اور میرا (عمرؓ کا) جی چاہتا ہے کہ میں اسے کتاب اللہ میں لکھ دوں۔ بہر حال اس قسم کی زیادہ تر روایات ان ہی حضرت سے منقول ہیں۔ مشہور شیعہ مؤلف شیخ عباس قمی فرماتے ہیں کہ ابن شہاب زہری پہلے سنی تھے پھر شیعہ ہو گئے تھے۔

(تتمہ المنتہی ص ۱۲۸)

عین الغزال فی اسماء الرجال میں بھی ابن شہاب زہری کو شیعہ ہی بتایا گیا ہے۔ مشہور بریلوی عالم شیخ الاسلام علامہ محمد قمر الدین صاحب سجادہ نشین آستانہ عالیہ سیال شریف (جو آج کل اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن بھی ہیں، فدک کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ:

اب فدک والی روایات میں ایک شخص محمد ابن مسلم ہے جس کو ابن شہاب زہری بھی کہتے ہیں۔ صرف یہی راوی یہ روایت کرتا ہے اس کے ساتھ دوسرا کوئی شاید نہیں اور یہ ابن شہاب زہری اہل تشیع کے اصول کافی میں بیسیوں جگہ پر روایتیں کرتا نظر آتا ہے اور اہل تشیع کی فروع کافی نے تو اس کی روایتوں کے بل بوتے پر کتاب کی شکل اختیار کر لی ہے۔ تو بھائیو! اہل تشیع کے

اس قدر مشہور و معروف کثیر الروایت آدمی کی روایت سے اہل سنت پر الزام قائم کرنا اور ائمہ صادقین کو جھٹلانا عجیب فکر و نظر ہے .... آپ کی مزید تسلی کے لیے ہم اسی محمد ابن مسلم ابن شہاب زہری صاحب کو کتاب منتہی المقا لیار جال بو علی میں شیعوں کی صف میں بے نقاب بیٹھا ہوا دکھاتے ہیں۔ دیکھو کتاب رجال بو علی میں صاف لکھا ہوا ہے کہ محمد ابن مسلم ابن شہاب زہری شیعہ ہے۔ تو فدک کا جھگڑا اب تو ختم کرو ہمتو ابن شہاب زہری کو اچھا سمجھتے اگر گھر کے بھیدی یہ بھید نہ کھولتے۔

(مذہب شیعہ "مطبوعہ مکتبہ ضیاء الشمس الاسلام سیال شریف ضلع شاہ پور: ص ۱۰۲ تا ۱۰۳)

انہی ابن شہاب زہری کا تذکرہ شیخ عباس قمی کی کتاب الکنی والالقاب ج ۲ ص ۲۷۴ تا ۲۷۵ میں بھی دیکھا جا سکتا ہے یہ شیعہ اسماء الرجال کی کتاب ہے اس میں ان کا ذکر ان کے تشیع کی کھلی دلیل ہے وہ فرماتے ہیں کہ۔

روی الخطیب فی تاریخ بغداد ج ۴ ص ۴۸ ان ابا اسحٰق الزہری المذ کو رقدم العراق ۱۸۴ھ فاکرمہ الرشید واظھر برہ وسئل عن الغناء فافتی بتحلیلہ

"خطیب نے تاریخ بغداد ج ۴ ص ۸۴ میں بیان کیا ہے کہ ابو اسحٰق زہری مذکور ۱۸۴ھ میں عراق آئے تو ہارون رشید نے ان کا اکرام فرمایا اور ان پر احسانات فرمائے۔ ان سے گانے بجانے کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے اسے حلال قرار دیا۔

شیعہ اسماء الرجال کے امام محمد باقر ابن الحاج میر زین الدین موسوی الخوانساری فرماتے ہیں

وروی الثقۃ الجلیل علی بن محمد بن علی الخزازنی کتابہ الکفایۃ روایۃ تدل علی تشیعہ وروی النص علی کون الائمۃ اثنی عشر عن علی ابن الحسین وان المھدی سابع اولا دابنہ محمد ابن علی والذی ھو الراجح فی النظر عندی فی حق ھذا الرجل بعد استقصائی الکامل لکلمات المادحین لہ ولقادحین والتامل الغائر التام فی سبب کل منھما وما ھو طریق الجمع بین الادلۃ التی لم یطلع علی عمدھا صاحب التعلیقات التی استظھر تشیعہ وحسن احوالہ فضلا عن الشیخ ابی علی الرجالی الذی ھو یضیق عندہ الفنونوقاصر عن ادراک ما ھوعنداھلہ مخزون انہ مرۃ کان فی مبتداءامرہ کما عرفتہ من عبارۃ تاریخ ابن خلکان من جملۃ علمای اھل السنۃ وندماءحزب الشیطین ثم ان علمہ وادراکہ وارشادہ الی الحق المبین فصیرہ فی اواخرعمرہ من الراجعین الی الامام زین العابدین وفی زمرۃ المستفیدین من برکات انفاسہ الشریفۃ والمستندین الی کلماتہ الطریفۃ والمحبین لہ بیدہ ولسانہ والحافظین لغیبہ المعلنین لعظم شانہ و برھانہ فمن جملۃ ماتدلک علی ذالک وکانہ الذی راہ صاحب التعلیقات وجعل ایاہ الدلیل علی تشیعہ وکمال ایمانہ دون روایۃ النص علی الائمۃ الاثنی عشر الذی فھمہ صاحب المنتھی من عبادتہ۔ (روضات النجات فی احوال العلماء والسادات ج ا ص ۲۸۹)

" جلیل القدر اور قابل اعتماد بزرگ علی ابن محمد بن علی الخزاز نے اپنی کتاب کفایہ میں ایک روایت بیان کی ہے جو ان کے شیعہ ہونے پر دلالت کرتی ہے اور انہوں نے علی ابن الحسین سے یہ نص نقل کی ہے کہ ائمہ بارہ ہوں گے اور مہدی ان کے صاحبزادہ محمد بن علی کی ساتویں پشت میں ہوں گے۔ اس شخص کے بارے میں غور و فکر کرنے کے بعد اور ان کی مدح کرنے والوں اور قدح کرنے والوں کی باتوں پر مکمل انتہائی تامل کے بعد جو کچھ میرے نزدیک راجح ہے نیز ان دلائل میں عمیق تامل کر کے کہ مدح اور قدح کے اسباب کیا ہیں اور ان کے درمیان میں جمع کرنے کی کیا صورت ہے جن پر صاحب تعلیقات کو واقفیت حاصل نہیں ہو سکی، نہ شیخ بو علی کو (گو کہ ان کے سامنے تمام علوم وفنون سپر افگندہ ہیں اور لوگ ان فنون کے ادراک سے قطعاً قاصر ہیں جو ان کے ہاں محفوظ ہیں) ان تمام امور پر غور فکر کر لینے کے بعد میر اجائزہ یہ ہے کہ وہ ابتدأ عہد میں کبھی جیسا کہ تاریخ ابن خلکان کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے منجملہ علمائے اہل سنت اور گروہ شیطانی کے ہم نشینوں میں سے رہے ہیں لیکن پھر ان کے علم و شعور نے ان کی حق مبین کی طرف دستگیری اور رہنمائی کی چنانچہ ان کے علم و شعور نے ان کو آخری عمر میں امام زین العابدین کی طرف لوٹ آنے والوں میں سے بنا دیا اور انہیں امام زین العابدین کے انفاس قدسیہ کی برکت سے فائدہ حاصل کرنے والوں کے زمرہ میں داخل کر دیا اور ان کے عجیب وغریب کلمات سے سند لینے والوں اور اپنے ہاتھ اور زبان کے ذریعہ سے ان سے محبت کرنے والوں اور ان کی غیبت میں ان کی حفاظت کرنے والوں اور ان کی عظمت شان اور مستقیم برہان کا اقرار کرنے والوں میں سے بنا دیا۔ اور یہی منجملہ ان باتوں کے ہے جو تمہیں اس بات کی طرف رہنمائی کرتی ہیں اور جس کو امام شیخ بو علی نے ان کے شیعہ ہونے کی اور ان کے کمال ایمان کی دلیل بنایا ہے اور غالباً یہی وہ بات ہے جسے صاحب تعلیقات نے بھی دیکھا ہے مگر بارہ اماموں کے وجود کی نص کو روایت کرنے والی بات ان سے بھی اہم ہے جسے صاحب منتہی نے ان کی عبارت سے سمجھا ہے۔ (روضات الجنات فی احوال العلماء والسادات مولفہ امام محمد باقر موسوی خوانساری)

ان تصریحات کے بعد اس امر میں شبہ نہیں رہ جاتا کہ محمد ابن مسلم ابن

شہاب زہری منجملہ شیعہ علماء کے ہیں جن کو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرات شیخین رضی اللہ عنہما سے خدا کے واسطے کا بیر اور للہی بغض ہے۔ ان کا کام ہی یہ ہے کہ وہ ایسی باتوں کو پھیلائیں جن سے ان حضرات کی سبکی ہوتی ہو قرآن کریم پر لوگوں کے دلوں میں شبہات پیدا ہوں۔

اس کے بعد ہم اس روایت کا باقاعدہ تجزیہ کر کے بتاتے ہیں کہ درایت کے نقطہ نظر سے اس میں کس قدر خامیاں ہیں۔

1- سب سے پہلے تو اس پر غور فرمایئے کہ ابن شہاب زہری نے یہ حدیث چار تابعین سے روایت کی ہے یعنی عروہ ابن زبیرؒ، سعید ابن المسیبؒ، علقمہؒ ابن وقاصؒ اور عبید اللہ، ابن عبد اللہ ابن عتبہ ابن مسعودؒ، لیکن پوری روایت کسی ایک راوی کی نہیں ہے بلکہ روایت کا کچھ حصہ ایک راوی نے بیان کیا اور کچھ حصہ دوسرے نے، کچھ تیسرے نے اور کچھ چوتھے نے اور ابن شہاب زہری نے ان سب کی روایتوں کو جوڑ کر ایک مربوط کہانی مرتب کر لی ہے۔ اس میں یہ فائدہ ہے کہ حدیث کا کوئی خاص ٹکڑا چونکہ کسی ایک راوی کی طرف منسوب نہیں ہے لہٰذہ اگر کوئی انکار کرنے لگے تو آسانی کے ساتھ اس کا منہ بند کیا جاسکتا ہے کہ میں نے کب کہا ہے کہ یہ بات آپ نے بیان کی تھی؟ آپ نے بیان نہیں کی تو دوسرے لوگوں میں سے کسی نے بیان کی ہو گی۔ علی ہذا القیاس کوئی دوسرا راوی اگر انکار کرنے لگے تو اسکا منہ اسی طرح بند کیا جاسکتا ہے۔[1] راوی کو متعین طور پر بتانا چاہیے کہ اس کے کون کون سے استاد نے کون سی بات بیان کی ہے تاکہ اس کی تحقیق اور پھر اس کی تصدیق یا تکذیب کی جاسکے، ایسی مجہول روایت کا کیسے اعتبار کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے (فتح الباری ج ۱۰ ص ۴۹) میں فرمایا ہے کہ قاضی عیاضؒ نے فرمایا ہے کہ محدثین نے زہری کے اس طرز عمل پر سخت تنقید کی ہے جو انہوں نے اپنی اس روایت کے سلسلہ میں اختیار کیا ہے کہ چار راویوں کی روایات کو خلط ملط کر کے ایک روایت بنا ڈالی ہے۔ انہیں چاہیے تھا کہ ہر راوی کی روایت الگ الگ بیان کرتے، انتہی حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ میں نے روایات کو تلاش کیا تو مجھے عروہ اور علقمہ کی روایتیں الگ الگ مل گئیں لیکن دونوں روایتوں کے سیاق میں زہری کے اس سیاق سے جو انہوں نے چاروں راویوں سے نقل کیا ہے بڑی مخالفتیں نقص اور زیادتیاں پائی جاتی ہیں۔ مزید برآں انہوں نے یہ بھی نقل فرمایا ہے کہ راوی نے یہاں تو روایت یوں شروع کی ہے کہ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے یوں فرمایا لیکن فلیحؒ راوی نے اپنی روایت یوں شروع کی ہے کہ زعموا ان عائشۃ قالت یعنی ان چاروں راویوں کا یہ خیال ہے کہ حضرت عائشہ نے یوں فرمایا ہو گا۔ یعنی انہیں اس بات کا یقین نہیں کہ حضرت عائشہؓ نے یوں فرمایا۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ "زعم کا لفظ عربی زبان میں قال کی جگہ بھی استعمال ہو جاتا ہے یعنی کہنے والے کو تردد نہ ہو۔ لیکن یہاں اس لفظ کو استعمال کرنے میں غالباً راز یہ ہے کہ زہری کے تمام استادوں نے ان کے سامنے اس بات کی صراحت نہیں فرمائی کہ انہوں نے یہ روایت حضرت عائشہ ہی سے سنی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حافظ کرمانیؒ نے اسی طرف اشارہ فرمایا ہے، (فتح الباری ج ۱۰ ص ۱۷) ان تمام باتوں سے اس روایت کی قدر و قیمت متعین کرنے میں جو اہم مدد مل سکتی ہے وہ ظاہر ہے۔

(۲) دوسری بات اس روایت میں یہ بیان کی گئی ہے کہ کیونکہ پردہ کا حکم نازل ہو چکا تھا۔ لہٰذہ کچھ آدمی انہیں (حضرت عائشہؓ) کو ہودج میں بٹھا کر سواری پر چڑھاتے اتارتے تھے۔ ہودج اونٹ کا تھا یا تھی کا تو تھا نہیں اونٹ کا ہودج (کجاوہ) جن لوگوں نے دیکھا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ اس کے دو حصے ہوتے ہیں جو اونٹ کے کوہان کے دونوں طرف ہوتے ہیں۔ جب تک ان دونوں حصوں کا وزن برابر نہ ہو یعنی دونوں طرف دو آدمی برابر وزن کے سوار نہ ہوں اسے اونٹ پر نہ کسا جاسکتا ہے نہ چڑھایا جاسکتا ہے۔ اگر ہودج میں ایک طرف تو کوئی سوار موجود ہو اور دوسری طرف کوئی سوار نہ ہو تو اسے اونٹ پر چڑھایا ہی نہیں جاسکتا، دوسری طرف بھی کوئی سواری ہونی چاہیے یا کوئی وزنی چیز رکھنی چاہیے ورنہ ہودج گر پڑے گا۔ یہی وجہ ہے کہ مع سواری کے ہودج کو اونٹ پر نہیں چڑھایا جاسکتا پہلے ہودج باندھا جاتا ہے اس کے بعد سواری کو ہودج میں بٹھایا جاتا ہے لیکن یہاں معمول کے خلاف مع سواری کے ہودج چڑھایا جارہا ہے اور سواری کو متنبہ بھی نہیں کیا جاتا کہ وہ ہودج کا وزنی توازن درست کر لے۔ جس طرف آدمی سوار ہے وہ یا تو دوسری طرف کسی آدمی کو بٹھائے گا یا اُدھر کوئی وزنی چیز رکھے گا۔ اگر یہ کہا جائے کہ ہودج میں دوسری طرف کوئی وزنی چیز ہودج کا توازن قائم رکھنے کے لیے پہلے سے رکھی ہوئی تھی تو پھر بھی چونکہ ہودج میں حضرت عائشہؓ موجود ہی نہیں تو لامحالہ ان کی جہت خالی ہے ہودج کو فوراً گر جانا چاہیے تھا لیکن ہودج گرتا بھی نہیں ہے، چنانچہ

[1] یہاں مجھے امام ابو زرعہؒ محدث اور امام احمد ابن حنبلؒ کا ایک واقعہ یاد آگیا ہے کہ وہ جامع مسجد کوفہ کے دروازہ پر پہنچے تو ایک صاحب وہاں وعظ فرما رہے تھے اور ان دونوں حضرات ہی کے حوالہ سے روایات بیان کر رہے تھے، اپنا نام سن کر ان دونوں حضرات کے کان کھڑے ہوئے، دونوں ٹھٹک کر کھڑے ہوگئے روایات قطعاً من گھڑت تھیں وعظ ختم ہوا تو امام ابو زرعہ آگے بڑھے اور ان واعظ صاحب سے عرض کیا کہ میں ابو زرعہ ہوں اور یہ احمد ابن حنبل ہیں ذرا بتایئے کہ یہ حدیثیں ہم نے آپ سے کب بیان کی تھیں؟ ہم نے تو یہ حدیثیں آپ سے کبھی بیان نہیں کیں۔ بجائے شرمندہ ہونے کے وہ صاحب نہایت دیدہ دلیری سے بولے کہ اے لیجئے ابو زرعہ اور احمد ابن حنبل آپ ہی رہ گئے ہیں۔ میاں ستر ابو زرعہ ہیں اور ستر ہی احمد ابن حنبل ہیں جن سے میں روایت کرتا ہوں اس نام کے آدمی دنیا میں صرف آپ ہی تو نہیں۔

پوری ایک منزل کے سفر میں کسی کو بھی یہ احساس نہیں ہو سکا کہ ہودج خالی ہے اور حضرت عائشہؓ موجود نہیں ہیں لہٰذہ ان کو تلاش کیا جائے۔

(۳) بخاری ہی میں ابن ابی ملیکہ عن القاسم عن عائشہؓ کی سند سے کتاب النکاح (باب القرعة بين النساء اذا اراد سفرا) میں ایک روایت آئی ہے کہ ایک سفر میں حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ آنحضرت ﷺ کے ساتھ سفر میں تھیں اور آنحضرت ﷺ حضرت عائشہؓ کے اونٹ کے ساتھ رات بھر چلتے تھے اور حضرت عائشہ سے باتیں کرتے رہتے تھے۔ حضرت حفصہؓ نے حضرت عائشہ کو یہ تجویز پیش کی کہ لاؤ آج رات کو ہم دونوں اونٹ بدل لیں، دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ حضرت عائشہؓ چکمہ میں آ گئیں اور آنحضرت ﷺ رات بھر اسی اونٹ کے ساتھ ساتھ چلتے رہے جس پر بجائے حضرت عائشہؓ کے حضرت حفصہؓ سوار تھیں اور ساری رات بھر کے سفر میں حضرت عائشہؓ آنحضرت ﷺ کی بات چیت سے محروم رہیں اور منزل پر پہنچ کر حضرت عائشہؓ نے اذخر میں اپنے پاؤں خوب ملے اور رگڑے اور خود کو کوسنے دیئے۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ سفر میں حضرت عائشہؓ کو تنہا نہیں چھوڑتے تھے ان کے اونٹ کے ساتھ ساتھ رہتے اور باتیں کرتے ہوئے چلتے تھے۔ یہی آپ کی عادت تھی مگر اس سفر میں آنحضرت ﷺ کو رات بھر سفر میں حضرت عائشہؓ کی گم شدگی کی کوئی خبر نہیں ہوئی بلکہ منزل پر پہنچ کر بھی دوپہر ہو گیا، اور آپ کو کوئی اطلاع نہیں ہوئی، تا آنکہ وہ حضرت صفوان کے ساتھ قافلہ میں پہنچ گئیں۔ اب آنحضرت ﷺ اور دوسرے لوگوں کو آپ کی گم شدگی اور حضرت صفوان ابن معطل کے ساتھ قافلہ میں آمد کی اطلاع ہوئی اور لوگوں کو باتیں بنانے کا موقعہ ملا۔ تعجب ہے کہ خلاف عادت آنحضرت ﷺ حضرت عائشہؓ سے اس درجہ غافل رہے، یہ بات بھی محل تامل ہے۔

(۴) ابن شہاب زہری کی اسی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ اور دیگر ازواج مطہرات قضائے حاجت کے لیے رات کو جنگل تو جایا کرتی تھیں مگر تنہا نہیں جاتی تھیں۔ چنانچہ مدینہ منورہ میں قضائے حاجت کے لیے آپ کے جنگل جانے کا تذکرہ کیا گیا ہے تو حضرت ام مسطحؓ آپ کے ساتھ ہیں۔ عجیب بات ہے کہ مدینہ منورہ میں تو آپ قضائے حاجت کے لیے جنگل جاتی ہیں تو کسی نہ کسی عورت کے ساتھ جاتی ہیں لیکن سفر میں جہاں کے جنگل سے آپ واقف بھی نہیں قضائے حاجت کے لیے جاتی ہیں تو تن تنہا جاتی ہیں اور ایسے چپ چپاتے چلی جاتی ہیں کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی نہ رسول اللہ ﷺ کو اس کی اطلاع ہوتی ہے اور نہ پورے لشکر اسلام میں کوئی آپ کو جاتے ہوئے دیکھتا ہے حالانکہ آنحضرت ﷺ اور حضرت عائشہؓ کا قیام منزل پر اگر ہو گا تو وہ کسی درمیانی جگہ پر ہو گا۔ عام قاعدہ یہی ہے کہ لشکر کے کمانڈر کا قیام لشکر کے قلب میں ہوا کرتا ہے اور آنحضرت ﷺ کا قیام تو ویسے بھی لشکر کے درمیان ہی میں ہونا چاہیے کیونکہ صحابہ آپ کو اور آپ کی حرم محترم کو سفر میں کسی یکسو مقام پر تو چھوڑنے سے رہے جبکہ آپ کی حفاظت وصیانت کا فریضہ بھی ان پر عائد ہوتا تھا۔ یہ بات بھی محل تامل ہے۔

(۵) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی کم سنی اور کم وزنی کا چرچا زور شور سے کیا گیا ہے۔ ہم دلائل سے بتا چکے ہیں کہ ان کی کم سنی کا افسانہ بالکل غلط ہے ان کا نکاح کم از کم سولہ سال کی عمر میں اور رخصتی کم از کم انیس سال کی عمر میں ہوئی ہے اور غزوہ بنی مصطلق میں جو ۵ھ میں ہوا ہے ان کی عمر والی عورت کم از کم بائیس سال تو ضرور ہے۔ بائیس سال کی عمر والی عورت کو کم سن اور کم وزن قرار دینا کہ ہودج اٹھا کر اونٹ پر کسنے والوں کو پتہ ہی نہ چلے کہ کوئی اس ہودج میں سوار ہے یا نہیں عجیب بات ہے۔ بائیس سال کی ایک عورت وہ کتنی ہی دبلی پتلی اور لاغر کیوں نہ ہو اتنی بے وزن تو لا محالہ نہیں ہو سکتی کہ ہودج اٹھانے والوں کو اندازہ ہی نہ ہو سکے کہ کوئی ہودج میں سوار ہے یا نہیں۔

(۶) ہار کا ٹوٹ کر اس طرح گر جانا اور حضرت عائشہؓ کو لشکر اسلام کے قریب پہنچنے تک اس کا علم نہ ہونا بھی محل تامل ہے۔ جبکہ ہار یمنی منکوں کا تھا اور ایک مرتبہ اور بھی (واقعہ تیمم میں) ٹوٹ کر گر چکا تھا، یہ ہار بار بار کیوں ٹوٹتا تھا؟ کیا اس کو ہمیشہ کچے دھاگے میں پرویا جاتا تھا؟ یمنی منکوں کے ہار میں کچھ وزن تو ضرور ہونا چاہیے۔ اس ہار کا ٹوٹ کر گر جانا اور پہننے والی عورت کو معلوم نہ ہونا بھی حیرتناک ہے۔ پھر حضرت عائشہؓ (بقول راوی کے) قضائے حاجت کے لیے دور جاتی ہیں واپس آتی ہیں اور لشکر اسلام میں اپنی سواری کے قریب پہنچتی ہیں اور سینہ پر ہاتھ پھیرتی ہیں تو ان کو علم ہوتا ہے کہ ہار نہیں۔ چنانچہ وہ ہار تلاش کرنے کے لیے دوبارہ جاتی ہیں مگر بار بار آنے اور جانے کے باوجود لشکریوں میں سے کسی نے بھی ان کو نہ دیکھنا اور بھی باعث تعجب ہے۔ لشکر اسلام کے درمیان سے ان کا ایک مرتبہ قضائے حاجت کے لیے جانا پھر واپس آنا اور اپنی سواری تک پہنچنا اور ہار کی غیر موجودگی کا علم ہو کر پھر دوبارہ واپس جانا۔ یہ ان کے تین چکر ہو گئے۔ تعجب ہے کہ وہ کسی کو نظر نہ آئیں۔ کیا انہوں نے داستان امیر حمزہ کی کلاہ سلیمانی اوڑھ رکھی تھی کہ وہ سب دیکھتی رہیں اور خود کسی کو نظر نہیں آئیں، کتنی خلاف عقل بات ہے۔

(۷) روایت میں بتایا گیا ہے کہ: ”وہ ہار اسلامی لشکر کے روانہ ہونے کے بعد حضرت عائشہ کو ملا۔ ہار کو لے کر وہ اپنی منزل پر آئیں تو دیکھا وہاں کوئی بھی نہیں۔ وہ اپنی جگہ پر اس خیال سے بیٹھ گئیں کہ جب مسلمانوں کو ان کے گم ہونے کا علم ہو گا تو انہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے اسی جگہ آئیں گے۔ کچھ دیر بعد انہیں

نیند آگئی اور وہ سو گئیں۔ یہ ساری بات انسانی فطرت کے بالکل خلاف ہے ایک نوجوان عورت (بلکہ بقول راوی ایک کمسن لڑکی) جنگل بیابان میں، جہاں دور تک کوئی آبادی نہیں۔ (عرب کے ریگستانوں کا منظر ذہن میں رکھیئے) آ دم ہے نہ آدم زاد۔ عورت تنہا ہے۔ وہ اپنے کارواں سے بچھڑ گئی ہے۔ رات کا وقت ہے۔ ہر طرف سناٹا ہے۔ ہو کا عالم ہے۔ وہ وہاں اطمینان سے بیٹھ جاتی ہے کہ مسلمانوں کو میری گم شدگی کا علم ہو گا تو خود ہی ڈھونڈنے آئیں گے اور وہ مزے سے سو جاتی ہے۔ واضح رہے کہ یہ 5ھ کا واقعہ ہے جب کہ ہر طرف مشرکین عرب کا غلبہ تھا جو اپنی وحشت و بربریت میں ضرب المثل تھے۔ ان حالات میں تو اچھے سے اچھا سورما بھی اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے گا، چہ جائے کہ ایک کمسن اور نوعمر لڑکی کس قدر خلافِ فطرت بات ہے کہ ایک کم سن اور نوعمر لڑکی کو کوئی وحشت لاحق ہوتی ہے نہ گھبراہٹ بلکہ وہ اطمینان کے ساتھ بیٹھ جاتی اور پرسکون حالت میں اس کی آنکھ بھی لگ جاتی ہے۔ ہمارا تو خیال ہے کہ ان حالات میں خود امام زہری ہوتے تو ان کا زہرہ بھی آب ہو جاتا۔ کہاں نیند اور کہاں کا سکون واطمینان۔ یہ خلاف فطرت گھڑا ہوا افسانہ نہیں تو اور کیا ہے۔

(۸) جن لوگوں نے ایک لشکر کے ساتھ اونٹوں پر کبھی سفر کیا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ لشکر کی روانگی کے وقت انتہائی شور وشغب ہوتا ہے۔ خصوصاً جبکہ اونٹوں کے ذریعہ سفر کیا جارہا ہو تو صرف اونٹوں کے بلبلانے کی آواز ہی اتنی شدید ہوتی ہے کہ میلوں تک سنی جاسکتی ہے۔ حیرت ہے کہ حضرت عائشہؓ کو لشکر کی روانگی کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ ان کو لشکر کی روانگی کا علم اس وقت ہوا جب وہ پڑاؤ پر پہنچیں۔ چنانچہ راوی کہتا ہے کہ "ہار کو لے کر وہ اپنی منزل پر پہنچیں تو وہاں کوئی بھی نہیں تھا" حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ لشکر کی روانگی کا علم تو انہیں لشکر اور اونٹوں کے شور و غوغا سے ہو جانا چاہیے تھا۔ اور انسانی فطرت یہ ہے کہ روانگی کے شور و غوغا کو سننے کے ساتھ ساتھ انہیں واپسی میں انتہائی سرعت کرنی چاہیے تھی۔ بھاگنا دوڑنا چاہیے تھا۔ لشکر کو چیخ کر بلند آواز سے روانگی سے روکنا چاہیے تھا۔ مگر حضرت عائشہ جو راوی کے بیان کے مطابق نہایت کم سن اور کم عمر لڑکی تھیں انہوں نے فطرت انسانی کے خلاف نہ شور کیا، نہ کسی کو آواز دی، نہ وہ بھاگیں، نہ دوڑیں، نہ کسی قسم کی گھبراہٹ اور توحش کا اظہار فرمایا۔ وہ نہایت اطمینان کے ساتھ صُمٌّ بُکْمٌ بنی ہوئی ہار کے دانے ہی ڈھونڈتی رہیں اور جب تک ایک ایک دانہ تلاش نہیں کر لیا وہ دنیا ومافیہا سے بالکل بے خبر رہیں۔ اسلامی لشکر منزل سے روانہ بھی ہو گیا اور انہیں کانوں کان خبر بھی نہیں ہوئی۔ رات کی تاریکی میں ان دانوں کو تلاش کرنا بجائے خود ایک حیرت ناک بات ہے۔ نہ کوئی روشنی ساتھ ہے، نہ لالٹین ہے، نہ ٹارچ ہے، رات کو اندھیرے میں وہ دانے کیسے ملے۔

(۹) حضرت صفوان ابن معطل سلمیؓ جو بعد میں ذکوانی مشہور ہو گئے اسلامی لشکر کے پیچھے رہا کرتے تھے۔ وہ صبح کے وقت حضرت عائشہؓ کے قریب پہنچے۔ عجیب بات ہے صفوان بن معطل سلمیؓ اسلامی لشکر ہی کا ایک جزو تھے۔ وہ اسلامی لشکر کے پیچھے رہا کرتے تھے تاکہ لشکر کی گری پڑی چیزیں اٹھا لیں لیکن کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ ایک منزل پیچھے رہا کرتے تھے۔ کیونکہ اسلامی لشکر شروع رات میں روانہ ہو چکا ہے اور صفوان ابن معطل اس منزل پر صبح سویرے پہنچے ہیں، بہرحال یہ بات غور طلب ہے کہ وہ اتنا پیچھے کیوں رہتے تھے۔ اگلی منزل پر وہ حضرت عائشہؓ کو لے کر اسلامی لشکر کے پڑاؤ پر پہنچ گئے ہیں اور اسلامی لشکر ہی کے ساتھ انہوں نے بھی قیام کیا ہے تو اس سے پچھلی منزل میں وہ لشکر سے اس قدر دور کیوں رہ گئے تھے۔ پیچھے رہنے کا مطلب تو یہ ہونا چاہیے کہ صفوان بھی لشکر کے ساتھ قیام کریں لیکن اس کے ساتھ روانہ نہ ہوں۔ بلکہ ایک دو گھنٹے کے بعد روانہ ہوں تاکہ لشکر کی گری پڑی چیز اٹھاتے لائیں۔ واضح رہے کہ عرب میں جو ایک ریگستانی ملک ہے سفر عام طور پر رات کو کیا جاتا ہے اور صبح ہونے پر لشکر پڑاؤ کر لیتا ہے۔ ایک منزل بارہ کوس یعنی اٹھارہ میل کی ہوتی ہے۔ ایک ایسے علاقہ میں جہاں قدم قدم پر خطرات ہوں اور ہر طرف دشمن ہی دشمن ہوں، ایک تنہا آدمی کو لشکر سے اتنی دور یعنی اٹھارہ میل کے فاصلہ پر تو نہیں چھوڑا جاسکتا۔ یہ بات خلافِ عقل اور خلافِ مصلحت ہے کیونکہ وہ بھی تو اسلامی لشکر کا ہی ایک فرد ہے۔

(۱۰) بتایا گیا ہے کہ کیونکہ انہوں نے پردہ کے حکم سے پہلے حضرت عائشہؓ کو دیکھا تھا لہٰذا وہ دیکھتے ہی حضرت عائشہ کو پہچان گئے اور کہا کہ: "اِنَّا للہ وانّا الیہ راجعون۔" ان کلمات کی آواز سے حضرت عائشہؓ جاگ گئیں اور فوراً اپنی چادر سے اپنا منہ چھپا لیا۔ ان دونوں نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کی اور نہ حضرت عائشہ نے سوائے استرجاع (انّا للہ وانّا الیہ راجعون) کے ان کی زبان سے کوئی اور بات سنی"۔ یہ بھی انسانی فطرت کے بالکل خلاف ہے صفوانؓ ابن معطل کو علم غیب تو تھا نہیں۔ انہیں اس بات پر حیرت ہوئی کہ حضرت عائشہؓ لشکر سے بچھڑ گئی ہیں اور تن تنہا یہاں ریگستان میں پڑی ہیں، اور وہ اس پر اِنّا للہ وانّا الیہ راجعون بھی پڑھتے ہیں۔ مگر وہ اپنی ماں (ام المومنین) سے یہ تک نہیں پوچھتے کہ یہ حادثہ کیوں اور کیسے پیش آیا وہ کس وجہ سے پیچھے رہ گئیں۔ وغیرہ ذالك"۔ یہ تو انسانی فطرت ہے کہ جب کوئی عجیب بات اس کے سامنے آتی ہے تو وہ اس کی وجہ ضرور معلوم کرنا چاہتا ہے اس کے لیے اسے قصد وارادہ بھی نہیں کرنا پڑتا یہ باتیں بلا ارادہ اس سے صادر ہوتی ہیں جیسا کہ بلا ارادہ ان کی زبان سے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ

نکل گیا تھا دوسری باتیں بھی (از قسم استفسارات) بلا ارادہ ان کی زبان سے نکلنی چاہیے تھی۔

(۱۱) بتایا گیا ہے کہ: "اسلامی لشکر میں عبد اللہ ابن ابیؓ اور منافقین کا ایک گروہ شامل تھا۔ ان لوگوں کو موقع ملا انہوں نے حضرت عائشہؓ پر تہمت لگائی۔ اس تہمت کا اصل بانی منافقین کا سرغنہ عبد اللہ ابن ابی منافق تھا۔ سوال یہ ہے کہ منافق کسے کہتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ منافق ان لوگوں کو کہتے ہیں جو زبان سے اسلام لانے کا دعویٰ کرتے ہیں خود کو مسلمان کہتے ہیں اور تمام اعمال مسلمانوں جیسے کرتے ہیں البتہ ان کے دل میں اسلام و ایمان نہیں ہوتا۔ وہ دوسری طرف کفار سے بھی ملے رہتے ہیں لیکن ان پر مسلمانوں کے تمام احکام جاری ہوتے ہیں وہ غزوات میں شریک ہوتے ہیں اور انہیں مال غنیمت میں سے حصے بھی دیئے جاتے ہیں وہ کسی حکم سے مستثنیٰ نہیں ہوتے۔ آنحضرت ﷺ کو بھی اس کا اچھی طرح علم تھا کہ اس فتنہ کا سرغنہ عبد اللہ ابن ابی ہے۔ چنانچہ ایک ماہ تک اذیت سہتے سہتے بالآخر آپ مسجد نبوی میں خطبہ دیتے ہیں اور گروہ انصار و مہاجرین سے اس کے خلاف مدد بھی طلب فرماتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا: "کون ہے جو اس شخص کے مقابلہ میں میری مدد کر سکے جس نے میری بیوی کے معاملہ میں مجھے سخت صدمہ پہنچایا ہے لیکن جب حضرت عائشہؓ کی برأت نازل ہو جاتی ہے اور ان بہتان طرازی کرنے والوں کا کذب ثابت ہو جاتا ہے تو حد قذف صرف ان تین آدمیوں پر نافذ کی جاتی ہے (حسان ابن ثابتؓ، مسطح بن اثاثہؓ، اور حمنہ بنت جحشؓ) جو غریب محض ان منافقین کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔ سوال یہ ہے کہ عبد اللہ ابن ابی اور دوسرے منافقین کو کیوں معاف کر دیا گیا۔ کیا وہ اس قدر صاحب قوت تھے کہ حضور اکرم ﷺ ان پر حد جاری کرنے سے ڈر گئے؟ یا آپ نے کسی مصلحت اندیشی کی بناء پر درگزر کرنا مناسب سمجھا؟ حدود اللہ کے جاری کرنے میں یقیناً آنحضرت ﷺ کسی مصلحت کا شکار ہرگز نہیں ہو سکتے تھے۔ فتح مکہ کے موقعہ پر جب ایک قریشی عورت چوری کے جرم میں پکڑی گئی اور پورے قریش میں اس حکم پر کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے ایک سنسنی سی پھیل گئی کیونکہ یہ ان کی ناک کا مسئلہ تھا۔ اور حضرت اسامہؓ کو سفارشی بنا کر بھیجا گیا تو آپ نے حضرت اسامہؓ کو ڈانٹ پلائی تھی کہ: اتشفع فی حدود اللہ "کیا اللہ کی حدود کے معاملے میں تم سفارش کرتے ہو؟" اور فرمایا تھا کہ اگر فاطمہ بنت محمد ﷺ سے بھی (معاذ اللہ) یہ جرم سرزد ہوا ہوتا تو میں اسکا ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔ تو آپ کے متعلق یہ تصور تو نہیں کیا جا سکتا کہ آپ مصلحت اندیشی کا شکار ہو گئے تھے نہ ہی یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ آپ خدانخواستہ ڈرتے تھے کہ اس پر حد جاری کر دی گئی تو کوئی قیامت برپاء ہو جائے گی۔ جو شخص تن تنہا پورے عربستان کے مقابلہ میں کسی طرح کے خوف و اندیشہ کا شکار نہیں ہوا اور اپنی بات بانگ دہل دہرا اتار رہا اس کے متعلق یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ خدانخواستہ سعد ابن عبادہؓ کی تقریر سے ڈر گئے تھے۔ پھر ابن ابی منافق کا کوئی عذر بھی پیش نہیں کیا جاتا جس کی بنا پر اسے معاف کر دیا گیا ہو۔

(۱۲) بتایا گیا ہے کہ: "مدینہ منورہ پہنچتے ہی حضرت عائشہ صدیقہؓ بیمار ہو گئیں۔ بیماری نے طول کھینچا یہاں تک کہ ایک مہینہ گزر گیا۔ بیمار کیوں ہو گئیں، اور بیماری بھی ایسی کہ ایک مہینہ گزر گیا اور بیماری نے اتنا طول کھینچا۔ اس کی وجہ بیان نہیں کی گئی؟ بیماری کیا تھی یہ بھی نہیں بتایا گیا۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کو اس تہمت کی ایک مہینہ تک کوئی اطلاع بھی نہیں ملی تھی کہ اسے ہی بیماری کا سبب قرار دیا جاسکے بہرحال یہ بات بھی شبہ میں ڈالنے والی ہے۔

(۱۳) اس کے بعد بتایا گیا ہے کہ یہ بات پھیلتے پھیلتے ایک انصاری کو پہنچی اس نے سنتے ہی فوراً کہا: "اے اللہ تو پاک ہے ہمارے لیے یہ زیبا نہیں کہ ہم ایسی بات منہ سے نکالیں۔ اے اللہ! تو پاک ہے یقیناً یہ بہتان عظیم ہے۔" یہ وہی الفاظ ہیں جو خود قرآن کریم میں آئے ہیں کہ مسلمانوں کو سنتے ہی یوں کہنا چاہیے تھا۔ یہ انصاری معلوم نہیں کون تھا لیکن نہایت کامل الایمان شخص تھا جس کا عمل بالکل منشائے الٰہی اور رضائے خداوندی کے مطابق رہا۔ اس نے وہی کچھ کہا جو حق تعالیٰ چاہتے تھے کہ ایک مسلمان یہ کچھ کہے اور ماشا اللہ یہ انصاری خود آنحضرت ﷺ اور حضرت علی کرم اللہ وجہ پر بھی سبقت لے گیا کہ نہ تو رسول اللہ ﷺ نے یہ کچھ کہا بلکہ وہ حضرت زینبؓ، حضرت علیؓ حضرت اسامہؓ اور حضرت بریرہؓ سے مشورے اور تحقیقات ہی کرتے رہے۔ اور حضرت علیؓ دبے لفظوں میں تہمت کی تائید ہی کرتے رہے اور لگے حضرت بریرہؓ کو مارنے پیٹنے کہ وہ کچھ تو خلاف کہہ دے۔ اِنّا للہ وانّا الیہ راجعون راوی نے یہ کہہ کر آنحضرت ﷺ، حضرت علیؓ، حضرت اسامہؓ، حضرت بریرہؓ، سب پر اچھا خاصا وار کر دیا ہے۔ خصوصاً آنحضرت ﷺ اور حضرت علیؓ کا مسلمانوں میں جو تقدس و احترام ہے وہ تو بالکل ہی پارہ پارہ کر دیا ہے۔

(۱۴) آگے ارشاد ہوا ہے: "لوگوں میں اس تہمت کا چرچا ہونے لگا۔ وہ اس میں غور و فکر کرتے تھے لیکن حضرت عائشہ صدیقہؓ کو اب تک اس تہمت کا علم نہ تھا۔" یہ کتنی خلافِ عقل بات ہے، ازواج مطہرات کے حجرہ بھی مسجد نبوی سے متصل بنے ہوئے تھے۔ حضرت صدیق اکبرؓ کا حجرہ بھی مسجد کے ساتھ ہی تھا چنانچہ آخری زمانہ میں آپ ﷺ نے تمام صحابہ کے در وازے جو مسجد کی طرف کھلتے تھے سوائے ابو بکرؓ کے دروازے کے بند کرا دیئے تھے لہٰذہ ثابت ہے کہ مسجد کے ساتھ ہی حضرت ابو بکر صدیقؓ کا مکان بھی تھا۔ ایک مہینہ تک مدینہ منورہ میں خاصا کہرام مچا رہا۔ مسجد نبوی میں

آپ نے خطبہ دیا وہاں اُوس اور خزرج کے سرداروں سعد ابن معاذؓ اور اسعد ابن عبادہؓ کے درمیان تو تو میں میں ہوتی ہے، ہر قبیلہ اپنے سردار کے ساتھ آواز بلند کرتا ہے اتنا شور ہوتا ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ ازواج مطہرات کے حجروں میں مسلمان عورتیں مسائل پوچھنے کے لیے آتی رہتی تھیں لیکن اس پورے مہینہ میں کوئی انصاری یا مہاجر خاتون کو بھی کوئی مسئلہ پیش نہیں آیا اور کوئی عورت نہیں آئی، انصاری عورت آئی بھی تو آخری مرحلے میں آئی جب آیات برأت نازل ہونے کو تھیں۔ اس سے پہلے پورے ایک مہینہ تک سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ نہ حضرت عائشہؓ کو مہینہ بھر تک خبر ہوئی نہ ان کے والدین کو خبر ہوئی نہ ان سے ہمدردی رکھنے والی کسی مسلمان خاتون کو خبر ہوئی کہ وہ آکر حضرت عائشہؓ کو بتا دیتی۔ یہ ساری باتیں خلافِ عقل ہیں جو کسی طرح سمجھ میں نہیں آتیں۔ علاوہ ازیں ازواج مطہرات کے حجرے تو مسجد نبوی کے ساتھ ہی تھے اور تمام ازواجِ مطہرات ایک دوسرے سے ملتی رہتی تھیں۔ سب کے حجرے پاس پاس تھے حضرت عائشہ صدیقہؓ رضی اللہ عنہا پورے ایک ماہ بیمار رہیں، اس پورے ایک مہینہ میں کوئی زوجہ مطہرہ ان کی عیادت کے لیے بھی نہیں آئی کہ کوئی تو کچھ بتا دیتی۔

(۱۵) کہا گیا ہے کہ حضرت عائشہ اپنی بیماری میں رسول اللہ ﷺ کا وہ لطف و کرم نہیں دیکھتی تھیں جو اس سے پہلے اپنی بیماری میں دیکھا کرتی تھیں۔ انہیں اس بات سے شک ہوتا تھا کہ (غالباً رسول اللہ ﷺ کچھ خفا ہیں) رسول اللہ ﷺ ان کے پاس تشریف لاتے سلام کرتے اور پوچھتے: "تم کیسی ہو" پھر واپس چلے جاتے کم سنی کی وجہ سے حضرت عائشہ صدیقہؓ کو بھلے برے کا زیادہ شعور نہیں تھا۔ (وہ نہ سمجھ سکیں کہ آخر کیا بات ہے؟) یہ انسانی فطرت کے بالکل ہی خلاف بات ہے، جس قدر محبت اور تعلق زیادہ ہوتا ہے اسی قدر ذرا سی بے رخی نا قابل برداشت ہو جاتی ہے۔ حضور اکرم ﷺ کو حضرت عائشہ سے انتہائی محبت تھی ایسی ہی محبت حضرت عائشہ کو بھی آنحضرت ﷺ کے ساتھ تھی۔ جس کا مظاہرہ ایک دوسری حدیث میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ سفر میں ایک مرتبہ حضرت حفصہؓ نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ لاؤ آج رات کو ہم دونوں اپنا اپنا اونٹ بدل لیں دیکھیں کیا ہوتا ہے چنانچہ حضرت حفصہؓ حضرت عائشہؓ کے اونٹ پر اور حضرت عائشہؓ حضرت حفصہؓ کے اونٹ پر سوار ہو گئیں، آنحضرت ﷺ اسی اونٹ کے ساتھ ساتھ چلتے رہے جو حضرت عائشہ کا تھا لیکن اس پر حضرت حفصہؓ سوار تھیں اور اس طرح حضرت عائشہؓ اور آنحضرت ﷺ کی معیت اور آپ کی باتوں سے رات بھر محروم رہیں تو منزل پر پہنچنے کے بعد اذخر گھاس میں انہوں نے خوب خوب پاؤں رگڑے اور اپنے آپ کو کوسنے دیئے کہ "پرودگار! میرے اوپر کسی بچھو یا سانپ کو مسلط کر دے جو مجھے ڈس لے میں آنحضرت ﷺ کو تو کچھ نہیں کہہ سکتی۔ ملاحظہ فرمایئے کہ صرف ایک رات رسول اللہ ﷺ کی معیت اور گفتگو سے محرومی پر تو آپ کو اتنی شدید نا گواری ہوئی مگر یہاں ایک مہینہ تک اس محرومی پر کوئی خاص ملال نہیں ہوا۔ صرف شک ہی ہوا کہ شاید آپ ناراض ہیں۔ انسانی فطرت کا یہ عین تقاضا تھا کہ حضرت عائشہؓ نے آپ کی ذرا سی بے رخی دیکھی تھی تو فوراً آنحضرت ﷺ سے اس کی وجہ معلوم کرتیں۔ پھر کس قدر غیر معقول بات ہے کہ کم سنی کی وجہ سے حضرت عائشہ صدیقہؓ کو بھلے برے کا زیادہ شعور نہیں تھا۔ اول تو یہی غلط ہے کہ وہ کم سن تھیں اور اگر بالفرض کم سن تھیں بھی تو انہیں تو اور زیادہ پوچھنا چاہیے تھا کیونکہ بھلے برے کا شعور نہ ہونے کی بنا پر وہ مصلحت اندیش نہیں ہو سکتی تھیں کہ وہ وجہ دریافت کرنے میں مصلحت نہ سمجھ کر خاموش ہو جاتیں۔ ان میں تو بے چینی اور بے صبری زیادہ ہونی چاہیے تھی۔ کم سن ہونے کے معنے یہ تو نہیں کہ بچہ کسی کی محبت اور شفقت کو بھی نہ سمجھے۔ دوسروں کی محبت اور شفقت کو تو دودھ پیتے بچے تک خوب سمجھتے ہیں لہٰذہ جب انہوں نے آپ کی بے توجہی بے اعتنائی اور بے رخی کو محسوس کر لیا تھا تو ان کے اضطراب اور بے چینی کا تقاضا تو یہی تھا کہ وہ بلا تاخیر فوراً اس کی وجہ معلوم کرنا چاہتیں۔

(۱۶) آگے چل کر فرمایا گیا ہے کہ: "جب حضرت عائشہ صدیقہؓ کو بیماری سے افاقہ ہوا تو وہ ایک رات قضائے حاجت کے لیے نکلیں .... حضرت عائشہ صدیقہؓ کے ساتھ حضرت ام مسطحؓ بھی قضائے حاجت کے لیے نکلیں........ راستہ میں حضرت ام مسطحؓ کا پاؤں چادر میں الجھ کر پھسل گیا وہ کہنے لگیں: "مسطح ہلاک ہو" اردو کی ایک ضرب المثل ہے: "ماروں گھٹنا، پھوٹے آنکھ" یہ ضرب المثل شاید ایسے ہی موقعوں کے لیے کہی گئی ہے قصور تو اپنا یا اپنی چادر کا ہے کہ اس میں ان کا پاؤں الجھ کر پھسل گیا اور شامت آ گئی۔ غریب حضرت مسطحؓ کی کہ والدہ صاحب نے ان کو کوسنا شروع کر دیا۔ شاید وہ ادھار ہی کھائے بیٹھی تھیں کہ کچھ بات ہو اور وہ یہ کہانی اگلیں۔ بات بے بات جب اگلنے کے لیے ادھار ہی کھائے بیٹھی تھیں تو پورے ایک ماہ تک ان سے صبر کیسے ہوا۔ مزید تعجب اس پر ہے کہ وہ مسطحؓ کو کوس رہی ہیں اصل سرغنہ یعنی عبد اللہ ابن ابی کو نہیں کوستیں۔ اس کا نام کوئی نہیں لیتا۔ وہ مسطحؓ کو اس انداز میں کوس رہی ہیں۔ گویا سارا طوفان اسی کا اٹھایا ہوا ہے حالانکہ طوفان عبد اللہ ابن ابی کا اٹھایا ہوا تھا، یہ غریب تو اس کے طوفان میں بہہ گئے تھے۔ پھر بتایا گیا ہے کہ: "گھروں میں اس وقت تک بیت الخلاء نہیں بنائے گئے تھے عورتیں صرف رات کو قضائے حاجت کے لیے باہر جایا کرتی تھیں۔ قدیم عربوں سے یہی دستور چلا آرہا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ قضائے حاجت

کے لیے عورتیں باہر ہی جایا کرتی تھیں۔ قضائے حاجت کا تقاضا تو حضرت عائشہؓ کو بیماری میں بھی ہوتا ہو گا، کیونکہ بیماری میں آدمی کا بول و براز تو بند نہیں ہو جاتا اور جیسا کہ آج بھی ہمارے ہاں چھوٹے چھوٹے دیہاتوں میں عورتیں قضائے حاجت کے لیے باہر ہی جاتی ہیں اور دو چار عورتیں مل کر ساتھ جاتی ہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اس سے پہلے بھی باہر جاتی رہی ہوں گی اور دو چار عورتوں کے ساتھ ہی جاتی رہی ہوں گی۔ جیسا کہ بیماری کے بعد وہ ام مسطح کے ساتھ گئی ہیں، تو حیرت ہے کہ کسی عورت نے آج تک یہ واقعہ حضرت عائشہ سے بیان نہیں کیا۔ حالانکہ عورتوں کی فطرت ایسی ویسی بات کو ضبط کرنے کی نہیں ہوتی بلکہ عورتیں زیادہ تر پیٹ کی ہلکی ہوتی ہیں وہ تو باتوں کو اگلنا ہی جانتی ہیں جیسا کہ ام مسطحؓ کے سلسلہ میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ محض بات کو اگلنے کی خاطر وہ اپنا پاؤں پھسلنے پر اپنے بیٹے مسطحؓ کو کوسنے لگیں کہ اس بہانے وہ بات کو اگل سکیں، حالانکہ پاؤں پھسل جانے پر غریب مسطحؓ کو کوسنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

(۱۷) آگے بیان ہوا ہے کہ: ”حضرت ام مسطحؓ نے تہمت کا سارا حال سنایا یہ سن کر حضرت عائشہ صدیقہؓ کی بیماری بڑھنی شروع ہو گئی۔ جب وہ گھر پہنچیں تو رسول اللہ ﷺ تشریف لائے۔ آپ ﷺ نے سلام کیا پھر پوچھا: ”تم کیسی ہو؟“ حضرت عائشہ نے رسول اللہ ﷺ سے اپنے والدین کے ہاں جانے کی اجازت مانگی تا کہ ان سے اس خبر کا مزید حال معلوم کریں۔“ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے متعلق یہ نہ بھول جائیے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی زوجہ مطہرہ ہونے کے باوجود ایک عورت ہیں اور پاک دامن اور پاکباز عورت ہیں، تہمت کا سارا حال ام مسطحؓ سے ان کو معلوم ہو چکا ہے۔ پورے ایک مہینہ سے وہ آنحضرت ﷺ کے تیور بدلے ہوئے دیکھ رہی ہیں آپ کی بے اعتنائی اور بے رخی سے ان کے دل پر کیا کچھ گزر رہی ہو گی ظاہر ہے۔ ایک عورت کی فطرت کو سامنے رکھتے ہوئے اس قدر ضبط اور تحمل کی توقع ان سے نہیں کی جا سکتی کہ وہ پھٹ نہ پڑتیں اور بجائے رونے دھونے کے صرف اپنے والدین کے ہاں جانے کی اجازت مانگتیں۔ جو کچھ راوی نے ان کے متعلق والدین کے ہاں جانے کے بعد بیان کیا ہے وہ کچھ ام مسطح کے بیان کے بعد ہو جانا چاہیے تھا۔

(۱۸) راوی کہتا ہے کہ والدین کے گھر پہنچنے کے بعد ”اتنے میں ایک انصاری عورت آئی اور کہنے لگی اللہ فلاں شخص کے ساتھ برائی کرے۔ حضرت ام رومانؓ نے کہا: ”تم نے کیا بات کہی“ اس نے کہا کہ میرا بیٹا بھی تہمت لگانے والوں میں شامل ہے۔ حضرت ام رومانؓ نے پوچھا آخر کیا قصہ ہے (اس کی کیا تفصیل ہے؟) اس عورت نے پورا قصہ بیان کیا جب وہ بیان کر چکی تو حضرت عائشہ صدیقہؓ نے پوچھا کیا رسول اللہ ﷺ نے بھی یہ بات سنی ہے؟ اس نے کہا: ”ہاں“ حضرت عائشہ نے پوچھا کیا ابو بکر نے بھی یہ بات سنی ہے؟ اس نے کہا ”ہاں“ یہ سن کر حضرت عائشہ صدیقہؓ بے ہوش ہو کر اپنی والدہ پر گر پڑیں یہ ساری داستان بھی محض داستان اور وہ بھی من گھڑت داستان ہی معلوم ہوتی ہے کیونکہ ام مسطحؓ حضرت عائشہؓ سے تہمت کی ساری داستان بیان کر چکی تھیں۔ حضرت عائشہ جب والدین کے ہاں آئی ہیں تو انہوں نے ام مسطحؓ کی باتیں اپنی والدہ کو سنا دی تھیں اور یہ سب باتیں سننے کے بعد ہی انہوں نے حضرت عائشہؓ کو تسلی دیتے ہوئے کہا تھا کہ ایسی عورتیں بہت کم ہیں جو خوبصورت ہوں کسی محبت کرنے والے شوہر کے پاس ہوں۔ پھر ان کی سوکنیں بھی ہوں اور انہیں تہمت نہ لگائی جائے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ام رومانؓ کو پوری کہانی معلوم تھی یا معلوم ہو گئی تھی۔ لیکن انصاری عورت کے آنے پر ام رومانؓ بالکل بے خبر بن جاتی ہیں اور خود اس انصاری عورت سے پوچھنے لگتی ہیں کہ آخر قصہ کیا ہے؟ پھر حضرت عائشہؓ کا اس سے یہ سوال کہ کیا رسول اللہ ﷺ نے بھی یہ بات سنی ہے؟ کیا ابو بکرؓ نے بھی یہ بات سنی ہے، محض تجاہل عارفانہ معلوم ہوتا ہے کیا اتنا بڑا حادثہ پیش آ جانے کے بعد ماں اور باپ میں کبھی اس کا ذکر اذکار نہیں آیا تھا کہ ام رومانؓ حضرت عائشہؓ کو بتا دیتیں کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ اور رسول اللہ ﷺ نے یہ بات سن لی ہے اور کیا وہ خود پورے ایک مہینہ سے آنحضرت ﷺ کے تیور بدلے ہوئے اور آپ کی بے اعتنائی اور بے رخی نہیں دیکھ رہی تھیں کہ اب انہیں یہ بھی پوچھنے کی ضرورت پیش آ گئی کہ کیا رسول اللہ ﷺ نے یہ بات سنی ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اتنی کودن اور غبی تو کبھی نہیں تھیں۔ پھر یہ انصاری عورت بیان کر رہی ہے کہ اس کا بیٹا بھی تہمت لگانے والوں میں شامل ہے مگر سزا پانے والوں میں اس کا کہیں نام نظر نہیں آتا، آگے چل کر جب اسی روز آنحضرت ﷺ ابو بکرؓ کے مکان پر تشریف لے جاتے ہیں اور حضرت عائشہؓ کو سخت لرزہ سے بخار چڑھا ہوا ہے تو رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: ”شاید تہمت کی خبر سن کر بخار آ گیا ہے؟“ تو حضرت ام رومان رضی اللہ عنہا کو تہمت کی ساری داستان معلوم تھی ورنہ حضور اکرم ﷺ اس طرح بات نہ فرماتے اور ام رومان رضی اللہ عنہا اس طرح جواب نہ دیتیں۔

(۱۹) آگے اس داستان کا وہ افسوسناک حصہ آ رہا ہے جس پر جتنا ماتم بھی کیا جائے کم ہے۔ یعنی ”پھر رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی ابن ابی طالبؓ اور اسامہ ابن زیدؓ کو بلایا اور اپنی بیوی حضرت عائشہ صدیقہؓ کی علیحدگی کے سلسلہ میں ان سے مشورہ لیا۔ حضرت اسامہؓ نے کہا وہ آپ کی بیوی ہیں (بھلا ان سے یہ کام کیسے ہو سکتا ہے؟) آپ بدستور انہیں اپنے ہی پاس رکھیئے ہم بجز بھلائی کے ان کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ حضرت علیؓ بھی حضرت

عائشہ صدیقہؓ کے معاملے میں سلامت رہے کسی قسم کا شبہ نہیں کیا۔ البتہ (رسول اللہ ﷺ کا غم غلط کرنے کے لیے) یہ عرض کیا اے اللہ کے رسول اللہ نے آپ پر کوئی تنگی نہیں کی آپ کے لیے ان کے علاوہ عورتیں ہیں (لیکن پہلے) آپ خادمہ سے تو پوچھیں۔ وہ آپ کو صحیح بات بتائے گی۔ رسول اللہ ﷺ نے خادمہ کو جن کا نام بریرہؓ تھا بلوایا پھر رسول اللہ ﷺ ان سے فرمایا: "کیا تم نے عائشہ کی کبھی کوئی ایسی بے جا حرکت دیکھی ہے جو تمہیں شک میں ڈالتی ہو؟" حضرت بریرہؓ نے کہا: "اس ذات کی قسم جس نے آپ کو سچا نبی بنا کر بھیجا ہے میں نے ایسی کوئی بات نہیں دیکھی جس کی وجہ سے میں عائشہؓ کو تہمت لگا سکوں، وہ تو اتنی (بھولی) کم سن لڑکی ہیں کہ آٹا گوندھ کر سو جاتی ہیں پلی ہوئی بکری آ کر کھا جاتی ہے۔ ایک شخص نے انہیں دھمکا کر کہا: ("دوسری روایات میں تصریح ہے کہ یہ حضرت علیؓ تھے) کہ سچ سچ بیان کرو۔ حضرت بریرہؓ نے کہا کہ: "سبحان اللہ میں تو عائشہ کو اس طرح بے عیب جانتی ہوں جس طرح جوہری خالص سونے کی ڈلی کو بے عیب جانتا ہے۔" اس افسانہ میں سب سے پہلی بات جو محل تامل ہے وہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے وزیر تو حضرت ابو بکر اور حضرت عمرؓ تھے تمام اہم معاملات میں آپ ان ہی سے مشورہ فرمایا کرتے تھے۔ ان دونوں کے بعد اگر کوئی اہم شخصیت تھی وہ حضرت عثمان کی تھی۔ اس سے پہلے کسی اہم معاملے میں حضرت اسامہ ابن زیدؓ اور حضرت علیؓ سے مشورہ فرمانا ثابت نہیں ہے۔ تو اس اہم معاملہ میں آپ نے نہ حضرت ابو بکرؓ کو یاد فرمایا نہ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کو یاد فرمایا تو حضرت اسامہؓ اور حضرت علیؓ کو یاد فرمایا۔ یہ آپ کی عام عادت کے خلاف ہے کہا جا سکتا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ کی تو بیٹی کا معاملہ تھا اس لیے ان کو یاد نہیں فرمایا لیکن حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کو یاد نہ فرمانا انتہائی حیرت کا باعث ہے۔

(۲۰) دوسری اہم اور قابلِ استعجاب بات یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ان دونوں حضرات سے اپنی بیوی حضرت عائشہ صدیقہؓ کی علیحدگی کے سلسلہ میں مشورہ لیا، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آنحضرت ﷺ کے قلب اطہر میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کے خلاف شبہ پیدا ہو گیا تھا۔ جو قطعاً منشائے الٰہی اور تقاضائے خداوندی کے خلاف ہے۔ حق تعالیٰ تو عام مسلمانوں سے یہ تقاضا کر رہے ہیں کہ:

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِيْ مَآ اَفَضْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۴﴾ اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا ۖ وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ ﴿۱۵﴾ وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا ۖ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۶﴾ يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖٓ اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷﴾ (النور:۱۴تا۱۷)

"اور (اے مسلمانو!) تم پر دنیا و آخرت میں اگر اللہ کا فضل اور احسان نہ ہوتا تو جس بات کا تم نے چرچا کیا ہے اس کی وجہ سے تمہیں بڑا عذاب پکڑ لیتا۔ یاد کرو جب تم اسے اپنی زبانوں سے مزے لے لے کر نقل کر رہے تھے اور اپنے مونہوں سے وہ بات کہہ رہے تھے جس کا تمہیں کوئی علم نہیں تھا اور تم اسے معمولی بات سمجھ رہے تھے حالانکہ وہ اللہ کے نزدیک بڑی بات تھی جونہی تم نے اس بات کو سنا تم نے یہ کیوں نہ کہا کہ ہمیں یہ بات جائز نہیں کہ ہم اسے منہ سے نکالیں۔ خدا کی ذات بے عیب اور پاک ہے۔ یہ تو بہت بڑا بہتان ہے۔ خدا تمہیں نصیحت کرتا ہے کہ تم دوبارہ ایسا کام کبھی نہ کرو اگر تم مومن ہو"۔

غور فرمایئے کہ عام مسلمانوں سے خدائے تعالیٰ کے اس مطالبہ کا کیا جواز رہ جاتا ہے کہ انہیں بات سنتے ہی یہ کہنا چاہیے تھا کہ "ہمیں یہ بات جائز نہیں کہ ہم اسے منہ سے نکالیں "خدا کی ذات بے عیب اور پاک ہے یہ تو یقینا بہت بڑا بہتان ہے جبکہ خود اللہ کا رسول بھی اس معیار پر پورا نہیں اتر رہا ہے۔ اس رسول الٰہی کا ایک جلیل القدر صحابی (حضرت علیؓ) بھی در پردہ اس کی تائید میں ہے۔ اگر اس بات کو تسلیم کر لیا جائے تو نعوذ باللہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت علیؓ سے تو وہ انصاری صحابی ہی اچھے رہے اور خدا کے اس معیار پر پورے اترے کہ تہمت کی بات سنتے ہی انہوں نے کہا: "اے اللہ تو پاک ہے، ہمارے لیے یہ زیبا نہیں کہ ہم یہ بات منہ سے نکالیں اے اللہ تو پاک ہے یقینا یہ بہتان عظیم ہے۔" راوی نے یہ بات کہہ کر نعوذ باللہ حضرت علیؓ اور آنحضرت ﷺ کے متعلق مسلمانوں کے دلوں میں جو تقدس اور احترام پایا جاتا ہے اسے انتہائی تکلیفدہ حد تک ٹھیس پہنچائی ہے"

اعاذنا اللہ من ذالك۔"

۲۱۔ تیسرے یہ زبردستی کی بات بھی قابل ملاحظہ ہے کہ حضرت علیؓ فرماتے ہیں: "اے اللہ کے رسول! اللہ نے آپ پر کوئی تنگی نہیں فرمائی آپ کے لیے ان کے علاوہ بہت عورتیں ہیں۔ آپ خادمہ سے تو پوچھیں وہ آپ کو صحیح بات بتائے گی اور پھر اس کے بعد یہ کہ ایک شخص نے حضرت بریرہؓ کو دھمکا کر کہا کہ سچ سچ بیان کرو" بیہقی اور طبرانی کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص حضرت علیؓ تھے اور انہوں نے نہ صرف بریرہؓ کو دھمکایا بلکہ مارا پیٹا بھی تھا تا کہ وہ حضرت علیؓ کے خیال کے مطابق صحیح صحیح بات بتا دیں، لیکن ان سب باتوں کے باوجود راوی کا دعویٰ یہ ہے کہ حضرت علیؓ بھی حضرت عائشہ صدیقہؓ کے معاملہ میں سلامت رہے (یعنی کسی قسم کا شبہ نہیں کیا) سبحان اللہ یہ اچھی

سلامتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی بیوی کی علیحدگی کے سلسلہ میں مشورہ فرمارہے ہیں اور حضرت علیؓ یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ: "اے اللہ کے رسول! اللہ نے آپ پر کوئی تنگی نہیں کی، آپ کے لیے ان کے علاوہ بہت عورتیں ہیں یعنی آپ میری ماں کو طلاق دید یجئے اور کوئی دوسری عورت گھر میں لے آیئے۔ اگر سلامتی اسی کا نام ہے تو پھر تہمت میں ملوث ہونا کسے کہتے ہیں۔ اور پھر یہ مشورہ حضرت علیؓ دے رہے ہیں کہ جو ماشا اللہ حافظ قرآن ہیں۔ قرآن کے بہت بڑے عالم ہیں جنہوں نے (بتایا جاتا ہے کہ) نزول ترتیب کے مطابق قرآن کریم کو مرتب بھی فرمایا تھا۔ نزول کا اتنا بڑا عالم اور یہ کہہ رہا ہے کہ اے اللہ کے رسول اللہ نے آپ پر کوئی تنگی نہیں کی، آپ کے لیے ان کے علاوہ اور بہت عورتیں ہیں۔ گویا اسے قرآن کی یہ آیت معلوم ہی نہیں:

لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنۢ بَعْدُ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ (الاحزاب:۵۲)

"اے پیغمبر اسلام! (آپ کے لیے اس کے بعد عورتیں حلال نہیں ہیں اور نہ یہ حلال ہے کہ ان ازواج کے بدلے آپ دوسری ازواج بدلیں خواہ ان کا حسن آپ کو کتنا ہی پسند آئے۔"

واضح رہے کہ مذکورہ بالا آیت سورۃ احزاب کی ہے اور سورۃ احزاب غزوۂ احزاب (خندق) کے فوراً بعد نازل ہوئی ہے جیسا کہ اس کی آیات سے ظاہر ہے اور غزوہ احزاب (خندق) ۴ھ میں واقع ہوا ہے جبکہ غزوہ بنی مصطلق جس میں واقعہ افک پیش آیا ہے (جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے) ۵ھ کا واقعہ ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ۵ھ میں جبکہ آنحضرت ﷺ کے لیے مزید شادیاں ممنوع قرار دی جاچکی تھیں اور ایک بیوی کی جگہ (اسے طلاق دے کر) دوسری بیوی کرلینا بھی حرام قرار دے دیا گیا تھا۔ اس کے پورے ایک سال بعد حضرت علیؓ آنحضرت ﷺ سے یہ فرمائیں کہ اے اللہ کے رسول! اللہ نے آپ پر کوئی تنگی نہیں فرمائی، آپ کے لیے ان کے علاوہ اور بہت عورتیں ہیں جبکہ حضرت علیؓ قرآن کریم کو ترتیب نزول کے مطابق مرتب کرنے والے بھی شمار کیے جاتے ہیں، اگر ترتیب نزول کی معلومات حضرت علیؓ کو ایسی ہی تھیں تو جیسا کہ قرآن کریم کو انہوں نے مرتب فرمایا ہوگا وہ ظاہر ہے۔ شاید اسی وجہ سے امت میں وہ مقبول نہیں ہوسکا حتیٰ کہ خود شیعان علیؓ کی درس گاہوں میں بھی بار نہ پاسکا ورنہ آج کہیں تو اس کا سراغ ملتا۔

ہمارے نزدیک عائشہؓ دشمنی میں یہ حضرت علیؓ کو مطعون کرنے کی سازش ہے کہ وہ ایسا بے ہودہ مشورہ آنحضرت ﷺ کو دے رہے ہیں۔ یہ حضرت علیؓ کے ذمہ بہت بڑا بہتان ہے۔ ہمارے نزدیک یہ مفروضہ ہی غلط ہے کہ اس معاملہ میں آنحضرت ﷺ ان سے کوئی مشورہ فرماسکتے تھے۔ حضرت علیؓ اور حضرت اسامہؓ آنحضرت ﷺ سے عمر میں پورے تیس سال چھوٹے اور آپ ہی کے پروردہ تھے اور حضرت اسامہؓ حضرت زید کے بیٹے ہیں جو آپ کے منہ بولے بیٹے تھے یعنی پوتے کی جگہ تھے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ نے ایک بیٹے اور پوتے سے مشورہ فرمایا۔ ایسے معاملات میں اولاد سے مشورہ نہیں لیا جاتا بلکہ اپنے ہم عمروں اور ہم سنوں سے مشورہ لیا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس روایت کی یہ کوتاہی بعض راویوں کو محسوس ہوئی، چنانچہ قسطلانی نے شرح بخاری میں موافقات فاروق اعظمؓ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے صاحب الریاض کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے حضرت عائشہؓ کے بارے میں حضرت عمرؓ سے مشورہ فرمایا تھا جب اہل افک نے حضرت عائشہؓ پر تہمت لگائی تو حضرت عمر نے آنحضرت ﷺ سے سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول! عائشہؓ سے آپ کا نکاح کس نے کرایا تھا۔ آپ نے جواب دیا کہ حق تعالیٰ نے۔ تو حضرت عمرؓ نے کہا کہ تو کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کے پروردگار نے آپ کے اس معاملہ میں گھپلا کیا "سبحانك هذا بهتان عظيم" چنانچہ قرآن کریم میں بھی یہی الفاظ نازل ہوئے۔ بہرحال حضرت عمرؓ سے مشورہ فرمانے کا ایک امکان ہو سکتا تھا لیکن حضرت علیؓ اور حضرت اسامہؓ سے تو مشورہ فرمانے کا کوئی امکان ہی نہیں لیکن ہمارے نزدیک چونکہ واقعہ افک کی یہ کہانی محض ایک من گھڑت داستان ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں اس لیے ہم حضرت عمرؓ سے مشورہ فرمانے کی بات کو بھی موضوع سمجھتے ہیں۔

۲۲۔ چوتھی بات یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ اور حضرت اسامہؓ کو مشورہ کے لیے طلب فرمایا تھا انہیں تھانیدار تو نہیں بنایا تھا۔ حضرت علیؓ کو آنحضرت ﷺ کے حضور میں تھانیدار بننے کا کیا حق تھا کہ وہ حضرت بریرہؓ کو ڈانٹنا، دھمکانا اور مارنا پیٹنا شروع کر دیں یہ تو۔

لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (الاحزاب)

"اللہ اور اس کے رسول کے سامنے پیشقدمی نہ کرو۔"

اور

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ

(الحجرات)

"نبی کی آواز پر اپنی آواز بلند نہ کرو۔"

کی صریح خلاف ورزی اور سخت ترین گستاخی اور سوءِ ادبی شمار کی جائیگی۔ تعجب ہے راوی نے اس کی جسارت کیسے کی کہ حضرت علیؓ کے خلاف اس قسم کی بہتان طرازی کرے۔

۲۳۔ مذکورہ بالا حصہ کے سلسلہ میں پانچویں اور آخری کاٹنے کی بات یہ ہے کہ راوی نے بیان کیا ہے کہ حضرت علیؓ نے یہ مشورہ دیا کہ آپ خادمہ سے پوچھیں وہ آپ کو صحیح بات بتائے گی۔ رسول اللہ ﷺ نے خادمہ کو جن کا نام بریرہ تھا بلوایا پھر رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا کیا تم نے عائشہؓ کی کبھی کوئی ایسی بے جا حرکت دیکھی ہے جو تمہیں شک میں ڈالتی ہو؟" الخ۔ اس میں حضرت بریرہؓ کو حضرت عائشہ کی خادمہ بتایا گیا ہے کیونکہ حضرت بریرہ دراصل ایک لونڈی تھیں اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ان کے مالکوں سے خرید کر آزاد فرمایا تھا۔ اور اس کے بعد وہ حضرت عائشہ کی خدمت میں رہنے لگی تھیں چنانچہ اس انداز سے ان کا نام لیا گیا ہے گویا وہ تو حضرت عائشہؓ کے گھر میں ہر وقت رہتی تھیں اور ہر بات سے واقف تھیں لہٰذہ وہ صحیح صحیح بات بتادیں گی۔ حضرت علیؓ ان کو دھمکاتے بھی ہیں کہ سچ سچ بیان کرو، لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ جس وقت کا یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے اس وقت حضرت بریرہؓ کا حضرت عائشہؓ کے گھر سے کسی قسم کا کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔ چنانچہ علامہ قسطلانی شارح بخاری فرماتے ہیں کہ: "یہاں خادمہ یا لونڈی کا نام بریرہؓ بیان کرنا بہت مشکل سمجھا گیا ہے کیونکہ قصہ افک حضرت بریرہؓ کو خریدنے اور ان کے آزاد کرنے سے بہت پہلے کا ہے۔ کیونکہ واقعہ افک ۵ھ یا ۶ھ میں (باختلاف الاقوال) پیش آچکا تھا، اور حضرت بریرہؓ کو آزاد کرنے کا واقعہ فتح مکہ کے بعد ۹ یا ۱۰ھ میں ہوا ہے۔ اسی واسطے زرکشی نے کہا کہ لونڈی کا نام بریرہؓ کسی راوی نے بعد میں بڑھا دیا ہے یہ کوئی اور باندی ہوگی لیکن شیخ تقی الدین سبکی نے اس کے کئی جواب دیئے ہیں جن میں سب سے اچھا جواب یہ ہے کہ حضرت بریرہؓ حضرت عائشہؓ کی خدمت ان کو خریدنے سے پہلے بھی کرتی ہوں گی۔" (قسطلانی شرح بخاری ج ۷ ص ۲۹۲)

حافظ ابن حجرؒ نے بھی زرکشی کا یہ قول نقل کیا ہے اور بتایا ہے کہ زرکشی نے یہ بات حافظ ابن القیم حنبلیؒ سے لی ہے کیونکہ انہوں نے بھی کہا ہے کہ باندی کا نام بریرہ بیان کرنا وہم ہے جو کسی راوی کو ہو گیا ہے،

(فتح الباری ج ۸ ص ۳۸)

رہا شیخ تقی الدین سبکیؒ کا قیاسی جواب سو وہ بہت کمزور ہے۔ حضرت بریرہؓ ایک باندی تھیں وہ اپنی آزادی کی خواہاں تھیں کیوں کہ وہ جن لوگوں کی باندی تھیں، وہ لوگ ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش نہیں آتے تھے اور ان سے زیادہ خدمت لیتے تھے حتیٰ کہ اگر کوئی شخص ان کو خرید کر آزاد کر دے تو انہیں اس پر اصرار تھا کہ ولاء انہی کے لیے ہوگا یعنی ضرورت پڑنے پر وہ پھر بھی ان سے خدمت لینے کا خود کو حقدار سمجھتے تھے اور چاہتے تھے کہ اگر حضرت بریرہؓ مر گئیں تو وارث بھی وہی ہوں گے۔ غرض یہ کہ اتنے حریص اور بخیل مالکوں سے ان کا واسطہ تھا اسی لیے وہ حضرت عائشہؓ کے پاس آئیں اور اپنی دکھ بھری داستان انہیں سنائی۔ آنحضرت ﷺ کو بتایا گیا تو آپ نے فرمایا ان کے شرط کرنے سے کچھ نہیں ہوتا ولاء اسی کے لیے ہوگا جو ان کو آزاد کرے گا۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ نے ترس کھا کر ان کو خرید کر آزاد کر دیا۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں یہ توقع عبث ہے کہ وہ دوسروں کی لونڈی ہوتے ہوئے حضرت عائشہؓ کی خدمت کرتی ہوں گی اور ان کے مالک ان کو اس کی اجازت دیتے ہوں گے کہ وہ حضرت عائشہؓ کی خدمت گزاری کرتی رہیں اور ان کے گھر میں ہر وقت پڑی رہیں کہ ان کے خلوت وجلوت کی راز آشنا بن جائیں اور حضرت عائشہ کے متعلق صحیح صحیح بات بتا سکیں۔ ہمیں زرکشی کے اس قول سے مکمل اتفاق ہے کہ حضرت بریرہؓ کا نام اس روایت میں لینا غلط ہے اور سراسر غلط ہے۔

۲۴۔ اس کے بعد بیان کیا گیا ہے کہ: "اس دن رسول اللہ ﷺ ممبر پر تشریف لے گئے۔ آپ نے فرمایا کہ: کون ہے جو اس شخص کے معاملہ میں میری مدد کر سکے جس نے میری بیوی کے معاملہ میں مجھے سخت صدمہ پہنچایا ہے۔ اللہ کی قسم میں اپنی بیوی میں سوائے بھلائی کے اور کچھ نہیں جانتا اور جس شخص کا نام اس سلسلہ میں انہوں نے لیا ہے اس کے متعلق بھی سوائے بھلائی کے میں کوئی گمان نہیں کر سکتا۔ وہ میری عدم موجودگی میں کبھی میرے گھر نہیں آیا۔ یہ سن کر بنو عبد اشہل کے بھائی حضرت سعد ابن معاذ کھڑے ہوئے اور کہا: "یا رسول اللہ! میں آپ کی مدد کروں گا۔ اگر وہ اوس قبیلہ کا آدمی ہے تو میں اس کی گردن اڑادوں گا اور اگر ہمارے بھائی خزرج قبیلہ کا آدمی ہے تو جو آپ حکم دیں گے ہم اس کی تعمیل کریں گے۔" یہ سن کر قبیلہ خزرج کے سردار سعد ابن عبادہؓ کھڑے ہوئے، یہ بہت اچھے آدمی تھے لیکن اس موقعہ پر پھسل گئے قومی حمیت اور غرور نے انہیں ابھارا۔ کہنے لگے تم جھوٹے ہو، واللہ تم خزرجی کو قتل نہیں کر سکتے اور نہ اس کے مارنے پر قادر ہو سکو گے۔ اگر وہ تمہاری قوم سے ہوگا تو تم اس کے قتل کو پسند نہیں کرو گے۔ یہ سن کر حضرت اسید ابن حضیرؓ کھڑے ہوئے۔ یہ حضرت سعد ابن معاذؓ کے چچازاد بھائی تھے۔ حضرت اسیدؓ نے حضرت سعد ابن عبادہؓ سے کہا۔ "تم جھوٹے ہو۔ اللہ کی قسم ہم اسے مار ڈالیں گے۔ تم منافق ہو کہ منافقوں کی طرف سے جھگڑتے ہو" اس پر اوس اور خزرج دونوں قبیلے اتنا بڑھ گئے کہ لڑنے پر آمادہ ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ ابھی ممبر پر ہی تھے۔ آپ ان کو چپ کراتے رہے۔ یہاں تک کہ بالآخر وہ چپ ہو گئے۔"

داستان کا یہ حصہ بھی مختلف وجوہ سے قابل ردّ ہے۔ سب سے پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اس میں آنحضرت ﷺ کا کردار انتہائی متضاد بیان کیا گیا ہے۔

اس سے پہلے ہم دیکھ چکے ہیں کہ آپ حضرت علیؓ اور حضرت اسامہ سے بیوی کی علیحدگی کے متعلق مشورہ فرما رہے ہیں۔ حضرت زینبؓ اور حضرت بریرہؓ سے حضرت عائشہؓ کے کیریکٹر کے متعلق تحقیقات میں لگے ہوئے ہیں۔ جس سے مترشح ہوتا ہے کہ آپ ﷺ حضرت عائشہؓ کے متعلق خاصے مشکوک ہیں حتیٰ کہ ان کو طلاق دے دینے اور اپنے سے علیحدہ کر دینے پر آمدہ ہیں۔ لیکن یہاں بر سر ممبر سارے صحابہؓ کے سامنے اللہ کی قسم کھا کر یہ بیان دے رہے ہیں کہ "میں اپنی بیوی میں سوائے بھلائی کے اور کچھ نہیں جانتا اور جس شخص کا نام اس سلسلہ میں انہوں نے لیا ہے۔ اس کے متعلق بھی سوائے بھلائی کے میں اور کوئی گمان نہیں کر سکتا۔ وہ میری عدم موجودگی میں کبھی میرے گھر نہیں آیا۔" ذرا دیانت داری کے ساتھ غور فرمایئے کہ ان دونوں باتوں کو سامنے رکھ کر آپ کے متعلق کیا تاثر پیدا ہوتا ہے۔ اگر آپ کو اس قدر یقین تھا جسکا آپ اب مظاہرہ فرما رہے ہیں تو اس سے پہلے وہ سب مشورے اور تحقیقات کیوں کی جا رہی تھی، کس نے کہا تھا کہ آپ بیوی پر شبہ کریں اور اس کو الگ کرنے کی سوچیں۔ یہی تو وہ باتیں ہیں جن کے سہارے متشرکین اور دیگر مذاہب کے اہل قلم ہر طرح کی ہرزہ سرائیوں پر اتر آتے ہیں۔ لیکن یہ خود ہم ہی ہیں جو ان لوگوں کو ان کی یاوہ گوئیوں کے لیے مواد فراہم کرتے ہیں۔ نعوذ باللہ ہم آنحضرت ﷺ کے متعلق ایسا قابل اعتراض تصورت قائم نہیں کر سکتے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی ذات بابرکات اس سے کہیں بلند ہے کہ آپ کو ظن و تخمین کی وادیوں میں یوں بھٹکتا ہوا اور وہم و گمان کے ریگستانوں میں یوں سرگرداں ہوتا ہوا پیش کیا جائے۔ آپ علم و یقین کے اس بلند مقام پر فائز تھے کہ آپ اہم معاملات میں دوٹوک اور جچے تلے صحیح فیصلے فرمانے کی اہلیت رکھتے تھے۔ اس میں آپ کو نہ کسی ملامت گر کی ملامت کا خوف ہوتا تھا، اور نہ کسی مصلحت اندیشانہ رکاوٹ سے سابقہ پڑتا تھا۔ کیا کوئی شخص تصور بھی کر سکتا ہے کہ دنیا کے اتنے عظیم ترین انقلاب کا قائد جو چند سال میں دنیا کی بساط الٹ کر رکھ دیتا اور ایک نئی دنیا تعمیر کر کے دکھا دیتا ہے وہ بات کی تہ تک پہنچنے اور بروقت صحیح فیصلے کرنے میں اس قدر کوتاہ دست اور کمزور ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے ایک گھریلو معاملہ کا فیصلہ کرنے میں کبھی دائیں کو جھکتا ہے اور کبھی بائیں کو، مگر فیصلہ نہیں کر پاتا۔

۲۵۔ دوسری بات جو اس روایت کو قابل رد قرار دیتی ہے وہ یہ ہے کہ کوئی شریف آدمی اپنے گھریلو معاملات کو یوں قوم کی چوپال میں پیش نہیں کیا کرتا جس طرح یہاں آنحضرت ﷺ کو بر سر ممبر ایک بے ہودہ بات کا چرچا کرتا ہوا اور قابل شرم بات کو اچھالتا ہوا دکھایا گیا ہے۔ ہمیں تو آپ نے قرآن کریم کے ذریعہ سے یہ تعلیم دی ہے کہ۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۱۹ (النور:۱۹)

"یقیناً جو لوگ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ ایمان لانے والوں میں بے حیائی کی کوئی بات پھیلے ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے اور اللہ ہی خوب جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔"

تو کیا آنحضرت ﷺ حق تعالیٰ کی اس واضح ہدایت کے علی الرغم ایسا کر سکتے تھے کہ آپ بر سر ممبر اس بات کا چرچا فرماتے۔ صحابہ کے ان بیانات کو سامنے رکھئے کہ آپ میں شرم و حیا اس قدر تھی کہ کنواری لڑکیوں میں بھی نہیں ہوتی۔ آپ کسی کی موجودگی میں جنگل میں قضائے حاجت اور پیشاب تک نہیں کرتے تھے۔ تعمیر کعبہ کے وقت (نبوت سے بہت پہلے) جب پتھر ڈھو ڈھو کر لا رہے تھے تو چچا حضرت عباسؓ نے تہد کھول کر کندھے پر رکھ دینا چاہا کہ اس پر پتھر رکھ کر لاؤ تو خود کو ننگا دیکھ کر بے ہوش ہو گئے۔ کیا اس قدر شریف اور شرم و حیا کا پتلا خاص اس معاملہ میں اتنا لاابالی ہو گیا کہ اپنے گھر کی ایک افسوسناک بات کو یوں علی الاعلان بر سر ممبر بیان کر کے اپنی ملت سے فریاد کر رہا ہے اس سے مدد کی بھیک مانگ رہا ہے استغفر اللہ !

۲۶۔ تیسری اہم ترین بات اس روایت میں یہ ہے کہ حضرت سعد ابن معاذؓ کو بتایا گیا ہے کہ وہ آنحضرت ﷺ کی فریاد پر کھڑے ہوئے اور یوں گویا ہوئے "یارسول اللہ! میں آپ کی مدد کروں گا۔ اگر وہ اوس قبیلہ کا آدمی ہے تو میں اس کی گردن اڑادوں گا اور اگر ہمارے بھائی خزرج قبیلہ کا آدمی ہے تو جو حکم آپ دیں گے ہم اس کی تعمیل کریں گے۔ حالانکہ حضرت سعد ابن معاذ رضی اللہ عنہ کا انتقال غزوہ بنی المصطلق سے ایک سال پہلے غزوہ خندق میں ۴ھ میں ہو چکا تھا۔ چنانچہ علامہ قسطلانیؒ شارح بخاری تحریر فرماتے ہیں کہ یہاں سعد ابن معاذ رضی اللہ عنہ کا تذکرہ بڑا مشکل سمجھا گیا ہے۔ کیونکہ واقعہ افک ۶ھ غزوہ مریسیع میں پیش آیا تھا اور حضرت سعدؓ کا انتقال اس تیر لگنے کی وجہ سے ہوا وہ جو انہیں غزوہ خندق میں ۴ھ میں لگا تھا اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ غزوہ مریسیع کے بارہ میں مورخین و محدثین کے مختلف اقوال نقل کئے گئے ہیں، چنانچہ بخاری ہی میں موسیٰ ابن عقبہ کا یہ قول بھی نقل کیا گیا ہے کہ وہ غزوہ ۴ھ میں پیش آیا تھا، ایسے ہی خندق بھی۔ اور ابن اسحق نے کہا ہے کہ غزوہ مریسیع شعبان میں اور غزوۂ خندق شوال میں پیش آیا تھا تو اگر دونوں غزوے ایک ہی سال میں ہوئے ہوں تو سعد ابن معاذؓ کا دونوں میں موجود ہونا ناممکن نہیں ہے۔ لیکن موسیٰ ابن عقبہ سے جو کچھ صحیح اسناد سے نقل کیا گیا ہے وہ یہی ہے کہ غزوہ مریسیع ۵ھ میں پیش آیا ہے۔ پس بخاری میں جو کچھ نقل ہو گیا ہے

(یعنی اس وقت حضرت سعد ابن معاذ کا موجود ہونا) اس کو محدثین نے سبقت قلم پر ہی محمول کیا ہے۔ (قسطلانی شرح بخاری ج ۷ ص ۲۹۳)

حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں اس مسئلہ پر تفصیل سے بحث کی ہے انہوں نے حافظ ابن عبد البرؒ، ابن حزمؒ، ابن العربیؒ، قرطبیؒ وغیرہ محدثین سے یہی نقل کیا ہے کہ سعد ابن معاذ کا ذکر اس قصہ میں قطعاً غلط اور وہم ہے۔
(فتح الباری ج ص ۸۷)

اس سے ظاہر ہے کہ ۵ھ میں جب (بقول راوی) واقعہ افک پیش آیا ہے اس سے ایک سال پہلے حضرت سعد ابن معاذ وفات پا چکے تھے۔ لہٰذہ افک کے واقعہ میں حضرت سعد ابن معاذؓ کا تذکرہ غلط ہے۔ موسیٰ ابن عقبہ کے متعلق تو خود علامہ قسطلانی نے واضح کر دیا ہے کہ ان سے غزوہ مریسیع کا ۴ھ میں پیش آنا صحیح سند سے ثابت نہیں ہے۔ رہ گئے ابن اسحٰق تو ان کے متعلق ہم اتنا ہی عرض کریں گے کہ یہ وہی بزرگ ہیں جن کے متعلق امام مالکؒ کا یہ ارشاد نقل کیا جاتا ہے کہ انہ دجال من الدجاجلۃ۔ (وہ دجالوں میں سے ایک دجال ہے) تو ان جیسے حضرات کے بیانات میں مشہور اور راجح اقوال کے خلاف پناہ ڈھونڈھنا محض ایک غلط بات کو زبردستی صحیح باور کرانے کی ایک ناکام کوشش ہی ہے۔ اس کے بعد اس روایت کے متعلق بجز اس کے موضوع ہونے کے اور کیا کہا جاسکتا ہے۔ نرم سے نرم بات جو اس سلسلے میں کہی جاسکتی ہے وہ یہی ہے کہ یہ روایت امام محمد بن مسلم شہاب زہری کی طرف سے غلط طور پر منسوب ہوگئی ہو۔ کیونکہ رواۃ حدیث میں زہری نام سے روایت کرنے والے ایک محمد بن مسلم بن شہاب زہری ہی نہیں بلکہ اسماء رجال کی کتابوں میں مثلاً تہذیب التہذیب اور لسان المیزان وغیرہ کے مطالعہ سے ایسے ایک سو بیس راویوں کا ذکر ملتا ہے جو زہری ہی کے نام سے موسوم تھے۔ ان میں کچھ وضاع اور کذاب بھی تھے۔ پھر زہری کے شاگردوں میں بھی ایسے وضاع اور کذاب موجود تھے جو زہری کی شہرت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے من گھڑت حدیثوں کو اس کے نام سے مشہور کر دیتے تھے۔

۲۷۔ اس سلسلہ میں ایک اور قابلِ تردید بات یہ ہے کہ روایت میں بتایا گیا ہے کہ حضرت سعد ابن عبادہ رضی اللہ عنہ نے ناروا رویہ اختیار فرمایا۔ چنانچہ روایت کا بیان یہ ہے کہ: "یہ سن کر قبیلہ خزرج کے سردار حضرت سعد ابن عبادہؓ کھڑے ہوئے یہ بہت اچھے آدمی تھے لیکن اس موقعہ پر پھسل گئے۔ قومی حمیت اور غرور نے انہیں ابھارا کہنے لگے تم جھوٹے ہو۔ واللہ تم خزرجی کو قتل نہیں کر سکتے اور نہ اس کے مارنے پر قادر ہو سکو گے۔ اگر وہ تمہاری قوم سے ہوگا تو تم اس کے قتل کو پسند نہیں کرو گے۔ یہ حضرت سعد ابن عبادہ رضی اللہ عنہ کے خلاف انتہائی گھناؤنا الزام ہے۔ حضرت سعد ابن عبادہ قبیلہ خزرج کے سر دار ہیں اور قبیلہ خزرج مدینہ منورہ میں انصارؓ کا ایک مقتدر قبیلہ تھا۔ واضح رہے کہ بیعت عقبہ اولیٰ میں مدینہ منورہ سے بنو خزرج کے لوگ ہی حاضر ہوئے تھے اور بیعت عقبہ ثانیہ میں بھی انہی کی اکثریت تھی۔ بنو اوس کے تھوڑے لوگ اس بیعت میں شریک تھے۔ اصل ہجرت کے داعی قبیلہ خزرج ہی کے لوگ تھے۔ بنو خزرج میں ہی حضرت سعد ابن عبادہؓ بھی تھے۔ لہٰذہ حضرت سعد ابن عبادہؓ قدیم الاسلام شخصیت ہیں۔ آپ بیعت عقبہ ثانیہ میں شریک تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ منورہ چلے آنے کی دعوت دینے والوں میں شامل تھے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار میں سے جو بارہ نقیب مقرر فرمائے تھے ان میں قبیلہ بنی ساعدہ کے لیے آپ نے نذر ابن عمروؓ کے ساتھ آپ کو بھی نقیب مقرر فرمایا تھا، تمام سیرت اور تاریخ کے ائمہ اس پر متفق ہیں۔ غرض یہ کہ مدینہ منورہ میں انصار کے دو بڑے قبیلے تھے اوس اور خزرج۔ اوس کے مقابلہ میں خزرج قبیلہ زیادہ مقتدر سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے پہلے مدینہ منورہ کے باشندوں نے یہ طے کیا ہوا تھا کہ پورے مدینہ کا سردار عبد اللہ ابن ابی ابن سلول کو بنا دیا جائے۔ اس کی تاجپوشی طے ہو چکی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمائی اور عبد اللہ ابن ابی کی سرداری کا خواب پریشان ہو کر رہ گیا۔ عبد اللہ ابن ابی ابن سلول قبیلہ بنی خزرج ہی کا ایک سردار تھا۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ بنو خزرج کے اقتدار پر پورا مدینہ منورہ اتفاق کر چکا تھا۔ چنانچہ خود بخاری باب مناقب الانصار اور باب کیف آخر النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور کتاب البیوع میں حضرت انس اور سعدؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت سعدؓ بیمار ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ راستہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عبد اللہ بن ابی کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے ٹھہر گئے۔ عبد اللہ ابن ابی نے کہا: "تم جو کچھ کہتے ہو یہ اچھی چیز نہیں۔ ہماری مجلس میں آکر ہمیں تکلیف نہ دیا کرو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے حضرت سعدؓ کے ہاں پہنچے اور ان سے اس بات کا ذکر کیا۔ حضرت سعدؓ نے کہا: "اے اللہ کے رسول میرا باپ آپ پر قربان ہو جائے آپ درگزر فرمایئے۔ اس کو معاف کر دیجئے۔ اس ذات کی قسم جس نے آپ پر کتاب نازل کی ہے، بے شک اللہ نے جو کتاب آپ پر نازل کی ہے وہ حق کے ساتھ نازل کی ہے اور جو مرتبہ اللہ نے آپ کو دیا ہے وہ دیا گیا ہے۔ بات یہ ہے کہ اس شہر کے لوگوں نے اتفاق کر لیا تھا کہ عبد اللہ ابن ابی کو تاج پہنا کر دستار باندھ دیں۔

لیکن اللہ نے یہ حق سیادت آپ کو عطا فرما دیا اس وجہ سے اس کو حسد پیدا ہو گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو معاف کر دیا۔

(بخاری باب مناقب الانصار وغیرہ)

اس روایت سے علاوہ اس بیان کی تائید کے لیے جو علمائے سیرت و تاریخ نے بیان فرمایا ہے۔ یہ چند باتیں مزید ثابت ہوتی ہیں۔

(۱) حضرت سعد ابن عبادہؓ قدیم الاسلام تھے۔ کیونکہ یہ واقعہ شروع ہجرت کا ہے جبکہ عبد اللہ ابن ابی مسلمان بھی نہیں ہوا تھا۔ بعد میں یہ منافقانہ طور پر اسلام لے آیا تھا۔

(۲) عربوں میں سرداری نظام رائج تو تھا ہی لیکن اسی کے ساتھ ساتھ پورا شہر عبد اللہ ابن ابی کو سردار بنانے پر اتفاق کر چکا تھا جو ایک خزرجی آدمی تھا۔ لہٰذہ بنو خزرج کی قوت و اقتدار بنو اوس کے مقابلہ میں کہیں زیادہ تھی۔ لہٰذا یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ آنحضرت ﷺ اور دیگر مہاجرین کو مدینہ منورہ میں پناہ مل جانا دراصل بنو اوس کے مقابلہ میں بنو خزرج کا زیادہ مرہون منت تھا۔ چنانچہ مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی دعوت دینے میں بھی بنو خزرج ہی پیش پیش تھے۔

(۳) چونکہ عربوں میں اسلام سے پہلے سرداری نظام رائج تھا اس لیے حضرت سعد ابن عبادہؓ کی قوت اور ان کا اقتدار (جو اپنے قبیلہ کے مسلمہ سردار تھے) ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔

(۴) ابتداء ہجرت میں آنحضرت ﷺ سے حضرت سعد ابن عبادہؓ کی جو گفتگو نقل ہوئی ہے وہ ان کے راسخ الایمان ہونے اور قومی حمیت و غرور سے بالکلیہ بری ہونے کا منہ بولتا ثبوت ہے۔[1]

(۵) حضرت سعد ابن معاذؓ نے یہ کہا ہی نہیں تھا کہ ہم اس شخص کو اگر وہ خزرجی ہوا تو قتل کر دیں گے۔ انہوں نے تو یہ کہا تھا کہ: "اگر وہ اوس قبیلہ کا آدمی ہے تو میں اس کی گردن اڑا دونگا اور اگر ہمارے بھائی خزرج قبیلہ کا آدمی ہے تو جو حکم آپ دیں گے ہم اس کی تعمیل کریں گے۔" اس کے جواب میں سعد ابن عبادہؓ کا یہ فرمانا: تم جھوٹے ہو۔ واللہ تم خزرجی کو قتل نہیں کر سکتے اور نہ اس کے مارنے پر قادر ہو سکو گے۔ اگر وہ تمہاری قوم سے ہوگا تو تم اس کے قتل کو پسند نہیں کرو گے۔" بالکل بے تکا جواب ہے۔ سعد ابن معاذ نے کہا تھا کہ اگر وہ اوس قبیلہ کا ہو تو میں اس کی گردن اڑا دوں گا اس پر سعد ابن عبادہ فرما رہے ہیں کہ اگر وہ تمہاری قوم سے ہوگا تو تم اس کے قتل کو پسند نہیں کرو گے۔ سعدہ ابن معاذؓ فرما رہے ہیں کہ اگر وہ ہمارے بھائی خزرج قبیلہ کا آدمی ہے تو جو حکم آپ دیں گے ہم اس کی تعمیل کریں گے اور اس کے جواب میں سعد ابن عبادہؓ فرماتے ہیں کہ تم جھوٹے ہو۔ واللہ تم خزرجی کو قتل نہیں کر سکتے اور نہ اس کے مارنے پر قادر ہو سکو گے۔ 'سوال از آسماں جواب از ریسماں شاید' اسی کو کہتے ہیں راوی غالباً یہ چاہتا ہے کہ حضرت سعد ابن عبادہؓ کے متعلق سامعین یہ تصور قائم کرلیں کہ وہ نہایت کودن غبی اور انتہائی متعصب اور مغرور انسان تھے۔ ایک جلیل القدر صحابی کے متعلق ہم ایسا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ حضرت سعد ابن عبادہؓ کے متعلق ایک دوسری روایت میں جو آنحضرت ﷺ کی وفات حسرت آیات کے بعد سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار اور مہاجرین کے اجتماع اور خلافت کے فیصلہ کے بارے میں ہے۔ اس میں حضرت عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ اور حضرت سعد ابن عبادہ رضی اللہ عنہ کے درمیان جو جھڑپ اور بدکلامی ہوئی نیز یہ کہ حضرت سعد ابن عبادہؓ کو جو اس وقت بخار میں مبتلا تھے۔ لوگوں نے روند ڈالا۔ کسی کے متنبہ کرنے پر حضرت عمرؓ کا یہ فرمانا کہ اللہ سعد ابن عبادہؓ کو غارت کرے۔ حضرت سعد ابن عبادہؓ سے یہ فقرہ منسوب کرنا کہ ایک امیر تم میں سے ہوگا اور ایک امیر ہم میں سے" اور یہ بتانا کہ حضرت سعد ابن عبادہؓ نے آخر وقت تک حضرت ابو بکر صدیقؓ کی بیعت نہیں کی حتیٰ کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ موجودہ روایت ان سے کچھ زیادہ ہی افسوس ناک ہے، یہ دوسری روایت بھی حضرت محمد ابن مسلم ابن شہاب زہری کا کارنامہ ہے جو انہوں نے حضرت عمرؓ سے منسوب کر کے نقل فرمائی ہے۔ (دیکھئے بخاری کتاب الحدود) ہمیں افسوس ہے کہ ابو بکرؓ و عمرؓ دشمنی میں بے چارے سعد ابن عبادہؓ خواہ مخواہ زد میں آ گئے۔ راوی کو باور تو یہ کرانا تھا کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا متفقہ اور اجتماعی انتخاب گویا متنازعہ فیہ تھا اور اس کی حقیقت خدانخواستہ ایک زبردستی اور دھاندلی کی بیعت کی تھی اور اس کے ثابت کرنے کے لیے راوی نے حضرت سعد ابن عبادہؓ کو امت کی نگاہوں میں مطعون کر ڈالا۔

ساتھ ہی اس پر غور فرمایئے کہ سعد ابن عبادہؓ کے ساتھ ساتھ ان کا پورا قبیلہ زد میں آ رہا ہے۔ کیونکہ سعد ابن عبادہؓ کی بات کو کاٹنے کے لیے بنو خزرج کا کوئی آدمی کھڑا نہیں ہوا۔ ان کی بات کا جواب دینے کے لیے کوئی اٹھا ہے تو وہ حضرت اسید ابن حضیرؓ ہیں جو پھر قبیلہ اوس ہی کے آدمی اور حضرت سعد ابن معاذؓ کے چچا زاد بھائی تھے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ پورا قبیلہ کا قبیلہ حضرت سعد ابن عبادہؓ ہی کا ہمنوا تھا۔ ہم بتا چکے ہیں کہ مدینہ منورہ میں قبیلہ خزرج زیادہ طاقتور اور با اقتدار قبیلہ تھا اگر اس سارے قبیلہ کا یہ حال تھا تو اسلام کے متعلق ہمیں اس دور میں جو خوش فہمیاں ہیں ان کی حقیقت معلوم۔ قرآن کریم تو ہمیں یہ بتاتا ہے کہ:

[1] چونکہ مدینہ منورہ میں آنحضرت ﷺ کو بلانے میں حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کا بڑا ہاتھ تھا اس لیے یہی وجہ ہے کہ شیعوں کو ان سے خصوصی پرخاش ہے اس لیے ہر مخالفت میں انہیں پیش پیش دکھاتے ہیں۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿۶۴﴾ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿۶۵﴾ (النساء:۶۴ تا ۶۵)

"اور ہم نے ہر رسول اسی غرض سے بھیجا ہے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت و فرماں برداری کی جائے اور اگر وہ جب کبھی اپنے نفسوں پر ظلم کریں اس کے بعد آپ کے پاس چلے آئیں پھر اللہ سے خود بھی استغفار کریں اور رسول بھی ان کے لیے استغفار کرے تو وہ یقیناً اللہ کو بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا پائیں گے۔ اے پیغمبر اسلام! آپ کے پروردگار کی قسم ہے وہ لوگ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے جب تک وہ اپنے تمام باہمی اختلاف و نزاعات میں آپ کو حکم نہ بنالیں۔ پھر جو کچھ آپ فیصلہ فرمادیں اس کے خلاف اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور پوری طرح اسے تسلیم کرلیں۔"

انصار کے قبیلہ خزرج کے کردار کی جو نقش گری اس روایت میں کی گئی ہے، وہ ظاہر ہے کہ قرآن کریم کے اس صریح ارشاد کی خلاف ورزی ہے۔ اس میں حق تعالیٰ نے قسم کھا کر (فَلَا وَرَبِّكَ) یہ بات بتائی ہے کہ ایسے لوگ مومن ہو ہی یہ نہیں سکتے تو کیا قبیلہ خزرج پر فاتحہ پڑھ لی جائے اور تسلیم کرلیا جائے کہ پورا قبیلہ مومن نہیں تھا۔ اگر ایسا ہی تھا (العیاذ باللہ) تو سمجھ میں نہیں آتا کہ چند سال کے عرصہ میں انہوں نے قیصر و کسریٰ کے تخت کس طرح الٹ دیئے اور ایک تہائی معلوم دنیا پر پرچم اسلام کس طرح لہرادیا۔

حضرت سعد ابن معاذؓ نے یہی تو فرمایا تھا کہ: "اگر وہ ہمارے بھائی خزرج کا آدمی ہے تو جو حکم آپ دیں گے ہم اس کی تعمیل کریں گے۔" حضرت سعد ابن معاذ کا یہ فرمانا قطعاً قرآنی حکم کے مطابق تھا۔ اس کی تردید میں حضرت سعد ابن عبادہؓ کا وہ کچھ فرمانا جو ان سے منسوب کیا گیا ہے، قرآنی حکم کے مطابق اپنی بے ایمانی کا کھلا ثبوت مہیا کردینا نہیں تو اور کیا تھا۔

(۲۸) اس کے بعد راوی بیان کرتا ہے: "ان دونوں قبیلوں کے اختلاف کی وجہ سے اس دن رسول اللہ ﷺ نے کوئی عملی قدم نہ اٹھایا۔" اس سے آنحضرت ﷺ کی کس قدر بے بسی اور عاجزی کا اظہار ہو رہا ہے گویا آنحضرت ﷺ لوگوں کی مرضی اور خوشنودی کے ماتحت ہی فیصلے فرمانے پر مجبور تھے۔ کسی معاملہ میں اپنے حسن و قبح کے مطابق آپ فیصلے نہیں کرسکتے تھے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا (النساء:۱۰۵)

"اے پیغمبر اسلام! ہم نے آپ پر حق کے ساتھ کتاب نازل فرمادی ہے تاکہ آپ لوگوں کے درمیان جو کچھ خدا نے آپ کو سمجھایا ہے اس کے مطابق فیصلے کریں۔"

اور

وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (المائدہ: ۶۷)

"اے پیغمبر اسلام! اللہ لوگوں سے آپ کی حفاظت فرمائے گا۔"

پر آپ کا نہ عمل تھا نہ اعتماد۔ آپ بھی خدانخواستہ اسی طرح مصلحت اندیشیوں کا شکار ہوتے تھے جیسا کہ دنیا کے اور سربراہانِ مملکت شکار ہوا کرتے ہیں، حتیٰ کہ خود راوی اس بات کا اعتراف کرچکا ہے کہ: "اسلامی لشکر میں عبداللہ ابن ابی اور منافقین کا ایک گروہ شامل تھا۔ ان لوگوں کو موقع ملا انہوں نے حضرت عائشہؓ پر تہمت لگائی۔ اس تہمت کا اصل بانی منافقین کا سرغنہ عبداللہ ابن ابی منافق تھا لیکن آنحضرت ﷺ آیات براءت نازل ہونے کے بعد بھی نہ عبداللہ ابن ابی کو کچھ کہہ سکے نہ دوسرے منافقین کو۔ آپ نے حد جاری فرمائی تو تین صادق الایمان مسلمانوں پر جو سب کے سب جلیل القدر صحابی ہیں یعنی حضرت حسان ابن ثابت مداح رسول رضی اللہ عنہ، اور حضرت مسطح ابن اثاثہ جو عباد ابن مطلب کے پوتے یعنی آنحضرت ﷺ کے بھتیجے اور ماں کی طرف سے صخر ابن عام کی بیٹی (جو حضرت ابوبکرؓ کی خالہ تھیں) کی لڑکی کے صاحبزادے یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پھوپھی زاد بھائی تھے اور حضرت حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا یعنی آنحضرت ﷺ کی پھوپھی زاد بہن اور ام المومنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کی حقیقی بہن تھیں۔ صرف ان تین آدمیوں پر جو سارے ہی سچے مسلمان اور آپ کے جان نثار تھے اور منافقین کی سازش کا اپنی سادگی سے شکار ہو گئے تھے۔ ان پر تو آپ نے حد جاری فرمادیا اور وہ منافقین جو اصل تہمت لگانے والے تھے، خصوصاً ان کا سرغنہ یعنی عبداللہ ابن ابی ان کو ایسا صاف چھوڑ دیا جیسے انہوں نے کچھ کیا ہی نہیں تھا۔

ہم پہلے بھی بتاچکے ہیں کہ منافق ان لوگوں کو کہتے ہیں جو بظاہر اسلام لے آتے ہیں، مسلمانوں میں گھلے ملے رہتے ہیں، سارے اسلامی احکام بجا لاتے ہیں ان کے ساتھ مسلمانوں جیسا برتاؤ ہی کیا جاتا ہے، سارے اسلامی احکام ان پر نافذ ہوتے ہیں مگر ان کے دل میں اسلام نے کماحقہ گھر نہیں کیا ہوتا۔ اور آنحضرت ﷺ کے متعلق معلوم ہے کہ آپ حدود الٰہی میں ذرا بھی رعایت نہیں فرماتے تھے۔ جیسا کہ خود صحیح بخاری باب مناقب اسامہؓ اور کتاب المغازی باب فتح مکہ اور کتاب الحدود نیز صحیح مسلم کتاب الحدود میں یہ

حدیث موجود ہے (جسے ہم پہلے بھی بیان کر چکے تھے) کہ حضرت اسامہ رسول اللہ ﷺ کے محبوب کہلاتے تھے۔ مکہ معظمہ میں ایک مخزومی عورت نے جب چوری کی تو لوگوں نے سفارش کے لیے حضرت اسامہؓ کو ہی انتخاب کیا انہوں نے سوچا کہ سوائے اسامہؓ کے یہ جرأت اور کون کر سکتا ہے ان لوگوں کے کہنے سے حضرت اسامہؓ نے سفارش کی، رسول اللہ ﷺ کا چہرہ متغیر ہو گیا آپ نے فرمایا: "اے اسامہؓ تم اللہ کی حدود میں سے ایک حد میں سفارش کرتے ہو؟" حضرت اسامہؓ نے عرض کیا: "اے اللہ کے رسول! میرے لیے دعائے مغفرت کیجئے۔" اس حقیقت کے ہوتے ہوئے سوال یہ ہے کہ منافقین کے سلسلہ میں خصوصاً عبد اللہ ابن ابی کے حق میں آپ نے یہ طرز عمل کیوں اختیار فرمایا کہ انہیں آپ نے کھلی چھٹی دے دی۔ کیا حضرت سعد ابن عبادہ کی اس دھمکی سے ڈر کر جو انہوں نے حضرت سعد ابن معاذؓ کے مقابلہ میں علی الاعلان دی تھی، آپ نے ان خزرجیوں کو ہاتھ لگانا مناسب نہیں سمجھا؟ حدود الٰہی کے مقابلہ میں کیا آپ بھی ان مصلحت کو شیوں کا (العیاذ باللہ) شکار ہو جایا کرتے تھے؟ اگر ایسا ہی تھا تو پھر دوسروں سے کیا توقع رکھی جاسکتی ہے؟

(۲۹) اس کے بعد آنحضرت ﷺ جب حضرت ابو بکر صدیقؓ کے گھر تشریف لائے اور حضرت عائشہؓ سے تہمت کے بارے میں خطاب فرمایا تو راوی کہتا ہے کہ: "جب رسول اللہ ﷺ نے اپنی بات ختم کی تو حضرت عائشہؓ کے آنسو بالکل خشک ہو گئے۔ آنسو کا ایک قطرہ بھی نہ ٹپکا، حضرت عائشہؓ نے والد حضرت ابو بکر صدیقؓ سے کہا: "آپ میری طرف سے رسول اللہ ﷺ کو جواب دیجئے۔ حضرت ابو بکرؓ نے کہا: "اللہ کی قسم میں نہیں جانتا کہ میں رسول اللہ ﷺ کو کیا جواب دوں۔" پھر حضرت عائشہ نے اپنی والدہ سے کہا کہ: "آپ رسول اللہ ﷺ کی بات کا جواب دیجئے انہوں نے کہا کہ: "اللہ کی قسم مجھے نہیں معلوم کہ میں رسول اللہ ﷺ کو کیا جواب دوں"۔ یہ جواب سن کر حضرت عائشہ صدیقہؓ نے جو ایک نو عمر لڑکی تھیں جواب دینے کا ارادہ کیا الخ "اس میں حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت ام رومانؓ کا جواب دینے سے پہلو تہی فرمانا قطعاً انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ وہ کئی دنوں اور راتوں سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر جو گزر رہی تھی وہ کھلی آنکھوں دیکھ رہے تھے اس کا ماں باپ کے دل پر کیا اثر ہو گا۔ اسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں وہ دونوں بھی حضرت عائشہ کے ساتھ روتے رہے تھے۔ اور وہ دونوں ڈر رہے تھے کہ (بقول راوی) ان کے رونے سے کہیں ان کا کلیجہ نہ پھٹ جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے جو کچھ فرمایا تھا وہ کچھ غیر معقول بات بھی نہیں تھی۔ آپ نے تہمت لگانے والوں کی بات کی تائید و توثیق بھی نہیں فرمائی تھی۔ ان دونوں حضرات کو بات کا جواب دینے سے کیا امر مانع تھا۔ فطرت انسانی کا تقاضا تھا کہ وہ اس ناگوار صورت حال کو جتنی جلد ختم کر سکتے تھے کریں۔ نہ کہ اس کو اور طول دیں۔ کیا وہ حضرت اسامہؓ اور حضرت عمرؓ ابن الخطاب کی طرح محض حضرت عائشہؓ کی برأت اور اہل نفاق کی اس سازش کا پردہ بھی چاک نہیں فرما سکتے تھے۔ لیکن چلیے اسے حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت ام رومانؓ کی غایت عقیدت واحترام پر محمول کر کے اگر نظر انداز بھی کر دیا جائے تو یہ بات کیسے نظر انداز کی جاسکتی ہے کہ وہ حضرت عائشہؓ کے متعلق راوی کا یہ ریمارک قطعاً غلط ہے کہ وہ ایک نو عمر لڑکی تھیں اور اس وقت تک زیادہ قرآن بھی پڑھی ہوئی نہیں تھیں۔ ہم اپنے مقام پر ثابت کر چکے ہیں کہ حضرت عائشہؓ کی عمر رخصتی کے وقت کم از کم انیس سال تھی لہٰذہ ۵ھ میں وہ کم از کم بائیس سال کی ایک جوان عورت تھیں۔ ماں باپ کے گھر میں بچپن سے قرآن کریم کی تلاوت ہوتے دیکھتی اور سنتی آ رہی تھیں اور آنحضرت ﷺ کے ہاں تشریف لے آنے کے بعد تو ہر صبح و شام آپ کا مشغلہ ہی قرآن پڑھنا اور سننا تھا۔ امور خانہ داری میں مصروفیت بھی برائے نام ہی تھی۔ مہینہ مہینہ بھر تک گھر میں چولہا نہیں جلتا تھا، کھجور اور دودھ پر گزارہ ہوتا تھا اور اکثر اس کا بھی ناغہ ہو جاتا تھا تو آپ کو گھر میں سوائے قرآن شریف پڑھنے اور سننے کے کام کیا تھا۔ لہٰذہ راوی کا یہ کہنا کہ وہ نو عمر لڑکی تھیں اس وقت تک زیادہ قرآن بھی پڑھی ہوئی نہیں تھیں خلافِ واقعہ اور خلافِ حقیقت ہے۔

(۳) اس کے بعد راوی نے حضرت عائشہؓ کی جواب دہی نقل فرمائی ہے کہ حضرت عائشہ نے کہا: "اللہ کی قسم میں جانتی ہوں کہ تم لوگوں نے یہ بات سنی ہے اور وہ تمہارے دلوں میں جم گئی ہے۔ اور تم نے اسے مان بھی لیا ہے۔ اب اگر میں یہ کہوں کہ میں بری ہوں تو تم مجھے سچا نہ سمجھو گے۔ اور اگر میں تم سے اس امر کا اقرار کر لوں حالانکہ اللہ جانتا ہے کہ میں اس سے بری ہوں تو تم مجھے سچا سمجھو گے؟ اللہ کی قسم میں اپنی اور تم لوگوں کی مثال یوسف علیہ السلام کے باپ کے مثل سمجھتی ہوں جبکہ انہوں نے یہ کہا تھا۔

فَصَبْرٌ جَمِيلٌ ۖ وَاللَّهُ الْمُسْتَعَانُ عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ ﴿١٨﴾

میں بھی (ان کی طرح) خوبصورتی کے ساتھ صبر کرتی ہوں اور جو کچھ تم لوگ کہہ رہے ہو، اس پر اللہ ہی مددگار ہے۔ یہ کہہ کر حضرت عائشہؓ منہ پھیر کر اپنے بچھونے پر لیٹ گئیں۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ کا جواب نہایت معقول اور موقع و محل کے عین مطابق ہے اور ان کی قرآن دانی اور قرآن فہمی کا کھلا ثبوت ہے۔ غم واندوہ میں شدّت جذبات کے ماتحت حضرت یعقوب علیہ السلام کا نام یاد آنا عین فطرت

نسوانی بلکہ فطرتِ انسانی کے مطابق ہے۔ اس موقعہ پر کہانی نویس نے اپنے فن کا اچھا مظاہرہ کیا ہے لیکن آخر میں وہ پھر پٹڑی سے اتر گیا۔ ایسے موقعہ پر حضرت عائشہ کا منہ پھیر کر اپنے بچھونے پر لیٹ جانا نہ صرف بد تمیزی اور گستاخی کی دلیل ہے اور اس سے پہلے ماں باپ کی جو کردار نگاری راوی نے کی تھی اس کے قطعاً خلاف ہے۔ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ ابو بکرؓ اور ام رومان کی بیٹی ہیں جو آنحضرت ﷺ کے سامنے شدید ضرورت کے وقت بھی لب کشائی کی جرات نہیں فرماتے، ان کی بیٹی یوں منہ پھیر کر پڑ رہتی ہے جبکہ یہ موقعہ تھا کہ وہ ان تاثرات اور رد عمل کا بغور مطالعہ کرتیں جو ان کے ان کلمات سے آنحضرت ﷺ کے چہرہ اقدس پر مرتب ہوئے تھے جو انہوں نے آنحضرت ﷺ کے ارشادات پر جواباً عرض کئے تھے۔

۳۱۔ اس کے بعد راوی کہتا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں اللہ کی قسم رسول اللہ ﷺ ابھی اپنی جگہ سے اٹھنے بھی نہ پائے تھے اور نہ گھر کا کوئی آدمی باہر جانے پایا تھا کہ آپ پر وحی نازل ہونے لگی۔ اور جو شدت آپ پر بوقتِ نزولِ وحی ہوا کرتی تھی وہ شروع ہو گئی۔ سردی کا دن ہونے کے باوجود وحی کے بوجھ سے آپ کے جسم اطہر سے پسینہ موتیوں کی طرح ٹپک رہا تھا۔ الخ۔

سبحان اللہ! اس ساری داستان پر اگر دشمنان اسلام یہ پھبتی کسیں کہ محمد ﷺ تہمت لگانے والوں کا تو کچھ نہ کر سکے اور نہ دلائل و شواہد سے اپنے حرم محترم کی برأت ثابت کر سکے۔ آخر وحی کا ڈھونگ رچا کر (نعوذ باللہ) ان کی برات کا بزعمِ خود اعلان کرنے کا ایک بہانہ تراش لیا تو کیا جواب دیا جائے گا۔ ہم خود ہی دشمنان اسلام کے لیے اسلام اور پیغمبرِ اسلام کو بدنام اور مطعون کرنے کے لیے مواد مہیا کرتے ہیں پھر طعن کرنے والوں پر زبان طعن دراز کرتے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ۔

یہ تھا اس روایت کا تجزیہ محض درایت کے نقطۂ نظر سے۔ بات بہت طویل ہو گئی ہے مگر چونکہ بات بہت اہم تھی اس لیے ہمیں تفصیل کے ساتھ بحث کرنی پڑی ہم نے درایت کے نقطہ نظر سے اکتیس وجوہ پیش کی ہیں جن میں سے ہر وجہ ایسی ہے کہ اس کی بناء پر اس روایت کو رد کیا جا سکتا ہے۔ بہر حال قرآن کریم نے تمام آیات میں کہیں بھی حضرت عائشہ صدیقہؓ اور ان پر تہمت لگائے جانے کا کوئی تذکرہ نہیں کیا لہٰذہ کسی کو کوئی حق حاصل نہیں ہے وہ خواہ مخواہ کی کہانیاں گڑھے اور حضرت عائشہؓ پر انگشت نمائی کا سامان پیدا کرے۔ علامہ شبلی نعمانی اپنی سیرت النبی حصہ اول میں ص ۴۲۷ پر لکھتے ہیں کہ:

"واقعہ افک یعنی حضرت عائشہ پر منافقین نے جو تہمت لگائی تھی وہ اس لڑائی (مریسیع) سے واپسی پر پیش آیا تھا۔ احادیث اور سیر کی کتابوں میں اس واقعہ کو نہایت تفصیل سے نقل کیا گیا ہے لیکن جس واقعہ کی نسبت قرآن مجید میں صاف مذکور ہے کہ سننے کے ساتھ ہی لوگوں نے یہ کیوں نہ کہہ دیا کہ: "یہ بالکل افترا ہے" اس کو تفصیل کے ساتھ لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ البتہ اس سے یہ اندازہ کرنا چاہیے کہ محض جھوٹ اور بے ہودہ خبر بھی کس طرح پھیل جاتی ہے۔ یہ خبر اصل میں منافقین نے مشہور کی تھی لیکن بعض مسلمان دھوکہ میں آگئے جن کو تہمت لگانے کی سزا دی گئی۔ جیسا کہ صحیح مسلم وغیرہ میں مذکور ہے۔

آج کل کے عیسائی مورخوں نے بھی قدیم مورخوں کی طرح اس واقعہ کو اس جوش مسرت سے لکھا ہے کہ خود بخود ان کے قلم میں روانی آگئی ہے لیکن ہم ان سے توقع بھی یہی کر سکتے تھے۔

آپ نے دیکھا کہ اگرچہ علامہ شبلیؒ نعمانی احادیث و سیر کی اس موضوعہ داستان کو رد نہیں فرما سکے کیونکہ ان کے عہد میں ابھی لوگوں میں اتنی جرأت پیدا نہیں ہوئی تھی لیکن ان کی سلیم الطبعی اپنے قلم کو اس موضوع داستان سے ملوث کرنا بھی پسند نہیں کرتی۔ اس لیے وہ ایک سرسری تذکرہ کر کے گزر جانے ہی کو بہتر تصور فرما رہے ہیں ایک سلیم الطبع انسان کے لیے ان کا یہ خفیف سا اشارہ سا اشارہ بھی تردید سے کم نہیں ہے۔

شان نزول کی دوسری روایت

آخر میں ان حضرات کی خدمت میں جو آیات قرآنی کی تفسیروں میں شان نزول کی احادیث بغیر گزارہ ہی نہیں کر سکتے ان ہی آیات کی تفسیر میں مستدرک حاکم کی یہ روایت پیش خدمت ہے جس کی رو سے اس آیت کریمہ کا شان نزول حضرت عائشہ صدیقہؓ کے بارے میں مشہور قصے کے بجائے حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کے واقعہ کو بتایا گیا ہے۔ مستدرک میں ہے:

حدثنا علی ابن حمشاد العدل قال حدثنا احمد بن علی الا بار قال حدثنا الحسن ابن حماد سجادہ قال حدثنی یحیٰی ابن سعید الاموی قال حدثنا ابو معاذ سلیمان بن الارقم الانصاری عن عروۃ رضی اللہ عنہا عن عائشۃ رضی اللہ عنہا قالت اھدیت ماریۃ الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ومعھا ابن عم لھا قالت فوقع علیھا وقعۃ فاستمرت حاملًا قالت فعزلھا عند ابن عمھا قالت فقال اھل الافک والزور من حاجتہ الی الولد دعی ولد غیرہ وکانت امہ قلیلۃ اللبن فابتاعت لہ ضائنۃ لبون فکان یغذیٰ بلبنھا فحسن علیہ لحمہ قالت عائشۃ رضی اللہ تعالیٰ عنھا فدخل بہ علی النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ذات یوم فقال کیف ترین فقلت من غذی بلحم الضان یحسن لحمہ قال وما آشبہٗ قالت فحملنی ما تحمل النساء من الغیرۃ ان قلت ما اری شئیا قالت فبلغ رسول اللہ

ﷺ ما یقول الناس فقال لعلی رضی اللہ عنہ خذ ھذا السیف فانطلق فاضرب عنق ابن عم ماریة حیث وجدته قالت فانطلق فاذا ھو فی حائط علی نخلة یخترف رطبھا قالت فلما نظر الی علی رضی اللہ عنہ ومعه السیف استقبلته عدة قال فسقطت الخرقة فاذا ھو لم یخلق اللہ له ما للرجال شئی ممسوح۔ (مستدرک حاکم ج۴ص۳۹)

"ہم سے علی ابن حمشاد نے حدیث بیان کی ہے جو ثقہ راوی ہیں انہوں نے کہا کہ ہم سے احمد بن علی ابّار نے حدیث بیان کی۔ انہوں نے کہا کہ ہم سے حسن بن حماد سجادہ نے حدیث بیان کی، انہوں نے کہا کہ مجھ سے یحیٰ ابن سعید اموی نے حدیث بیان کی، انہوں نے کہا کہ ہم سے ابو معاذ سلیمان ابن الارقم انصاریؒ نے حدیث بیان کی، انہوں نے عروہ سے، انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بیان کیا کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا: "ماریہؓ رسول اللہ ﷺ کو تحفہ میں بھیجی گئی تھیں اور ان کے ساتھ ان کا چچازاد بھائی بھی۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے ان سے مقاربت فرمائی تو انہیں حمل رہ گیا۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ اس کے بعد حضور اکرم ﷺ نے ان سے (حمل کی بناپر) الگ رہے (تاکہ حمل کو نقصان نہ پہنچے) اور انہیں ان کے چچازاد بھائی کے پاس بھیج دیا، حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ اہل افک اور اہل زور نے کہا کہ محمد (ﷺ) کو بیٹے کی ضرورت تھی۔ لہٰذا انہوں نے دوسرے کے بیٹے پر دعویٰ کر دیا (کہ میرا بیٹا ہے) ابراہیمؓ کی ماں کا دودھ کم تھا، آپ نے اس کے لیے دودھ دینے والی بکری خرید دی چنانچہ اسی کا دودھ اسے پلایا جاتا تھا۔ بچہ پر خوب گوشت چڑھ گیا۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ ایک دن بچہ کو لے کر آنحضرت ﷺ میرے ہاں آئے اور فرمانے لگے۔ کیوں کیسا لگتا ہے تو میں نے کہا جسے بکری کا گوشت غذا میں دیا جائے گا اس پر گوشت کیوں نہ چڑھے گا۔ آپ نے فرمایا مشابہت نہیں دیکھتیں۔ مجھے وہی رشک سوار ہوا جو عورتوں کو ہوا کرتا ہے۔ میں نے کہہ دیا، مجھے تو کوئی مشابہت نظر نہیں آتی۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کو بھی وہ بات پہنچی جو لوگ آپس میں کرتے تھے۔ تو آپ ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا: "یہ تلوار لو اور جاؤ ماریہؓ کا چچازاد بھائی جہاں بھی ملے اس کی گردن اڑا دو۔" حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضرت علیؓ گئے تو وہ ایک باغ میں کھجور کے درخت پر چڑھا ہوا پکی کھجوریں توڑ رہا تھا۔ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ اس نے حضرت علیؓ کو دیکھا اور ان کے ہاتھ میں تلوار دیکھی تو اس پر کپکپی طاری ہو گئی اور اسکی لنگوٹی گر پڑی تو یکبارگی (حضرت علیؓ نے دیکھا) اللہ نے اس کے وہ کچھ پیدا ہی نہیں فرمایا تھا جو مردوں میں ہوتا ہے۔ محض سپاٹ جگہ تھی۔ (یعنی وہ مخنث آدمی تھا)

یہ حدیث مستدرک حاکم کی ہے۔ مستدرک کے متعلق حاکم کا دعویٰ یہ ہے کہ میں نے اس میں وہ صحیح احادیث جمع کی ہیں جو صحیح ہیں لیکن امام بخاری اور امام مسلم سے رہ گئی ہیں۔ ان کے اس دعوے کو تمام محدثین نے تسلیم کیا ہے، چنانچہ شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد عثمانی اپنے مقدمہ اعلاء السنن میں لکھتے ہیں کہ:

"حافظ ابو عبد اللہ حاکم نے مستدرک میں ان احادیث کو درج کرنے کا اہتمام فرمایا ہے جو بخاری اور مسلم سے زائد ہیں یعنی ان دونوں کی شرط پر صحیح ہیں یا ان میں سے کسی ایک کی شرط پر صحیح ہیں یا فی نفسہٖ صحیح ہیں اگرچہ ان میں سے کسی ایک کی شرط پر نہ بھی ہوں۔

(قواعد فی علوم الحدیث مع التعلیق لعبد الفتاح ابو غدہ ص ۷۰ مطبوعہ بیروت)

بہر حال یہ بھی اسی درجہ کی حدیث ہے جیسا کہ بخاری اور مسلم کی وہ حدیث ہے جس پر ہم تفصیلی بحث کر چکے ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ مستدرک حاکم کی یہ روایت بھی حضرت عائشہؓ ہی سے مروی ہے۔ اور ان سے بیان کرنے والے بھی حضرت عروۃ ابن الزبیرؓ ہی ہیں جو اس روایت کے راویوں میں بھی شامل ہیں جو بخاری اور مسلم نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت کی ہے تو بخاری اور مسلم کی روایت کو ماننے والے حضرات اس روایت کو کیوں نہیں مانتے۔ پھر یہ روایت مستدرک حاکم کے علاوہ صحیح مسلم میں بھی مختصراً موجود ہے چنانچہ کتاب التوبہ کے آخری باب باب براءۃ حرم النبی ﷺ عن الریبۃ میں ہے کہ:

عن انس رضی اللہ عنہ ان رجلا کان یتھم بام ولد النبی ﷺ فقال رسول اللہ ﷺ لعلی رضی اللہ عنہ اذھب فاضرب عنقه فاتاہ علی فاذا ھو فی رکی یتبرد فیھا فقال له علی اخرج فناوله یدہ فاخرجه فاذا ھو مجبوب لیس له ذکر فکف علی رضی اللہ عنہ عنه ثم اتی النبی ﷺ فقال یا رسول اللہ ﷺ انه المجبوب ماله ذکر۔ (صحیح مسلم مطبوعہ مصر ج۴ص۲۱۳۹ بتحقیق عبد الباقی)

"حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی پر آنحضرت ﷺ کی ام ولد (حضرت ماریہ قطبیہؓ) کے ساتھ تہمت لگائی جاتی تھی تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا جاؤ اور اس کی گردن مار دو۔ حضرت علیؓ اس کے پاس گئے تو یکایک وہ ایک تالاب میں ٹھنڈک حاصل کرنے کے لیے گھسا ہوا تھا۔ حضرت علیؓ نے اس سے کہا: "باہر نکل" اس نے حضرت علیؓ کو اپنا ہاتھ پکڑا دیا اور انہوں نے اسے نکالا تو یکایک اس کا آلہ تناسل کٹا ہوا تھا۔ حضرت علیؓ اسے قتل کرنے سے باز رہے، پھر آنحضرت ﷺ کے پاس آئے کہا اے رسول اللہ وہ تو مقطوع الذکر ہے اس کا آلہ تناسل نہیں ہے۔

مزید سنئے کہ حضرت ماریہؓ کے متعلق یہ روایت صرف اہلسنت کی کتابوں میں ہی نہیں شیعوں کی کتابوں میں بھی ہے۔ مشہور شیعہ عالم مولوی مقبول حسین اپنے ترجمہ قرآن کے حاشیہ پر لکھتے ہیں کہ:

تفسیر قمی میں ہے کہ عامہ کی روایت تو یہ ہے کہ یہ آیت جناب عائشہؓ کے بارے میں ہے اور جو اتہام ان پر غزوہ بنی مصطلق میں لگایا گیا تھا، اس کے بارے میں ہے اور خاصہ کی روایت یہ ہے کہ یہ آیت ام المومنین ماریہ قبطیہ کی شان میں ہے اور جو الزام عائشہؓ نے ان پر لگایا تھا اس کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ چنانچہ امام محمد باقر سے اس کی تفسیر میں روایت ہے کہ جب فرزند جناب رسولِ خدا کا انتقال ہوا اور آنحضرت ﷺ کو بہت رنج ہوا تو عائشہؓ نے کہا کہ آپ رنج کیوں کرتے ہیں؟ وہ تو جریح قبطی کا بیٹا تھا۔ پس آنحضرت ﷺ نے علی المرتضیٰ کو بھیجا اور جریح کے قتل کا حکم دیا (آگے یہ داستان بڑی طویل ہے جس کا مفہوم اور خلاصہ یہ ہے کہ علیؓ کے خوف سے جریح کا ستر کھل گیا تو معلوم ہوا کہ وہ نہ عورت ہے نہ مرد۔)

بہر حال یہ روایت تفسیر قمی میں امام محمد باقرؒ سے اور صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ صحیح مسلم کی روایت میں امام مسلمؒ کا باب برأت حرم النبی ﷺ من الریبۃ کے تحت اس روایت کو ذکر کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ امام مسلمؒ اسے آیات برأت کا شان نزول سمجھتے ہیں اور اس واقعہ کو انہی آیات پر چسپاں فرما رہے ہیں۔ ہمارے نزدیک جیسا کہ ہم نے شروع میں کہا ہے یہ روایت بھی صحیح نہیں بلکہ یہ پہلی روایت سے بھی گئی گزری ہے۔ اس پر سب سے بڑا اعتراض تو یہ وارد ہوتا ہے کہ اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ محض سنی سنائی باتوں پر بغیر کسی شہادت اور ثبوت کے اور بغیر متہم آدمی کو اپنی صفائی کا موقعہ دیئے یونہی قتل کے احکام جاری کر دیا کرتے تھے۔ ایسا تو کوئی بڑے سے بڑا سفاک ڈکٹیٹر بھی نہیں کرتا۔ وہ بھی کم از کم کچھ جھوٹے گواہ پیدا کر کے اور کوئی جھوٹا ثبوت مہیا کر کے ہی ایک معصوم جان کو قتل کرتا ہے چہ جائے کہ آنحضرت ﷺ پر اس بے ثبوت سفا کی کا اتہام لگایا جائے۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ آپ نے اس آدمی کو تو قتل کرانے کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیج دیا۔ لیکن اس کنیز کو آپ نے کچھ نہیں کہا جو زنا کی مرتکب ہوئی تھی۔ تالی ایک ہاتھ سے تو نہیں بجتی۔ زنا کا ارتکاب مرد اور عورت دونوں ہی کرتے ہیں اور دونوں یکساں مجرم ہوتے ہیں۔ اگر آپ نے اس زانی کو قتل کرانا چاہا تھا تو زانیہ کو بھی قتل کرانا چاہیے تھا۔

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے اس شخص کو قتل کیوں نہیں کیا ان کو صاف طور پر یہ حکم دیا گیا تھا کہ یہ تلوار لو اور اس کی گردن مار دو۔ یہ تو نہیں کہا گیا تھا کہ اس کو جا کر دیکھو۔ اگر وہ مقطوع الذکر ہو تو اسے چھوڑ دینا اور اگر اس کے آلہ تناسل پاؤ تو قتل کر دینا۔ انہوں نے اختیار تمیزی سے کیوں کام لیا۔ ان کا کام تو تعمیلِ ارشاد تھا انہیں اسے قتل کر دینا چاہیے تھا۔

بہر حال ہمارے نزدیک یہ روایت بھی قطعاً اس قابل نہیں ہے کہ اس پر کوئی توجہ دی جائے بلکہ ہم تو "اذا تعارضا تساقطا" کے اصول کے مطابق حضرت عائشہ کے متعلق روایت ہو یا حضرت ماریہؓ کے متعلق دونوں کو موضوع اور گھڑی ہوئی سمجھتے ہیں۔ اور یہ بھی جانتے ہیں کہ اگر اس قسم کا کوئی واقعہ اللہ تعالیٰ بتانا چاہتا تو وہ افک کے احکام بتاتے ہوئے اس قسم کے کسی واقعہ کا خود ہی ذکر فرما دیتا۔ جب اس نے ذکر نہیں فرمایا تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ان احکام کا سمجھنا ان واقعات پر موقوف نہیں۔ اس کے باوجود بھی اگر کوئی شخص کسی بھی زوجہ مطہرہ کو متہم بتانے والی موضوع روایات کا ذکر کرنا چاہتا ہے یا کم از کم ان پر لگائے گئے کسی اتہام کا ذکر ضروری سمجھتا ہے تو وہ اپنی عاقبت کی فکر کرے اور قیامت کے دن حضور اکرم ﷺ، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہے۔

وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ

کتاب السرقہ

چوری کرنے والوں کی سزا کے متعلق قرآن کریم میں ایک ہی آیت ہے جو بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ سورۃ مائدہ میں ہے:

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَاۗءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٣٨﴾ (المائدہ:۳۸)

"اور چوری کرنے والے مرد اور چوری کرنے والی عورت، تو ان دونوں کے ہاتھ کاٹ دو، یہ سزا ہے اس عمل کی جو انہوں نے کمایا۔ یہ اللہ کی طرف سے سزائے عبرت ہے اور اللہ بڑا غالب حکمت والا ہے۔"

اس آیت کریمہ میں بنیادی لفظ "السارق والسارقۃ" ہے سوال یہ ہے کہ سرقہ کسے کہتے ہیں؟ ایک آدمی کو ہم چوری کرنے والا یا چوری کرنے والی کب کہہ سکتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ لغت کے اعتبار سے چوری اسے کہتے ہیں کہ کسی غیر کا مال چھپ کر رازداری کے ساتھ لے لیا جائے۔ نیز جو چیز چرائی جائے وہ قیمتی ہونی چاہیے۔ کسی نے اگر دوسرے آدمی کے گھر سے ایک گلاس پانی لے لیا ہے تو اسے بھی چوری نہیں کہا جاتا، یا کوئی بہت ہی معمولی چیز مثلاً سوئی، دھاگہ، بٹن، آم کی ایک کیری، تھوڑا سا نمک، مرچ، لے لیا ہے تو اسے بھی چوری نہیں کہا جاتا۔ ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ وہ محفوظ جگہ سے لی گئی ہو۔ اگر سڑک پر پڑی ہوئی ہے، دروازہ کے باہر پڑی ہوئی ہے۔ یا کسی غیر محفوظ مقام مثلاً پبلک پارک یا میدان میں پڑی ہوئی ہے۔ جہاں ہر شخص بلا روک ٹوک آسکتا ہے اور وہاں سے کسی نے کوئی چیز لے لی ہے تو اسے بھی چوری نہیں کہا جاتا۔

فقہاء نے مسجدوں، پبلک اسکولوں، جماعت خانوں وغیرہ کو بھی اسی میں شامل کیا ہے جو ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ ان مقامات سے چوری کرنے کی شناعت تو اور بھی زیادہ ہے۔ لہٰذہ ان صورتوں میں سخت سزا دینے کی ضرورت ہے۔ ایسے ہی وہ چیزیں جو جلد خراب ہو جانے والی ہوں، مثلاً دودھ، دہی، سبزیاں، پکے پھل، پکا ہوا سالن، کچا گوشت وغیرہ ان چیزوں کے لے لینے کو بھی چوری نہیں کہا جائے گا۔ کیونکہ ممکن ہے یہ چیزیں اس نے اس لیے لے لی ہوں کہ ان کے خراب ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اس نے یہ سمجھا ہو کہ میں انہیں استعمال کر لوں تو یہ کام آجائیں گی ورنہ سڑ بُھس جائیں گی، اس لیے اسے بھی چوری میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہ چوری کا ثبوت اس وقت ہو گا جب وہاں کسی شبہ اور تاویل کی گنجائش نہ ہو۔ مثلاً کسی نے اپنے والدین کے ہاں سے، اپنی اولاد کے ہاں سے، کسی ذی رحم محرم کے ہاں سے کچھ چرا لیا تو چونکہ اس میں شبہ اور تاویل کی گنجائش ہے کہ وہ اس چیز کو اپنی چیز سمجھ رہا ہو۔ کیونکہ والدین ماموں، چچا، بھانجا، بھتیجا، بیٹا وغیرہ ایسے رشتے ہیں کہ آدمی ان کی چیزوں کو غیروں کی چیز نہیں سمجھتا تو اسے اصطلاحِ شریعت میں چوری نہیں کہا جائے گا۔ بشرطیکہ معاشرہ کے عرف اور رواج میں اس کی گنجائش ہو اور حاکم مجاز اس تاویل سے مطمئن ہو اور مال مسروقہ اتنا ہو کہ عرف عام میں اسے چوری نہ کہا جاتا ہو لیکن اگر بیٹے نے باپ کی تجوری توڑ کر دس ہزار روپے چرا لیے ہیں یا بکس اور الماری کو توڑ کر ماں کے زیورات چرا لیے ہیں تو میں نہیں سمجھتا کہ عرف عام میں اسے چوری نہیں کہا جا سکتا۔ لہٰذہ یہ چوری ہو گی اس پر قطع ید کی حد جاری کی جائے گی۔ چوری کرنا لوگ اوّل اوّل اپنے گھروں ہی سے سیکھتے ہیں، لہٰذہ اس کا سدباب ضروری ہے۔

بہر حال ان چند شرائط کا لحاظ ضروری ہے، اگر یہ شرائط موجود ہوں تو اس وقت اگر کوئی شخص کسی کی چیز محفوظ مقام سے خفیہ طور پر لے لے تو اسے چوری کرنا کہا جائے گا۔ اسے شریعت کے مطابق سزا دی جائے سکے گی، یہ باتیں انسانوں کی عقل عام سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کے لیے نہ کسی نص کی ضرورت ہے اور نہ کوئی بے لچک قانون بنایا جا سکتا ہے۔

ان میں سے ایک شرط یہ تھی کہ مسروقہ چیز قیمتی ہونی چاہیے۔ اس میں کہ قیمتی چیز کسے کہا جائے گا فقہاء کی رائے میں اختلاف رہا ہے۔

امام شافعیؒ کے نزدیک وہ ایک چوتھائی دینار کی قیمت کی ہونی چاہیے
امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ تین درہم قیمت کی ہونی چاہیے۔
امام ابو حنیفہؒ کا مذہب یہ ہے کہ وہ دس درہم کی قیمت کی ہونی چاہیے۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنے عہد میں ایک ڈھال کی قیمت کے برابر اگر کوئی چیز چرائی گئی تو آپ نے چور کا ہاتھ کاٹ دیا ہے۔ پھر اس میں روایات مختلف ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں ڈھال کی قیمت کتنی ہوتی تھی۔ تین درہم سے لے کر دس درہم تک روایات ملتی ہیں۔ اسی اختلاف پر فقہاء کا اختلاف مبنی ہے۔ حنفیہؒ کا قول مبنی بر احتیاط معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے زیادہ سے زیادہ قیمت والی روایات کو ترجیح دی ہے کیونکہ حدود میں احتیاط ہی مدنظر رہنی چاہیے۔

ہم شروع میں بتا چکے ہیں کہ حدود میں قرآن کریم نے جو سزائیں بیان فرمائی ہیں وہ انتہائی سزائیں ہیں۔ ہم نے یہ بھی بتایا تھا کہ عربی زبان میں "نکال" کا لفظ ایسی سزاؤں پر بولا جاتا ہے جو جرائم کی انتہائی صورتوں میں دی جائیں، اور لوگوں کے لیے سامانِ عبرت ہو سکیں۔ اب چونکہ ہمارے عہد میں اور آنحضرت ﷺ کے عہد میں بڑا تفاوت ہو چکا ہے، ضروری نہیں کہ جو چیزیں آپ ﷺ کے زمانہ میں قیمتی سمجھی جاتی تھیں وہ آج بھی قیمتی سمجھی جاتی ہوں اور جو آج قیمتی سمجھی جارہی ہیں عین ممکن ہے کہ کل کو قیمتی نہ سمجھی جائیں۔ اس بات کا مدار معاشرہ کے اقتصادی حالات پر ہی ہو سکتا ہے۔ اس لیے کوئی متعین مقدار ہمیشہ کے لیے متعین نہیں کی جاسکتی۔ لہٰذہ ہمیں نظام سزا پر بڑی احتیاط سے نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے۔ ہماری پارلیمنٹ کو غور وخوص کے بعد موجودہ حالات کے مطابق قانون سازی کرنی چاہیے اور بتانا چاہیے کہ آج کے عہد میں کس قیمت کی چیز پر ہاتھ قطع کر دینا چاہیے اور کس قیمت تک دوسری سزاؤں پر اکتفا کرنا چاہیے۔

ہمارے نزدیک جیل خانوں میں بند کر دینا اور قید و بند کی سزائیں دینا کچھ مفید نتائج مرتب نہیں کر رہا ہے۔ ہمارے جیل خانے جرائم کی اچھی خاصی تربیت گاہیں بن گئی ہیں، جیل خانوں میں جا کر مجرم بجائے کچھ نصیحت حاصل کرنے اور بجائے اپنی اصلاح کرنے کے جرائم میں پختہ کار اور عادی مجرم بن کر نکلتے ہیں۔ وہاں جرائم پیشہ لوگوں کی صحبت میں آدمی بجائے اپنی اصلاح کرنے کے متنوع جرائم سیکھ کر نکلتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے قید و بند کی سزائیں تجویز نہیں کیں۔ ورنہ حق تعالیٰ کے لیے ایسا کرنا کچھ دشوار نہیں تھا۔ یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ قرآن کریم کے عہد نزول میں جیل خانے نہیں تھے۔ اس لیے قرآن کریم نے قید و بند کی سزائیں نہیں دیں۔ خود قرآن کریم میں حضرت یوسف علیہ السلام کے تذکرہ میں فرعون کے قید خانہ کا ذکر موجود ہے۔ عرب کے آس پاس ایسی متمدن قومیں موجود تھیں جن کے ہاں جیل خانے ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں جیل خانہ بنالیا تھا حضور اکرم ﷺ نے اگرچہ کوئی جیل خانہ نہیں بنایا تھا، لیکن آپ نے لوگوں کو مختلف صحابہ کے محفوظ مکانات میں قید کیا ہے۔ روایات سے اس کا ثبوت ملتا ہے اور اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ عرب میں جیل خانوں کا رواج نہیں تھا اور وہ جیل خانوں سے واقف نہیں تھے تو جس طرح حق تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کو کشتی بنانا سکھایا تھا اور اس کی تعلیم دی تھی کیا مشکل تھا کہ وہ آنحضرت ﷺ کو جیل خانے بنانے کی تعلیم دے دیتے۔ لیکن حق تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا۔ اس سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ قید و بند کی سزائیں دینا حق تعالیٰ کو منظور ہی نہیں تھا۔ لہٰذہ جن چوریوں میں ہماری پارلیمنٹ ہاتھ نہ کاٹنے کا فیصلہ کرے اس کے لیے بجائے قید و بند کی سزاؤں کے کوڑے مارنے کی سزا مقرر کر دینی چاہیے۔ کہ قرآن کریم نے کوڑوں کی سزا مقرر فرمائی ہے اور یہ سزا اس نے اخلاقی جرائم ہی میں تجویز کی ہے۔

واضح رہے کہ میں جیل خانوں کی افادیت کا انکار نہیں کر رہا۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اخلاقی مجرموں کے لیے جیل خانے مفید مطلب نہیں۔ دوسری انواع کے مجرموں کو قید و بند کی سزائیں دی جاسکتی ہیں نیز جب تک مقدمات کے فیصلے نہ ہو پائیں اتنے عرصہ تک مجرموں کو قید میں رکھا جاسکتا ہے۔ لیکن دوسرے عادی مجرموں کے ساتھ انہیں اختلاط کی اجازت نہ ہونی چاہیے۔ ساتھ ہی ہمیں جیل خانوں کی اصلاح کی طرف بھی خصوصی توجہ دینی چاہیے تاکہ وہ اصلاح گھر بن سکیں جرائم کی تربیت گاہیں نہ رہیں۔

قطع ید

نیز آیت کریمہ میں قطع ید کا لفظ بھی قابل غور ہے قطع کے معنے کسی چیز کو کاٹ دینا۔ راغب نے کہا ہے کہ یہ لفظ حسی چیزوں کے کاٹنے پر بھی بولا جاتا ہے جیسے "قطع اللحم" اس نے گوشت کاٹا اور معنوی چیزوں کے کاٹنے پر بھی بولا جاتا ہے۔ جیسے "قطع السبیل"، یعنی ڈاکہ ڈال کر راستہ کو پُرخطر بنادینا کہ لوگ ڈر کے مارے سفر نہ کر سکیں۔ "قطع لسانہ" کسی پر احسان وانعام کر کے اس کی زبان بند کر دینا کہ وہ بدگوئی نہ کر سکے۔ "قطع رحمہ" اس نے قرابت داری کے حقوق کو ادا نہیں کیا۔ قرآن کریم میں ہے:

وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ (البقرہ: ۲۸)

"وہ ان رشتوں کو قطع کر دیتے ہیں جنہیں اللہ نے ملانے کا حکم دیا تھا۔"

یہاں بھی حسی قطع نہیں بلکہ معنوی قطع مراد ہے" قَطَعَ خصمہ

بالحجة" اس نے دلائل وبراہین سے فریق مقابل کو ساکت اور لاجواب کر دیا۔ قطعت لسانہ۔ اس کی زبان جو پہلے بڑی تیز چلا کرتی تھی بند ہو کر رہ گئی۔ قطعت یدہ "اس کا ہاتھ بے کار ہو گیا۔" قرآن کریم نے سورۃ یوسف میں قطع ید کا لفظ ہی استعمال فرمایا ہے۔

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِيْنَةِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ تُرَاوِدُ فَتٰىهَا عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ۭ اِنَّا لَنَرٰىهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٣٠﴾ فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَيْهِنَّ وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّاٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا وَّقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ۚ فَلَمَّا رَاَيْنَهٗٓ اَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ۭ اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ﴿٣١﴾

"اور شہر کی بعض عورتیں کہنے لگیں دیکھو عزیز (مصر) کی بیوی اپنے غلام پر ڈورے ڈالنے لگی ہے تاکہ اسے رجھالے، وہ اس کی چاہت میں اپنا دل ہار بیٹھی ہے۔ ہمارے خیال میں تو وہ صریح بدچلنی کا شکار ہو گئی ہے۔ جب عزیز (مصر) کی بیوی نے ان کی مکاری کی یہ باتیں سنیں تو انہیں بلوا بھیجا اور ان کے لیے مسندیں آراستہ کیں (اور دستور کے مطابق) ہر ایک کے ہاتھ میں ایک ایک چھری تھما دی (کہ کھانا کھانے میں کام آئے) پھر (جب یہ سب کچھ ہو چکا تو) یوسفؑ سے کہا ان سب کے سامنے نکل آؤ۔ جب یوسفؑ نکل آیا اور ان عورتوں نے اسے دیکھا تو (ایسا پایا کہ) اس کی بڑائی کی قائل ہو گئیں۔ انہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے اور بے اختیار پکار اٹھیں سبحان اللہ یہ تو انسان نہیں ہے ضرور ایک فرشتہ ہے، بڑے مرتبہ والا فرشتہ۔"

یہاں "قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ" کے معنے یہ تو نہیں ہیں کہ انہوں نے پہنچوں سے ہاتھ کاٹ کر الگ ڈال دیئے تھے۔ بلکہ اس کے معنے یا تو یہ ہیں کہ کھانا کھاتے کھاتے ان کے ہاتھ فرط حیرت سے رک گئے اور جو پھل وغیرہ وہ کاٹ رہی تھیں وہ کاٹنا ہی بھول گئیں یا یہ معنے ہیں کہ چھری ان کے ہاتھوں میں تھی وہ فرطِ حیرت سے بجائے پھل کاٹنے کے اپنے ہاتھوں کو زخمی کر بیٹھیں۔ بہرحال یہاں "قطعن ایدیھنّ" کے معنے ہاتھوں کو روک لینے یا زخمی کر لینے کے ہیں۔ سورۃ عنکبوت میں قوم لوطؑ کے متعلق ہے۔

اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ (العنکبوت:۲۱)

"کیا تم (شہوت رانی کے لیے) مردوں کے پاس جاتے ہو اور راستہ بند کرتے ہو۔"

اس آیت میں "قطع السبیّل" کے معنے یا تو یہ ہیں کہ تم ڈاکے ڈالتے ہو اور لوگوں کو سفر کرنے سے روک دیتے ہو یا یہ معنے ہیں کہ تم اپنی بدعملی یعنی لواطت سے افزائش نسل کی راہیں بند کرتے ہو۔ بہرحال دونوں معنے ہیں حسی کاٹنا نہیں ہے بلکہ معنوی قطع مراد ہے "قُطِعَ الرجل" کے معنے ہیں، آدمی ناامید ہو گیا اور عاجز رہ گیا۔ (راغب، ابن فارس، تاج العروس ومحیط المحیط)

اس میں دوسرا لفظ یَدٌ ہے۔ ویسے تو اس کے معنے ہاتھ کے ہیں لیکن اس لفظ کا استعمال عربی زبان میں نہایت وسیع ہے۔ جیسے اردو زبان میں ہاتھ کا لفظ نہایت ہی وسیع ہے اسی طرح عربی زبان میں بھی ید کا لفظ بے شمار معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً: جاہ اور وقار، قوت واقتدار، غلبہ و تسلّط، ملکیت، مددگار، امداد اور فریاد رسی، احسان وانعام، حفاظت وصیانت، حذاقت ومہارت، ندامت وشرمندگی، ذلت وانقیاد جیسے بہت سے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ خود قرآن کریم میں یہ الفاظ ان میں سے بہت سے معنوں میں استعمال ہوا ہے مثلاً:

قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ (آل عمران:۷۳)

"پیغمبر اسلام کہہ دیجئے کہ فضل اللہ کے اختیار اور قبضہ میں ہے۔"

بِيَدِكَ الْخَيْرُ (آل عمران:۲۴)

"بھلائی تیرے قبضہ میں ہے۔"

اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ (البقرہ:۳۳)

"یا وہ معاف کر دے جس کے اختیار میں نکاح کا بندھن باندھا ہے۔"

قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ (المومنون: ۸۸)

ترجمہ: اے پیغمبر کہہ دیجئے کہ ہر چیز کی حکومت کس کے اقتدار میں ہے۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ (الملک:۱)

ترجمہ: بابرکت ہے وہ ذات جس کے قبضہ واقتدار میں حکومت ہے۔

قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ۭ اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ ﴿٧٥﴾ (ص: ۷۵)

"حق تعالیٰ نے فرمایا اے ابلیس تجھے کس چیز نے روکا کہ تو اسے سجدہ کرے جسے میں نے اپنی قدرت سے پیدا کیا تھا۔"

وَاذْكُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اُولِي الْاَيْدِيْ وَالْاَبْصَارِ (ص:۴۵)

"اور ہمارے بندوں ابراہیم، اسحٰق اور یعقوب کا تذکرہ کیجئے جو بڑی قوتوں کے مالک تھے۔"

قرآن کریم میں اور بھی بہت سی آیات میں جن سے ان معانی پر

روشنی پڑتی ہے۔ حق تعالیٰ کی ذات ہاتھ پاؤں سے منزہ ہے۔ حق تعالیٰ کے ہاتھ سے کوئی کام ہونے کا مطلب یقیناً یہی ہو سکتا ہے کہ اس کی قدرت، ارادہ، قبضہ، اقتدار، غلبہ، اور تسلط کی بنا پر وہ کام ہوا ہے۔ لہٰذہ قطع الید کے معنے کسی کی قدرت، قبضہ، اور اقتدار یا غلبہ و تسلّط کو ختم کر دینے سے بھی ہونگے۔ نیز قطع الید کے معنے ہاتھوں کو زخمی اور بے کار کر دینے کے بھی ہوسکتے ہیں جیسا کہ عزیز مصر کی بیوی نے جب شہر کی خواتین کو بلایا تو حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر فرط حیرت واستعجاب سے مبہوت ہو کر ان کے ہاتھ رک گئے۔ یا انہوں نے اپنے ہاتھوں کو زخمی کر لیا تھا، نیز قطع الید کے معنے یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ ہاتھ کے کسی حصہ کو کاٹ کر الگ کر دیا جائے۔ پانچوں انگلیوں اور ہتھیلی کو پہنچے سے کاٹ دینا بھی" قطع الید" کہلا سکتا ہے نیز ہاتھ کی کسی انگلی کو یا انگوٹھے کو کاٹ دینا بھی" قطع الید" کہلا سکتا ہے۔ بہر حال" قطع الید" کی یہ تمام صورتیں ہو سکتی ہیں خود ہمارے ہاں اردو زبان کا محاوہ ہے کہ تم نے دستاویز پر دستخط کر کے اپنے ہاتھ ہی کاٹ لیے یعنی اپنے اختیار کو ختم کر دیا اور اپنے آپ کو پابند و مجبور معذور بنالیا۔ یہ تمام صورتیں" قطع الید" ہی کی ہیں۔ چوری میں حکومتِ وقت کو اس قسم کی قانون سازی کرنی چاہیے کہ کتنے بڑے جرم میں اسے قطع ید کی کونسی صورت اختیار کرنی چاہیے، بہر حال قطع ید کی یہ صورت کہ ہاتھ کو پہنچے سے کاٹ دیا جائے انتہائی اور آخری سزا ہے جو اسی وقت دی جاسکتی ہے جبکہ کسی آدمی نے بہت بڑی چوری کی ہو۔ اور اسلامی رفاہی حکومت قائم ہو۔ اس کی تمام بنیادی ضروریات کی کفالت حکومت کر رہی ہو۔ اسے چوری کرنے کی کوئی ضرورت اور احتیاج لاحق نہ ہو۔ اگر ان حالات میں کوئی شخص لاکھ دو لاکھ روپئے کی بڑی چوری کرتا ہے تو اس کے ہاتھ کاٹ دینا چاہیے۔ اس سے کم مقدار کی چوری میں اس کی صرف ایک آدھ انگلی کاٹ دی جائے، اس سے کم میں اس کے ہاتھوں کو صرف زخمی کر دیا جائے، اس سے بھی کم مقدار میں کوئی ایسی تدبیر کی جائے کہ وہ اپنے ہاتھوں سے کام نہ لے سکے۔ اس کو قید کر دیا جائے یا کوئی اور صورت اختیار کی جائے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کا ہاتھ کا غلبہ واقتدار اور قوت واستعداد ناکارہ ہو کر رہ جائے۔ یہ تمام صورتیں" قطع الید" ہی کہلائیں گی اور اس طرح ہم قرآن کے ارشاد" فاقطعوا ایدیھما" ہی پر عمل کریں گے لیکن جرم کی شدت اور خفت مجرم کے حالات و کوائف کے اعتبار سے قطع ید کی صورتیں مختلف ہوں گی۔ ظاہر ہے کہ جرم اگر خفیف ہو تو اس قدر سزا نہیں دی جانی چاہیے جو شدید جرم میں دی جاتی ہے ایک شخص نے ایک لاکھ روپے چوری کیے ہیں۔ اور دوسرے شخص نے صرف ایک سو روپے چوری کیے ہیں۔ دونوں کا جرم یقیناً یکساں نہیں ہے۔ لہٰذہ دونوں جرائم کی سزا یکساں نہیں ہو سکتی، فرق کرنا ضروری ہوگا۔

سوسائٹی اور معاشرہ کے حالات بھی ہمیشہ یکساں نہیں ہوتے ایک زمانہ میں چند دراہم و دنانیر کی قدر و قیمت اور وقعت بہت زیادہ ہو سکتی ہے اور دوسرے زمانہ میں ہزار روپیہ کی بھی وقعت و منزلت نہیں ہوتی۔ اس لیے اس سلسلہ میں کوئی ایک بات ہمیشہ کے لیے طے نہیں کی جاسکتی۔ خود ہمارے بچپن میں جو ایک روپیہ کی قدر و منزلت اور قیمت ہوا کرتی تھی وہ آج ایک سو روپے کی نہیں ہے۔ لہٰذہ یہ بات طے کرنا کہ کتنے مال کی چوری پر کتنی سزا دی جائے، ہر زمانہ کی حکومت کو خود طے کرنا چاہیے۔ قرآن کریم نے اس کی مقدار متعین نہیں کی کیونکہ یہ مقدار ہر عہد اور ہر زمانہ کے لیے متعین کی ہی نہیں جاسکتی۔ اس نے صرف یہ کہا ہے کہ مجرم کو چور کہا جاسکے۔ اگر اسے چور کہا جاسکتا ہے تو اسے سزا دی جانی چاہیے اور اگر اسے چور نہیں کہا جاسکتا تو سزا نہیں دی جائے گی۔

اور قطع ید کی سزا بھی دی جائے تو اس کی کیفیت کیا ہونی چاہیے۔ کیونکہ چوری کرنے والے کو قید کر دینے سے لے کر ہاتھوں کو زخمی کر دینے۔ ہاتھ کا کچھ حصہ مثلاً ایک انگلی کاٹ دینے اور پورے ہاتھ کو پہنچے سے کاٹ کر الگ کر دینے تک سب قطع ید کی صورتیں ہیں۔ اس کا فیصلہ بھی حکومتِ وقت کو اپنے احوال و ظروف کے ماتحت کرنا چاہیے۔ نیز اگر حکومت رفاہی نوعیت کی نہیں ہے۔ افراد ملت کی بنیادی ضروریات کی کفالت حکومتِ وقت نہیں کر رہی ہے۔ معاشرہ میں معاشی ناہمواریاں ہیں، کوئی لکھ پتی ہے تو کوئی روٹی کا محتاج ہے۔ ایسی حکومت کو قطعاً اختیار نہیں ہے کہ وہ چوری کی حدود قائم کرے۔ حضرت عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ نے قحط سالی کے زمانہ میں سرقہ کی حد کو معطل فرما دیا تھا۔ نیز ابوداؤد اور نسائی نے نقل کیا ہے کہ عباد بن شرجیل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں مجھے قحط سالی نے ستایا تو میں مدینہ کے باغ میں گھس گیا اور میں نے باغ سے پھل توڑ لیے، کھائے بھی اور کپڑے میں باندھ کر لے چلا، باغ کے مالک نے آکر مجھے پکڑ لیا، مجھے مارا اور میرا کپڑا بھی چھین لیا۔ اور مجھے پکڑ کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ سے سارا واقعہ بیان کیا تو آپ نے اس انصاری سے فرمایا کہ وہ ناواقف اور جاہل تھا۔ تم نے اسے بتایا نہیں، وہ بھوکا اور گرسنہ تھا تم نے اسے کھلایا نہیں، آپ نے اس انصاری سے فرمایا کہ اس کا کپڑا اسے واپس کرو۔ اور مجھے اپنے پاس سے ایک وسق یا نصف وسق (پیمانہ کا نام ہے) کھانے کی چیزیں عطا فرمائیں۔ (ابوداؤد و نسائی بحوالہ جمع الفوائد ج ا ص ۲۹۰)

یہی ابن عبد الرحمن کا بیان ہے کہ حضرت حاطب رضی اللہ عنہ کے غلاموں نے مزینہ کے ایک آدمی کی اونٹنی چرالی اور اسے کاٹ کر کھا گئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے مقدمہ پیش ہوا۔ اول تو آپ نے کثیر ابن الصلت رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ ان

کے ہاتھ کاٹ دیں۔ لیکن فوراً ہی حضرت عمرؓ کو خیال آیا انہوں نے حضرت حاطب سے کہا میرا خیال ہے تم غلاموں کو بھوکا رکھتے ہو۔ میں تم پر اتنا تاوان ڈالوں گا جو تمہیں گراں ہو۔ پھر مزنی سے پوچھا کہ تیری اونٹنی کیا قیمت تھی؟ (ابھی مزنی کچھ کہنے نہیں پایا تھا) حضرت عمرؓ نے خود ہی کہا کہ میں اسے چار سو درہم کی فرض کرلیتا ہوں لہذا تم اس مزنی کو آٹھ سو درہم ادا کرو۔

(جمع الفوائد ج اص ۲۹۰)

بہر حال ملک وملت کے حالات و کوائف کو بھی مد نظر رکھنا ضروری ہے۔ اندھا دھند حدود کو نافذ نہیں کیا جاسکتا۔ اگر کسی نے حالات سے مجبور ہو کر چوری کی ہے۔ وہ بھوکا تھا، اس کے بیوی بچے بیمار تھے۔ اسے ان کے علاج کے لیے رقم کی ضرورت تھی اس لیے مجبور ہو کر اس نے چوری کی ہے تو حکومت اور معاشرہ اس کی چوری کا ذمہ دار ہے اسے اس کا تاوان دینا چاہیے۔

چنانچہ ابوداؤد اور ترمذی نے حضرت رافع بن عمرؓ سے نقل کیا ہے کہ میں ڈھیلے مار مار کر ایک انصاری کے نخلستان سے کھجوریں گرا رہا تھا کہ ان لوگوں نے مجھے پکڑ لیا اور حضور ﷺ کے پاس لائے۔ حضور ﷺ نے پوچھا کہ "رافع یہ تم ان کے درختوں پر کلوخ اندازی کیوں کر رہے تھے؟" عرض کیا یارسول اللہ! بھوک نے مجبور کر دیا تھا، فرمایا۔ کلوخ اندازی تو نہ کیا کرو۔ ہاں اِدھر اُدھر جو کھجوریں خود ٹپک پڑیں وہ کھا لیا کرو۔ اللہ تمہیں شکم سیر اور سیراب کرے۔"

اس واقعہ میں آنحضرت ﷺ نے حضرت رافعؓ کو کوئی سزا نہیں دی بلکہ پختہ ہو کر خود گر جانے والی کھجوریں کھانے کی اجازت مرحمت فرمادی۔

موطا امام مالک میں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ ایک آدمی اپنے ایک غلام کو پکڑ کر حضرت عمرؓ کے پاس لایا کہ اس نے میری بیوی کا آئینہ چرایا ہے۔ اس کا ہاتھ کاٹ دیجئے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جاسکتا۔ یہ تمہارا ہی تو خادم ہے اور اس نے تمہارا ہی مال چرایا ہے۔

نیز حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ مالِ خمس کے غلاموں میں سے ایک غلام نے خمس کے مال ہی میں چوری کر لی تھی اس کا مقدمہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لایا گیا۔ تو آپ نے اس غلام کا ہاتھ نہیں کاٹا اور فرمایا سب اللہ ہی کا تو مال ہے اللہ کے مال نے اللہ کا مال چرالیا ہے تو کیا ہوا۔

(للقزوینی بضعف بحوالہ جمع الفوائد ج اص ۰۹۲)

اصحاب سنن نے حضرت بسر بن ارطاۃؓ سے حضور اکرم ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ سفر میں ہاتھ نہیں کاٹے جاسکتے (سفر سے مراد عام سفر اور سفر جہاد دونوں ہیں) بہر حال روایات کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ اور حضرت خلفائے راشدین نے ہر چوری پر قطع ید کی سزا نہیں دی۔ بعض صورتوں میں معاف فرمادیا، بعض صورتوں میں غلام کے مالک سے تاوان دلوایا۔ بعض صورتوں میں معمولی تعزیر فرمادی اور بعض میں الٹا انعام بھی دیا۔

نیز بعض خاص حالات میں سزائے سرقہ کو معطل ہی فرما دیا مثلاً سفر میں قحط میں یا معمولی چیزوں کی چوری پر۔

نیز اصحاب سنن کی دوسری روایتوں سے جو حضرت عبد اللہ بن عمرو ابن العاصؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ کا یہ فیصلہ بھی ثابت ہے کہ غیر محفوظ مال کی سزا قطع ید نہیں اور درخت پر لگے ہوئے پھلوں کی چوری پر بھی قطع ید نہیں، نیز ایک خاص مقدار سے کم قیمت (نصاب سے کم چوری) پر بھی قطع ید کی سزا نہیں بلکہ ان سب صورتوں میں تعزیر ہے یا دوگنا تاوان یا دونوں۔

عباد بن شراحیل کی روایت ہم پہلے پیش کر چکے ہیں اسے غور سے دیکھئے شراحیل نے پھل توڑے تھے اور باغ والے نے انہیں مار پیٹ کر ان کا کپڑا ان سے چھین لیا تھا۔ اس سے حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ۔

ماعلمته اذا کان جاهلا ولا اطعمته اذا کان ساغبا۔

ترجمہ: یہ نادان اور جاہل تھا تو تم نے اسے تعلیم نہیں دی اور یہ بھوکا تھا تو تم نے اسے کھانا نہیں کھلایا۔

حضور اکرم ﷺ نے سے کوئی سزا نہیں دی بلکہ خود باغ والے سے اس کا کپڑا واپس دلایا اور خود اپنے پاس سے اسے غلّہ مرحمت فرمایا۔ اس حدیث میں آنحضرت ﷺ نے دراصل ایک بنیادی نکتہ ارشاد فرمادیا ہے یعنی چوری کی سزا سے پہلے دو چیزیں ضروری ہیں اول تو اخلاقی اور ذہنی تعلیم وتربیت اور دوسرے معاشی فراغت۔ ان دونوں چیزوں کے بغیر قطع ید کی سزا نہیں دی جاسکتی۔

لہٰذہ اگر تعلیم وتربیت سے یہ مرض دور ہو سکے تو قطع ید کے بجائے یہی کرنا چاہیے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ اخلاقی تعلیم اور ذہنی تربیت اور ضروریات، زندگی مہیا ہونے کے بعد بھی اگر کوئی چوری کرے تو وہ اجرائے حد کا مستحق ہوگا۔ یہی صورت حد زنا میں بھی ہے جہاں معاشرے نے جائز نکاح میں ہزار طرح کی مالی اور رواجی رکاوٹیں ڈال رکھی ہوں اور حرام کاری بہ نسبت نکاح ہزاروں درجے سہل اور آسان ہو وہاں جرم زنا حد جاری کرنا کوئی انصاف نہیں ہوسکتا، ٹھیک اسی طرح جس طرح ایک بھوک کے مارے کے لیے کچھ غلہ چرا لینے پر حد سرقہ لگانا قرینِ عدل نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ حد وہاں لگتی ہے جہاں جائز وسائل کے موجود ہوتے ہوئے ناجائز ذرائع استعمال کیے جائیں اور ایسی حالت میں حدود تعزیر سے پہلو تہی کرنا ہزار قسم کے جرائم اور فساد فی الارض کا سبب ہوسکتا ہے لہذہ ایسی سوسائیٹیاں جہاں۔

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ
بازمی گوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش

والی کیفیت ہو وہاں ایسی سزاؤں کے سلسلے میں انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے۔ اسی لیے قدیم فقہائے کرام نے اس سلسلے میں بہت ہی کڑی شرطیں عائد کی ہیں۔ یعنی وہ بتانا چاہتے تھے کہ شدید محرکات کے باوجود یہ سزائیں نافذ نہیں کرنی چاہئیں۔

دو قابلِ غور نکتے :

اس سلسلہ میں دو قابل غور نکتے ہیں جن پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے ایک نکتہ تو یہ ہے کہ سرقہ کی حد کے بیان سے چار آیات پہلے ایک بڑا اصولی اور بنیادی حکم یہ بتایا گیا ہے۔

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝٣٣ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝٣٤ (المائدہ)

"جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں، ان کی سزا بس یہی ہے کہ ان کو قتل کر دیا جائے یا پھانسی دیدی جائے یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف جہت سے کاٹ دیئے جائیں یا انہیں ملک بدر کر دیا جائے۔ یہ ان کے لیے اس دنیا میں تو رسوائی ہے اور آخرت میں ان کے لیے بڑا ہی عذاب ہے۔ بجز ان لوگوں کے جو قبل اس کے تم ان پر قابو پاؤ خود ہی باز آجائیں (اور توبہ کرلیں) تو سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ بڑے بخشش دینے والے مہربان ہیں۔"

اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کا بالکل وہی مفہوم ہے جو سبوتاج (Sabotaj) کا ہے چنانچہ ہمارے فقہاء کرام نے اس سے مراد ڈکیتی، بغاوت، اور ہر وہ فتنہ وفساد لیا ہے جو اسلامی معاشرہ کے خلاف کاری ضرب لگانے کے لیے عمل میں لایا جائے۔ سود خوری کو بھی قرآن کریم نے اللہ اور رسول کے خلاف جنگ قرار دیا ہے۔

بہرحال بغاوت ہو، ڈاکہ زنی ہو یا جو صورت بھی اللہ اور رسول کے خلاف جنگ کی سی صورت اختیار کی جائے وہ چوری کی بہ نسبت زیادہ بڑا جرم ہے اور قرآن کریم نے اس کے لیے چار متبادل سزائیں تجویز فرمائی ہیں۔ قتل، پھانسی، قطع دست وپا اور نفی من الارض۔ (جس کے معنے ملک بدر کرنا بھی ہیں اور قید کر دینا بھی) اب اہل علم کو سوچنا چاہیے کہ قرآن کریم نے چوری سے بڑے جرم کے لیے چار متبادل سزائیں رکھی ہیں تو اس سے ہلکے جرم کے لیے صرف ایک ہی سزا کیوں؟ اگر چور سے بڑے مجرم کو ملک بدر یا قید کیا جاسکتا ہے تو چور کو جو چھوٹا مجرم ہے یہی سزا کیوں نہیں دی جاسکتی؟ اس کے جواب میں یہی کہا جائے گا کہ قرآن کریم کی لفظی پیروی ہی ضروری ہے تو چور کی دوسری چوری پر آپ اس کا الٹا پاؤں کیوں کاٹتے ہیں جبکہ قرآن کریم نے تو چور کی سزا میں "فاقطعوا ایدیھما" فرمایا ہے "فاقطعوا ایدیھما وارجلھما من خلاف" تو نہیں فرمایا اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ حدیث شریف میں ایسا ہی آیا ہے اور حضور اکرم ﷺ نے اجتہاد فرما کر یعنی اسی محاربت کی آیت۔

اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ (المائدہ:۳۳)

"مخالف جہت سے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں۔"

ہی سے استنباط فرما کر یہ حکم دیا ہے کہ ایسے بدطینت انسانوں کو جو ایک مرتبہ ہاتھ کٹوانے کے بعد بھی باز نہ آئیں صرف ایک ہاتھ کاٹ دینا کافی نہیں۔ انہیں بے دست وپا کر دینا چاہیے، اور اس کی بہترین شکل مِنْ خَلاف ہی ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں ہماری گزارش یہی ہے کہ اگر آنحضرت ﷺ نے محاربت کی آیت سے استدلال فرما کر بایاں پاؤں (دوسری چوری میں) کاٹنے کا حکم دیا ہے۔ اور سرقہ کی آیت کی لفظی پابندی کو ضروری نہیں سمجھا تو اسی آیت سے یہ استنباط بھی ہو سکتا ہے۔ کہ جس طرح ایک معاشرے کو مخرب اثرات سے بچانے کے لیے بڑے مجرم (باغی یا ڈاکو) کو ملک بدر یا قید کی سزا بھی دی جاسکتی ہے، اسی طرح اگر قاضی مناسب سمجھے تو چھوٹے مجرم (چور) کو بھی یہ سزا دی جاسکتی ہے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ ملک کا قید خانہ ایسا ہو جہاں تعلیم وتربیت اور نفسیاتی علاج کے ذریعے ذہنی تربیت دے کر اور کسب معاش کے لیے بہتر ہنر سکھا کر اسے اس سرقہ کی عادت سے باز رکھنے کا قوی امکان ہو، جب چور کو معافی بھی دی جاسکتی ہے اور بعض اوقات وہ الٹا انعام بھی پاسکتا ہے، جب بھوک میں کسی کے باغ سے گری پڑی کھجوریں کھا لینے کی اجازت دی جاسکتی ہے، جب سفر اور قحط میں قطع ید سے احتراز کیا جاسکتا ہے، جب خادم کو اس سزا سے مستثنیٰ کیا جاسکتا ہے، جب ڈنڈا اور معمولی تعزیر پر اکتفاء کی جاسکتی ہے، اور ان سب حالات میں قطع ید کے قرآنی حکم سے کوئی تعارض یا تناقص لازم نہیں آتا تو کیا صرف ملک بدری اور قید ہی ایک ایسی چیز ہے جو حکم قرآنی کے خلاف جاتی ہے؟

چور اگر گرفتاری سے پہلے توبہ کرلے

دوسری بات اس سلسلہ میں یہ بھی قابل غور ہے کہ اوپر کی زیر بحث

آیت محاربہ میں ڈاکوؤں، باغیوں یا دوسرے سبو تاج کرنے والوں کی سزا بیان فرمانے کے بعد حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِن قَبْلِ أَن تَقْدِرُوا عَلَيْهِمْ ۖ فَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٣٤﴾ (المائدہ:۳۴)

"مگر یہ مجرمین اگر اپنی حرکتوں سے باز آجائیں اور توبہ کرلیں قبل اس کے کہ تم ان پر قابو پاؤ (گرفتار کرو) تو سمجھ لو کہ اللہ بخش دینے والا مہربان ہے۔"

اب ذرا چور کی سزا بھی سن لیجئے چور کے متعلق حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا جَزَاءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٣٨﴾ فَمَن تَابَ مِن بَعْدِ ظُلْمِهِ وَأَصْلَحَ فَإِنَّ اللَّهَ يَتُوبُ عَلَيْهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (المائدہ:۳۸تا۳۹)

"چوری کرنے والے مرد اور چوری کرنے والی عورت کے ہاتھ کاٹ دو، یہ ان کے کرتوت کی سزا ہے اور اللہ کی طرف سے (دوسروں کے لیے) عبرت بھی یقیناً اللہ غلبہ اور حکمت والا ہے پھر جو اپنی زیادتی کے بعد توبہ کرلے اور اپنی اصلاح بھی کرلے اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمائے گا اللہ یقیناً بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔"

یہاں غور کرنے کی بات صرف یہ ہے کہ محاربہ (سبو تاج) عام سرقہ سے بڑا جرم ہے۔ ایسے محاربین چاروں قسم کی سزاؤں سے محفوظ ہو جائیں گے اگر گرفتاری سے پہلے پہلے وہ توبہ کرلیں۔ اس پر سب کا اتفاق ہے لیکن اگر سارق سزا پانے سے پہلے توبہ کرلے اور اس کے ساتھ اصلاح حال بھی کرلے بلکہ اگر چوری کا مال واپس بھی کر دے جب بھی وہ قطع ید سے نہیں بچ سکتا۔ سب کے نزدیک اس پر حد جاری کرنا ضروری ہے اس کی وجہ؟ وجہ صرف یہی بتائی جاتی ہے کہ محاربین کی سزا کے بعد حرف استثناء "اِلَّا" آگیا ہے اور چوروں کی سزا کے بعد "اِلَّا" کے بجائے فَمَنْ آیا ہے یعنی "اِلَّا" تو استثناء کے لیے آتا ہے اور "فَمَنْ" اس لیے نہیں آتا لہٰذہ بڑے مجرم کے لیے توبہ سے معافی ہو سکتی ہے۔ لیکن چھوٹے مجرم کے لیے یہ معافی نہیں ہے۔ شیخ الاسلام امام ابو بکر جصاص رازیؒ نے احکام القرآن میں یہ بتانے کی بڑی کوشش فرمائی ہے کہ یہ معافی محارب کے لیے کیوں ہے اور سارق کے لیے کیوں نہیں ہے۔ لیکن بات بن نہیں سکی، کم از کم ہماری تسلی تو نہیں ہو سکی۔ وہ صرف اس لیے اس تفریق کے قائل ہیں کہ لوگ ایسا ہی مانتے چلے آئے ہیں۔ اور اس کو صحیح ثابت کرنے کے لیے انہوں نے بڑی کوشش فرمائی ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا ہماری تسلی نہیں ہو سکی۔ شاید اس کی وجہ ہمارا قصور فہم ہو۔ واللہ اعلم

آپ ذرا دونوں مجرموں کے لیے الفاظ کا مقابلہ کرکے دیکھیے۔

محارب		سارق
إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا		فَمَن تَابَ مِن بَعْدِ ظُلْمِهِ وَأَصْلَحَ
"جو لوگ توبہ کرلیں۔"		"پھر جو اس جرم کے بعد توبہ کرلے اور اپنی اصلاح کرلے۔"
مِن قَبْلِ أَن تَقْدِرُوا عَلَيْهِمْ		فَإِنَّ اللَّهَ يَتُوبُ عَلَيْهِ
"گرفتار سے پہلے۔"		"تو یقیناً اللہ اس کی توبہ قبول فرمالے گا"
فَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ۔		إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ
"تو سمجھ لو کہ اللہ بڑا غفور و رحیم ہے۔"		"بیشک اللہ بڑا غفور رحیم ہے۔"

خوب غور سے دیکھئے۔ کیا سارق کے لیے "فمن" کا لفظ ٹھیک اسی طرح محل استثناء میں نہیں جس طرح محارب کے لیے "الا" کا لفظ آرہا ہے۔ قرآن کریم میں تقریباً اسی / ۸۰ جگہ "فمن" کا لفظ آیا ہے وہ محل استثناء ہی میں ہے مردار، خون، لحم، خنزیر اور ما اہل لغیر اللہ بہ کا حکم بیان کرنے کے بعد کئی جگہ یوں استثناء فرمایا ہے:

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ (بقرہ:۱۷۳)

"پھر کوئی دلی خواہش اور زیادتی کئے بغیر حالت اضطرار میں کھالے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔"

کیا اس آیت کریمہ میں "فمن" بالکل اسی طرح محلِ استثناء میں نہیں ہے جس طرح آیت ذیل میں "الا" ہے۔

وَقَدْ فَصَّلَ لَكُم مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ (الانعام:۱۱۹)

"اور اللہ نے تمہارے لیے ان چیزوں کی تفصیل بیان کر دی ہے جو اس نے تم پر حرام کی ہیں بجز اس کے جس کی طرف تم مجبور ہی ہو جاؤ۔"

نیز: صوم رمضان کا حکم دینے کے بعد:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿١٨٣﴾ أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ (بقرہ:۱۸۳تا۱۸۴)

"تم پر روزے اسی طرح فرض کیے گئے ہیں جیسا کہ تم سے پچھلی امتوں پر فرض کیے گئے تھے تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو جائے یہ روزے چند گنے چنے دنوں کے ہیں۔"

اس آیت میں ایک عام قانون بیان فرما کر اس کے استثناء آرہا ہے:

فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ (البقرہ: ۱۸۴)

"تو جو کوئی تم میں سے مریض ہو یا سفر پر ہو تو وہ دوسرے دنوں سے

گنتی پوری کر دے۔"

اسی سلسلہ میں آگے ایک کلی حکم آرہا ہے:

وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ (بقرہ:۱۸۴)

"اور جو لوگ بمشکل روزہ رکھ سکیں ان پر فدیہ واجب ہے یعنی وہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔"

لیکن چونکہ یہ حکم لازم نہیں ہے اس لیے اس سے پھر استثناء آرہا ہے:

فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ (بقرہ:۱۸۴)

"پھر جو خوشی سے نیکی کرنا چاہے تو وہ اس کے لیے بہتر ہے۔"

کیا ان تمام آیات میں "فمن" کا لفظ "الا" کی طرح محل استثناء میں نہیں ہے؟ ایسی بیسیوں مثالیں قرآن کریم میں موجود ہیں سب کو پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ ذوق سلیم خود رہنمائی کر دیتا ہے کہ یہ دو مختلف انداز بیان ہیں اور مقصد دونوں کا کوئی استثناہی ہوتا ہے لہٰذہ محارب ہو یا سارق۔ قابو پانے اور گرفتار ہونے سے پہلے پہلے توبہ اور اصلاح کا یقین دونوں کے لیے معافی کا سبب بن سکتا ہے۔ بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ چھوٹے مجرم (سارق) کے لیے اس کے امکانات بڑے مجرم (محارب، ڈاکو) کے مقابلے میں زیادہ ہیں۔

بڑے ہی تعجب کی بات ہے کہ چور پر قابو پا لینے، اسے گرفتار کر لینے، اقرارِ جرم کر لینے، مالِ مسروقہ کے برآمد ہو جانے کے بعد بھی اگر چوری کی واردات سفر میں، زمانۂ قحط میں، اپنے آقا کے گھر میں یا مال خمس میں ہوئی ہو تو تمام فقہاء متفقہ طور پر چور کو معافی دیدینے کے قائل ہیں۔ لیکن اگر یہ باتیں نہ ہوں البتہ قابو پانے اور گرفتار کئے جانے سے پہلے وہ توبہ کر لے۔ اس کی اصلاح ہونے کا یقین ہو جائے تو ڈاکو اور باغی کو تو معافی دی جا سکتی ہے مگر چور کو معافی نہیں دی جا سکتی۔ ایسا کیوں ہے؟ صرف اس لیے کہ آیت سرقہ میں "الا" کا لفظ نہیں آیا بلکہ اسی معنی میں "فمن" کا لفظ آگیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ان سزاؤں کا مقصد معاشرہ کی اصلاح ہے یا محض ہاتھ کٹواتے رہنا؟ خود ہی یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ معمولی شبہات کو بھی اجرائے حدود سے بچنے کا بہانہ بنالو اور جہاں تک ممکن ہو مجرم کو اجرائے حد سے بچاؤ کیونکہ غلطی سے سزا کو معاف کر دینا اس سے کہیں بہتر ہے کہ غلطی سے سزا دیدی جائے لیکن ایک قوی اور معقول شبہ کے ہوتے ہوئے کہ توبہ کے بعد بڑے مجرم کو معاف کیا جا سکتا ہے تو چھوٹے مجرم کو بطریق اولیٰ معاف کیا جانا چاہیے۔ ہمارے فقہائے کرام سارق کو معاف کرنے کے لیے تیار نہیں۔

ہمارا خیال ہے کہ قاضی کو ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے کہ مجرم اجرائے حد سے بچ جائے اور اگر سزا دینی ہی پڑے تو جرم کی نوعیت، مجرم کے حالات، معاشرہ کے کوائف ساری باتوں کو نظر میں رکھ کر سزا دے اور ہر جرم میں انتہائی سزا نہ دے البتہ جرم کی انتہائی شکل میں چور کا دایاں ہاتھ پہنچے سے کاٹ دیا جائے گا اور ہاتھ کو کاٹ کر پہلے زمانہ میں لوہے سے داغ دیا جاتا تھا۔ تاکہ خون بند ہو جائے ورنہ مجرم کی موت واقع ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ مقصد مجرم کو سزا دینا ہے، جان سے مار ڈالنا نہیں ہے۔ لیکن آج کل خون روکنے کے لیے داغ لگانے کی ضرورت نہیں، میڈیکل سائنس اتنی ترقی کر چکی ہے کہ ٹانکے لگا کر خون کو روکا جا سکتا ہے اس میں بہ نسبت داغ لگانے کے اذیت کم ہے۔ لہٰذہ اسی کو اختیار کیا جائے گا۔

جس شخص کا دایاں ہاتھ چوری میں کاٹا جا چکا ہے اگر وہ دوبارہ چوری کرے تو فقہائے حجاز اور فقہائے عراق اس کے قائل ہیں کہ اب اس کا بایاں پاؤں کاٹا جائے گا۔ بعض اصحاب ظاہر اور کچھ تابعین سے نقل کیا گیا ہے کہ دائیں ہاتھ کے بعد بایاں ہاتھ کاٹنا چاہیے، کیونکہ قرآن کریم نے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا ہے۔ پاؤں کاٹنے کا حکم نہیں دیا۔ فقہائے حجاز و عراق اس پر اتفاق کرنے کے بعد کہ پہلی چوری میں دایاں ہاتھ اور دوسری چوری میں بایاں پاؤں کاٹنے کے بعد تیسری مرتبہ چوری کرنے میں امام سفیان ثوریؒ اور امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اب کچھ نہیں کاٹا جائے گا۔ قاضی اسے کوئی دوسری سزا دے اور جس کا مال اس نے چرایا تھا اسے اس کا تاوان دلوائے۔ امام شافعیؒ اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ تیسری مرتبہ چوری کرنے میں بایاں ہاتھ اور چوتھی مرتبہ چوری کرنے میں دایاں پاؤں کاٹا جائے گا۔

(بدایہ المجتہد۔ ج۲ص ۴۵۲ تا ۴۵۳)

ہمارے خیال میں اصحاب ظاہر اور بعض تابعین کا یہ قول اقرب الی القرآن ہے کہ دوسری مرتبہ چوری کرنے پر چور کا بایاں ہاتھ کاٹنا چاہیے۔ بایاں پاؤں نہیں کیوں کہ قرآن کریم نے پاؤں کاٹنے کا قطعاً کوئی حکم نہیں دیا۔ لہٰذہ پاؤں نہیں کاٹے جا سکتے، نیز قرآن کریم نے "فاقطعوا ایدیھما" کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ پہلی چوری میں سارق اور سارقہ کے ہاتھ کاٹنے کے لیے ایدیھما (ان کے ہاتھ) جمع کے صیغہ کے ساتھ ارشاد فرمانے سے غالباً اسی طرف اشارہ ہے کہ بعد میں بھی ہاتھ کاٹنے کا عمل نافذ ہو سکتا ہے جمع کا اطلاق تین اور تین سے زیادہ پر ہوتا ہے۔ لہٰذہ دوسری چوری میں بھی ہاتھ ہی کاٹنا چاہیے اور تیسری مرتبہ چوری کا جرم ثابت ہو جانے پر امام ابو حنیفہؒ اور سفیان ثوری کا مذہب قرآن سے قریب تر ہے کہ اب کچھ نہیں کاٹا جائے گا کیونکہ ہاتھوں کو کاٹنے کا حکم تھا اور دو مرتبہ چوریوں میں دونوں ہاتھ کاٹے جا چکے ہیں۔ اب ہاتھ ہی نہیں رہے پاؤں کاٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ پاؤں کاٹنے کا حکم قرآن نے نہیں دیا۔

ویسے بھی یہ صورت کہ دو مرتبہ چوری میں دونوں ہاتھ گنوا دینے کے

بعد کوئی شخص تیسری اور چوتھی مرتبہ بھی چوری کا ارتکاب کر سکتا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی[1]۔

اگر چوری کئی آدمیوں نے مل کر کی ہے تو ہاتھ کاٹنے کے لیے مسروقہ مال کی جو مقدار مقرر کی جائے۔ اگر ہر چور کے حصہ میں اتنی ہی مقدار آجائے جس پر ہاتھ کاٹے جاسکتے ہیں تو سب کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں گے۔ اور اگر ہر ایک کے حصہ میں اتنا مال نہیں آتا تو کسی کے بھی ہاتھ نہیں کاٹے جاسکتے۔ پھر ان کو کوڑے مار دیئے جائیں۔

ہم شروع میں بتا چکے ہیں کہ مال مسروقہ کی وہ مقدار جس پر قطع ید کی سزا دی جائے گی۔ اسلامی مملکت کی مجلس قانون ساز کو ملک کی اقتصادی حالات کے پیش نظر از سر نو متعین کرنی چاہیے کیونکہ اب وہ اقتصادی حالات نہیں ہیں جو عہد رسالت مآب میں تھے۔ اس کے مطابق جو مقدار مقرر کی جائے، اگر جماعت کی صورت میں کچھ لوگوں نے مل کر چوری کی ہے تو یہ دیکھنا ہوگا کہ ہر فرد کے حصہ میں اتنا مال آتا ہے یا نہیں جس پر قطع ید کی سزا دی جانی چاہیے۔ اگر ہر فرد کے حصہ میں اتنی ہی مقدار کا مال آجاتا ہے تو پھر قطع ید کی سزا دی جاسکتی ہے ورنہ کوئی دوسری سزا دی جائے۔ اور قطع ید کی تعبیر بھی اس مال کی مقدار کے مطابق ہی کرنی چاہیے یعنی ہاتھ کی ایک انگلی کاٹی جائے، دو انگلیاں کاٹی جائیں یا پہونچے سے ہاتھ کاٹا جائے، یہ مال کی مقدار کے مطابق طئے کرنا ہوگا۔

شراب کی بوتلیں، خنزیر، اور تمام ناجائز اور حرام چیزیں چوری کر لینے میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ کیونکہ وہ شرعاً مال متقوم نہیں ہیں۔ قرآن کریم کے نسخے، صلیب، شطرنج، نرد، چوسر، ریڈیو، ٹی وی، وغیرہ کو بھی فقہائے نے مال متقوم نہیں مانا چنانچہ ان چیزوں کی چوری کر لینے میں وہ قطع ید کی اجازت نہیں دیتے۔ مگر ہمیں اس سے اختلاف ہے، قرآن کریم نے ان کو کہیں حرام نہیں فرمایا کہ انہیں غیر متقوم قرار دیا جاسکے۔ یہ چیزیں غلط طور پر استعمال کرنے سے ناجائز ہو سکتی ہیں۔ لیکن ان کا جائز استعمال بھی تو ہو سکتا ہے لہٰذہ نہیں مال غیر متقوم قرار نہیں دیا جاسکتا۔

ایسے ادارات سے چوری کرنے میں جو عوام (پبلک) کی ملکیت ہوں مثلاً سرکاری بنک، ڈاکخانے، عدالتیں، ہسپتال وغیرہ سے چوری کرنے میں سرقہ کی سزا دی جائے گی۔ کیونکہ یہ تمام ادارے گو پبلک کی ملکیت ہیں اور چوری کرنے والا شخص خود بھی پبلک ہی کا ایک فرد ہے۔ اس بناء پر یہ کہنا کہ اس چیز کی ملکیت میں وہ خود بھی شریک ہے۔ لہٰذہ اس نے کوئی ایسی چیز نہیں چرائی جو بالکلیہ غیروں ہی کی ملکیت ہو۔ بلکہ اس نے ایسی چیز چرائی جس میں جزوی طور پر وہ خود بھی شریک ہے، قانونی موشگافی سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ سوال یہ ہے کہ اسے عرف عام میں چوری کہتے ہیں یا نہیں۔ اس کی شناعت تو عام چوریوں سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہاتھ کاٹنے کی سزا چوری میں رکھی گئی ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اسے چوری ہی کہا جاتا ہے۔ پبلک مقامات سے چوری کرنے کو کچھ اور نہیں کہا جاتا۔ رہی اس کی جزوی شرکت تو وہ انتہائی غیر اہم ہے جس کو اتنی اہمیت نہیں دی جاسکتی۔

اس سلسلہ میں ہمارے فقہاء نے بڑی بڑی نکتہ آفرینیاں فرمائی ہیں جن کا قرآن کریم کے فلسفۂ سزائے سے کوئی تعلق نہیں مثلاً یہ کہنا کہ تین آدمیوں نے مل کر چوری کی۔ ایک نے نقب لگایا۔ دوسرا مکان کے اندر گھسا اور تیسرے نے چوری کا سامان باہر سے پکڑا تو کسی کا ہاتھ نہیں کاٹا جاسکتا۔ جس نے نقب لگایا اس نے چوری نہیں کی، جس نے اندر گھس کر سامان باہر پکڑایا اس نے نقب کردہ مکان سے یعنی ایک غیر محفوظ جگہ سے سامان اٹھایا ہے اور تیسرے شخص نے تو کچھ بھی نہیں کیا صرف سامان پکڑا ہے لہٰذہ چوری کا جرم کسی پر بھی ثابت نہیں ہوا۔ محض قانونی موشگافی ہے۔ سوال یہ ہے کہ نقب لگا کر مکان کو غیر محفوظ بنانا بھی تو چوری کرنے کے لیے تھا۔ اسے چوری کا جزو قرار نہ دینا کون سا قانون ہے؟ ہم اس کی تائید نہیں کر سکتے۔ یہ قانون سزا کو غیر مؤثر بنانے کی ترکیبیں ہیں جن سے خود قرآن اور اسلام بدنام ہوتے ہیں۔ ایسی سزاؤں سے کیا فائدہ جن پر عمل نہ کیا جاسکے۔

باب قطع الطریق

قطع طریق عربی زبان میں ڈاکہ زنی کو کہتے ہیں۔ یعنی ہتھیار کا استعمال کر کے۔ لوگوں کو ڈرا دھمکا کر ان کے اموال چھین لینا۔ چوری کرنے میں جیسا کہ ہم نے کتاب السرقہ میں بتایا ہے چھپ کر رازداری کے ساتھ دوسروں کا مال لیا جاتا ہے لیکن قطع الطریق (ڈاکہ زنی) میں چھپ کر رازداری کے ساتھ دوسروں کا مال نہیں لیا جاتا بلکہ علانیہ، ڈرا دھمکا کر، اسلحہ دکھا کر دوسروں کا مال لیا جاتا ہے۔ یہ جرم سرقہ سے زیادہ شدید ہے اس کے لیے قرآن کریم کی اس آیت کریمہ سے استدلال کیا جاتا ہے:

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِى الْاَرْضِ
فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ

[1] میں نے ۱۹۵۰ء میں حج کے موقعہ پر حجاز کے ارباب اقتدار سے پوچھا تھا کہ سعودی گورنمنٹ کے قیام کے بعد سے کل کتنے چوروں کے ہاتھ کاٹے گئے ہیں تو مجھے بتایا گیا تھا کہ تقریباً انیس سال کے عرصہ میں صرف تیرہ ہاتھ کاٹے گئے ہیں اس سے قطع ید کے اثرات کا اندازہ کر لینا کچھ دشوار نہیں۔

خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (المائدہ:۳۳)

"جو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کریں اور زمین میں فساد پھیلانے کی کوشش کریں ان کی سزا یہی ہے کہ انہیں بری طرح قتل کیا جائے یا انہیں سولی دی جائے یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف جہت سے کاٹ دیئے جائیں یا انہیں سرزمین اسلام سے شہر بدر کردیا جائے۔ یہ دنیا میں ان کے لیے رسوائی ہوئی اور ان کے لیے آخرت میں بڑا عذاب ہوگا۔"

اس آیت کریمہ میں: اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا کا فقرہ بڑی اہمت کا حامل ہے عربی زبان میں حرب کے اصل بنیادی معنی ویرانی، تباہی وبربادی، تلف، سلب ونہب کے آئے ہیں (محیط المحیط)

ابن فارس نے لکھا ہے کہ اس کے بنیادی معنے چھیننے کے ہیں یہ لفظ سلم (امن وصلح) کی ضد ہے۔

نواب صدیق حسن خاں نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں حاء اور راء اکھٹے آئیں ان میں مشقت اور سختی کا مفہوم ہوا کرتا ہے۔ (کتاب الاشتقاق)

اسی وجہ سے حرب کے معنے لڑائی اور جنگ کے ہوتے ہیں۔ حاربہ اس نے اس سے جنگ کی۔ نیز یہ لفظ سرکشی اختیار کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے چنانچہ:

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ

(التوبۃ:۱۰۷)

"اور جن لوگوں نے مسلمانوں کو باہم ضرر پہنچانے، کفر کرنے اور مومنوں میں تفرقہ ڈالنے اور ان لوگوں کے لیے جو اللہ اور رسول کے خلاف سرکشی اختیار کرتے ہیں تاک لگانے اور گھات میں بیٹھنے کا اڈہ بنانے کے لیے پہلے سے ایک مسجد بناڈالی ہے۔"

میں حارب کے معنی سرکشی اختیار کرنے ہی کے ہیں۔ لہٰذہ سورۃ مائدہ کی آیت (المائدہ:۳۳) اَلَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا کے معنے صرف ڈاکہ ڈالنے ہی کے نہیں ہیں۔ بلکہ یہ آیت اپنے مفہوم کے اعتبار سے نہایت وسیع معنوں کی حامل ہے۔ ڈاکہ ڈالنے کے لیے ہمارے فقہاء نے قطع الطریق کا لفظ استعمال کیا ہے۔ قرآن کریم نے بھی سورۃ العنکبوت میں قوم لوطؑ کے متعلق تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ (العنکبوت ۲۹)

"کیا تم (نفسانی خواہشات کے لیے) مردوں کے پاس آتے ہو اور ڈاکے ڈالتے ہو اور اپنی مجلس میں ناروا باتیں کرتے ہو۔"

چنانچہ اس آیت میں صرف ڈاکہ زنی کے لیے "قطع السبیل" کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ بہرحال ڈاکہ ڈالنا حکومت کے قانون کو طاقت کے ذریعہ سے توڑنا اور سرزمین اسلام میں فتنہ وفساد پھیلانا ہے جس میں ڈاکہ ڈالنا بھی شامل ہے لہٰذہ اس کی وہی سزا ہے جو ایک باغی کی سزا ہوا کرتی ہے۔ اگر ایسے مجرموں کو اس سے پہلے کہ وہ کسی کا مال چھین سکیں، یا کسی کو قتل کرسکیں، گرفتار کرلیا گیا تو ان کو حکومت وقت اسلامی مملکت سے ملک بدر کرسکتی ہے۔ خلفائے راشدین کے وقت میں مجرموں کو ملک بدر کردینے کے بعد یہ سزا چونکہ ان کے ارتداد پر منتج ہوئی لہٰذہ خلفائے راشدین نے صحابہ کے مشورہ سے ایسے مجرموں کو بجائے ملک بدر کرنے کے قید کردینے کا طریقہ اختیار کیا، آج کے حالات میں بھی ملک بدر کردینا ممکن نہیں رہا۔

کیونکہ اگر اپنے ملک سے ان کو نکال دیا گیا تو وہ کہاں جائیں گے جبکہ پاسپورٹ اور ویزا کی پابندیاں ہر ملک کی طرف سے عائد ہیں۔ لہٰذہ اس کے سوا کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ ایسے مجرموں کو جیسا کہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں کیا گیا تھا قید کردیا جائے، لیکن ہمارے ہاں جیلیں اور قید خانے جرائم کی تربیت گاہیں بن گئے ہیں اس لیے یا تو ان کی مناسب اصلاح کی جائے یا پھر بجائے جیل بھیجنے کے حکومت وقت کوڑوں کی سزا تجویز کرے۔ اگر ایسے لوگ دل سے توبہ کرلیں اور آئندہ ایسی حرکت کے اعادہ نہ کرنے کا یقین دلائیں اور حکومت کو اطمینان حاصل ہوجائے تو ان کو رہا کیا جاسکتا ہے۔

اگر ان ڈاکوؤں نے کسی مسلمان یا ذمی کا مال لے لیا ہے لیکن کسی کو قتل نہیں کیا اور اتنا مال لیا ہے کہ ہر ایک ڈاکو کے حصہ میں اتنا مال آجاتا ہے جس پر حد جاری ہونی چاہیے (موجودہ حالات میں حکومت وقت کو اس کی مقدار متعین کرنی ہوگی دو تینیا دس درہموں پر حد جاری کردینا آج کے حالات میں صحیح نہیں ہے۔) تو ایسے مجرموں کے دائیں ہاتھ بائیں پاؤں کاٹ دینے چاہئیں لیکن یاد رہے کہ یہ انتہائی سزائیں ہیں۔ جرم کی سنگینی اور حالات کے تقاضوں کے ماتحت ہی کورٹ کو یہ سزائیں دینی چاہئیں۔

اگر ان ڈاکوؤں نے مال تو کچھ نہیں لیا۔ البتہ کچھ لوگوں کو قتل کردیا ہے تو ایسی صورت میں ان کو قتل کردیا جائے گا۔ یہ قتل کرنا بطور قصاص کے نہیں ہے بلکہ بطور حد کے ہے۔ لہٰذہ اگر مقتولین کے ورثاء معاف کرنا چاہیں تو معاف نہیں کرسکتے۔ نہ ہی خون بہا لے سکتے ہیں اس پر تمام فقہاء کا اجماع ہے۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ بات صحیح ہے۔ اور اگر ڈاکوؤں نے مال بھی چھینا ہے اور

قتل بھی کیا ہے تو حکومت کو اختیار ہے کہ ان کے دائیں ہاتھ اور بائیں پاؤں کاٹ کر انہیں قتل کر دے یا انہیں پھانسی دے دے۔ خواہ ان کو صرف قتل کر دے، یا خواہ ان کو پھانسی دے دے، جرائم کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے کورٹ مناسب فیصلہ کرے۔ امام محمدؒ کا ارشاد ہے کہ ان کو قتل کر دیا جائے یا پھانسی دیدی جائے۔ ہاتھ پاؤں نہ کاٹے جائیں۔

اگر پھانسی دی جائے تو شاہراہِ عام پر ان کی لاش لٹکا دی جائے تا کہ دیکھنے والوں کو عبرت ہو سکے۔ لیکن تین دن سے زیادہ لاش کو نہ لٹکایا جائے، کیونکہ تین دن کے بعد لاش گلنی سڑنی شروع ہو جاتی ہے جس سے لوگوں کو اذیت ہوتی ہے اور شہر کی ہوا بھی خراب ہونے کا اندیشہ ہے۔

جیسا کہ ہم نے شروع میں کہا تھا کہ: الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِى الْاَرْضِ فَسَادًا کے معنے ڈاکہ ڈالنے ہی کے نہیں ہیں بلکہ یہ آیت اپنے مفہوم کے اعتبار سے نہایت وسیع معانی کو حامل ہے۔ مثلاً مملکت اسلامی کے خلاف بغاوت کرنا، تخریب کاری کرنا، سول نافرمانی کرنا، وغیرہ وغیرہ، اس لیے ان پر ہم اپنے اپنے مقامات پر بحث کریں گے۔

باب القصاص والجنایات

الجنایات، جنایۃ کی جمع ہے جنایۃ عربی زبان میں شر انگیزی کو کہتے ہیں، لیکن فقہ کی اصطلاح میں خصوصیت کے ساتھ اس شر انگیزی کو کہتے ہیں جس کا نشانہ انسانی جان یا انسانی اعضاء بنیں، یعنی کوئی شخص کسی کو قتل کر دے، اس کا کوئی عضو (مثلاً ہاتھ پاؤں) کاٹ دے یا دانت وغیرہ توڑ دے۔

تین چیزیں انسان کی عزیز ترین متاع کہلاتی ہیں۔ جان، مال، آبرو۔ اسلام جیسا کہ انسانی مال اور آبرو کو اہمیت دیتا ہے، اسی طرح وہ انسانی جان کو بھی انتہائی اہمیت دیتا ہے۔ چنانچہ اسلام کی نگاہ میں ایک آدمی کو بھی قتل کر دینا پوری نوعِ انسانی کو قتل کر دینے کے مرادف ہے۔ کیونکہ جو آدمی کسی ایک انسان کو قتل کرتا ہے وہ انسانی خون کی حرمت کو پامال کرتا ہے اور دوسرے لوگوں کو اس فعل شنیع کی جرأت دلانے کا سبب بنتا ہے سورۃ مائدہ میں ہے:

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِى الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا

"اسی وجہ سے تو ہم نے بنی اسرائیل پر (تورات میں) لکھ دیا تھا کہ جو کوئی کسی شخص کو بغیر کسی نفس (کے بدلے) کے یا زمین میں فتنہ وفساد پھیلانے کے قتل کر دے تو گویا اس نے پوری نوعِ انسانی کو قتل کر دیا اور جو کوئی کسی کو مرنے سے بچا لے تو اس نے پوری نوعِ انسانی کو مرنے سے بچا لیا۔"

کیونکہ اس سے دوسرے لوگوں کے لیے ایک مثال قائم ہو جاتی ہے اور اس طرح انسانی خون کی عزت و حرمت ختم ہوتی ہے۔ سورۃ نساء میں ہے۔

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا (النساء)

"اور جو شخص کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کر دے، اس پر اللہ کا غضب نازل ہو گا اور اللہ اس پر لعنت فرمائے گا اور اللہ نے اس کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔"

حق تعالیٰ نے اتنی اہمیت کسی جرم کو نہیں دی جتنی قتل عمد کے جرم کو دی ہے کہ اس کے لیے پوری پانچ سزائیں بیان فرما دی ہیں (۱) اس کی سزا جہنم ہو گی۔ (۲) وہ جہنم میں ابد الآباد تک رہے گا۔ (۳) اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہو گا، (۴) اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت اور پھٹکار برسے گی۔ (۵) اور اللہ نے اس کے لیے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

ابدی جہنم کی سزا سوائے کافر اور قاتل عمد کے کسی کے لیے نہیں ہے۔ خود قرآن کریم نے اس سے پچھلی آیت میں فرمایا ہے کہ ایک مومن کا یہ کام ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ کسی مسلمان کو عمداً قتل کر دے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا (النساء:۹۲)

"اور کسی مومن کے لیے ممکن نہیں کہ وہ کسی مومن آدمی کو قتل کر دے اِلّا یہ کہ غلطی سے ایسا ہو جائے۔"

سورۃ بنی اسرائیل میں ہے:

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِىْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ (بنی اسرائیل:۳۳)

"اور جس جان کو قتل کرنا اللہ نے حرام قرار دیا ہے اسے قتل نہ کرو۔ البتہ حق کے ساتھ قتل کر سکتے ہو۔"

چنانچہ حضور اکرم ﷺ نے بھی حجۃ الوداع میں ایک لاکھ صحابہ کے مجمع میں یہی نصیحت فرمائی تھی۔

اَلَا لَا تَرْجِعُوْا بَعْدِىْ كُفَّارًا يَضْرِبُ بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ۔

(بخاری مسلم، ابو داؤد رزین۔ عن ابی بکرۃ بحوالہ جمع الفوائد ج ۱ ص ۱۵۔ وطبرانی کبیر عن کلثوم بن جبیر بحوالہ جمع الفوائد۔ ج ۱ ص ۳۹۱)

"دیکھو! میرے بعد کافر ہو کر اسلام سے نہ پھر جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے لگو۔"

نیز حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

سِبَابُ الْمُؤْمِنِ فُسُوْقٌ وَقِتَالُهٗ كُفْرٌ (بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی عن ابن

مسعود بحوالہ جمع الفوائد ج ۲ ص ۱۵۹)

"کسی مومن کو گالیاں دینا فسق ہے اور کسی مومن سے لڑنا کفر ہے۔"

مذکورہ بالا آیت (۱۷، ۳۳) ہی میں ہے:

وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطَانًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا (بنی اسرائیل: ۳۳)

"اور جو مظلوم کر کے قتل کر دیا جائے تو ہم نے اس کے وارث (ولی) کے لیے قانونی غلبہ رکھ دیا ہے۔ لہٰذہ وہ خود قتل کرنے میں کوئی زیادتی نہ کرے۔ بلاشبہ اس کی مدد کی جائے گی۔"

یعنی خود اسلامی حکومت کی یہ ڈیوٹی اور فریضہ ہوگا کہ وہ قانونی کارروائی کر کے قاتل کو کیفر کردار تک پہنچائے۔ لہٰذا مقتول کے ورثاء کو قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر قاتل سے انتقام لینے میں کوئی زیادتی نہیں کرنی چاہیے۔ بلاشبہ ان کی پوری پوری مدد کی جائے گی۔ ہم نے یعنی اسلام نے مقتول کے ورثاء کا انتقام کا حق تسلیم کیا ہے (جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰناً) لہٰذا انہیں اس کا بدلہ ضرور دلوایا جائے گا۔ انہیں از خود کوئی اقدام نہیں کرنا چاہیے۔

یہی مضمون سورۂ بقرہ میں بھی بیان فرمایا گیا ہے جہاں ارشاد فرمایا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى

(البقرہ: ۱۷۸)

"اے پیروانِ دعوت ایمانی! مقتولین کے سلسلہ میں بدلہ دلانا تم پر فرض کیا گیا ہے۔"

اس آیت کریمہ میں مقتول سے بدلہ لینا مقتول کے ورثاء کی ذمہ داری نہیں دی گئی۔ بلکہ مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ یعنی پورے مسلم معاشرے کو جس کی نمائندہ اسلامی مملکت ہوتی ہے ذمہ دار قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذہ قتل کا جرم کسی فرد کے خلاف نہیں ہے کہ وہ قاتل سے بدلہ (یعنی قصاص) لیتا پھرے یہ جرم اسلامی مملکت کے خلاف ہے وہ خود اس کا انتقام لے گی۔ کیونکہ اس نے معاشرہ کے تمام افراد کے جان، مال آبرو کی حفاظت و صیانت کی ذمہ داری قبول کی ہوئی ہے لہٰذہ مملکت کا فرض ہے کہ وہ خود اقدام کرے۔

قصاص امم سابقہ میں

قصاص اور دیت کا حکم اسلام میں کوئی نیا حکم نہیں ہے قدیم اقوام میں بھی جب سے انسان تہذیب و تمدن سے آشنا ہوا ہے۔ اس پر عمل ہوتا تھا۔ امم سابقہ میں بھی جبکہ انسان محض قبائلی زندگی بسر کرتا تھا اس کا وجود ملتا ہے۔ بنی اسرائیل کے متعلق تو خود قرآن کریم نے بتا دیا ہے کہ:

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَاۤ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ (المائدہ: ۴۴)

"اور ہم نے بنی اسرائیل پر تورات میں فرض کر دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے، کان، دانت کے بدلے دانت اور زخموں میں برابر سرابر بدلہ ہے۔"

بنی اسرائیل کے علاوہ دیگر اقوام میں بھی اس کا رواج ملتا ہے۔ انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجین اینڈ ایتھکس میں جسے جیمس ہسٹیکنز نے ایڈٹ کیا ہے۔ اس موضوع پر بڑی تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ چنانچہ اس کی جلد چہارم چیپٹر "کرائمز اینڈ پنشمنٹ" کے ماتحت مصنف نے لکھا ہے کہ:

"قدیم زمانہ میں قتل خطاء اور قتل عمد اور دیگر جنایات میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا تھا۔ تاہم اپنے قبیلہ سے باہر چوری کر لینا یا قتل کر دینا کوئی عیب کی بات نہیں سمجھی جاتی تھی۔ بلکہ بعض اوقات اسے مستحسن سمجھا جاتا تھا۔ البتہ اگر انتقام کا اندیشہ ہوتا تھا تو اسے برا سمجھا جاتا تھا۔ آگے چل کر جب اخلاقیات کا تصور پیدا ہوا تو قبیلہ سے باہر اور قبیلے کے اندر دونوں جگہ اس کی برائی تسلیم کر لی گئی۔.... ملزم کی دولتمندی اور تنگدستی و فقر و فاقہ کی وجہ سے سزا میں فرق کیا جاتا تھا۔ پہلے اور دوسرے جرم میں بھی سزا کے اعتبار سے فرق کیا جاتا تھا البتہ بعد کے جرائم میں قتل کی سزا دی جاتی تھی۔ پہلی چوری میں ایذا دی جاتی تھی۔ دوسری چوری میں انگلیاں کاٹ دی جاتی تھیں۔ اور تیسری چوری میں ہاتھ کاٹ دیئے جاتے تھے۔ اور چوتھی چوری میں جان سے مار ڈالتے تھے۔ بعض قبائل میں جھوٹی گواہی دینے پر زبان کاٹ دی جاتی تھی۔ لیکن یہ عام دستور تھا کہ اعضاء کو نقصان پہنچانے میں قصاص بالمثل کا رواج تھا یعنی ہاتھ کے بدلے ہاتھ کان کے بدلے کان آنکھ کے بدلے آنکھ کا قانون رائج تھا۔"

یہودی قانون اور حمورابی کے قانون میں قصاص کی سزا دی جاتی تھی، بعض قبائل میں انتہائی زیادتیاں کی جاتی تھیں صاحب اقتدار لوگ جو اپنے آپ کو خدا ہی سمجھتے تھے، ایک حاکم اور مقتدر آدمی کے بدلے میں پورے کے پورے قبیلہ کو قتل کر ڈلتے تھے۔ جادو، خون، محرمات کے ساتھ زنا، دین سے انحراف، بغاوت، زنا اور چوری، کی سزا جان سے مار ڈالنا تھی .... قتل کی سزا کے مختلف طریقے رائج تھے بعض طریقے نہایت ہی تحقیر آمیز، ذلت آفریں اور نہایت ہی خوفناک ہوا کرتے تھے، مثلاً سینہ میں نیزہ مار کر ہلاک کر دینا، آگ سے جلا کر دینا، اوپر سے گرا دینا، پتھروں سے مار مار کر ہلاک کر دینا، مجرم پر پوری دیوار گرا دینا، وغیرہ وغیرہ۔

دیت کا طریقہ بھی پرانے زمانہ میں رائج تھا جو غالباً قتل کے سلسلہ میں ہوتا تھا، جب کہ قاتل دشمن کے انتقام سے بچنے کے لیے مقتول کے ورثاء کو خطیر رقم ادا کرتا تھا لیکن قتل عمد میں دیت کا رواج نہیں تھا۔

بعض قبائل میں اپنے قبیلہ سے باہر قتل کر دینا کوئی عیب کی بات نہیں تھی۔ اور خون کا بدلہ لینا قومی فرائض میں شمار ہوتا تھا۔ اکثر حالات میں قاتل کو قاتل کی اولاد کو اور اگر ان دونوں پر دسترس نہ ہو تو قاتل کے قبیلہ کے کسی بھی آدمی کو قتل کر دیا کرتے تھے۔ اور تصور یہ تھا کہ جب تک کسی نہ کسی کو قتل نہ کر دیا جائے مقتول کی روح کو چین نصیب نہیں ہو سکتا۔

قبائل میں عورت کو مرد کی پراپرٹی (جائیداد) سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے زنا کو ایک قسم کی چوری سمجھا جاتا تھا۔ اور بعض قبائل میں تو محض عورت کو ہاتھ لگانے کی سزا بھی موت ہوا کرتی تھی۔ بعض قبائل میں زنا کے جرم میں مرد کو مقطوع کر دیتے تھے اور عورت کے چہرہ کو عیب دار بنا دیتے تھے۔ اور بار بار زنا کے جرم میں عورت کو قتل کر دیا جاتا تھا۔ لیکن عام طور پر مرد اگر زنا کا ارتکاب کرے تو اسے کوئی سزا نہیں دی جاتی تھی نیز شہر بدر کر دینا تھی۔

اگر کوئی چوری کرتا تھا اور اس کے پاس مال ہوتا تھا تو جس کی چوری کی گئی تھی اس سارق کے مال سے دوگنا اور بعض مرتبہ دس گنا زیادہ تک دلوایا جاتا تھا۔

حمورابی کے قانون میں قذف (تہمت لگانے) کی سزا بھی موت تھی۔ بغیر گواہوں کے چیز خریدنے کی سزا بھی موت تھی۔ کسی کے گھر میں جا کر چوری کرنے اور کسی کا بچہ اٹھا لینے کی سزا بھی موت تھی۔ قتل خطاء (بلا ارادہ) میں دیت دی جاتی تھی۔ آزاد آدمی کی دیت نصف مانا چاندی، غلام اور باندی کی دیت ایک تہائی 3/1 مانا چاندی دی جاتی تھی۔ عورت اور مرد کی دیت میں کوئی فرق نہیں تھا۔ دونوں کی دیت برابر تھی اگرچہ وہ باقی تمام معاملات میں مردوں اور عورتوں میں مساوات کے قائل نہیں تھے۔ لیکن دیت کے مسئلہ میں مساوات پر عمل کرتے تھے۔ ڈاکٹر یا حکیم کی بے احتیاطی کی وجہ سے کسی کی موت واقع ہو جاتی تھی تو ڈاکٹر یا حکیم کے ہاتھ کاٹ دیتے تھے۔ اگر ایک غلام کی آنکھ ضائع کر دی جاتی تھی تو اس کی آدھی دیت دی جاتی تھی۔ بعض حالات میں چوری کی سزا موت تھی۔ البتہ اگر ملازم نے سبزی چرا لی یا گھر سے کھانے کی چیزیں چوری کر لیں تو ملازم کے ہاتھ کاٹ دیئے جاتے تھے۔

چینی تہذیب میں قتل، زنا، چوری، کے لیے مستقل قوانین نافذ تھے، کوڑے لگانے کی سزا بھی دی جاتی تھی۔ جو بید سے دی جاتی تھی، چمڑے کے کوڑے سے نہیں۔ بید مارنے میں وہ اسقدر ماہر ہوتے تھے کہ اگر چاہتے تو تین کوڑوں ہی میں مجرم کی کھال ادھیڑ دیتے تھے اور اگر چاہتے تو ہزار کوڑوں میں بھی جسم کو کوئی گزند نہیں پہنچتا تھا۔ قتل، ڈاکہ، بغاوت، جعلی سکے بنانے، آگ لگانے کی سزا موت تھی۔ بارہ سال سے کم عمر کی لڑکیوں سے زنا کرنے کی سزا بھی موت تھی۔ نیز نمک اسمگل کرنے کی سزا بھی موت تھی۔ سزا کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ آدمی کو ایک پنجرے میں قید کر دیا کرتے تھے۔ صاحب عزت اور مقتدر لوگوں کو سخت سزائیں نہیں دی جاتی تھی۔ عورتوں کو قید و بند کی سزا نہیں دی جاتی تھی۔ البتہ عورت اگر زنا کی مرتکب ہوتی تھی تو شوہر کو اجازت تھی کہ اسے قتل کر دے۔

یونانیوں میں جرم کا تصور اللہ کی نافرمانی کا تھا۔ ان کے ہاں قتل کرنے کے جرم میں عاقبت کی سزا اور اللہ کی ناراضگی سے بچنے کا طریقہ یہی تھا کہ وہ اپنے گھر بار سے نکل جائے اور ملک بدر ہو جائے۔ البتہ اگر مقتول کے ورثاء دیت قبول کر لیں تو وہ اپنے گھر بار میں رہ سکتا تھا۔ یونانیوں میں دیت کا رواج عام تھا لیکن قتل خطاء (بلا ارادہ قتل) میں سزا میں کمی اور تخفیف ہو سکتی تھی۔

یہودیوں میں قصاص تھا۔ دیت نہیں تھی۔ جان کے بدلے جان، کان کے بدلے کان، آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت، ہاتھ کے بدلے ہاتھ اور پاؤں کے بدلے پاؤں کا قانون رائج تھا۔ قتل عمد اور قتل خطاء میں فرق نہیں کیا جاتا تھا۔

ہندوؤں میں مشہور تھا کہ سزا اور قصاص سے زندگی بڑھتی ہے اگر سزا اور قصاص نہ ہو تو لوگ ایک دوسرے کو قتل کرنے لگیں گے، جرمانے زیادہ تر کئے جاتے تھے۔ آنکھ کے بدلے آنکھ، اور کان کے بدلے کان کا رواج تھا۔ قذف (تہمت لگانے) کی سزا زبان کاٹ دینا تھی البتہ برہمنوں کو سخت سزائیں نہیں دی جاسکتی تھیں۔

عرب میں قبل از اسلام جرم کو ایک قسم کی گندگی سمجھا جاتا تھا اور سزا سے صفائی ہو جاتی تھی۔ عربوں میں انتقام میں ایک کے بدلے کئی کئی آدمیوں کو مار ڈالنے کا دستور تھا اور دیت کا طریقہ بھی رائج تھا۔

(انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجین اینڈ ایتھکس بائی جیمس ہیسٹنگز جلد چہارم "کرائمز اینڈ پنشمنٹ")

اسلام سے پہلے عربوں میں انتقام اور بدلہ لینے کی بڑی اہمیت تھی۔ تاریخ العرب قبل الاسلام میں ہے کہ:

"اسلام سے پہلے عہد جاہلیت میں انتقام لینے کا تعلق ان کے عقیدہ سے تھا جو مقتول اور مقتول کے اہل و عیال سے متعلق تھا۔ جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں مقتول کی روح کو اس وقت تک قرار نہیں آتا تھا اور نہ اسے سکون حاصل ہو سکتا تھا جب تک اس کے خون کا انتقام نہ لے لیا جائے۔ اس کی قبر پر (اس کی روح کا) ایک پرندہ برابر پھڑ پھڑ اتار رہتا تھا جو یہی پکارتا تھا "میری پیاس بجھا دو! میری پیاس بجھا دو!" اور جب تک اس کا انتقام نہ لے لیا

جاتا اور قاتل کا یا قاتل کے خاندان کے کسی فرد کا قاتل کے بجائے خون نہ بہا لیا جاتا وہ بے تاب و بیقرار رہتا تھا۔ لہٰذہ انتقام لینا محض عزت و شرف، حسب و نسب یا عرف اجتماعی کی بات ہی نہیں تھی بلکہ یہ ایک ایسا موضوع تھا جس کا تعلق ان کے عقیدہ اور دینی رائے سے بھی تھا۔ مقتول کی روح برابر بے چین اور بے قرار رہتی تھی۔ لہٰذہ جب تک قاتلیا اس کے اعزہ اور خاندان سے انتقام نہ لیا جائے خود مقتول کے اعزاء اقرباء اور خاندان کی سلامتی کے لیے خطرہ رہتا تھا۔ اور اس ذہنی پریشانی سے نجات کے لیے ضروری تھا کہ ہر ممکن طریقہ سے ضرور ہی انتقام لیا جائے۔ لہٰذہ وہاس کے لیے ہر بڑے بڑے خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔

رہ گئی دیت تو اگر چہ وقتی طور پر مخالفت و عدوات کو روک دیتی تھی لیکن اس سے نہ تو خون دھل سکتا تھا اور نہ دلوں کو سکون حاصل ہو سکتا تھا۔ بلکہ دیت کو قبول کر لینا کمزوری اور مسکنت سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ خون کا عوض مال نہیں ہو سکتا تھا۔ اور نہ وہ دیت کے چند اونٹوں سے دھل سکتا تھا اس کے لیے تو خون ہی ضروری تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مقتول کے اعزاء دیت کو قبول کرنے سے انکار کر دیتے تھے۔ اور خون کے سوا کسی بات پر راضی نہیں ہوتے تھے۔ جب تک قاتل کا خون بھی اسی طرح نہ بہا لیا جائے جیسے مقتول کا خون بہایا گیا تھا۔ اکثر مقتول اپنے گھر والوں اور اپنے خاندان کو قسم دے جاتے تھے کہ وہ اس کے خون کو ضروری دھوئیں اور دیت قبول کر کے کسی کو تاہی کا ثبوت نہ دیں خواہ اس کے لیے انہیں کتنے ہی طویل زمانہ تک انتظار کیوں نہ کرنا پڑے۔

(تاریخ العرب قبل الاسلام، ج ۶ ص ۳۴۱، مطبع المجمع العلمی عراق مطبوعہ ۱۹۵۶ء)

اسلام سے پہلے عربوں میں اگر چہ انتقام کی بڑی ہی اہمیت تھی تاہم خاص حالات میں دیت کا رواج بھی موجود تھا اور اس پر عمل بھی ہوتا تھا چنانچہ مصر کے مشہور مورخ جرجی زیدان کہتے ہیں کہ:

"زخمی جب زخم سے مر جاتا تھا اور آزاد ہوتا تھا تو دیت نصف من چاندی ہوا کرتی تھی اور اگر وہ آزاد کردہ غلام ہوتا تھا تو ایک تہائی من چاندی ہوتی تھی۔ اور اگر کوئی طبیب کسی بیمار کا علاج کرتا اور اس کے ہاتھ پر اس کی موت ہو جاتی تو اگر وہ آزاد ہوتا تھا تو طبیب کو دس شواقل چاندی دینی پڑتی تھی اور اگر مریض آزاد کردہ غلام ہوتا تھا تو طبیب کو پانچ شواقل چاندی کا تاوان دینا پڑتا تھا۔ اگر کوئی کسی آزاد آدمی کی ہڈی توڑ دیتا تھا تو بدلہ میں اس کی ہڈی بھی توڑ دی جاتی تھی اور اگر آزاد شدہ غلام کی ہڈی توڑ دیتا تھا تو توڑنے والے کو ایک من چاندی تاوان میں ادا کرنی پڑتی تھی اور اگر جس کی ہڈی توڑی گئی ہے وہ غلام ہوتا تو نصف من چاندی کا تاوان دینا پڑتا تھا (عربی میں من کے معنے وہ نہیں ہوتے جو ہمارے ہاں ہوتے ہیں عربی میں من ایک سیر کو کہتے ہیں) باقی اسی پر قیاس کر لیجئے۔ تورات کے زمانہ میں یہودیوں میں بھی کچھ ایسا ہی قانون رائج تھا۔" (العرب قبل الاسلام جرجی زیدان ج ۲ ص ۵۹ مطبوعہ دار الہلال قاہرہ)

دیت کے سلسلہ میں دائرہ معارف اسلامیہ میں ہے کہ: "آئین دیت کی تاریخی اصل زمانہ قبل اسلام کے رواجی دستور میں پائی جاتی ہے جب کہ یہ عرب کے معاشری نظام کے ساتھ لازم و ملزوم تھا۔ معاشرے کی بنیاد قبائلی زندگی پر تھی۔ ملک میں کوئی سیاسی اقتدار عام موجود نہیں تھا۔ بلکہ کسی قبیلہ میں علیحدہ شکل میں بھی نہیں پایا جاتا تھا۔ اپنا انصاف خود چکانے کا رواج تھا، جس میں کسی حد تک پنچایت کے فیصلے کو بھی دخل ہوتا تھا۔ قتل کی صورت میں شخصی طور بدلہ (ثار) (قصاص) لینے کا قاعدہ خاص طور پر ہر جگہ نافذ تھا۔ اگر چہ یہ ممکن تھا کہ اس حق سے باختیار خود کوئی دست بردار ہو جائے اور اس کے بدلے میں دیت لینا منظور کرلے۔ اس دیت کی مقدار اصولاً سو اونٹ مقرر تھی کم از کم اس علاقے کے اندر جہاں اسلام وجود میں آیا۔ اگر چہ بعض روایات میں صرف دس اونٹوں کا ذکر بھی موجود ہے۔ اس قاعدے پر عمل کرنے میں قبیلے کے تمام افراد کا بالقوہ اور بالفعل قوی اتحاد کام کرتا تھا۔ سارا قبیلہ مجموعی طور پر دیت کے ادا کرنے کا ذمہ دار تھا۔ اسلام نے اس رواج کی اصل بنیاد میں مداخلت نہیں کی قرآن مجید کی مختلف عبارتیں اس کی صراحۃً تصدیق کرتی ہیں لیکن ان آیات میں بعض ترمیمات پائی جاتی ہیں جن میں سب سے زیادہ اہم یہ ہے کہ قتل خطاء میں بھی دیت ادا کرنا واجب ہو گا۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۹ ص ۵۲۴ تا ۵۲۸ (مطبوعہ دانش گاہ لاہور)

اس ساری تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ اسلام سے پہلے متمدن اقوام میں قصاص اور دیت کے سلسلہ میں کیا قوانین نافذ تھے اور خود عربوں میں جہاں کوئی متحدہ حکومت قائم نہیں تھی بلکہ قبائلی نظام کے ماتحت ہی وہ زندگی بسر کرتے تھے۔ کیا رواج نافذ تھے۔ اسلام نے انہی رواجات اور قوانین کو بنیاد بنا کر اپنے قوانین نافذ کیے تھے۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے چھٹے خطبہ میں اجتہاد کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا اقتباس پیش کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ:

"لیکن جہاں تک مسئلہ اجتہاد کا تعلق ہے ہمیں چاہیے کہ ان احادیث کو جن کی حیثیت سر تا سر قانونی ہے ان احادیث سے الگ رکھیں جن کا قانون سے تعلق نہیں (یعنی فقہی اور غیر فقہی احادیث کو۔ مترجم) پھر اول الذکر کی بحث میں بھی ایک بڑا اہم سوال یہ ہو گا کہ ان میں عرب قبل اسلام کے اس رسم و رواج کا جسے جوں کا توں چھوڑ دیا گیا، یا جس میں حضور رسالت مآب ﷺ نے تھوڑی بہت ترمیم کر دی، کس قدر حصہ موجود ہے۔ لیکن یہ وہ

حقیقت ہے جسکا انکشاف مشکل ہی سے ہو سکے گا۔ کیونکہ علمائے متقدمین شاذ ہی اس رسم ورواج کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ہمیں تو شاید یہ بھی معلوم نہیں کہ جس رسم رواج کو جوں کا توں چھوڑ دیا گیا خواہ حضور رسالت مآب ﷺ نے اس کی بالصراحت منظوری دی یا خاموشی اختیار فرمالی، اس پر کیا سچ مچ ہر کہیں اور ہر زمانے میں عمل کرنا مقصود تھا؟ شاہ ولی اللہ نے اس مسئلے میں بڑی سبق آموز بحث اٹھائی ہے۔ ہم اس کا مفاد ذیل میں پیش کریں گے۔ شاہ ولی اللہ کہتے ہیں کہ انبیاء کا عام طریقِ تعلیم تو یہی ہے کہ وہ جس قوم میں مبعوث ہوتے ہیں ان پر اسی قوم کے رسم ورواج اور عادات وخصائص کے مطابق شریعت نازل کی جاتی ہے۔ لیکن جس نبی کے سامنے ہمہ گیر اصول ہیں اس پر نہ تو مختلف قوموں کے لیے مختلف اصول نازل کیے جائیں گے، نہ یہ ممکن ہے کہ وہ ہر قوم کو اپنی اپنی ضروریات کے لیے الگ الگ اصول عمل متعین کرنے کی اجازت دے۔ وہ کسی ایک قوم کی تربیت کرتا اور پھر ایک عالمگیر شریعت کی تشکیل میں اس سے تمہید کا کام لیتا ہے لیکن ایسا کرنے میں وہ اگرچہ انہی اصولوں کو حرکت دیتا ہے جو ساری نوع انسانی کی حیات اجتماعیہ میں کار فرماہیں، پھر بھی ہر معاملے اور ہر موقعہ پر عملاً ان کا اطلاق اپنی قوم کی مخصوص عادات کے مطابق ہی کرتا ہے۔ لہٰذہ اس طرح جو احکام وضع ہوتے ہیں مثلاً تعزیرات (ایک لحاظ سے اسی قوم کے لیے مخصوص ہوں گے پھر چونکہ احکام مقصود بالذات نہیں اس لیے یہ بھی ضروری نہیں کہ ان کو آئندہ نسلوں کے لیے بھی واجب ٹھہرایا جائے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے جو اسلام کی عالمگیر نوعیت کو خوب سمجھ گئے تھے احادیث سے اعتنا نہیں کیا۔ الخ (تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ خطبہ ششم۔ ص ۲۶۵ تا ۲۶۶)

(ترجمہ سید نذیر نیازی مطوعہ بزم اقبال کلب روڈ لاہور)

علامہ اقبالؒ نے حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے اقتباس سے جو نتائج اخذ فرمائے ہیں ان کے بیان میں ذرا سا الجھاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ جناب علامہ قرآن کریم کے بیان فرمودہ احکام اور قوانین کو بھی ہر ملک، ہر قوم اور ہر زمانہ کے لیے واجب العمل نہیں سمجھ رہے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ سید نذیر نیازی مرحوم کو اسی بناء پر حاشیہ میں کہنا پڑا ہے:

"یہاں شاہ صاحبؒ کی عبارت سے ایک غلط فہمی کا اندیشہ ہے، لہٰذہ اس امر کی صراحت ناگزیر ہو جاتی ہے کہ قرآن پاک میں تو یہی "عالمگیر شریعت" نازل ہوئی جس کی طرف شاہ صاحب اشارہ فرمارہے ہیں۔ رہا اس کے اطلاق میں قوموں کے احوال وخصائص کا مسئلہ سو یہ قانون کا مسئلہ ہے شریعت کا نہیں۔ قرآن پاک کا صاف وصریح ارشاد ہے۔"

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ (الشوریٰ: ۱۳)(مترجم بحوالہ بالا)

ہمارا عقیدہ ہے کہ قرآن کریم چونکہ تمام دنیا کے لیے ہے وہ صرف عربوں کے لیے نہیں ہے۔ اس میں کسی ملک، کسی قوم اور کسی زمانہ کی تخصیص نہیں کی جا سکتی۔ وہ اللہ کا آخری پیغام ہے اس کے بعد کوئی دوسرا پیغام آنے والا نہیں ہے، اس لیے اس کی ہدایات ابد الآباد تک کے لیے ہیں۔ البتہ حضور اکرم ﷺ نے قرآنی ہدایات کو جو عملی جامہ پہنایا ہے وہ عربوں کے معاشرتی حالات اور ان کے احوال وظروف کے مطابق ہی پہنایا ہے۔ ہر نبی الٰہی ہدایات کے مطابق بطور خمیر کے کسی ایک قوم ہی کو تیار کرتا ہے تاکہ باقی اقوام کے لیے ان کے ذریعہ سے ہدایت کا سامان بہم پہنچائے۔ تو ایک نبی کی یہ عملی تشکیل ہر قوم اور ہر ملک اور ہر زمانے کے لیے صورۃً بھی لابدی نہیں ہوتی۔ الٰہی ہدآیات کی یہ عملی تشکیل مختلف اقوام وملل اور مختلف زمانوں میں صورۃً مختلف ہو سکتی ہے جب کہ ان ہدایاتِ الٰہیہ کی روح اور اسپرٹ ہمیشہ یکساں رہتی ہے۔

(تفصیل کے لیے مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی کتاب۔ شاہ والی اللہؒ اور ان کا فلسفہ ملاحظہ ہو)

صورت زیر بحث میں قصاص اور دیت کے سلسلہ میں قرآن کریم نے قصاص کا حکم دیا ہے اور دیت کا حکم بھی دیا ہے لیکن دیت (خون بہا) کیا ہو گی اور کس مقدار میں ہو گی اسے قرآن کریم نے متعین نہیں فرمایا۔ آنحضرت ﷺ نے اس جزئیہ کی عملی تشکیل عربوں کے معاشرتی حالات کو سامنے رکھ کر فرمائی اور سو اونٹ دیت کے سلسلہ میں مقرر فرما دیئے۔ کیونکہ عربوں میں اونٹ بکثرت ہوتے تھے اور یہی ان کے ہاں مال کی صورت تھی۔ لیکن دنیا کے ہر خطہ میں اونٹ نہیں ہوتے اور نہ وہ ہر علاقے میں مالی معیار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لہٰذہ ہر قوم، ہر ملک اور ہر زمانہ میں اس کے معاشرتی حالات کے اعتبار سے دیت کی شرح مقرر کرنی پڑے گی اور جو قوم نبی اکرم ﷺ نے اپنی تربیت سے تیار کی تھی وہ دوسری قوموں میں ان کے معاشرتی حالات کے مطابق ہی اس کی تعیین اس طرح کرے گی کہ قرآنی ہدایات کی روح اور اسپرٹ تو وہی رہے گو دوسری قوموں کے حالات وکوائف کے مطابق اس میں صورۃً تبدیلی ہو جائے جو قریب قریب ناگزیر ہے۔ چنانچہ یہ تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔

دائرہ معارف اسلامیہ میں ہے:

"تاہم بہت عرصہ نہ گزرنے پایا تھا کہ یہ قانون مسلمانوں کے جدید معاشرے کے حالات کے لیے عملاً سازگار نہ رہا۔ معاشرہ ترقی کر کے بہت جلد ایسی جماعت بن گیا جو نظری طور پر متحد اور بالخصوص ایک منظم ریاست

کی صورت میں نمودار ہوئی۔"

ان مخالفانہ مطالبات کے زیر اثر کام کرتے ہوئے ماہرین قانون نے دیت (اور ذاتی انصاف کے قانون (رک۔ قصاص) کا ایک نظریہ قائم کیا جس کے اندر مختلف میلانات کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ یہ نظریہ عموماً سنی اور شیعہ دونوں مسلکوں میں یکساں پایا جاتا ہے۔

دیت کی موجودہ صورت

موجودہ زمانہ میں دیت کا نظام دو خاص شکلوں میں مقامی حالات کے مطابق باقی نظر آتا ہے۔

بدوی قبائل میں جو بالطبع ہر نظام حکومت سے دلی مخالفت رکھتے ہیں ذاتی انتقام کا طریقہ ابھی تک جاری ہے جس کے ساتھ ساتھ دیت سے بھی حسب موقع کام لیا جاتا ہے۔ اس نظام کی بنیاد چند خصوصیات کے لحاظ سے ایسے رسم ورواج پر ہے جو قدیم عرب کے رسم ورواج سے ملتا جلتا ہے۔ اگرچہ ہر قبیلے میں اس کی صورت الگ الگ ہے۔

متعلقہ حکومتیں اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکیں کہ ان جماعتوں کے طریق عمل پر چند پابندیاں عائد کر دیں جن کا دائرۂ اثر بھی محدود ہے۔

چنانچہ مصر، اردن اور شام میں یہ رسم تقریباً عام ہے کہ قتل عمد کے سوا ہر صورت میں دیت واجب ہے۔ دیت کے اجزائے ترکیبی میں قبیلے قبیلے کے لحاظ سے فرق ہوتا ہے۔ صرف چالیس نر اونٹ یا چالیس نر اونٹ اور ایک دوشیزہ لڑکی یا نقد روپیہ (مثلاً مصر میں ۴۰۰ مصری پونڈ یا ۳۰۰ مصری پونڈ یا ۱۰۵ مصری پونڈ وغیرہ)۔ عورت کی دیت مرد سے زیادہ ہوتی ہے۔ بعض قبائل میں اس کی مقدار مرد کی دیت سے چار گنا یا آٹھ گنا تک زیادہ ہوتی ہے۔ اثباتِ جرم کے لیے آگ یا پانی سے گزرنے کا امتحان اکثر عمل میں آتا ہے۔ بعض قبائل میں عمل قسامت بھی دیکھا جاتا ہے۔

زیادہ ترقی یافتہ اور سیاسی حیثیت سے زیادہ منظم قوموں میں دیت دراصل اس لیے باقی رہی کہ اس کی نوعیت مذہبی حکم کی سی ہو گئی تھی۔ اس کی مخصوص مثال حکومتِ عثمانیہ میں ملتی ہے۔ اگرچہ وہاں انیسویں صدی عیسوی کے وسط کے قریب زمانہ حال کے مطابق قانون کی اصلاح ہو چکی تھی اور نقصان رسیدہ کے معاوضے کا قانون (معاوضے کے صحیح معنوں کے لحاظ سے) نافذ کر دیا گیا تھا۔ اور اس کے مطابق قانون عامہ باقاعدہ معمول بہ ہو چکا تھا۔ پھر بھی اہل مقدمہ کے قصاص کا اور آگے چل کر دیت کے مطالبہ کا حق باقی رکھا گیا۔ خاص طور پر ۱۸۶۳ء کے قانون تعزیرات میں سرکاری طور پر دیت کی مقدار دو سو چوبیس ترکی پونڈ معین کی گئی تھی۔

اب عملی طور پر یہ سب باتیں، دستور سازی سے غائب ہو چکی ہیں۔ لیکن پہلے حالات کے آثار جن کا مٹانا سخت مشکل ہے ابھی تک باقی ہیں۔ بعض ممالک جیسے شام میں عدالتیں اگرچہ قانون کی ظاہراً و باطناً پابند ہیں اور دیوانی اور فوجداری قوانین زمانہ حال کے تقاضے کے مطابق ۱۹۴۹ء سے جاری ہیں۔

پھر بھی وہ دیات ادا کرنے کا فیصلہ کرتی ہیں جس کی مقدار قتل انسان کی صورت میں یکمشت رقم ہوتی ہے اور اس کی کمی بیشی قتل عمد یا قتل خطأ کے لحاظ سے معین کی جاتی ہے۔ (اردو دائرۂ معارف اسلامیہ جلد نہم ص ۵۲۴ تا ۵۲۸ (مطبوعہ دانش گاہ پنجاب لاہور)

قصاص اور دیت کے اس تاریخی پس منظر کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ اسکے بعد ہم قرآن کریم کی فقہی جزئیات پر تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے۔

القصاص

قصاص کا مادہ قصص (ق ص ص) ہے اس کے بنیادی معنے کسی کے پیچھے پیچھے چلنے کے ہوتے ہیں۔ کسی کے نقش قدم پر چلنا۔ (تاج العروس) ابن فارس نے کہا ہے کہ اس لفظ کے بنیادی معنے کسی چیز کا پیچھا کرنے اور جستجو کرنے کے ہیں۔

سورۃ کہف میں ہے:

قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا

(الکہف:۶۴)

"موسیٰؑ نے کہا! اسی کو تو ہم تلاش کر رہے تھے چنانچہ دونوں اپنے نشانات قدم کی پیروی کرتے ہوئے واپس لوٹے۔"

سورۃ قصص میں ہے:

وَقَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ فَبَصُرَتْ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ

(القصص:۱۱)

"ام موسیٰ نے موسیٰ کی بہن سے کہا! اس کے پیچھے پیچھے جاؤ، چنانچہ وہ کنارے سے اسے دیکھتی ہوئی چلتی رہی اور فرعون کے لوگوں کو اس کی خبر تک نہ ہوئی۔"

قص علیه الخبر قصصا اسے وہ خبر بتادی، اس پر اسے مطلع کر دیا۔ چونکہ واقعہ کے متعلق اس کے وقوع پذیر ہونے کے بعد ہی بتایا جاتا ہے اس لیے اس میں پیچھے چلنے کے معنے پائے جاتے ہیں۔ سورۃ یوسف میں ہے:

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ (یوسف: ۱۳)

"اے پیغمبر! ہم آپ سے بہترین قصہ بیان کرتے ہیں۔"

چنانچہ اَلْقِصَّۃ معاملہ، خبر اور واقعہ کو کہتے ہیں جو وقوع پذیر ہو چکا ہے اور اسکے بعد ہی لوگوں سے بیان کیا جائے گا۔ قص الشعر اس نے بال کاٹے۔ المقص "قینچی" کو کہتے ہیں جس سے بال کاٹے جائیں۔ بال کاٹنا بھی بال پیدا ہو جانے کے بعد ہی عمل میں آتا ہے، اگر کسی کے بال ہی نہ ہوں تو کیا کاٹا جائے گا۔ القصاص مجرم کا اس طرح پیچھا کرنا کہ اسے اس کے جرم کی سزا مل کر رہے۔ مجرم کو اس کے جرم کی سزا دیدینا۔ قانونِ عدل کا مجرم کے پیچھے پیچھے چلنا۔ اس کی تلاش اور جستجو کرنا۔ راغب نے اس کے معنے خون کے پیچھے خون بہا (مالی بدلہ دیت) کا آنا کیئے ہیں (مفرادت)۔ قرآن کریم نے اس لفظ کو خصوصیت کے ساتھ جرم قتل کی سزا کے سلسلہ میں استعمال کیا ہے۔ اس میں خون کے بدلے خون اور خون کے بدلے دیت دونوں شامل ہیں، چنانچہ ان معنوں کے لحاظ سے قصاص کا لفظ جرم قتل کی سزا کے لیے ہو گا خواہ موت کی سزا ہو یا دیت ہو۔ پھر کثرت استعمال سے اس کے معنے جرم کے بدلے کے کیئے جانے لگے۔

جرم قتل کے متعلق پہلی آیت سورۂ بقرہ میں آئی ہے۔

يَآأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى

(البقرہ: ۱۷۷)

"اے پیروانِ دعوت ایمانی! مقتولین کے بارے میں تم پر قاتل کا پیچھا کرنا (یا قتل کا بدلہ لینا اور سزا دینا) فرض کیا گیا ہے۔"

واضح رہے کہ آیت مذکورہ بالا میں خطاب مقتول کے ورثاء اور اولیاء کو نہیں فرمایا گیا ہے، بلکہ خطاب جماعت مومنین کو یعنی مسلمانوں کی ہیت اجتماعیہ کو ہے۔ اسلامی حکومت کا فریضہ ہے کہ وہ قاتل کا پیچھا کرے، اس کی تلاش اور جستجو کرے اور اسے اس کے جرم کی سزا دے جس کو تکلیف اور اذیت پہنچائی گئی ہے۔ اسے اس کا بدلہ دلایا جائے مجرم کو یونہی نہ چھوڑ دیا جائے کہ وہ کسی انسان کو قتل کر کے یا اسے ایذا پہنچا کر دندناتا پھرے اور اپنے کرتوت کی سزا نہ پا سکے۔ قصاص کے معنے ہمارے ہاں عام طور پر صرف سزائے موت کے کر دیئے جاتے ہیں جو صحیح نہیں ہیں۔ جیسا کہ ہم نے عرض کیا ہے قصاص کے معنے قتل کے مجرم کا پیچھا کرنا، اس کا تعاقب کرنا اور اس کی تلاش و جستجو کرنا ہیں تا کہ اسے اس کے جرم کی سزا دی جا سکے۔ صرف سزائے موت کے نہیں ہیں وہ سزائے موت بھی ہو سکتی ہے، سزائے دیت بھی ہو سکتی ہے۔ آنکھ کے بدلے آنکھ، کان کے بدلے کان، ناک کے بدلے ناک اور دانت کی سزا بھی ہو سکتی ہے۔

اسلام سے پہلے دنیا بھر میں یہ رواج تھا کہ قتل کے مجرم سے انتقام لینا مقتول کے ورثاء اور اس کے خاندان کی ذمہ داری سمجھی جاتی تھی یعنی وہ خود مجرم کا پیچھا کریں، اس کو تلاش کریں اور اس سے انتقام لیں۔ اس دور میں عموماً منظم حکومتیں نہیں تھیں زیادہ تر قبائلی نظام رائج تھا۔ جہاں کسی درجہ میں منظم حکومتیں قائم بھی تھیں۔ وہاں بھی وہ اپنی ابتدائی شکل میں تھیں لیکن عرب میں تو ابتدائی شکل میں بھی منظم حکومت کا کوئی وجود نہیں تھا۔ لہٰذہ اس کا امکان ہی نہیں تھا کہ اس قسم کی جنایات کی سزا کی ذمہ داری حکومت کی قرار دی جائے۔ چنانچہ مقتول کے ورثاء اور اولیاء خود ہی قاتل کو تلاش کرتے اور اس سے انتقام لیتے تھے۔ اجتماعی ذمہ داری نہ ہونے کی وجہ سے افراد کے لیے یہ کام آسان نہیں تھا کہ وہ اصل مجرم کو تلاش کر لیں اور اسی سے انتقام لیں۔ لہٰذہ اس سلسلہ میں بڑی زیادتیاں ہوتی تھیں۔ صحیح قاتل نہ مل سکے تو قاتل کے خاندان کے کسی بھی آدمی کو قتل کر دیا جاتا تھا۔ نیز اگر مقتول کا خاندان متمول اور طاقتور ہوتا تھا تو ایک آدمی کے بدلے ایک ہی آدمی کو قتل نہیں کرتے تھے بلکہ ایک آدمی کے بدلے دس دس آمیوں کو قتل کر دیتے تھے۔ اگر مقتول غلام یا عورت ہوتی تھی تو چونکہ مقتول طاقتور خاندان سے تعلق رکھتا تھا اس لیے اس کے بدلے میں قاتل کے خاندان سے آزاد آدمیوں کو قتل کر دیتے تھے۔ یہ رواج عزت، حسب و نسبت اور عرف اجتماعی کی وجہ سے ہی نہیں تھا بلکہ یہ ان کے عقیدہ اور دینی و مذہبی رائے کی وجہ سے بھی تھا۔ تاریخ العرب قبل الاسلام کا اقتباس اس سلسلہ میں پہلے گزر چکا ہے۔

چونکہ عربوں میں مقتول کے بدلے میں صرف قاتل ہی کو قتل کر دینا ضروری نہیں تھا بلکہ قاتل کے گھر یا خاندان کے کسی بھی آدمی کو قتل کر دینا ضروری سمجھا جاتا تھا اس لیے قرآن کریم نے مذکورہ بالا آیت (البقرہ: ۱۷۸) میں ساتھ ہی اس کی وضاحت بھی ضروری سمجھی کہ یہ رواج غلط ہے۔ مقتول کے بدلے میں صرف قاتل ہی کو قتل کیا جانا چاہیے۔ اس کے گھر یا خاندان کے کسی دوسرے آدمی کو قتل نہیں کیا جا سکتا، جس نے جرم کیا ہے اسی کو اس کے جرم کی سزا ملنی چاہیے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى (البقرہ: ۱۷۸)

"آزاد قاتل کی جگہ اسی آزاد کو قتل کیا جائے گا۔ قاتل غلام کی جگہ اسی غلام کو قتل کیا جائے گا، قاتل عورت کی جگہ اسی عورت کو قتل کیا جائے گا۔"

چنانچہ شیخ الاسلام امام ابو بکر جصّاص رازی نے لکھا ہے کہ:

"اور حق تعالیٰ کا ارشاد "الحر بالحر" اسی کا بیان ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے اور اسی کی تاکید ہے حق تعالیٰ نے اس میں اس حال کو بیان فرمایا ہے جس کے لیے یہ کلام صادر ہوا ہے، یہ وہی بات ہے جو شعبیؒ اور قتادہؒ نے بیان فرمائی

ہے کہ عرب کے دو خاندانوں میں جنگ چلتی آ رہی تھی۔ ان میں ایک خاندان کو دوسرے خاندان پر برتری حاصل تھی۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ ہم اس کے بغیر راضی نہیں ہو سکتے کہ اپنے ایک غلام کے بدلے میں تمہارے آزاد آدمی کو، اپنی عورت کے بدلے تمہارے مرد کو قتل کریں گے۔ تو حق تعالیٰ نے ان کی تردید کرتے ہوئے یہ حکم نازل فرمایا کہ مقتولین کے بارے میں تم پر قصاص (بدلہ) فرض کیا گیا ہے۔ آزاد کی جگہ وہی آزاد اور غلام کی جگہ وہی غلام قتل کیا جائے گا (جس نے قتل کے جرم کا ارتکاب کیا ہے)۔ اس سے اس کا ابطال کیا گیا ہے جو وہ چاہتے تھے اور ان کو تاکید کی گئی ہے کہ قصاص کی فرضیت قاتل ہی پر ہے کسی دوسرے پر نہیں ہے۔ کیونکہ وہ غیر قاتل کو قتل کر دیتے تھے۔ حق تعالیٰ نے ان کو اس سے منع فرما دیا ہے۔ اسی مضمون کی وہ روایت بھی ہے جس میں حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ کے نزدیک قیامت کے دن ظالم ترین شخص تین آدمی ہوں گے۔ (۱) وہ آدمی جو قاتل کے بجائے کسی دوسرے آدمی کو قتل کر دے (۲) وہ آدمی جو حرم میں کسی کو قتل کر دے اور (۳) وہ آدمی جو عہد جاہلیت کا انتقام وصول کرے۔ الخ (احکام القرآن للجصّاص الرازی (ج ا ص ۱۵۶ مطبوعہ المطبعۃ البہیۃ المصریہ سنہ ۱۳۴۷ھ)

اسلام نے عرب میں پہلی مرتبہ ایک منظم حکومت قائم فرمائی اور قبائلی نظام حکومت کو ختم کیا۔ اور اس طرح قانونی فرماں روائی کی بنیاد رکھی۔ آیت مذکورہ بالا میں خطاب مقتول کے ورثاء کو نہیں فرمایا گیا، بلکہ مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ کو خطاب فرمایا گیا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ۭ (البقرہ:۱۷۸)

"اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! مقتولین کے بارے میں قصاص (قاتل کی تلاش، جستجو، پیروی اور اس سے بدلہ لینا) تم پر (تمہاری ہیئت اجتماعیہ پر) فرض کیا گیا ہے۔"

یعنی قتل کا جرم کسی فرد کے خلاف نہیں ہے کہ وہ مجرم کا پیچھا کرے اور اگر اس میں اتنی قوت ہو کہ وہ مجرم کو پکڑ کر اس سے انتقام لے سکتا ہو تو وہ اس سے بدلہ لے لے۔ اور اگر مجرم کوئی بڑا آدمی ہو جس پر مقتول کے ورثا کو دسترس نہ ہو سکے تو وہ صبر کر کے بیٹھیں رہیں بلکہ یہ جرم مسلمانوں کی پوری ہیئت اجتماعیہ اور اسلامی معاشرہ کے خلاف ہے۔ لہٰذہ معاشرہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ مجرم کا پیچھا کرے اور اسے کیفر کردار تک پہنچائے۔ پورے معاشرہ کا فریضہ ہے کہ وہ قاتل سے مقتول کا بدلہ لینے کا انتظام کرے، قتل عمد کی صورت میں قتل اور قتل خطاء کی صورت میں خوں بہا وصول کرے۔ دور حاضر کی اصطلاح میں اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں یہ جرم قابل دست اندازی پولیس ہے۔ اس میں مستغیث مقتول کے ورثاء نہیں بلکہ خود اسلامی حکومت ہوتی ہے ورثاء جرم کے شاہد ہو سکتے ہیں مستغیث نہیں ہوں گے۔

جو چیز کسی پر فرض کی جاتی ہے اس کی ادائیگی وہی کرتا ہے جس پر وہ فرض کی گئی ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (البقرہ: ۱۸۳) كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ (البقرۃ ۲۱۶) كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَ اۨ ۚ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ (البقرہ:۱۸۰)

کی وجہ سے صیام، قتال اور وصیت کرنا تمام مسلمانوں پر فرض ہے۔ لہٰذہ (کتب علیکم القصاص (البقرہ: ۱۷۸) کے معنے بھی یہی ہوں گے کہ قصاص تمام مسلمانوں پر فرض ہے۔ اب اگر قصاص کے معنی صرف سزائے موت کے لیے جائیں تو ظاہر ہے تمام مسلمانوں پر سزائے موت تو فرض نہیں ہے۔ سزائے موت تو قتل عمد کے مجرم ہی پر فرض ہے مگر یہاں اس کی فرضیت تمام مسلمانوں پر فرمائی گئی ہے۔ اس سے یہ بات سمجھی جا سکتی ہے کہ قصاص کے معنے سزائے موت کے نہیں ہیں بلکہ اس کے معنے قاتلوں کو تلاش کرنے، ان کی جستجو کرنے، ان کا تعاقب کرنے، انہیں کیفر کردار تک پہنچانے اور اس سے مقتول کا بدلہ وصول کرنے کے ہیں۔ کیونکہ یہی چیزیں تمام مسلمانوں پر فرض ہو سکتی ہیں اور فرض ہیں۔ سزائے موت تو تمام مسلمانوں پر فرض نہیں ہے۔

قتل کی دو صورتیں ہوتی ہیں ایک قتل عمد اور دوسرے قتل خطاء۔ قتل عمد یہ ہے کہ آدمی جان بوجھ کر کسی کو بالارادہ قتل کر دے۔ اس کی سزا، سزائے موت ہے اور قتل خطاء یہ ہے کہ غلطی سے کوئی آدمی کسی کے ہاتھ سے قتل ہو جائے مثلاً کسی نے ایک ہرن پر گولی چلائی اور وہ غلطی سے کسی انسان کو لگ گئی۔ اس صورت میں قاتل کو خوں بہا یعنی دیت دینی لازم ہے۔

قتل عمد

قتل عمد یہ ہے کہ کوئی آدمی دوسرے آدمی کو کسی ہتھیار سے یا کسی ایسے طریقے سے قتل کر دے جس سے عموماً قتل کیا جاتا ہو تو اسے قتل عمد کہا جائے گا، کسی کو خاصے بڑے پتھر سے مار ڈالنا یا آگ سے جلا دینا بھی قتل عمد میں شامل ہے۔ غرضیکہ کسی ایسے طریقے سے کسی کی جان لے لینا جس سے عام طور پر قتل کا کام لیا جاتا ہو، قتل عمد کہلائے گا۔ خواہ کسی آلہ کے ذریعہ سے ہو یا بغیر آلہ کے، مثلاً زہر پلا دینا یا گلا گھونٹ دینا یا جوڈو کراٹے سے ایسی ضرب لگانا یا پانی میں ڈبو دینا وغیرہ جس سے دوسرے کی موت واقع ہو جائے۔

قتل عمد کے سلسلہ میں قرآن کریم میں ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا (النساء:۹۲)

"اور مومن کے لیے ناممکن ہے کہ وہ کسی مومن کو قتل کر دے اِلّا یہ کہ غلطی سے ایسا ہو جائے۔"

اس سے آگے ہے:

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاۗؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا (النساء ۹۳)

"اور جو کوئی کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کر دے تو اس کی جزا جہنم ہے۔ وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہے گا اور اللہ کا غضب اس پر نازل ہو گا اور اللہ کی لعنت اور پھٹکار اس پر برسے گی اور اللہ نے اس کے لیے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔"

اسی سلسلہ میں سورۂ مائدہ میں ہے:

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ۭ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ۭ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (المائدہ:۴۵)

"اور ہم نے تورات میں یہودیوں پر فرض کیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک اور دانت کے بدلے دانت کی سزا دی جائے اور زخموں کا بھی بدلہ ہو۔ تو جو کوئی معاف کر دے تو اس کا یہ عمل اس کے گناہوں کا کفارہ بن جائے گا اور جو کوئی اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلے نہ کریں تو وہی لوگ تو ظالم ہیں۔"

اس آیت کریمہ میں اگرچہ جو احکام بیان کئے گئے ہیں وہ بنی اسرائیل کے لیے ہیں لیکن چونکہ ان احکام کی تبدیلی یا نسخ کو نہ قرآن کریم نے بیان کیا اور نہ سنت رسول اکرم ﷺ نے بیان کیا اس لیے یہ احکام ہمارے لیے بھی ایسے ہی واجب العمل تھے کیونکہ شرائع من قبلنا ہمارے لیے بھی ایسے ہی حجت ہوتی ہیں جیسا کہ وہ گزشتہ امم کے لیے حجت ہوتے تھے بجز اس صورت کے کہ قرآن کریم نے یا سنت نبوی نے ان کو تبدیل نہ کر دیا ہو، لہٰذہ جو شخص کسی مسلمان کو جو محفوظ الدم ہو عمداً قتل کر دے اس کو مقتول کے بدلے قتل کیا جائے گا۔

آزاد آدمی غلام کے بدلے میں

اسی طرح اگر کوئی شخص جو آزاد ہو کسی غلام کو قتل کر دے تو اس غلام کے بدلے میں اس آزاد آدمی کو قتل کیا جائے گا۔ امام شافعیؒ کا خیال ہے کہ غلام کے بدلے میں آزاد آدمی کو قتل نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ قصاص میں مساوات ضروری ہے اور غلام اور آزاد میں مساوات موجود نہیں ہے۔

حنفیہؒ کا خیال ہے کہ قصاص میں جیسا کہ آزاد آدمی معصوم الدم ہوتا ہے ایسے ہی غلام بھی معصوم الدم ہوتا ہے۔ عصمت دم جیسا کہ دین سے حاصل ہوتی ہے ایسے ہی دار سے بھی حاصل ہوتی ہے۔ جیسا کہ آزاد آدمی اسلامی مملکت (دار الاسلام) کا باشندہ ہے ایسے ہی غلام بھی اسلامی مملکت کا باشندہ ہے لہٰذہ وہ بھی معصوم الدم ہے، خون کی عصمت میں دونوں برابر ہیں۔ لہٰذہ مساوات قائم ہے۔ لہٰذہ قصاص نہ لینے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ حنفیہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول قرآن سے قریب تر ہے۔ قرآن کریم ان النفس بالنفس (جان کے بدلے جان) فرمایا ہے اور انسانی جان جیسے آزاد آدمی میں ہے ایسے ہی غلام میں بھی ہے۔ لہٰذہ آزاد اور غلام میں فرق و امتیاز نہیں برتا جا سکتا۔

ذمی کے بدلے میں مسلم

اگر ایک اسلامی مملکت میں کوئی مسلمان کسی غیر مسلم (ذمی) کو قتل کر دے تو امام شافعیؒ کے نزدیک غیر مسلم کے بدلے میں کسی مسلمان کو قتل نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا خیال یہی ہے کہ چونکہ دونوں میں مساوات نہیں ہے۔ ایک مسلمان ہے اور دوسرا کافر ہے۔ مسلمان اور کافر برابر نہیں ہو سکتے۔ لہٰذہ قصاص کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حضرات حنفیہؒ کا خیال یہاں بھی وہی ہے کہ چونکہ دونوں اسلامی مملکت (دار السلام) کے باشندے ہیں۔ لہٰذہ عصمت دار دونوں کو حاصل ہے اور غیر مسلم کی حفاظت و صیانت کا حکومت نے عہد کیا ہوا ہے لہٰذہ اس کی جان کی حفاظت حکومت کا فریضہ ہے۔ لہٰذہ دونوں میں قصاص ہونا چاہیے۔ قرآن کی رو سے ہم فقہائے حنفیہؒ کی تائید کریں گے ہماری دلیل وہی ہے جو ہم نے اوپر ذکر کر دی ہے، کہ قرآن کریم نے: "ان النفس بالنفس" فرمایا ہے یعنی جان کے بدلے جان۔ "انسانی جان جیسی ایک مسلمان میں ہوتی ہے غیر مسلم میں بھی ہوتی ہے لہٰذہ مسلم اور غیر مسلم میں کوئی فرق اور امتیاز نہیں کیا جا سکتا۔ امام شافعیؒ نے حضور اکرم ﷺ کے اس ارشاد سے استدلال فرمایا ہے کہ جس میں آپ نے فرمایا ہے کہ:

لَا يُقْتَلُ مُؤْمِنٌ بِكَافِرٍ

"کوئی مومن کافر کے بدلے میں قتل نہیں کیا جا سکتا۔"

اس ارشاد کو امام بخاری ابو داؤد اور نسائی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اور ابو داؤد و ابن ماجہ نے حضرت عبد اللہ ابن عمرو سے اور بخاری نے اپنی تاریخ میں حضرت عائشہؓ سے نقل کیا ہے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں حنفیہؒ نے ارشاد

قرآنی کے ساتھ (ملاحظہ ہو جصاص) حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے استدلال فرمایا ہے جسے دار قطنی، بیہقی، امام محمدؒ، امام شافعیؒ نے روایت کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ذمی اور معاہد کے بدلے میں مسلمان کو قتل فرمایا تھا۔ اور ارشاد فرمایا تھا کہ:

اَنَا اَحَقُّ وَاَوْلٰی اَنْ اُوْفِیَ بِذِمَّتِیْ

"میں اس کا زیادہ حق دار اور اقرب ہوں کہ اپنے عہد اور ذمہ داری کو وفا کروں۔"

ہمارے نزدیک آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد قرآن کریم سے قریب تر ہے۔ رہ گئی پچھلی حدیث تو وہ بھی ہمارے خلاف نہیں ہے۔ اس حدیث کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی مومن ایسے کافر کے بدلے میں قتل نہیں کیا جاسکتا جو حربی اور غیر معاہد ہو۔ (مذکورہ بالا احادیث کے لیے الدرایہ فی تخریج احادیث الہدایہ ج۴ص۵۶۲ بر حاشیہ ہدایہ مطبوعہ کلام کمپنی کراچی اور اعلاء السنن ج۱۸ص۸۲ مطبوعہ سپر آرٹ پریس فریئر روڈ کراچی ملاحظہ فرمایئے)

مستأمن کے بدلے میں

اگر کوئی غیر مسلم امان لے کر اسلامی مملکت میں آیا ہو اور اسے کوئی مسلمان قتل کر دے تو فقہائے حنفیہؒ بھی اس کے قائل ہیں کہ اس کے بدلے میں مسلمان قاتل کو قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا۔ امام شافعیؒ کا مذہب بھی یہی ہے لیکن یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ انہوں نے اس سلسلہ میں یہ دلیل دی ہے کہ امن حاصل کر کے آنے والا غیر مسلم مستقل طور پر یا ابدی طور پر محفوظ الدم نہیں ہے لہٰذہ اسے کوئی مسلمان یا ذمی اگر قتل کر دے تو اس قاتل کو سزائے موت نہیں دی جاسکتی۔ قرآن کریم نے واضح طور پر فرمایا ہے کہ:

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝ (التوبۃ:٦)

"اگر مشرکین میں سے کوئی آپ سے کوئی پناہ مانگے تو آپ اسے پناہ دے دیجئے حتیٰ کہ وہ اللہ کا کلام سن لے۔ پھر اسے اس کی امن (حفاظت) کی جگہ تک پہنچا دیجئے۔ یہ حکم اس لیے دیا جاتا ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو (حقیقت کا) علم نہیں رکھتے۔"

اس آیت کریمہ میں بتایا گیا ہے کہ اگر کوئی مشرک بھی تم سے امان طلب کرے اور تم اسے امان دینا مناسب سمجھو تو ضرور امان دو۔ اس کے بعد یہ بھی ضروری ہے کہ اسے ایسے محفوظ مقام تک پہنچا دیا جائے جہاں اس کی جان کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو۔ اگلی آیتوں میں مشرکین ہی کے سلسلہ میں فرمایا گیا ہے کہ ان سے تو کوئی معاہدہ بھی نہیں ہو سکتا۔ وہ اگر تم پر غالب آ جائیں تو وہ نہ تو تمہارے کسی رشتہ کا لحاظ کریں گے نہ کسی معاہدہ کا۔ ایسے لوگوں کے متعلق بھی یہی حکم ہے کہ اگر وہ امان یا پناہ مانگیں اور تم مناسب سمجھو تو انہیں امان دیا جائے اور ان کی پوری حفاظت کی جائے اور ان کو ان کے محفوظ و مامون مقام تک پہنچایا جائے لہٰذہ یہ کہنا کہ وہ مستقل طور پر محفوظ الدم نہیں ہیں۔ اس لیے اگر کوئی انہیں قتل کر دے اور قتل کرنے والا مسلمان یا ذمی ہو تو قاتل کو قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا قرآن کے خلاف ہے۔ حضرات فقہائے کرام کے زمانے میں جو حالات ہوں سو ہوں مگر موجودہ حالات میں ویزا لے کر جو غیر مسلم ہمارے ملک میں آتے ہیں وہ عموماً وہی لوگ ہوتے ہیں جن کی حکومتوں کو ہم تسلیم نہیں کرتے مثلاً اسرائیل اور جنوبی افریقہ کی نسل پرست حکومتیں۔ ان کے لوگ ویزا لے کر بھی ہمارے ملک میں نہیں آسکتے۔ وہ اس ضمن میں آتے ہیں جن کے متعلق قرآن کریم نے محولہ بالا آیت میں حکم دیا ہے کہ اگر وہ بھی امان حاصل کرنا چاہیں تو انہیں امان دے سکتے ہو، ان کی حفاظت کی جائے اور کلام اللہ کو سننے کے بعد انہیں ان کے محفوظ مقام تک پہنچایا جائے۔

باقی تمام مستأمن (ویزا لے کر آنے والے) معاہد ہیں اور ان کے متعلق قرآن کریم کا صریحی ارشاد ہے کہ:

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝۷ كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۭ يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ ۚ وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝۸ (التوبۃ:۷تا۸)

"مشرکین کے لیے اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک کوئی عہد کیسے ہو سکتا ہے۔ بجز ان لوگوں کے جن سے تم نے مسجد حرام کے پاس معاہدہ کر لیا تھا۔ تو جب تک وہ تمہارے لیے معاہدہ کی پابندی کریں تم بھی ان کے لیے معاہدہ کی پابندی کرو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ (عہد شکنی سے) پرہیز کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے (ان سے جدید معاہدے) کیسے ہو سکتے ہیں اور وہ اگر تم پر غالب آ جائیں تو تمہارے بارے میں وہ نہ کسی رشتہ دار کا لحاظ کریں گے اور نہ کسی معاہدہ کا۔ وہ اپنے منہ سے (نکلتی ہوئی باتوں سے) تمہیں خوش کرتے ہیں لیکن ان کے دل ان کی باتوں کا ساتھ نہیں دیتے۔ اور ان میں سے اکثر فاسق ہی ہیں۔"

سورہ توبہ کی یہ آیات مشرکین عرب کے متعلق ہیں جن کے متعلق تمام فقہاء بالاتفاق اس کے قائل ہیں کہ ان سے کسی قسم کا معاہدہ نہیں ہو سکتا۔

ان سے یا تو اسلام قبول کیا جاسکتا ہے یا وہ قتل کر دیئے جائیں گے۔ ان کو ذمی بنا کر نہیں رکھا جاسکتا۔ لیکن ان کے متعلق بھی حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ اگر وہ پناہ طلب کریں اور تم انہیں پناہ دیدو تو ان کے جان ومال کی حفاظت مسلمانوں کا فریضہ ہے حتیٰ کہ کلام الٰہی سنانے کے بعد انہیں ان کے محفوظ ومامون مقام تک پہنچا دینا بھی مسلمانوں کی ذمہ داری ہے۔ عرب کے سوا دوسرے نو مسلموں کے لیے بھی بدرجہ اولیٰ اس کی پابندی ضروری ہو گی۔ ویسے عالم جنگ میں بھی کوئی مسلمان اگر کسی کافر کو پناہ دے دے تو اس کے امان کا احترام کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے جسے کسی مسلمان نے پناہ دیدی ہو۔ پناہ دینے والا مرد ہو یا عورت ہو یا غلام ہو، اسے قتل کرنا جائز نہیں ہے، چنانچہ ابو داؤد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ اگر کوئی عورت بھی مسلمانوں کی طرف سے کسی کافر کو پناہ دے دے تو یہ پناہ دینا جائز ہو گا۔ یعنی اس کی پابندی سب کو لازم ہو گی۔ (بحوالہ جمع الفوائد۔ ج ۲ ص ۱۳ مطبوعہ خیریہ میرٹھ)

بخاری اور مسلم میں ہے کہ:

فتح مکہ کے موقعہ پر حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں، آپ اس وقت غسل فرمارہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: "یہ کون ہے؟" ام ہانیؓ نے کہا کہ: "میں ام ہانی ہوں" پھر حضرت ام ہانیؓ نے عرض کیا: "اے اللہ کے رسول میرا ماں جایا بھائی (حضرت علیؓ) کہتے ہیں کہ وہ ہبیرہ کے لڑکے (یعنی میرے شوہر) کو قتل کر دیں گے۔ حالانکہ میں اسے پناہ دے چکی ہوں" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم نے جس کو پناہ دے دی ہم نے بھی اسے پناہ دے دی۔ (صحیح بخاری، کتاب الغسل، باب التستر فی الغسل و کتاب الصلوٰۃ، باب الصلوٰۃ فی الثوب الواحد عن ام ہانی و صحیح مسلم کتاب الحیض)

اس سے ظاہر ہے کہ جب عین میدان جنگ میں کسی بھی مسلمان کے پناہ دے دینے کے بعد چاہے پناہ دینے والی عورت ہی کیوں نہ ہو اس کا احترام تمام مسلمانوں پر فرض ہے تو جو لوگ خود حکومت وقت کی امان کے بعد اسلامی حکومت میں داخل ہوں اس کا احترام کیوں ضروری نہیں ہو گا۔ موجودہ حالات میں جو کفار اسلامی حکومت میں امان کے ساتھ (ویزا لے کر) داخل ہوتے ہیں ان کے جان مال کی حفاظت تمام مسلمانوں کا فرض ہے۔ اور ان کا حکم وہی ہونا چاہیے جو ان کفار کا ہوتا ہے جو مستقل طور پر ذمی کی حیثیت سے دارالاسلام میں رہتے ہوں۔ لہٰذہ ایسے مستامن کو اگر کوئی مسلمان قتل کر دے تو قصاص میں ایسے قاتل کو قتل کیا جانا چاہیے۔ ھذا ما رائیتہ واللہ اعلم۔

قصاص میں کوئی امتیاز نہیں

تمام فقہاء متفق ہیں کہ اگر مقتول عورت ہو یا بچہ، اندھا ہو، اپاہج اور معذور ہو، لنگڑا یا لونجا ہو یا مجنون ہو تو اس کے قاتل کو جو مرد ہو، بالغ ہو، بینا ہو، صحیح الاعضاء ہو اور عاقل ہو تو اگر قاتل نے عمداً قتل کیا ہے تو قاتل کو قصاص میں قتل کر دیا جائے گا۔ کیونکہ قاتل اور مقتول کے درمیان ان تفاوتوں کا لحاظ کرنے سے قتل وغارت کا دروازہ کھل جائے گا اور لوگوں کی جانیں محفوظ نہیں رہیں گی۔ ہم بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ کیونکہ قرآن کریم نے جان کے بدلے جان، (النفس بالنفس) کا حکم دیا ہے اور جان جیسے ایک مرد میں ہوتی ہے ایک مجنون اور نابالغ بچہ میں بھی ہوتی ہے، جیسے ایک تندرست اور توانا آدمی میں ہوتی ہے ایک نابینا اور اپاہج اور معذور میں بھی ہوتی ہے۔ قرآن کریم کی رو سے جان اور جان میں کوئی فرق نہیں کیا جاسکتا۔ قرآن کریم کا یہی ارشاد ہے۔

بیٹے کے بدلے باپ

اگر باپ یا ماں نے اپنے بیٹے کو قتل کر دیا ہو یا دادا، دادی نے اپنے پوتے کو اور نانا، نانی نے اپنے نواسے کو قتل کر دیا ہو تو امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کا ارشاد ہے کہ قاتل کو قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا۔ البتہ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اگر ماں، باپ، دادا، دادی اور نانا، نانی نے بچہ کو واقعی ذبح کیا ہو تو انہیں قصاص میں قتل کیا جائے گا، البتہ اگر انہوں نے تادیباً کوئی چیز پھینک کر ماری اور وہ کسی نازک مقام پر لگ گئی جس سے بچہ کی موت واقع ہو گئی تو چونکہ تادیب و تنبیہ کا شبہ موجود ہے اس لیے ان کو قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا۔ جمہور فقہائے نے حضرت عمرؓ اور ابن عباسؓ وغیرہ کی اس حدیث سے استدلال فرمایا ہے کہ جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ باپ کو بیٹے کے قتل پر قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا۔ اس حدیث کو دار قطنی، ترمذی اور حاکم و بیہقی وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ بیہقی نے کہا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے۔ ابن عبد البر نے کہا ہے کہ یہ حدیث مشہور ہے اہل حجاز اور اہل عراق سب نے اس حدیث کو قبول فرمایا ہے۔ (اعلاء السنن ج ۱۸ ص ۸۶ مطبوعہ سپر آرٹ پریس فریر روڈ کراچی)

چونکہ باپ، ماں، دادا، دادی اور نانا، نانی میں شفقت پدری و مادری کے باوجود اس کا امکان بہت ہی بعید ہے کہ وہ عمداً اپنی اولاد کو قتل کر دیں۔ لہٰذہ زیادہ تر احتمال اسی کا ہے کہ باپ ماں وغیرہ کے ہاتھوں اگر اولاد کا قتل عمل میں آیا ہے تو وہ خطأ ہی ہوا ہو گا۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمادیا ہو گا کہ باپ کو بیٹے کے قصاص میں قتل نہ کیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جو ارشادات نقل کئے گئے ہیں وہ مخصوص واقعات و حالات سے متعلق ہو سکتے ہیں انہیں عام قانون نہیں کہا جاسکتا۔ فقہاء کی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مفروضات

پر قانون سازیاں نہیں فرماتے تھے بلکہ جب کوئی واقعہ پیش آجاتا تھا اور اس کا حکم آپ سے دریافت کیا جاتا تھا تو صورت حال کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کا حکم آپ بیان فرمادیا کرتے تھے۔ لہٰذہ عین ممکن ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جس واقعہ میں یہ ارشاد فرمایا ہو اس میں تنبیہ و تادیب کا شبہ موجود ہو اس لیے آپ نے یہ فیصلہ فرمایا ہو۔ قرآن کریم نے عام مسلمانوں کو بھی مسائل کی کھود کرید کرنے سے منع فرمایا ہوا تھا۔ چنانچہ سورۃ مائدہ میں ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔـلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ

(المائدہ:۱۰۱)

"اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! تم (فرضی) چیزوں کے متعلق سوالات نہ کیا کرو کہ اگر ان کا حکم ظاہر کر دیا جائے تو تمہارے لیے تکلیف کا باعث بن جائے۔"

اسی آیت میں اس کے بعد ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔـلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَاِنْ تَسْـَٔـلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ۭ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۰۱﴾ قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾ (المائدہ۱۰۱تا۱۰۲)

"اور اگر تم قرآن کے نزول کے زمانہ میں ان کے متعلق سوالات کروگے تو تمہیں ان کے احکام بتا دیئے جائیں گے۔ اللہ نے تمہیں اب تو معاف فرما دیا۔ (لیکن آئندہ احتیاط رکھو) اور اللہ تعالیٰ تو بڑے مغفرت فرمانے والے اور بڑے ہی بردبار ہیں۔ تم سے پہلے بھی ایک قوم (بنی اسرائیل) نے ایسے سوالات کیے تھے پھر جب ان کو ان کا حکم بتادیا گیا تو وہ ان کے منکر بن گئے۔"

احادیث کا شانِ نزول

خود حق تعالیٰ نے اپنے اصول اور احکام، مسائل کی صورتیں فرض فرما کر نازل نہیں فرمائے۔ بلکہ جب تک کوئی مسئلہ واقعی طور پر پیش نہیں آگیا اس کا حکم نہیں بتایا۔ چنانچہ کتاب الٰہی کی تکمیل میں تیئس ۲۳ سال کا عرصہ لگ گیا۔ حق تعالیٰ کے لیے کچھ مشکل نہیں تھا کہ وہ ایک دفعہ ہی پوری کی پوری کتاب نازل فرما دیتا۔ مگر حق تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا بلکہ تدریجی طور پر احکام نازل فرمائے کہ جب کوئی حادثہ پیش آگیا تو اس کا حکم نازل فرمادیا۔ اور مسلمانوں کو بھی مسائل کی کھوج کرید کرنے سے منع فرمادیا۔ تو آنحضرت ﷺ نے بھی لامحالہ اسی سنت الٰہی کی پیروی فرمانا تھی۔ آپ نے بھی جو احکام بیان فرمائے ہیں بلکہ واقعات وحادثات کے بعد ہی بیان فرمائے ہوں گے۔ مگر ہماری یہ غلط نگہی حیرت ناک ہے کہ کتاب الٰہی کے متعلق تو جو قانون کی کتاب (Text Book) ہے۔ اس کے بیان فرمودہ احکام واصول میں تو ہم ان واقعات و حوادث (شانِ نزول) کی تلاش و جستجو اور چھان بین کرتے ہیں جن کے سلسلہ میں وہ اصول واحکام نازل ہوئے تھے۔ لیکن ان کی تشریح و تبیین میں جو احادیث وارد ہوئی ہیں ان میں ہم قطعاً اس کی فکر نہیں کرتے کہ آنحضرت ﷺ نے یہ تشریح و تبیین کب فرمائی تھی، کن حالات میں فرمائی تھی، کس واقعہ میں فرمائی تھی۔ حالانکہ قانون کی جو اصولی اور بنیادی کتاب (Text Book) ہے اس میں ہمیں اس کی جستجو نہیں ہونی چاہیے تھی۔ قانون کے تو الفاظ دیکھے جاتے ہیں کیونکہ قانون کا ہر لفظ اپنے معنے اور اپنا مقصد رکھتا ہے، وہ واقعات و حوادث کا پابند نہیں ہوتا۔ چنانچہ ہمارے فقہاء نے یہ فیصلہ فرمار کھا ہے کہ:

اَلعبرۃ لعموم الالفاظ لا لخصوص المورد

"الفاظ کے عموم کا اعتبار ہوگا۔ مخصوص واقعہ کا جس میں وہ وارد ہوا ہے کوئی اعتبار نہیں ہوگا۔"

کیونکہ ایک قانون کی حیثیت ہی یہ ہونی چاہیے اور ہوتی ہے لیکن قرآنی احکام کے لیے تو ہم شانِ نزول کی تلاش کرتے ہیں لیکن ان واقعات وحوادث کی ہم کوئی فکر ہی نہیں کرتے جن پر حضور اکرم ﷺ نے قرآن کے ان اصول واحکام کو منطبق (Apply) فرمایا تھا۔ چنانچہ ارشادات نبوی کے متعلق ہمیں نہ ان کی تاریخ معلوم ہے۔ نہ وہ واقعہ یا حادثہ معلوم ہے جس پر آپ نے قرآن کریم کے کسی حکم کو منطبق فرمایا تھا۔ اس طرح ہم نے اصل قانون کو فرع بناڈالا ہے اور فرع کو اصل بناڈالا ہے۔ جس کی وجہ سے ہم نے فقہ میں بڑی ہی مشکلات پیدا کرلی ہیں۔

بہرحال اس مسئلہ میں ہم امام مالکؒ کے قول کو ترجیح دیتے ہیں اور حضور ﷺ کے ارشاد کو کسی خاص واقعہ پر محمول کرنے پر مجبور ہیں جس میں تنبیہہ و تادیب کا شبہ موجود تھا لہٰذہ وہ قتل عمد نہیں بلکہ قتل خطا تھا۔ واللہ اعلم۔

اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ہمارے معاشرہ میں ایسے والدین کا وجود بھی عنقا نہیں ہے جو اپنی توہم پرستانہ شقی القلبی کا بدترین نمونہ ہیں۔ اخبارات اس کے شاہد ہیں کہ باپ نے بیٹے کو کسی جنسی اشتعال میں یا خواب میں بیٹے کو قربان کرتے ہوئے دیکھ کر بیٹے کو پوری شقاوت کے ساتھ ذبح کرڈالا۔ کیا ایسے باپوں کے متعلق بھی یہی کہا جائے گا کہ باپ نے شفقت ومرحمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بیٹے کو ذبح کر دیا تھا۔ ایسے والدین یقیناً اس کے مستحق ہیں کہ انہیں عبرتناک سزادی جائے اور تختۂ دار پر لٹکا دیا جائے۔

مجھے ان حضرات پر حیرت ہوتی ہے جنہوں نے اپنے موقف کی تائید میں

یہ دلیل پیش فرمائی ہے کہ باپ، ماں تو بچہ کی حیات کا سبب ہیں ان سے یہ کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اولاد کو قتل کردیں گے۔ لہٰذہ ماں باپ کو اولاد کے بدلے میں قتل نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ان حضرات نے کیا ہونا چاہیے اور کیا ہوتا ہے میں کوئی فرق نہیں کیا۔ یقیناً والدین کو ہرگز مناسب نہیں کہ وہ اپنی اولاد کو قتل کردیں۔ لیکن سوال تو اس کا ہے کہ اگر وہ قتل کردیں تو کیا ان کو اس کی سزادی جائے گی یا نہیں۔ کون نہیں جانتا کہ عربوں میں دختر کشی کا رواج تھا اور لوگ اپنی لڑکیوں کو زندہ دفن کردیا کرتے تھے۔ کیا لڑکیاں اولاد نہیں ہوتی تھیں۔ خود قرآن کریم نے اس قبیح رسم کا تذکرہ کئی جگہ کیا ہے مثلاً:۔

وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُىِٕلَتْ ۝ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۝ (الانفطار:۸ تا ۹)

"اور خیال کرو جب زندہ درگور کی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس جرم میں قتل کی گئی تھی۔"

ایسے درندہ صفت انسان ہر زمانہ اور ہر معاشرہ میں ہوسکتے ہیں اور ہوتے ہیں۔ تو اگر کوئی ایسا شخص ہو تو اسے سزا یقیناً دی جانی چاہیے۔ قرآن کریم نے ان النفس بالنفس کا عام قانون بیان کیا ہے۔ اس نے کہیں ماں باپ، دادا دادی، اور نانا نانی کا استثناء نہیں فرمایا۔ عدالت کو دیکھنا چاہیے کہ بچہ کا قتل عمداً ہوا ہے یا کسی غلطی کی وجہ سے ہوا ہے۔ اگر عمداً قتل ہوا ہو تو قتل عمد کی سزادی جائے اور خطاً قتل ہوا ہے تو قتل خطا کی کارروائی کی جائے۔

اپنے غلام مدبّر اور مکاتب کے بدلے

فقہاء نے ایک مسئلہ یہ بھی بیان کیا ہے کہ اپنے غلام یا مدبر یا مکاتب کے بدلے میں مالک کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ یہ اقسام اب موجود نہیں ہیں۔ لیکن اگر ایسے حالات پیدا ہوجائیں کہ یہ اقسام وجود پذیر ہوجائیں تو ہمارا خیال ان کے متعلق بھی یہی ہے کہ مالک کو قصاص میں قتل کیا جائے گا۔ جمہور فقہاء کا خیال ہے کہ مالک اگر اپنے غلام یا مدبر یا مکاتب کو قتل کردے تو مالک کو قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا۔ امام نخعیؒ کا ارشاد ہے کہ مالک قصاص میں قتل کیا جائے گا۔ (بدایۃ المجتہد ج ۲ ص ۳۹۸)

حنفیہ میں سے امام زفرؒ کا بھی یہی خیال ہے (اعلاء السنن ج ۱۸ ص ۹۴)

ہمارا خیال ہے کہ امام نخعیؒ اور امام زفرؒ کا قول قرآن سے قریب تر ہے۔ قرآن کریم نے جان کے بدلے جان کا حکم دیا ہے۔ اور جان غلام اور مدبر اور مکاتب میں بھی ہوتی ہے۔ لہٰذہ اس قرآنی حکم میں غلام اور مدبر و مکاتب کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔

ہمارے فقہائے کرام نے اس کی یہ دلیل دی ہے کہ غلام، مدبر اور مکاتب کے قصاص کے حق کا ولی خود مالک ہوتا ہے اور کسی چیز کو اگر صاحبِ حق کی اجازت سے تلف کردیا جائے تو ضمان ساقط ہوجاتا ہے۔ اور یہاں تو خود صاحب حق ہی تلف کرنے والا ہے۔ لہٰذہ قصاص ساقط ہوجائے گا۔ یہ ایسا ہی ہے کہ کوئی شخص کسی آدمی سے خواہش کرے کہ مجھے قتل کردو اور وہ آدمی اسے قتل کردے تو قتل کرنے والے آدمی پر قصاص نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس نے خود مقتول کی خواہش پر اسے قتل کیا ہے۔

(اعلاء السنن ج ۱۸ ص ۹۴ مطبوعہ سپر آرٹ پریس کراچی)

لیکن یہ دلیل ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ ہمارے خیال میں یہ بات بھی صحیح نہیں ہے کہ غلام، مدبر اور مکاتب کے حقِ قصاص کا ولی خود اس کا مالک ہوتا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں یقیناً ایسا تھا۔ لیکن اسلام کے آجانے کے بعد حقِ قصاص کی ولی خود اسلامی حکومت ہوتی ہے۔ کوئی فردِ واحد نہیں ہوتا۔ اس پر ہم تفصیل سے بحث کرچکے ہیں۔ اس ضمن میں اس سلسلہ میں فقہائے کرام نے جو مثال پیش فرمائی ہے وہ بھی درست نہیں ہے۔ آدمی اپنی جان کا مالک نہیں ہوتا کہ وہ کسی سے خواہش کرے کہ تو مجھے قتل کردے اور اس اجازت کی وجہ سے قاتل، جرمِ قتل سے بری الذمہ ہوجائے۔ آدمی کی جان حق تعالیٰ کی ملکیت ہے۔ لہٰذہ اس کے خون کی ولی بھی اسلام کی نمائندہ حکومت ہی ہوتی ہے۔ لہٰذہ کسی کے کہنے سے اگر کوئی آدمی جرم کرے تو جرم پھر بھی جرم ہی رہے گا۔ اگر کسی نے کسی کے کہنے پر کسی آدمی کو قتل کردیا تو قتل پر اکسانے والا بھی مجرم ہے اور قتل کرنے والا بھی۔ مجرم یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے تو فلاں کے کہنے پر قتل کیا ہے۔ لہٰذا مجرم وہ ہے جس نے مجھے قتل کرنے کو کہا تھا۔ لہٰذہ اسے قصاص میں قتل کیا جائے۔ ایسے ہی مذکورہ صورت میں بھی مجرم دونوں ہیں۔ جس نے قتل کیا وہ بھی مجرم ہے اور جس نے خواہش کی تھی کہ مجھے قتل کردو وہ بھی مجرم ہے۔ خواہش کرنے والا چونکہ مرچکا ہے اس لیے اس سے قصاص تو نہیں لیا جاسکتا۔ وہ عذابِ الٰہی کا مستحق ہوگا اور قاتل چونکہ زندہ ہے۔ اس لیے اس سے قصاص لیا جائے گا۔

دوسرے کے غلام کے بدلے

اگر کسی شخص نے کسی دوسرے کے غلام کو قتل کردیا تو امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد ابن حنبلؒ، ابوثورؒ اور لیثؒ کا قول یہ ہے کہ قاتل کو قتل نہیں کیا جائے گا کیونکہ قاتل اور مقتول ایک درجہ کے نہیں ہیں۔ نیز قرآن کریم نے فرمایا ہے کہ:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَ الْاُنْثٰی بِالْاُنْثٰی۔ (البقرۃ:۱۷۸)

"تم پر قصاص فرض کیا گیا ہے مقتولین کے سلسلہ میں۔ آزاد، آزاد

کے بدلے میں۔ غلام، غلام کے بدلے میں اور عورت، عورت کے بدلے میں۔"

لہٰذہ آزاد آدمی کو آزاد آدمی کے بدلے ہی میں قتل کیا جاسکتا ہے۔ غلام کے بدلے میں قتل نہیں کیا جاسکتا۔ ان حضرات کا یہ استدلال اگر صحیح ہے تو پھر غلام اگر کسی آزاد آدمی کو قتل کردے یا کوئی مسلمان عورت کو قتل کردے تو وہاں بھی قصاص نہ ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ آیت کریمہ کا وہ مطلب نہیں ہے جو یہ حضرات اس سے نکال رہے ہیں۔ بلکہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس آزاد آدمی نے قتل کیا ہے وہی قتل کیا جائے گا۔ وہ اپنے بدلے میں اپنے کسی غلام یا معتقد کو قتل کے لیے پیش نہیں کرسکتا یا جس غلام نے قتل کیا ہے وہی غلام قتل کیا جائیگا۔ جس عورت نے قتل کیا ہے وہی عورت قتل کی جائے گی۔ زمانۂ جاہلیت میں جو یہ دستور تھا کہ وہ قاتل کے خاندان کے کسی بھی آدمی کو قتل کردیتے تھے وہ غلط تھا۔ نیز قوی اور زور اور خاندان والے قاتل کے خاندان سے اپنے غلام کے بدلے میں آزاد آدمی کو، عورت کے بدلے میں مرد کو اور ایک مقتول کے بدلے میں دس دس آدمیوں کو قتل کردیتے تھے، وہ بھی غلط تھا۔ قصاص میں صرف اسی آدمی کو قتل کیا جاسکتا ہے جس سے جرم کا ارتکاب ہوا ہو۔ دوسروں کو قتل نہیں کیا جاسکتا۔ امام اعظم ابو حنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ، امام زفرؒ، اور نخعیؒ اس کے قائل ہیں کہ اگر کسی آزاد آدمی نے کسی کے غلام کو قتل کردیا ہے تو قاتل کو قتل عمد میں قصاص میں قتل کردیا جائے گا۔ ہم اسی قول کے حق میں ہیں۔ کیونکہ انسانی جان قابلِ احترام ہے اور اس کو قتل کرنا حرام ہے۔ وہ آزاد ہو تب بھی اور غلام ہو تب بھی۔ (بدایۃ المجتہد ج۲ ص ۳۹۸)

اگر قصاص کا وارث بیٹا ہو

ہمارے فقہاء کرام نے فرمایا ہے کہ اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کو قتل کردیا اور اس بیوی کا وارث اس کا بیٹا ہے جو قاتل (شوہر) کا بھی بیٹا ہے۔ تو چونکہ حقِ قصاص کا وارث بیٹا ہے۔ لہٰذہ قصاص ساقط ہوجائے گا کیونکہ بیٹا اپنے باپ سے قصاص نہیں لے سکتا۔ ہمیں اس سے بھی اختلاف ہے۔ ہم اس بنیاد کو تسلیم نہیں کرتے کہ حقِ قصاص کا وارث اور ولی مقتولہ کا بیٹا ہے۔ ہمارے نزدیک حق قصاص کی ولی اسلامی حکومت ہوتی ہے نہ کہ مقتول کے ورثاء۔ لہٰذہ حکومت ہی مدعی ہوتی ہے اور وہی حقِ قصاص کی وارث ہوتی ہے۔ لہٰذہ بیٹے اور باپ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

مقتول کے ورثاء اگر نابالغ ہوں

ہمارے بعض فقہاء کا خیال ہے کہ اگر مقتول کے ورثاء نابالغ ہوں یا کوئی ایک وارث یا چند وارث نابالغ ہوں تو چونکہ حق قصاص کے ولی مقتول کے وارث ہوتے ہیں لہٰذہ جب تک ورثاء بالغ نہ ہوجائیں یا جو ورثاء نابالغ ہوں وہ بالغ نہ ہوجائیں اس وقت تک قصاص کا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ یہ احتمال موجود ہے کہ بالغ ہونے کے بعد یہ ورثاء قصاص کو معاف کردیں۔ لہٰذہ ان کے بالغ ہونے کا انتظار کیا جائے گا۔ بالغ ہوجانے کے بعد وہ بھی اگر قصاص کا مطالبہ کریں قصاص کا فیصلہ ہوسکے گا اور اگر وہ معاف کردیں تو قصاص ساقط ہوجائے گا۔ البتہ امام ابو حنیفہؒ کا ارشاد ہے کہ جو ورثاء بالغ ہیں وہ اگر قصاص کا مطالبہ کریں تو انتظار نہیں کیا جائے گا۔ ہم امام ابو حنیفہؒ کے قول کو ترجیح دیتے ہیں۔ مگر ان کے استدلال سے ہم اتفاق نہیں کرسکتے۔ کیونکہ ہمارے نزدیک حق قصاص کے ولی مقتول کے ورثہ نہیں ہیں کہ اگر بالغ ورثاء قصاص کا مطالبہ کریں تو قصاص لیا جائے۔ حقِ قصاص کی ولی اسلامی حکومت ہے۔ لہٰذہ ورثاء کے بالغ یا نابالغ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

پانی میں ڈبو کر مار ڈالنا

اگر کسی شخص نے جان بوجھ کر کسی بچہ کو یا بڑے آدمی کو پانی میں ڈبو کر مار ڈالا تو امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ قصاص نہیں لیا جاسکتا کیونکہ پانی کوئی ایسی دھار دار چیز نہیں ہے جس سے عادۃً قتل کیا جاتا ہو۔ لہٰذہ قتل عمد نہیں ہوا۔ لیکن صاحبین یعنی امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ نیز امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ یہ قتل عمد ہے۔ لہٰذہ قصاص میں ڈبونے والے کو قتل کیا جائے گا۔ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ اس کی گردن اڑادی جائے گی اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ قاتل کو اسی طرح پانی میں ڈبو کر قتل کیا جائے گا۔ جس طرح اس نے مقتول کو ڈبویا تھا۔ ہمارے نزدیک اس صورت میں قصاص جاری ہونا چاہیے۔ عدالت کو اختیار ہے کہ وہ قتل کی جو صورت چاہے اختیار کرے۔ اگر لوگوں کو عبرت اور سبق دینا ضروری ہو تو وہ اسے پانی میں غرق کرکے بھی مار سکتی ہے اور اس کی ضرورت نہ ہو تو اس کی گردن بھی اڑا سکتی ہے اور تختہ دار پر چڑھا سکتی ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کا یہ ارشاد دراصل قتل عمد کی اس غلط تعریف پر مبنی ہے کہ قتل عمد اسے کہتے ہیں کہ قاتل بالارادہ کسی کو کسی دھار دار آلہ، یا دھار دار آلہ کے قائم مقام کسی آلہ سے مثلاً دھار دار لکڑی سے، دھار دار بانس کے پٹھے سے یا دھار دار پتھر کے ٹکڑے سے قتل کردے یا آگ میں جلا دے یہ تعریف صحیح نہیں ہے۔ قتل عمد کی تعریف میں ہر وہ قتل داخل ہے جس سے قاتل کا مقصد کسی کو قتل کرنا ہو، خواہ وہ دھار دار آلہ ہو یا کوئی اور ذریعہ ہو۔ مثلاً زہر دیدینا، آگ سے جلا دینا، پانی میں غرق کردینا، بڑے پتھر سے کچل دینا، بلند مکان سے گرادینا، جوڈو کراٹے سے کسی ایسی رگ پر ضرب لگانا جس

سے مضروب مرجائے، باکسنگ میں کسی نازک مقام پر ضرب لگانا جس سے مضروب کی جان چلی جائے۔ سب صورتیں اس میں داخل ہیں۔ قتل عمد کی تعریف ہی چونکہ فقہاء نے غلط کی تھی اس لیے امام اعظم ابو حنیفہؒ کی طرف یہ فیصلہ فقہاء کو منسوب کرنا پڑا۔ واضح رہے کہ امام اعظم ابو حنیفہؒ نے تمام فقہی جزئیات خود مرتب نہیں فرمائیں انہوں نے اصول مرتب فرمائے تھے۔ بعد کے فقہاء نے ان کے اصول پر جزئیات کی تخریج فرمائی ہے۔ اور چونکہ یہ تخریجات ان کے اصول پر فرمائی گئی ہیں اس لیے ان کی نسبت امام صاحبؒ کی طرف کر دی گئی ہے۔

قصاص میں سزائے موت کا طریقہ

قتل عمد میں سزائے موت کا فیصلہ ہو جائے تو سزائے موت کس طرح دی جائے؟ اس میں بھی اختلاف ہے امام ابو حنیفہؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ سزائے موت کا طریقہ صرف یہی ہے کہ قاتل کا سر تلوار سے قلم کر دیا جائے۔ امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ ثوریؒ اور عطاءؒ کا یہی مذہب ہے۔ اس کے برخلاف امام مالکؒ امام شافعیؒ، امام احمد ابن حنبلؒ اور عمر ابن عبد العزیزؒ کا مذہب یہ نقل کیا گیا ہے کہ جس طرح قاتل نے مقتول کو قتل کیا تھا بالکل اسی طرح قاتل کو قتل کیا جائے گا بشرطیکہ وہ طریقہ ناجائز اور حرام نہ ہو، مثلاً کسی نے نابالغ لڑکی سے جبراً زنا کیا جس سے اس کی موت واقع ہو گئی تو اس میں مماثلت نہیں ہو سکتی۔ لیکن اگر کسی نے کسی بچہ کو غرق کر کے مار ڈالا، زہر دے کر مار ڈالا، پتھر سے سر کچل کر مار دیا تو ان طریقوں میں مماثلت ممکن ہے۔ لہٰذہ وہی طریقے اختیار کئے جائیں گے جو قاتل نے مقتول کو قتل کرنے میں اختیار کئے تھے۔ ان حضرات نے قرآن کریم کی اس آیت کریمہ سے بھی استدلال فرمایا ہے جو سورہ بقرہ میں ہے کہ:

فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ

(البقرۃ: ۱۹۴)

"تو جو تم پر زیادتی کرے تم بھی اس پر زیادتی کر سکتے ہو جیسی اس نے زیادتی کی ہے۔"

اور سورہ شوریٰ میں ہے:

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ

(الشوریٰ: ۴۰)

"اور برائی کا بدلہ اسی جیسی برائی ہے۔ تو جو معاف کر دے اور صلح کرے تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے۔"

نیز سورہ یونس میں ہے:۔

وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍۢ بِمِثْلِهَا

"اور جن لوگوں نے برائیاں کمائی ہیں تو برائی کا بدلہ اسی کے مثل کے ساتھ ساتھ دیا جائے گا۔"

ان تمام آیاتِ کریمہ سے اسی کی تائید ہوتی ہے کہ جیسا کچھ کسی نے کیا ہے اسی طرح اس سے بدلہ لیا جائے۔ جس طرح قاتل نے کسی کو قتل کیا ہے بعینہ اسی طرح قاتل کو بھی قتل کیا جائے۔

فقہائے حنفیہؒ کا خیال ہے کہ مماثلت طریقۂ قتل میں ضروری نہیں ہے۔ یہ مماثلت اس میں ہے کہ جس طرح قاتل نے مقتول کی جان لی ہے ایسے ہی قاتل کی جان بھی لے لی جائے۔ مماثت صرف جان لے لینے میں ہے۔ جان لینے کے مخصوص طریقہ میں نہیں ہے اور یہ ممکن بھی نہیں ہے۔ ایک بچہ کو پتھر سے ایک مرتبہ سر کچل کر مارا جا سکتا ہے۔ لیکن اتنے ہی بڑے پتھر سے قاتل (بڑے آدمی) کا سر ایک مرتبہ کچل کر اسے نہیں مارا جا سکتا اگر ایک مرتبہ سر کچلنے کے بعد قاتل نہ مرا تو کیا اس کا سر دوبارہ کچلا جائے گا۔ اگر دوبارہ کچلا جائے گا تو مماثلت نہ رہی اور اگر قاتل کو اس کے بعد رہا کر دیا جائے تو اس میں خون مسلم کو رائیگاں کرنا ہے جس کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

لَا قَوَدَ اِلَّا بِالسَّيْفِ

"سزائے موت تلوار ہی سے دی جا سکتی ہے۔"

یہ حدیث مختلف طریقوں سے احادیث کی کتابوں میں مروی ہے۔ نیز حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ:۔

اِذَا قَتَلْتُمْ فَاَحْسِنُوا الْقِتْلَةَ

"جب تم کسی کو قتل کرو تو خوبی کے ساتھ قتل کرو۔"

نیز حضور اکرم ﷺ نے کسی کو نشانہ بنا کر مار ڈالنے اور صورت و ہیئت کو بگاڑنے (مثلہ کرنے) سے بھی سختی سے منع فرمایا ہے۔

(ان تمام احادیث کے لیے دیکھئے اعلاء السنن ج ۱۸ ص ۸۷ تا ۹۷ مطبوعہ سپر آرٹ پریس کراچی)

جانوروں کے متعلق بھی آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ:

اللہ نے ہر چیز پر احسان فرمانے کا حکم دیا ہے۔ لہٰذہ جب تم کسی جانور کو ذبح کرو تو اچھے طریقے سے ذبح کرو۔ تمہیں چاہیئے کہ تم اپنی چھری کو خوب تیز کر لو اور اپنے ذبیحہ کو آرام پہنچاؤ۔ (مسلم۔ کتاب الصید والذبائح)

ایک صحابیؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ جب میں کسی بکری کو ذبح کرتا ہوں تو مجھے اس پر بڑا ترس آتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تمہیں بکری پر ترس آتا ہے تو حق تعالیٰ بھی تم پر رحم فرمائے گا۔ (مسند احمد ابن حنبلؒ ج ۳ ص ۴۳۶)

قرآن کریم میں ایک دو جگہ نہیں بے شمار مقامات پر حسنِ عمل اور احسان کی تاکید فرمائی گئی ہے کہ ہم جو کام بھی کریں خوب صورتی اور خوبی کے ساتھ کریں۔ حضور اکرم ﷺ نے سزائے موت کے لیے جو تلوار کی تخصیص فرمائی تھی اس کا مقصد یہی تھا کہ اس طرح مقتول کی جان آسانی سے جلد نکل جاتی ہے اور اسے زیادہ تکلیف نہیں ہوتی۔ آنحضرت ﷺ کے مبارک عہد میں آسان ترین طریقہ قتل یہی تھا کہ جس سے مقتول کو کم سے کم اذیت ہوتی تھی۔ لیکن اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ قیامت تک کے لیے ہم اسی طریقہ کے پابند ہو جائیں۔ حضور اکرم ﷺ کے عہد میں جنگی اسلحہ میں تیر و تلوار اور نیزے وغیرہ بہترین جنگی اسلحہ تھے۔ لہٰذہ آپ نے ان ہتھیاروں کا استعمال سیکھنے اور ان میں مہارت حاصل کرنے کا حکم دیا تھا۔ لیکن آج جنگی اسلحہ توپ و تفنگ، بمبار طیارے اور ٹینک و میزائل ہیں۔ آج کے حالات میں وہی احکام جو اس عہد میں تیر و تلوار نیزوں اور منجنیق کے لیے تھے، اب موجودہ اسلحہ پر منطبق کرنا ہوں گے۔ مقصد یہ ہے کہ قاتل کی جان تو لی جائے مگر آسان ترین طریقے سے لی جائے۔ آج اگر دوسرے طریقے تلوار سے بہتر ہوسکتے ہیں تو یقیناً ان کو اختیار کرنا ہوگا۔ پھانسی دینا بجلی کے جھٹکے سے مار ڈالنا، گردن اڑا دینا، توپ دم کر دینا، گولی مار دینا، سب اس میں داخل ہیں۔ حکومتِ وقت کو فیصلہ کرنا چاہیے کہ ان میں سے کون سا طریقہ آسان تر ہے۔ مقصد سزا دینا ہے۔ شقاوت قلبیکا مظاہرہ کرنا نہیں ہے۔ لیکن اگر حاکمِ وقت لوگوں کی تادیب اور عبرت کے لیے قاتل کو اسی طریقہ سے سزا دینا چاہیے جس طرح اس نے مقتول کو قتل کیا تھا۔ تو عدالت کو اسکا حق ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے ایک یہودی کو پتھر سے سر کچل کر مروادیا تھا کیونکہ اس نے بھی ایک مسلمان بچی کو اسی طرح قتل کیا تھا اسے طحاوی وغیرہ نے روایت کیا ہے اور اس کی سند کے تمام روای ثقہ ہیں۔ (اعلاء السنن ج ۱۸ ص ۷۷ مطبوعہ سپر آرٹ پریس کراچی)

ہمارے خیال میں حضور اکرم ﷺ نے تادیب و عبرت کی خاطر ایسا کیا تھا لہٰذہ اسطرح کی حدیثوں کو تعزیر پر محمول کرنا چاہیے۔

کسی نے ہل سے کسی کو قتل کر دیا

کسی شخص نے کسی آدمی کو کسان کے ہل سے مار ڈالا تو اگر اس نے ہل کے پھل سے اسے مارا تھا جو لوہے کا ہوتا ہے اور اس میں دھار ہوتی ہے تو اگر اس نے دھار کی طرف سے مارا ہے اور مقتول زخمی ہو گیا تھا تو قاتل کو سزائے موت دی جائے گی اور اسے قتلِ عمد شمار کیا جائے گا اور اگر اس نے لوہے سے دھار کی طرف سے نہیں بلکہ اس کی پشت کی طرف سے مارا ہے تو امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ کا ارشاد ہے کہ یہ قتل عمد ہے اور قاتل سزائے موت کا مستحق ہے۔ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اگر مقتول زخمی ہو گیا تھا تو قتل عمد شمار ہو گا ورنہ قتل خطاء شمار ہو گا اور بجائے سزائے موت کے دیت واجب ہو گی۔ لیکن اگر قاتل نے ہل کی لکڑی سے مارا ہے تو یہ قتل خطاء شمار ہو گا اور دیت واجب ہو گی۔

ہمارا خیال ہے کہ یہ تفصیل قطعاً غیر قرآنی ہے۔ ان تمام صورتوں میں جہاں قاتل نے عمداً قتل کیا ہے، اسے قتل عمد ہی سمجھنا چاہیے اور قاتل کو سزائے موت ہی دی جانی چاہیے۔ آلۂ قتل کا لوہے کا بنا ہوا ہونا ضروری نہیں ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے یہودی کو دو پتھروں کے درمیان سر کچل کر مروایا تھا اور سزائے موت ہی دی تھی (روایت اوپر گذر چکی ہے) پتھر نہ لوہے کا بنا ہوا ہوتا ہے نہ اس میں لوہے کی طرح دھار ہوتی ہے۔ اگر قتلِ عمد میں یہ شرط رکھ دی جائے کہ وہ صرف دھار دار آلہ سے قتل کرنے ہی میں ہوتا ہے تو لازم آتا ہے کہ زہر دے کر مار ڈالنے میں، پانی میں غرق کر کے مارنے میں، آگ سے جلا کر مار ڈالنے میں بھی سزائے موت نہ دی جاسکے بلکہ دیت پر فیصلہ کیا جائے۔ اس طرح تو خونِ مسلم کی ارزانی ہو جائے گی اور لوگ دوسرے ایسے طریقوں سے قتل کرنا شروع کر دیں گے جن میں وہ قتل عمد کی سزا سے بچ سکیں اور دیت ادا کر کے چھٹکارا حاصل کر لیں جو قانون کا مقصد نہیں ہے۔ قرآن کریم نے قتل کی دو ہی صورتیں بیان فرمائی ہیں۔ قتلِ عمد اور قتلِ خطاٗ۔ یہ عدالت کا کام ہے کہ وہ فیصلہ کرے کہ قاتل کا ارادہ واقعی قتل ہی کرنے کا تھا یا اس کا مقصد محض تادیب تھی اور بلا ارادہ مقتول کی موت واقع ہو گئی۔

مختلف اسباب سے موت واقع ہونا

اگر کسی شخص نے خود کشی کی کوشش کی اور اپنے کو زخمی کر لیا۔ اس کے بعد اس پر شیر نے بھی حملہ کر کے زخمی کر دیا، یا اسے سانپ نے ڈس لیا۔ پھر اس کے بعد کسی دشمن نے بھی اس پر حملہ کر دیا۔ اس کے بعد اس کی موت واقع ہو گئی۔ اب یہ معلوم نہیں کیا جاسکتا کہ اس کی موت کا اصل سبب کیا تھا۔ اس نے خود کشی کی بھی کوشش کی تھی اور خود کو زخمی کر لیا تھا۔ اسے شیر نے بھی زخمی کر دیا تھا یا سانپ نے بھی ڈس لیا تھا۔ پھر اس پر اس کے دشمن نے بھی حملہ کیا۔ اب معلوم نہیں کہ موت کا اصل سبب کیا تھا۔ ایسی صورت میں قاتل پر ایک تہائی دیت واجب ہو گی۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ اسے غسل بھی دیا جائے اور اس کی نماز جنازہ بھی ادا کی جائے۔ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ اسے غسل تو دیا جائے مگر اس کی نماز جنازہ نہ پڑھی جائے۔ کیونکہ اس نے خود کشی کی کوشش بھی کی تھی۔ لہٰذہ تعزیراً اس کی نماز جنازہ نہ

ہونی چاہیے تھی۔ ہم امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کی تائید کرتے ہیں کیونکہ خودکشی سے مرنا یقینی نہیں ہے جب کہ دوسرے دو اسباب بھی موجود ہیں۔

جنگ میں کوئی مسلمان قتل ہو جائے

اگر مسلمان کفار سے جنگ کر رہے ہوں۔ گھمسان کی جنگ ہو رہی ہو۔ دوران جنگ غلطی سے کوئی مسلمان کسی مسلمان ہی کے ہاتھوں سے قتل ہو جائے۔ قاتل نے یہ سمجھا کہ میں جس کو قتل کر رہا ہوں وہ کافر ہے تو قاتل پر نہ تو سزائے موت واجب ہوگی نہ دیت، البتہ اسے قتل کا کفارہ دینا چاہیے۔

کوئی مسلمانوں پر تلوار سونت لے

اگر کوئی شخص مسلمانوں پر تلوار سونت لے اور مسلمانوں کو قتل کرنا چاہے تو مسلمانوں پر واجب ہے کہ اسے قتل کر دیں۔ اس کا خون معاف ہے۔ اس کو قتل کرنے والے کو نہ سزائے موت دی جا سکتی ہے اور نہ اس پر دیت واجب ہوگی نہ کفارہ۔ یہ شخص باغی ہے اور اس پر باغیوں کے احکام نافذ ہوں گے۔ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ:

مَنْ شَهَرَ عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ سَيْفًا فَقَدْ اَحَلَّ دَمَهٗ (بزاز عن حذیفہ رضی اللہ عنہ وعن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ و ابو نعیم عن انس رضی اللہ عنہ)

"جو مسلمانوں کے خلاف تلوار اٹھا لے تو اس نے اپنے خون کو مباح کر دیا۔"

نیز آپ کا ارشاد ہے: مَنْ حَمَلَ عَلَيْنَا السِّلَاحَ فَلَيْسَ مِنَّا

(بخاری و مسلم عن ابن عمرو عن ابی موسیٰ و لمسلم عن ابی ہریرۃ و لمسلم)

من حديث سلمة مَنْ سَلَّ عَلَيْنَا السِّلَاحَ فَلَيْسَ مِنَّا۔

(بحوالہ الدرایہ فی تخریج احادیث الہدایہ ج۴ ص۵۶۷ ہدایہ مطبوعہ کلام کمپنی کراچی)

اگر کوئی پاگل یا کوئی نابالغ بچہ کوئی ہتھیار اٹھا لے اور کسی مسلمان پر حملہ کرنا چاہے یا کوئی جانور کسی پر حملہ کر دے اور اسے کوئی مار دے تو حنفیہؒ فرماتے ہیں کہ اسے قتل کرنے والے پر دیت واجب ہوگی اور امام ابو یوسفؒ کے خیال میں جانور کی صورت میں مالک کو اس کی قیمت (تاوان میں) ادا کرنی ہوگی۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ان تمام صورتوں میں قاتل پر کچھ بھی واجب نہیں ہوگا کیونکہ اس نے مدافعت میں اسے قتل کیا ہے ورنہ وہ اسے مار ڈالتا۔ ہم امام شافعیؒ کے قول کی تائید کرتے ہیں۔

تعجب ہے کہ اگر کوئی عاقل و بالغ مسلمانوں پر ہتھیار اٹھا لے اور انہیں قتل کرنے کے درپے ہو تو فقہاء فرماتے ہیں کہ اسے قتل کر دینا واجب ہے اور اس کو قتل کرنے میں نہ سزائے موت واجب ہوتی ہے نہ دیت لیکن اگر یہی حرکت کسی دیوانہ یا نابالغ بچہ یا چوپایہ سے سرزد ہو تو دیت یا چوپائے کی قیمت تاوان میں دلوائی جانے کا حکم دیا جاتا ہے۔ دیوانہ، نابالغ بچہ اور چوپایہ مرفوع القلم تو ہیں مگر اس کے یہ معنے تو نہیں کہ ہم ان سے اپنی مدافعت کے حق سے بھی محروم ہو جائیں۔ مرفوع القلم ہونے کے صرف یہ معنٰی ہیں کہ آخرت میں ان سے مواخذہ نہیں ہوگا۔ مگر ہمیں اپنی حفاظت اور مدافعت کرنے کا بہر حال حق ہے اور ہونا چاہیے۔

قصاص فیما دون النفس

اگر کسی نے کسی کی جان تو نہیں لی۔ لیکن کسی کے کسی عضو کو نقصان پہنچا دیا ہے تو اس میں بھی مظلوم کو ظالم سے بدلہ دلانا ضروری ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَ الْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَ الْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَ الْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَ السِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَ الْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ؕ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ؕ وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۵﴾ (المائدہ:۴۵)

"اور ہم نے بنی اسرائیل پر تورات میں فرض کر دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور تمام زخموں کا برابر کا بدلہ ہے تو جو کوئی شخص معاف کر دے تو وہ (قیامت میں، اس کے گناہوں کا) کفارہ بن جائے گا۔ اور جو کوئی اللہ کے نازل فرمودہ احکام کے مطابق فیصلے نہ کرے تو وہی لوگ ظالم ہیں۔"

اس آیت کریمہ میں بتایا گیا ہے کہ حق تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر تورات میں یہ حکم نازل فرمایا تھا کہ اگر کوئی کسی کو قتل کر دے تو جان کے بدلے جان کا قانون نافذ ہوگا نیز اگر کسی کی آنکھ بیکار کر دے تو مجرم کی آنکھ کو ویسا ہی نقصان پہنچایا جائے گا۔ اگر کسی نے کسی کی ناک کاٹ لی ہے تو اس کی بھی ناک کاٹی جائے گی۔ اگر کسی نے کسی کا دانت توڑ دیا ہے تو اس کا بھی دانت توڑا جائے گا۔ اگر کسی نے کسی کو زخمی کر دیا ہے تو زخم کا بھی بدلہ دلایا جائے گا۔ یعنی اس کو بھی ویسا ہی زخم پہنچایا جائے گا۔ حق تعالیٰ کے ان احکام کی پابندی لازمی ہے۔ اگر کوئی اللہ کے نازل کردہ احکام پر عمل نہیں کرتا تو ایسے ہی لوگ ظالم کہلائیں گے۔

یہ حکم تورات کا تھا اور اس کے مخاطب بنی اسرائیل تھے۔ لیکن فقہاء کا یہ اصول ہے کہ شرائع من قبلنا ہمارے لیے بھی حجت اور واجب العمل ہوتے ہیں جب تک ان احکام کا نسخ ثابت نہ ہو جائے۔ شیخ الاسلام امام ابو بکر جصاص

رازی اس آیت کریمہ کے تحت لکھتے ہیں کہ:

"اس آیت کریمہ میں قصاص کے متعلق جو کچھ بنی اسرائیل پر تورات میں فرض کیا گیا تھا اس کی خبر دی گئی ہے کہ نفس اور اعضاء مذکورہ میں بدلہ (قصاص) کا حکم تھا۔ اور امام ابو یوسفؒ نے اس آیت کے ظاہر سے استدلال فرمایا ہے کہ عورت اور مرد کے درمیان قصاص کا قانون نافذ ہو گا۔ یعنی عورت کی جان کے بدلے مرد کی جان لی جائے گی۔ کیونکہ قرآن کریم نے ان النفس بالنفس فرمایا ہے (یعنی جان کے بدلے جان) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ابو یوسفؒ کا مذہب یہی ہے کہ شرائع من کان قبلنا (پچھلی امتوں کی شریعتیں) ان کا حکم ثابت رہتا ہے جب تک حضور اکرم ﷺ کے کسی ارشاد یا نص قرآنی سے اس کا نسخ معلوم نہ ہو جائے اور آیت کریمہ کے ذیل میں حق تعالیٰ کا ارشاد:

وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۴﴾

(مائدہ: ۴۴)

اس آیت کے نازل ہونے کے وقت اس حکم کے ثابت ہونے کی دلیل ہے۔ اول تو یہ کہ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ یہ حکم ان احکام میں سے ہے جو حق تعالیٰ نے نازل فرمایا تھا۔ اور اس میں کسی زمانہ کی تخصیص نہیں فرمائی گئی تو یہ حکم تمام زمانوں میں ثابت رہنا چاہیے جب تک اس کو منسوخ کرنے والی کوئی آیت وارد نہ ہو جائے۔ دوسرے یہ کہ آیت کریمہ کے نازل ہونے کے وقت بنی اسرائیل پر ظلم اور فسق کا وصف بیان فرمایا گیا ہے۔ کیونکہ وہ اللہ کے نازل کردہ احکام کی آیت کریمہ کے نازل ہونے کے وقت پیروی نہیں کرتے تھے۔ یا تو وہ اس کا انکار کرتے تھے یا جو اللہ نے ان پر فرض کیا تھا اس پر (اپنی سستی اور مفاد پرستی کی بناء پر) انہوں نے عمل کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ قصاص (بدلے) کا قانون تمام نفوس (اور اعضاء) میں نافذ ہونا چاہیے جب تک اس کے نسخیا تخصیص پر کوئی دلیل قائم نہ ہو جائے۔"

(احکام القرآن ج ۲ ص ۵۳۴ تا ۵۳۵ مطبوعہ مطبعہ بہیہ مصریہ ۱۳۴۷ھ)

لیکن آیت کریمہ میں ایک جملہ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ بھی آ رہا ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ تمام زخموں میں بدلہ کا قانون برابر سرابر یعنی مساوات پر مبنی ہونا چاہیے۔ لہٰذہ یہ دیکھنا ضروری ہے کہ کسی نے کسی کے عضو کو جتنا نقصان پہنچایا ہے اتنا ہی اسے بھی نقصان پہنچایا جا سکے۔ اس میں کمی اور زیادتی نہ ہو۔

اس آیت کے علاوہ سورہ بقرہ میں ہے:

فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ

(البقرہ: ۹۴)

"جو شخص تم پر زیادتی کرے تو تم اس پر اتنی ہی زیادتی کر سکتے ہو جتنی اس نے تم پر زیادتی کی تھی۔"

سورہ شوریٰ میں ہے کہ:

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (الشوریٰ: ۴۰)

"برائی کا بدلہ برائی ہے، اسی کے برابر۔"

نیز سورہ یونس میں ہے:

وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍۢ بِمِثْلِهَا (یونس: ۲۸)

"اور جنہوں نے برائیوں کا ارتکاب کیا ہے، انہیں برائی کا بدلہ اس جیسا ہی دیا جا سکتا ہے۔"

ان تمام آیات کا تقاضا یہی ہے کہ کسی برائی کا انتقام لیا جائے تو اس میں مساوات ضروری ہے۔ کسی قسم کی کمی اور زیادتی نہیں ہو سکتی۔

ہمارا خیال ہے کہ اعضاء کو نقصان پہنچانے میں قطعی مساوات قائم رکھنا خاص خاص صورتوں کے علاوہ تمام صورتوں میں ممکن نہیں ہے۔ البتہ جہاں قطعی مساوات ممکن ہو وہاں بدلہ دلا دیا جائے لیکن جہاں کمی اور زیادتی کا احتمال ہو وہاں بجائے صورۃً انتقام کے اگر خوں بہا پر زخمی شخص کو راضی کیا جا سکے تو اس کی کوشش کرنی چاہیے۔ یا عدالت کو کوئی تعزیری سزا دینی چاہیے۔

پہنچے یا کہنی یا بغل سے ہاتھ کاٹ دینا

کسی نے دوسرے شخص کا ہاتھ اس کے پہنچے سے یا کہنی سے یا شانہ کے جوڑ سے کاٹ دیا تو چونکہ اس نے جوڑ سے ہاتھ کو کاٹا ہے۔ اس میں مماثلت ممکن ہے لہٰذا مجرم کا ہاتھ بھی اسی جوڑ سے کاٹا جا سکتا ہے۔ یہاں بدلے یعنی قصاص کی یہ صورت بھی ممکن ہے کہ مجرم کا ہاتھ بھی کاٹا جا سکتا ہے۔ لہٰذہ اس پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر مجرم نے جوڑ سے ہاتھ نہیں کاٹا بلکہ بازو کے یا ذراع کے درمیان سے ہاتھ کو توڑ دیا ہے جس میں بعینہ مماثلت ممکن نہیں ہے تو اس صورت میں دیت یعنی خون بہا پر فیصلہ کرنا چاہیے۔ ابن ابی شیبہ نے حضرت عمرؓ سے ضعیف سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ "ہم ہڈیوں میں قصاص نہیں لیں گے۔" نیز حضرت ابن عباسؓ سے بھی نقل کیا ہے کہ "ہڈیوں میں قصاص (بدلہ) نہیں ہے۔" لیکن اس کی سند بھی ضعیف ہے۔ سندوں کا ضعیف ہونا اس سلسلہ میں مضر نہیں ہے۔ کیونکہ ہم نے ان احادیث سے استدلال نہیں کیا۔ ہمارا استدلال قرآن کریم کی اُن آیات سے ہے جو ہم نے اوپر نقل کر دی ہیں۔ ضعیف احادیث سے تائید کا کام لیا جا سکتا ہے۔

(اعلاء السنن ج ۱۸ تا ۱۱۱ مطبوع سپر آرٹ پریس فریئر روڈ کراچی۔ ہدایہ ج ۵ ص ۵۶۹ مع درایہ مطبوعہ کلام کمپنی کراچی)

آنکھ اگر نکال دی جائے

اگر کسی نے دوسرے آدمی کی آنکھ کا ڈھیلا جڑ سے نکال دیا تو ہمارے فقہاء کا خیال ہے کہ اس میں قصاص (بدلہ) نہیں لیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ آنکھ کے ڈھیلے کو نکال دینے میں مماثلت ممکن نہیں ہے۔ اور اگر آنکھ اپنی جگہ پر موجود ہے۔ لیکن اس کی روشنی جاتی رہی یعنی بصارت غائب ہوگئی تو اس میں قصاص یعنی بدلہ لیا جائے گا اس کی صورت یہ تجویز کی گئی ہے کہ مجرم کے چہرہ پر بھیگی ہوئی روئی رکھ دی جائے اور جس آنکھ کی بصارت زائل کرنی ہو اس کے سامنے آئینہ گرم کرکے سامنے کر دیا جائے۔ آنکھ کی روشنی زائل ہو جائے گی۔

اس سلسلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک قول پیش کیا جاتا ہے جو حکم ابن عتیبہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے کسی آدمی کو تھپڑ مارا جس سے اس کی بصارت زائل ہوگئی۔ آنکھ کا ڈھیلا اپنی جگہ پر موجود تھا۔ اس نے قصاص کا مطالبہ کیا۔ لیکن کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کس طرح بدلہ دلایا جائے۔ اتفاق سے حضرت علی رضی اللہ عنہ ادھر سے گذرے تو انہوں نے بتایا کہ اس کے چہرے پر روئی رکھی جائے۔ پھر آفتاب کے سامنے اس کے چہرے کو کر دیا جائے اور اس کے قریب آئینہ کر دیا جائے اور اس کا عکس آنکھ پر ڈالا جائے۔ اس کی بصارت زائل ہو جائے گی اور آنکھ اپنی جگہ پر قائم رہے گی۔ اس روایت کی تخریج زیلعی نے کی ہے۔ لیکن اس کی سند جو بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے۔ قال عبدالرزاق قال اخبرنا معمد عن رجل عن الحکم بن عتیبۃ۔ اس کی سند میں معمر کے استاذ جن سے وہ روایت نقل کر رہے ہیں ایک مجہول آدمی ہیں اور حکم ابن عتیبہ کی ملاقات حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نہیں ہوئی۔ لہٰذہ حدیث منقطع بھی ہے۔ (اعلاء السنن ج۱۸ ص ۱۱۱ مطبوعہ سپر آرٹ پریس فریئر روڈ کراچی)

صاحبِ ہدایہ نے حنفیہ کا مسلک حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ارشاد کے مطابق نقل کیا ہے اور زیلعی نے بتایا ہے کہ یہ واقعہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں پیش آیا تھا اور انہوں نے صحابہ کرام سے مشورہ فرمایا تھا تو حضرت علیؓ نے یہ مشورہ دیا تھا (ہدایہ ص ۵۶۹ ج ۴ مطبوعہ کلام کمپنی کراچی مع حواشی)

لیکن ابن رشد نے لکھا ہے کہ:

اگر کسی نے کسی کو تھپڑ مار دیا اور اس کی آنکھ پھوڑ دی یا کوڑے سے مارا اور جس کو مارا تھا اس کی آنکھ پھوٹ گئی یا کچھ ایسا ہی کوئی اور عمل کیا جس سے آنکھ پھوٹ گئی جس سے بظاہر کسی عضو کو تلف کرنے کا ارادہ نہیں ہوتا جیسے تھپڑ مارنا اور آنکھ پھوٹ جانا تو جمہور فقہاء کا مذہب یہ ہے کہ یہ شبہ عمد ہے اور اس میں قصاص (بدلہ) نہیں ہے اور اس میں مکمل دیت (خوں بہا) دینا ہو گی۔ اور یہی امام مالکؒ سے اہل عراق کی روایت ہے۔ لیکن مشہور مذہب یہی ہے کہ یہ عمد ہے اور اس میں قصاص (بدلہ) دلانا ہو گا۔ (بدایۃ المجتہد ج ۲ ص ۴۰۷ مطبوعہ مصطفی البابی الحلبی مصر۔ اڈیشن دوم)

اس سلسلہ میں جمہور فقہاء کا مذہب بظاہر صحیح معلوم ہوتا ہے۔ جو روایت صاحب ہدایہ اور اعلاء السنن کے مصنفؒ نے حضرت علیؓ کی پیش فرمائی ہے وہ علاوہ اس کے ضعیف اور منقطع ہے اس میں یہی صورت بیان کی گئی ہے کہ کسی نے دوسرے آدمی کے تھپڑ مارا تھا جس سے مضروب کی آنکھ پھوٹ گئی تھی۔ تھپڑ مارنے سے آنکھ پھوڑ دینا کبھی بھی مقصد نہیں ہوتا۔ لہٰذہ اسے عمد شمار کرنا اور بدلہ دلوانا قابل حیرت ہے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما سے اس قسم کے فیصلے کی نسبت صحیح ہو سکتی ہے۔ اسی روایت کی بناء پر فقہاء نے یہ فیصلہ فرمادیا اور اس کے مضمرات پر غور نہیں فرمایا۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ نے تحریر فرمایا ہے کہ:

"میں کہتا ہوں کہ معمر کے استاد مجہول ہیں اور حکم عن علیؓ منقطع ہے لیکن اس کا کوئی حرج نہیں کیونکہ یہ مسئلہ قیاسی ہے۔ اور ضعیف روایت تائید اور تقویت کے لیے درست ہو سکتی ہے۔"

(اعلاء السنن ج ۱۸ تا ۱۱۱ مطبوعہ سپر آرٹ پریس کراچی)

اگر یہ مسئلہ واقعی قیاسی ہے تو قیاس تو اس فیصلہ کے خلاف جارہا ہے جو مشہور مذہب کے مطابق فقہائے کرام نے فرمایا ہے۔ قیاس تو جمہور کے قول کی تائید کرتا ہے۔ کیونکہ تھپڑ مارنے سے آنکھ کا پھوڑ دینا کبھی بھی مقصد نہیں ہوا کرتا۔ اسے عمد کہنا قیاس کے خلاف ہے۔ ھذا ما رایتہ واللہ اعلم

دانت توڑ دینا

اگر کسی نے دوسرے کو پتھر یا کسی دوسری چیز سے مارا اور اس کا دانت ٹوٹ گیا تو اگر دانت کا کچھ حصہ ٹوٹ گیا ہے تو فقہائے حنفیہؒ کا خیال ہے کہ جتنا مجروح کا دانت ٹوٹا ہے اتنا ہی دانت ریتی سے گھس دیا جائے اور اگر پورا دانت جڑ سے نکل گیا ہے تو اس میں قصاص (بدلہ) اس طرح لیا جائے گا کہ مجرم کا دانت بھی جڑ سے نکال دیا جائے۔ لیکن بعض فقہاء کا خیال ہے کہ جڑ سے دانت نہیں نکالا جائے گا بلکہ دیت (خوں بہا) دلوایا جائے گا۔ کیونکہ دانت کو جڑ سے نکالدینے میں اندیشہ ہے کہ مجرم کا دانت خراب ہو جائے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ اسے ریتی سے جڑ تک گھس دیا جائے۔

(ہدایہ ج ۴ ص ۵۶۹ مطبوعہ کلام کمپنی کراچی مع حواشی)

حضرت شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ اگر دانت کا کچھ حصہ ٹوٹ گیا ہے تو سال بھر تک انتظار کیا جائے گا اگر وہ دانت سال بھر میں سیاہ پڑ جائے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ پورا دانت بیکار ہو گیا۔ لہٰذہ بدلے یا دیت کا فیصلہ سال بھر تک انتظار کرنے کے بعد

کیا جائے اور اگر دانت سال بھر میں سیاہ نہیں پڑا تو جتنا دانت مجروح کا ٹوٹا ہے اس کے بقدر اس کے دانت کو ریتی سے گھس دیا جائے یا اسی کے بقدر اس کے نقصان کی تلافی خون بہا (دیت سے) کر دی جائے۔

(اعلاء السنن ج ۱۸ ص ۱۱۲ مطبوعہ کلام کمپنی کراچی مع حواشی)

ممکن ہے کہ حضرات فقہائے کرام کے زمانہ میں جڑ سے دانت نکال دینے میں کوئی قباحت پیش آتی ہو اور دانت کا کچھ حصہ ریتی سے گھس دینے میں سہولت ہوتی ہو۔ لیکن ہمارے عہد میں صورتِ حال ایسی نہیں ہے۔ پورا دانت جڑ سے نکال دینے میں آج کوئی قباحت نہیں ہوتی بلکہ آسانی سے نکالا جاسکتا ہے۔ البتہ دانت کا بعض حصہ ریتی سے گھس دینے میں واقعی قباحت ہے اور اس میں پوری مماثلت مشکل ہے۔ بہر حال قرآن کریم نے آیت نمبر (المائدہ: ۴۵) میں اَلسِّنَّ بِالسِّنِّ کا حکم صادر فرمایا ہے اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ اگر پورا دانت جڑ سے ٹوٹ گیا ہے۔ یا دانت کا کچھ حصہ ٹوٹ گیا اور سیاہ پڑ گیا ہے اور پورا دانت ہی خراب ہو گیا ہے اور مجرم نے بالقصد ایسا کیا ہے تو مجرم کا پورا دانت نکال دیا جانا چاہیے۔ اگر دانت کا کچھ حصہ ٹوٹ گیا ہے اور مجرم کا دانت اسی قدر گھس کر کم کیا جاسکتا ہے تو عمد کی صورت میں اس کا بدلہ بھی دلا دیا جائے اور اگر پوری مماثلت مشکل ہو تو دیت پر فیصلہ کیا جائے۔ امام بخاریؒ نے حضرت انسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت انس ابن مالکؓ کی پھوپھی ربیعؓ نے ایک انصاری لڑکی کا دانت توڑ دیا تھا۔ قوم نے قصاص (بدلے) کا مطالبہ کیا اور وہ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں مقدمہ لے آئے تو حضور ﷺ نے قصاص (بدلے) کا حکم صادر فرمایا۔ اس پر حضرت انس ابن مالکؓ کے چچا انس ابن النضرؓ نے عرض کیا۔ اے رسول اللہ! اللہ کی قسم اس کا دانت نہیں توڑا جائے گا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اے انسؓ! کتاب اللہ کا حکم قصاص ہی کا ہے۔ لیکن اس کے بعد قوم راضی ہو گئی اور انہوں نے دیت (خوں بہا) لینا منظور کر لیا۔

تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کے کچھ بندے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اگر وہ اللہ پر قسم کھا بیٹھیں تو حق تعالیٰ ان کی قسم پوری کر دیتا ہے۔

(صحیح بخاری۔ کتاب الصلح، باب الصلح فی الدیۃ عن انس ابن مالک و کتاب الجہاد باب قول اللہ عزوجل "من المومنین رجال صدقوا")

یہ روایت صحیح بخاری کی ہے اور قرآن کریم کے مطابق ہے لہٰذہ ہم اسی کو ترجیح دیتے ہیں۔

ہڈی توڑ دینے میں قصاص نہیں

اگر کسی نے دوسرے آدمی کی ہڈی توڑ دی ہے تو اس میں قصاص (بدلے) کا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ہڈی کو توڑ دینے میں قطعاً مماثلت ممکن نہیں ہے۔ ایک شخص نے کسی کے لاٹھی یا اور کوئی چیز مار دی جس سے اس کے ہاتھ پاؤں یا پسلی وغیرہ کی ہڈی ٹوٹ گئی تو اس کا بدلہ دلانا ممکن نہیں ہے۔ اس کا امکان نہیں کہ قصاص دلانے کے لیے مجرم کو ضرب پہنچائی جائے تو بالکل اتنی ہی ہڈی ٹوٹے اور وہیں سے ٹوٹے جہاں سے اس نے توڑی تھی لہٰذہ اس صورت میں دیت کا فیصلہ کرنا پڑے گا۔ ابن ابی شیبہ نے حضرت عمرؓ سے نقل کیا ہے کہ:

"ہم ہڈیوں میں قصاص (بدلہ) نہں دلا سکتے۔"

نیز ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ:

"ہڈیوں میں قصاص نہیں ہے۔"

ان دونوں روایتوں کو زیلعی نے نقل کیا ہے۔ ابن حجر نے درایہ میں کہا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ضعیف اور منقطع ہے اور ابن عباسؓ کا قول بھی ضعیف ہے۔ لیکن اول تو ہمیں یہ تسلیم نہیں کہ وہ دونوں حدیثیں ضعیف ہیں۔ کیونکہ ابن حجرؒ نے حجاج کی وجہ سے ان حدیثوں کو ضعیف کہا ہے مگر حجاج حنفیہ کے نزدیک ضعیف نہیں بلکہ حسن الحدیث ہے۔ دوسرے یہ کہ ہمارا استدلال ان احادیث سے نہیں ہے بلکہ قرآن حکیم کے حکم وَالْجُرُوحَ قِصَاص (زخم برابر سرابر ہیں) سے ہے۔ ہڈیوں کو توڑنے میں چونکہ بعینہ مماثلت ممکن نہیں ہے۔ اس لیے ہم یہاں بجائے قصاص (بدلے) کے دیت کے قائل ہوئے ہیں۔ واللہ اعلم۔

مادون النفس میں شبہ عمد نہیں ہوتا:

قتل نفس میں ہمارے فقہاء تین قسموں کے قائل ہیں۔ (۱) قتل عمد، (۲) قتل شِبہ عمد، (۳) قتل خطأ۔ لیکن قرآن کریم نے صرف دو قسمیں ہی بیان فرمائی ہیں۔ قتل عمد اور قتل خطأ۔ تیسری قسم یعنی قتل شِبہ عمد بیان نہیں کی۔ یہ قسم قرآن کریم پر اضافہ ہے جس کے ہم قائل نہیں ہیں کیونکہ ہم قرآن کریم پر کسی خبر واحد سے اضافہ کرنے کو صحیح نہیں سمجھتے۔ لیکن مدون النفس میں ہمارے فقہاء بھی شِبہ عمد کے قائل نہیں ہیں جو قطعاً صحیح اور قرآن کریم کے مطابق ہے جس کی ہم تائید کرتے ہیں۔

عورت اور مرد، آزاد اور غلام اور دو غلاموں میں قصاص

اگر کسی مرد نے کسی عورت کی آنکھ پھوڑ دی، ٹانگ توڑ دی، دانت، پسلی یا ٹانگ توڑ دی یا اور کوئی زخم پہنچا دیا، یا کسی آزاد آدمی نے کسی غلام کے ساتھ یہی حرکت کر دی یا دو غلاموں نے آپس میں ایک دوسرے کو فیما دون النفس

کوئی زخم پہنچادیا تو فقہائے حنفیہؒ اس کے قائل ہیں کہ ان تمام صورتوں میں قصاص یعنی بدلے کا قانون نافذ نہیں ہو سکتا۔ صرف دیت دلائی جا سکتی ہے۔ امام شافعیؒ اس کے خلاف قصاص کے قائل ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ انسانی اعضاء کا حکم بھی وہی ہے جو انسانی نفس کا ہے البتہ اگر کسی آزاد آدمی نے کسی غلام کے عضو کو نقصان پہنچایا ہے تو قصاص (بدلہ) کا قانون جاری نہیں ہو گا۔ ہمارے خیال میں عورت اور مرد، آزاد اور غلام یا غلام اور غلام میں کسی قسم کا فرق کرنا صحیح نہیں ہے۔ عورت اور مرد کی صورت میں ہم امام شافعیؒ کے مسلک کی تائید کرتے ہیں اور آزاد اور غلام اور غلام اور غلام کی صورت میں ہم امام شافعیؒ سے بھی اختلاف کرتے ہیں۔ قرآن کریم کے ارشادات کی روشنی میں ہر انسان قابلِ احترام ہے۔ اس کی جان اور اس کے تمام اعضاء محترم ہیں مثلاً:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ۔ (بنی اسرائیل۷۰:۱۷)

"ہم نے اولاد آدم کو مکرم و محترم بنایا ہے۔"

اور

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ (التین:۴)

"ہم نے انسان کو بہترین توازن اور استواری میں پیدا کیا ہے۔"

ایک عورت بھی اسی طرح اولادِ آدم اور انسان ہے جس طرح ایک مرد اولادِ آدم اور انسان ہوتا ہے۔ ایک آزاد آدمی اور غلام بھی یکساں آدم کی اولاد اور انسان ہے۔ لہٰذہ ان میں کسی قسم کا فرق و امتیاز برتنا قرآنی تعلیمات کے خلاف ہے۔ حنفیہؒ کی طرف سے یہ دلیل دی گئی ہے کہ اعضاء کا حکم اموال کا حکم ہے۔ چنانچہ مرد کے ہاتھ کی قیمت پانچ سو دینار مقرر کی گئی ہے اور عورت کے ہاتھ کی قیمت اس کا نصف ہے۔ لہٰذہ اسے یوں سمجھنا چاہیے کہ مرد کا ہاتھ کسی نے کاٹ دیا ہے تو اس نے پانچ سو دینار کا نقصان کیا ہے اور عورت کا ہاتھ کسی نے کاٹ دیا ہے تو اس نے ڈھائی سو دینار کا نقصان پہنچایا ہے۔ چونکہ دونوں صورتوں میں نقصانات برابر نہیں ہیں اس لیے قصاص (بدلے) کا قانون نافذ نہیں ہو سکتا۔ جس بنیاد پر یہ دلیل قائم ہے ہمارے خیال میں وہ بنیاد ہی صحیح نہیں ہے۔ قیمت کا یہ فرق خود متنازعہ فیہ ہے۔ اس پر ہم دیات کے باب میں بحث کریں گے۔ بہرحال قرآن کریم کا حکم نہایت واضح اور دوٹوک ہے:

اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ (المائدہ:۴۵)

"جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور تمام زخم برابر سرابر ہیں۔"

قرآن کریم نے عورت اور مرد آزاد اور غلام کی جان اور اعضاء میں کسی فرق و امتیاز کو روا نہیں رکھا تو ہمیں کسی فرق و امتیاز برتنے کا حق کہاں سے مل گیا۔ اخبار آحاد سے قرآن کریم کے واضح احکام میں تخصیص نہیں کی جا سکتی۔

کافر اور مسلم میں قصاص

اگر کسی مسلمان نے کسی ذمی کافر کے کسی عضو کو کوئی نقصان پہنچادیا یا مستامن اور معاہد کافر کے کسی عضو کو نقصان پہنچادیا تو ہمارے فقہاء قصاص (بدلے) کے قائل ہیں۔ ہم اس کی تائید کرتے ہیں۔ حیرت ہے کہ ہمارے فقہاء کے نزدیک ایک مسلمان عورت اور ایک مسلمان غلام ایک ذمی کافر سے بھی کم تر ہے کہ ذمی کافر کے سلسلہ میں وہ بدلے کے قائل ہیں لیکن مسلمان عورت اور مسلمان غلام کے سلسلہ میں بدلے کے قائل نہیں ہیں۔ یا للعجب!

نصف بازو سے ہاتھ کاٹ دینا یا زخم جائفہ پہنچانا:

اگر کسی نے دوسرے کا ہاتھ نصف بازو (ساعد) سے کاٹ دیا تو اس میں قصاص نہیں ہو گا بلکہ دیت (خوں بہا) دلایا جائے گا۔ کیونکہ یہ ہڈی کو مجروح کرنا ہوا اور ہڈیوں میں چونکہ مساوات ممکن نہیں ہے، اس لیے قصاص (بدلہ) نہیں دلایا جا سکتا۔

ایسے ہی اگر کسی نے دوسرے کو ایسا زخم پہنچادیا جو اندر تک سرایت کر گیا یعنی پیٹ میں خنجر یا نیزہ گھونپ دیا یا سینہ میں برچھی مار دی اور وہ اندر تک پہنچ گئی یا کمر اور معدہ میں چاقو مار دیا جو اندر تک پہنچ گیا۔ اور وہ خلاف معمول کچھ عرصہ بعد اچھا ہو گیا تب بھی قصاص (بدلہ) کا فیصلہ نہیں کیا جائے گا کیونکہ ایسے زخم عموماً اچھے نہیں ہوا کرتے بلکہ جان لیوا ثابت ہوتے ہیں۔ اگر مجرم کو ایسا ہی زخم لگایا گیا تو زیادہ تر اسی کا احتمال ہے کہ وہ اس زخم سے مر جائے گا۔ چونکہ مجروح اچھا ہو گیا ہے اس لیے مجرم کو سزائے موت تو نہیں دی جا سکتی۔ کوئی ضروری نہیں کہ مجرم بھی اس زخم سے اچھا ہو جائے۔ لہٰذہ دیت پر فیصلہ کرنا ہو گا۔ مجرم کو اتنا ہی زخم پہنچایا جا سکتا ہے جتنا اس نے مجروح کو پہنچایا ہے۔ اسے ایسا زخم نہیں پہنچایا جا سکتا جس سے اس کی موت واقع ہو جائے۔

کسی لونجے یا ناقص الید شخص نے اچھے آدمی کا ہاتھ کاٹ دیا

اگر کسی آدمی نے جس کا ہاتھ شل ہے یا اس کا ہاتھ ناقص ہے یعنی اس کی کچھ انگلیاں کٹی ہوئی ہیں ایک ایسے آدمی کا ہاتھ کاٹ دیا جو تندرست ہے۔ تو جس کا ہاتھ کاٹا گیا ہے یا تو مجرم کا ناقص ہاتھ ہی کاٹنے پر راضی ہو جائے یا اس کی

دیت لے لے۔ اسے دونوں باتوں کا اختیار ہے۔ اس کی رضامندی کے مطابق حاکم وقت فیصلہ کر سکتا ہے۔

قتل عمد میں قصاص حقِ حکومت ہے

ہمارے حضرات فقہائے کرام نے فرمایا ہے کہ اگر قاتل اور اولیاء مقتول میں مال کی کسی مقدار پر صلح ہو جائے تو قصاص ساقط ہو جائے گا اور جس مقدار مال پر مصالحت ہوئی ہے وہ قاتل کو ادا کرنا ہو گا۔ مال کی مقدار قلیل ہو یا کثیر ہو، اس کی پابندی کرنی ہو گی۔ حضرات فقہاء کرام نے اس آیت کریمہ سے استدلال فرمایا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَ الْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَ اَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ رَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۸﴾ (البقرۃ:۱۷۸)

"اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! تم پر مقتولین کے بارے میں بدلہ (جانی یا مالی) فرض کر دیا گیا ہے۔ آزاد کی جگہ وہی آزاد، غلام کی جگہ وہی غلام، اور عورت کی جگہ وہی عورت (جس نے قتل کا ارتکاب کیا ہے) قتل کیا جائے گا۔ تو جسے (مالی بدلہ میں) اس کے بھائی (ولی مقتول) کی طرف سے کچھ حصہ معاف کر دیا جائے تو دستور کے مطابق اس کا پیچھا کرنا اور حسن کارانہ انداز میں اس کی ادائیگی کرنا ضروری ہے۔ یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تخفیف اور مہربانی ہے۔ تو جو شخص اس کے بعد بھی کوئی زیادتی کرے تو اس کے لیے دردناک عذاب ہو گا۔"

اس آیت کریمہ میں قِصَاص کا لفظ قابل غور ہے ہم "القصاص" کے باب میں اس کی لغوی تحقیق تفصیل سے بیان کر چکے ہیں وہاں ہم نے بتایا تھا کہ "قصاص" کے معنے مطلق بدلے کے ہوتے ہیں۔ بدلہ جانی بھی ہو سکتا ہے اور مالی بھی اور یہ دونوں بدلے "قصاص" کے مفہوم میں داخل ہیں بلکہ ہم نے مفرداتِ راغب سے نقل کیا تھا کہ انہوں نے قِصَاص کے معنے خون کے پیچھے خون بہا (مالی بدلہ اور دیت) ہی کے لیے ہیں۔ لہٰذہ قصاص کے مفہوم میں مالی بدلہ بھی داخل ہے۔ اس کے بعد یہ مسئلہ غور طلب ہے کہ انسانی جان غیر متجزی اور غیر منقسم ہے جس کے اجزاء نہیں ہو سکتے۔ البتہ مالی بدلہ متجزی اور منقسم ہے۔ یعنی اس کے اجزاء ہو سکتے ہیں۔ لہٰذہ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ سے مراد مالی بدلہ ہی ہو سکتا ہے، جانی بدلہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ "تو جسے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معاف کر دیا جائے" سے واضح ہے کہ جانی بدلہ میں سے کچھ معاف کر دینے کے تو کوئی معنے ہی نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ جان میں سے کچھ حصہ معاف نہیں کیا جا سکتا البتہ مالی بدلہ میں سے کچھ معاف کیا جا سکتا ہے۔

قتل کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک قتل عمد اور دوسرے قتل خطاء۔ قتل عمد میں قاتل کو قتل کیا جاتا ہے یعنی مقتول کا جانی بدلہ اس کے ورثاء کو دلایا جاتا ہے۔ اور قتل خطاء میں مقتول کے ورثاء کو مقتول کا مالی بدلہ یعنی دیت (خون بہا) دلایا جاتا ہے۔ لہٰذہ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ قتل عمد سے متعلق نہیں ہے بلکہ قتل خطاء سے متعلق ہے۔ قتل خطاء میں دیت واجب ہوتی ہے جو مقتول کے ورثاء کا حق ہے۔ مقتول کے ورثاء میں کوئی وارث اپنا حصہ معاف کر سکتا ہے۔ یا تمام ورثاء دیت کی رقم میں سے کچھ رقم معاف کر سکتے ہیں۔ لیکن آدھی جان، تہائی جان اور چوتھائی جان معاف نہیں کی جا سکتی۔

امام ابو بکر جصاص رازی نے لکھا ہے کہ:

اور ابن عباسؓ سے مروی ہے جس کی سند ہم پہلے بیان کر چکے ہیں[1] کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، قتل عمد میں قتل کیا جائے گا بجز اس صورت کے کہ مقتول کا ولی معاف کر دے۔ اور سلیمان ابن کثیر نے روایت کی ہے کہ عمرو ابن دینار نے بیان کیا طاؤس سے، انہوں نے ابن عباس سے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص انبوہ میں قتل کر دیا جائے اور قاتل معلوم نہ ہو یا تیر افگنی میں یا خشت باری میں پتھر، کوڑے یا لاٹھی سے مارا جائے تو اس کی دیت قتل خطاء کی دیت ہو گی اور جو عمداً قتل کیا جائے تو جان لی جائے گی۔ پھر جو شخص قاتل اور ورثاء مقتول کے درمیان روک بن جائے (اور قاتل کو قتل نہ کرنے دے) تو اس پر اللہ کی اور ملائکہ کی اور تمام آدمیوں کی لعنت برسے گی۔ تو آنحضرت ﷺ نے ان دونوں حدیثوں میں بتادیا ہے کہ قتل عمد میں واجب صرف قَوَد (قتل کرنا) ہی ہے۔ اور اگر ورثاء کو دیت لینے کا بھی اختیار ہوتا تو حضور اکرم ﷺ دیت کا بیان کئے بغیر صرف (قتل کرنے) کے بیان پر اکتفاء نہ فرماتے۔ کیونکہ یہ جائز نہیں ہے کہ مقتول کے وارث کو دو چیزوں (قتل اور خوں بہا) میں سے کسی ایک کو انتخاب کرنے کا حق ہو اور رسول اللہ ﷺ دیت کا بیان نہ فرمائیں اور صرف قَوَد (قتل) کے بیان پر اکتفاء فرمائیں۔ کیونکہ اس سے تو اس تخییر کی نفی ہو جاتی ہے۔ اور اگر اس کے بعد اس میں تخییر کو بھی قبول کر لیا جائے تو وہ پہلے حکم کا نسخ ہو گا۔ (احکام القرآن ج ۱ ص ۱۷۵ مطبوعہ مطبعہ بہیہ مصریہ)

---

(1) سند یہ ہے: حدثنا عبدالباقی بن قانع قال حدثنا موسی ابن زکریا التستری قال حدثنا سهل بن عثمان العسکری ابو معاویة عن اسمٰعیل بن مسلم عن عمرو بن دینار عن طاؤس عن ابن عباس ؓ قال قال رسول اللہ ﷺ۔ (احکام القرآن ص ۱۵۹ ج ۱ مطبوعہ مطبعہ بہیہ مصریہ)

ذٰلِكَ تَخفِیف مِّن رَّبِّکُم وَ رَحمَۃ

انسائیکلوپیڈیا آف ریلی جین اینڈ ایتھکس بائی جیمس ہیسٹنگز جلد چہارم باب کرائمز اینڈ پنشمنٹ کے حوالہ سے اصل یہودی کتب سے ہم اس سے پہلے بتاچکے ہیں کہ:

"یہودیوں میں قصاص تھا، دیت نہیں تھی۔ جان کے بدلے جان، کان کے بدلے کان، آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت، ہاتھ کے بدلے ہاتھ اور پاؤں کے بدلے پاؤں کا قانون رائج تھا، قتل عمد اور قتل خطاء میں فرق نہیں کیا جاتا تھا۔"

چونکہ یہودیوں میں قتل عمد اور قتل خطاء میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا تھا۔ اسلام نے دونوں میں فرق کیا۔ قتل عمد میں قَوَد (قتل) اور قتل خطاء میں دیت کی اجازت مرحمت فرمادی۔ یہ حق تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کے لیے ایک تخفیف اور رحمت تھی کہ اس نے قتل خطاء میں تخفیف فرمادی اور دیت کی اجازت مرحمت فرمادی۔ یہ سہولت بنی اسرائیل کو حاصل نہیں تھی۔ ان کے ہاں قتل میں صرف ایک ہی سزا.... قَوَد.... یعنی قتل کر دینا تھی۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت

حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایت نقل کی جاتی ہے جسے شیخ الاسلام امام ابو بکر جصاص رازی نے بھی نقل کیا ہے۔ حدثنا عبد الباقی بن قانع قال حدثنا الحمیدی قال حدثنا سفیان الثوری قال حدثنا عمرو بن دینار قال سمعت مجاهد ایقول سمعت ابن عباس رضی اللہ عنہما یقول (کی سند کے ساتھ) بنی اسرائیل میں قصاص (قَوَد یعنی قتل) کا حکم تھا اور ان میں دیت نہیں تھی۔ تو حق تعالیٰ نے اس امت سے فرمایا.... "اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! تم پر قصاص فرض کیا گیا ہے مقتولین کے بارے میں۔" اپنے اس ارشاد تک.... "تو جسے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ حصہ معاف کر دیا جائے۔"

ابن عباسؓ نے کہا: "عفو یہ ہے کہ وہ قتل عمد میں دیت کو قبول کرے۔" اور یہ کہ........ "اور دستور کے مطابق اسکا پیچھا کرنا ہے اور حسنِ سلوک کے ساتھ اسے دیت ادا کرنی ہے۔ یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے (اس میں جو تم سے پہلوں پر فرض کیا گیا تھا) تو جو اس کے بعد زیادتی کرے تو اس کے لیے دردناک عذاب ہے"........ ابن عباسؓ نے کہا کہ یعنی دیت قبول کر لینے بعد قتل کر دے۔"

(احکام القرآن للجصاص الرازی ص ۱۷۶ ج ۱ مطبوعہ مطبعہ بہیہ مصریہ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ قتل عمد میں بنی اسرائیل کے لیے صرف قَوَد یعنی قتل کا حکم تھا اور امت محمدیہ پر حق تعالیٰ نے یہ سہولت فرمادی کہ قاتل کو قتل بھی کیا جاسکتا ہے اور اس سے دیت (خون بہا) بھی لی جاسکتی ہے اگر مقتول کے ورثاء اس پر راضی ہو جائیں۔ حضرت ابن عباسؓ کا غالباً یہ خیال تھا کہ قتلِ خطاً میں بنی اسرائیل کے لیے بھی دیت کی سہولت موجود تھی لیکن قتل عمد میں دیت کی سہولت موجود نہیں تھی۔ اور قرآن کریم کے ارشاد ذلک تخفیف من ربکم و رحمۃ سے مراد یہی ہے کہ امت محمدیہ کو قتل عمد میں بھی اگر ورثاء راضی ہو جائیں دیت (خوں بہا) کی سہولت عطا فرمادی گئی۔ اسی بات کی طرف حق تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے کہ یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے لیے تخفیف اور رحمت ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ خود تو اسرائیلی کتب کے عالم نہیں تھے۔ انہوں نے کعب الاحبار وغیرہ جیسے علمائے بنی اسرائیل سے معلومات حاصل کیں اور انہی معلومات کو بیان فرمادیا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ معلومات صحیح نہیں تھیں یہودیوں میں سے جو لوگ مسلمان ہوگئے تھے وہ سب کے سب یہودی کتب کے عالم تو نہیں تھے۔ مگر یہودی ہونے کی وجہ سے مسلمان ان کی باتوں پر اعتماد کر لیتے تھے۔ ان یہودی علماء نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو غلط معلومات بہم پہنچائیں۔ خواہ قصداً، خواہ اپنی کم علمی کی وجہ سے اور چونکہ وہ بظاہر مسلمان تھے اس لیے ان پر اعتماد کر لینا اور ان کی معلومات کو صحیح سمجھ لینا کچھ مستبعد نہیں تھا۔ لیکن اس ذرا سی غلط بیانی نے ملاحظہ فرمائیے، مسئلہ کو کس قدر الجھا دیا ہے۔ ذٰلِكَ تَخفِیف مِّن رَّبِّکُم وَ رَحمَۃ کا تقاضا یہ تھا کہ بنی اسرائیل کے مقابلہ میں امت محمدیہ کو سہولت بہم پہنچانا حق تعالیٰ کا ارشاد ہے جس میں کوئی شک اور شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ جو سہولت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو بتائی گئی اس سے مسئلہ کی نوعیت ہی بدل گئی۔ حق تعالیٰ نے جو تخفیف اور رحمت فرمائی تھی وہ تو یہ تھی کہ قتل خطاء میں بنی اسرائیل کے لیے دیت کی سہولت موجود نہیں تھی وہ امت محمدیہ کو عطا فرمادی گئی لیکن بتانے والے نے یہ بتایا کہ قتل عمد میں بھی دیت کی سہولت دیدی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خون مسلم کو وہ ارزانی حاصل ہوگئی جو حق تعالیٰ کا مقصد نہیں تھا اور مال دار اور دولت مند آدمیوں کے لیے کچھ مشکل نہ رہا کہ وہ جسے چاہیں قتل کر دیں اور مقتول کے ورثاء کی غربت اور ناداری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گرانقدر رقوم کی پیشکش کر کے سزا سے بچ جائیں۔ البتہ اگر قاتل غریب ہے تو وہ تختہ دار پر چڑھا دیا جائے۔ خیال تو فرمائیے کہ یہ بات حق تعالیٰ کا مقصد کیسے ہوسکتی ہے اور اس سے عدل و انصاف کے تقاضے کہاں تک پورے ہوسکتے ہیں۔ اگر قانون کی حکمرانی کا یہی تصور ہے کہ دولت مند اپنی دولت کے بل بوتے پر انصاف خرید سکتے ہیں اور تختہ دار پر چڑھنے کے لیے

صرف غریب اور نادار لوگ ہی ہیں تو ایسے طرزِ عمل کو قانون کی حکمرانی کہنا حق و انصاف کا منہ چڑانا نہیں تو یہ اور کیا ہے۔

اس سلسلہ میں انسائیکلوپیڈیا آف ریلی جین اینڈ ایتھکس کا بیان زیادہ قابل اعتماد ہے کیونکہ اس کی بیان کردہ تفصیلات اصل (اوریجنل) ماٰخذ پر مبنی ہیں اور اس کی تفصیلات دینے والے خود بھی اپنے مضامین میں سند (Authority) ہوتے ہیں۔ جبکہ حضرت ابن عباسؓ کے متعلق ہمیں یہ بھی معمول نہیں کہ انہیں یہ معلومات کس یہودی سے حاصل ہوئی تھیں۔ وہ عالم آدمی تھا یا عامی آدمی تھا۔

اس پوری تفصیل کے بعد اس مسئلہ پر پر غور فرمائیے جو ہم نے ہدایہ سے نقل کیا ہے اس مسئلہ کو دوبارہ سامنے لے آیئے۔ مسئلہ یہ ہے کہ:

"اگر قاتل اور مقتول کے اولیاء میں مال کی کسی مقدار پر صلح ہو جائے تو قصاص (بدلہ) ساقط ہو جائے گا اور مال کی جس مقدار پر مصالحت ہوئی ہے، وہ قلیل مقدار ہو یا کثیر ہو وہ قاتل کو ادا کرنی ہو گی۔ اس کی پابندی ضروری ہے۔"

(۱) اس کا مطلب ایک تو یہ ہوا کہ مال دار آدمی اپنی دولت کے بل پر سزا سے صاف بچ سکتا ہے اور صرف نادار غریب ولوگ ہی سزایاب ہو سکتے ہیں۔

(۲) دوسرے یہ کہ خون مسلم کی ذمہ داری حکومت کی کچھ بھی نہیں یہ مقتول کے ورثاء کا حق ہے۔ وہ جسے چاہیں معاف کر دیں اور جس سے چاہیں اپنے مقتول کے خون کا سودا کر لیں۔ حکومت مجبور ہے کہ وہ مقتول کے ورثاء کی مرضی کے تابع فیصلے کرے حالانکہ ہم بتا چکے ہیں کہ آیت کی ابتداء ان الفاظ سے ہوتی ہے۔

"اے پیروانِ دعوتِ اسلامی! مقتولین کے بارے میں، تم سب پر قصاص فرض کیا گیا ہے" یعنی اس حکم کی مخاطب پوری جماعت مومنین ہے۔ مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ ہے یعنی حکومت ہے۔ قصاص (بدلہ) لینا مقتول کے ورثاء کا فریضہ نہیں بلکہ حکومتِ اسلامیہ کا فریضہ ہے جس کی ادائیگی حکومت اسلامیہ کو کرنی ہے لیکن اس روایت ابن عباسؓ نے حکومت کو بے دست و پا بنا دیا ہے۔ یہ عجیب صورتِ حال ہے کہ جس پر قرآن کریم ایک فریضہ عائد کر رہا ہے اسے کوئی اختیار نہ ہو بلکہ اختیارات اسے ہوں جس کا فریضہ نہیں ہے۔

رہ گئی وہ دونوں روایتیں جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ابو بکر جصاص رازیؒ نے نقل فرمائی ہیں اور جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یہ الفاظ منسوب فرمائے گئے ہیں کہ: "قتل عمد میں قتل ہی کیا جائے گا بجز اس صورت کے کہ مقتول کا ولی معاف فرما دے"..... اس روایت میں یہ ٹکڑا کہ "بجز اس صورت کے کہ مقتول کا ولی معاف کر دے"..... حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا اپنا قول معلوم ہوتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی زیادہ تر روایتیں مرسل ہیں۔ کیونکہ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت بہت کم سن تھے۔ انہوں نے زیادہ تر روایات خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سنیں۔ بلکہ دوسرے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے سن سن کر بیان کی ہیں۔ ایک روایت جو ان سے اس سے پہلے بیان کی جا چکی ہے وہ بھی کسی ایسے صحابی سے مروی ہے جو فی الحقیقت یہودی تھے اور مسلمان ہو گئے تھے۔ یہودیت سے اسلام کی طرف آنے والے صحابہ سب کے سب یہودی کتب کے عالم نہیں تھے۔ معلوم نہیں کہ یہ دونوں روایتیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کس صحابی سے سنی تھیں۔ زیادہ تر امکان یہی ہے کہ یہ روایتیں بھی انہوں نے کسی ایسے ہی صحابی سے سنی ہوں گی جو یہودی کتب کے عالم نہیں تھے اور انہوں نے ایک غلط بات اپنی لاعلمی کی وجہ سے بیان کر دی ہو۔ نیز یہ بھی امکان ہے کہ خود حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا مذہب چونکہ پچھلی روایت کی وجہ سے یہی تھا کہ قصاص حق حکومت نہیں بلکہ حق ورثائے مقتول ہے اس لیے انہوں نے اپنی معلومات کی بناء پر ایسا ہی بیان فرمایا ہو اور بعد کے راویوں نے اسے مرفوع نقل کر دیا ہو۔ یعنی اس کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کر دی ہو۔ چونکہ ان روایت میں یہ احتمالات موجود ہیں۔ اس لیے ہمیں ان سے استدلال نہیں کرنا چاہیے۔

اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال

"جب کسی بات میں مخالف احتمال پایا جائے تو اس سے استدلال نہیں کیا جا سکتا۔" (ھذا ما رایتہ واللہ اعلم)

اگر ورثاء میں کوئی معاف کر دے

مقتول کے ورثاء میں سے اگر وارث خون معاف کر دے یا اپنے حصہ کے بقدر مال پر صلح کر لے تو ہمارے فقہاء کا خیال ہے کہ قصاص ساقط ہو جائے گا اور باقی ورثاء کو بھی بقدر ان کے حصص کے دیت میں سے رقم وصول کرنی پڑے گی۔ یہ مسئلہ بھی اسی مسلمہ اصول پر مبنی ہے کہ قصاص حقِ ورثاء ہے حق مملکت نہیں۔ اگر کسی ایک وارث نے اپنے حق قصاص معاف کر کے ساقط کر دیا یا مال پر صلح کر کے ساقط کر دیا تو باقی ورثاء کا حق بھی ساقط ہو گیا کیونکہ قَوَد (جان کے بدلے جان) کی تجزی یعنی تقسیم نہیں ہو سکتی۔ اس اصول کی کمزوری ہم پہلے ہی واضح کر چکے ہیں۔ ہمارے نزدیک قَوَد (یعنی جان کے بدلے جان) کا قانون اور اس کی ذمہ داری حکومت کی ہے۔ مقتول کے ورثاء کی نہیں ہے۔ مال کی کسی مقدار پر صلح یا معافی (خصوصی حالات میں) حکومت ہی کر سکتی ہے، ورثاء نہیں کر سکتی۔ ہم اپنے دلائل تفصیل سے بیان

کر چکے ہیں اور فقہاء کے دلائل پر بحث کر چکے ہیں۔ اس لیے ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

اگر کوئی جماعت کسی کو قتل کر دے

اگر لوگوں کی ایک جماعت کسی ایک آدمی کو قتل کر دے تو اس کے بدلے (قَوَد) میں پوری جماعت کو قتل کیا جائے گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ چونکہ مقتول ایک فرد واحد ہے تو اس کے بدلے میں ایک آدمی ہی کو قتل کیا جائے باقی کو رہائی مل جائے۔ چنانچہ امام محمدؒ نے اپنے موطاء میں اور امام شافعیؒ نے اپنی مسند میں امام مالک عن یحییٰ ابن سعید ابن المسیب کی سند سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے پانچ یا سات آدمیوں کو ایک آدمی کے بدلے (قَوَد) میں قتل فرمادیا تھا جسے انہوں نے خفیہ طور پر قتل کیا تھا اور فرمایا تھا کہ اگر اس کے قتل میں تمام صنعاء کے باشندے شریک ہوتے تو میں ان سب کو قتل کر دیتا۔ اس روایت کو دار قطنی نے بھی مغیرہ ابن شعبہ عن اسعد بن زرارہ بن جزءٍ اور طبرانی نے بھی نقل کیا ہے نیز امام بخاری نے عن نافع عن ابن عمرؓ اور ابن ابی شیبہ نے بھی نقل کیا ہے نیز ابن عباسؓ اور حضرت علیؓ سے بھی ایسا ہی منقول ہے۔ (دیکھئے درایہ بر حاشیہ ہدایہ ج ۴ ص ۵۷۲ مطبوعہ کلام کمپنی کراچی)

ہمارے ناقص خیال میں فقہاء کا یہ مسلک قرآن و سنت کے مطابق ہے۔ کیونکہ جرم قتل میں سب شریک ہیں اور ان سب کو سزا ملنی چاہیے۔

کسی ایک آدمی نے جماعت کو قتل کر دیا

اگر کسی ایک آدمی نے پوری ایک جماعت کو قتل کر دیا اور ان سب کے ورثہ نے حکومت سے فریاد کی تو ان سب کے بدلے (قَوَد) میں قاتل کو قتل کر دیا جائے گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ مثلاً دس آدمیوں کے بدلے میں صرف ایک قاتل کے قتل کو ناکافی سمجھا جائے اور مقتولین کے ورثاء کو اس کے علاوہ اور کچھ نہیں دلایا جائے گا۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ پہلے مقتول کے بدلے میں قاتل کو قتل کیا جائے گا اور باقی مقتولین کے بدلے میں اس سے ہر ایک کا خوں بہا وصول کیا جائے گا۔ جو باقی مقتولین کے ورثاء کو دلایا جائے گا اور اگر یہ معلوم نہ ہو سکے کہ پہلا مقتول کون تھا تو قاتل کو تمام مقتولین کے بدلے میں قتل کیا جائے گا اور سب مقتولین کی دیتیں بھی وصول کی جائیں گی جو سب میں مساویانہ تقسیم کر دی جائیں گی یا قرعہ اندازی کی جائے گی جس کے نام کا قرعہ نکل آیا اس کے بدلے میں قاتل کو قتل کیا جائے گا اور باقی کو دیتیں دلوائی جائیں گی۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ چونکہ قتل کرنے والا ایک آدمی ہے اور مقتول ایک جماعت ہے۔ لہٰذہ ایک جماعت کے بدلے میں جب ایک ہی آدمی کو قتل کیا جائے تو مماثلت نہیں پائی گئی۔ حالانکہ قصاص میں مماثلت ضروری ہے۔ اس کے جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ قاتل اگر جماعت ہو اور مقتول ایک ہی آدمی ہو تو ایک مقتول کے بدلے میں جماعت کو قتل کر دیا جاتا ہے تو مماثلت تو وہاں بھی نہیں پائی جاتی۔ تو امام شافعیؒ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ وہاں حکم شرعی (حضرت عمرؓ کے ارشاد) کی بناء پر قیاس کو چھوڑ دیا گیا تھا۔ لیکن اس کے عکس کے لیے کوئی حکم شرعی موجود نہیں ہے۔ لہٰذہ اس میں قیاس پر عمل کیا جانا چاہیے۔

حیرت ہے کہ امام شافعیؒ کی طرف یہ مسئلہ کیسے منسوب کر دیا گیا۔ حالانکہ بالکل بدیہی امر ہے کہ ہر مقتول کی طرف سے حکومت الگ الگ مدعی ہے اور ہر دعویٰ قاتل کو قتل کرنے ہی کا ہے لہٰذہ قاتل کا قتل مستقل طور پر ہر جرم کے مساوی اور مماثل ہے لہٰذہ مماثلت پائی جا رہی ہے۔ کوئی دعویٰ بھی قاتل کو قتل کرنے کے سوا کسی اور چیز کا مدعی نہیں ہے۔ لہٰذہ تمام دعوے ایک ہی چیز کے ہیں اور قاتل کو قتل کرنے سے ہر دعوے کی سزا پوری ہو جاتی ہے۔ لہٰذہ ایک ہی قتل سے تمام دعووں کی تکمیل ہو جاتی ہے اور یہ قتل ہر دعوے کے لیے الگ الگ مماثل ہے۔ ہم حنفیہؒ کے مسلک کو ترجیح دیتے ہیں۔

قاتل اگر اپنی موت سے مر جائے

اگر قتل عمد کا قاتل قَوَد (سزائے موت) سے پہلے ہی مر جائے تو قصاص ساقط ہو جائے گا۔ حنفیہؒ کا مسلک یہی ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ قتل عمد میں قَوَد (سزائے موت) اور دیت دونوں میں سے ایک لازم تھی۔ قَوَد (سزائے موت) تو ساقط ہو گئی لیکن اس کا بدل یعنی دیت ساقط نہیں ہوئی لہٰذہ قاتل کے ورثہ سے دیت وصول کی جائے گی۔ ہمارے نزدیک حنفیہ کا مسلک قرآن کے مطابق ہے۔ قتل عمد میں صرف قَوَد واجب ہوتی ہے اور قتل خطاء میں صرف دیت۔ چونکہ قَوَد (سزائے موت) کا محل باقی نہیں رہا اس لیے قصاص ساقط ہو گیا۔ تفصیل پہلے گذر چکی ہے۔

اگر دو آدمیوں نے کسی کا ہاتھ کاٹ دیا

اگر دو آدمیوں نے مل کر کسی کا ہاتھ کاٹ دیا تو فقہائے حنفیہؒ فرماتے ہیں کہ ان دونوں آدمیوں کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا بلکہ ہاتھ کی دیت دلائی جائے گی اور دونوں نصف نصف دیت ادا کریں گے۔ کیونکہ کسی ایک نے بھی پورا ہاتھ نہیں کاٹا بلکہ ہاتھ کا کچھ حصہ ہر ایک نے کاٹا ہے۔ لہٰذا قطع ید کا مکمل جرم کسی ایک سے بھی سرزد نہیں ہوا کہ بدلہ دلایا جائے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ دونوں کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ کیونکہ اعضائے انسانی کا حکم نفس انسانی کے

تابع ہے۔ اگر دو آدمی مل کر کسی کو قتل کر دیں تو دونوں کو قتل کیا جاتا ہے۔ لہٰذہ دو آدمی اگر ہاتھ کاٹتے ہیں تو ان دونوں کے ہاتھ کاٹے جائیں گے۔ ہمارے نزدیک امام شافعیؒ کا قول قرآن سے قریب تر ہے۔ حنفیہؒ کا یہ فرمانا کہ قطع ید کا جرم کسی ایک سے مکمل طور پر سرزد نہیں ہوا قابل قبول نہیں۔ کیونکہ قتل کی صورت میں جب دو آدمی مل کر کسی کو قتل کریں تو بھی یہی کچھ کہا جاسکتا ہے کہ قتل جرم کسی ایک سے مکمل طور پر سرزد نہیں ہوا۔ لیکن اس کے باوجود دونوں قاتلوں کو قتل کر دیا جاتا ہے۔

کسی نے کسی کو گولی ماری اور اس کے ساتھ دوسرا آدمی بھی مر گیا

کسی نے ایک آدمی پر گولی چلائی اور وہ مر گیا لیکن اس کے ساتھ ہی گولی کسی دوسرے آدمی کو بھی لگ گئی اور وہ بھی مر گیا۔ تو جس شخص پر اس نے عمداً گولی چلائی تھی اس کے بدلے میں اسے قَوَد (جان کے بدلے جان) میں قتل کیا جائے گا اور جس کو ساتھ ہی گولی لگ گئی اور وہ مر گیا اس کے لیے اس سے دیت وصول کی جائیگی کیونکہ یہ قتلِ خطاء ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ اس نے شکار پر گولی چلائی اور وہ کسی آدمی کو لگ گئی اور وہ مر گیا تو وہ قتل خطاء ہوتا ہے۔

ہمارے خیال میں دونوں قتل، قتل عمد ہیں۔ اور دونوں کے بدلے اسے قتل ہی کیا جائے گا۔ دوسرے آدمی کے لیے اس پر دیت واجب نہیں ہوگی۔ غور فرمایئے کہ اگر یہ صورت پیش آجائے کہ زید نے عمرو پر عمداً گولی چلائی اور وہ عمرو کو نہیں لگی بلکہ بکر کو لگ گئی تو کیا اسے قتل خطاء کہا جائے گا؟ اور قاتل کو قَوَد (جان کے بدلے جان) میں قتل نہیں کیا جائے گا اور صرف دیت دلائی جائے گی۔ اس طرح تو قتل و غارت کا دروازہ کھل جائے گا کہ جس کو جی چاہے گولی مار دیجئے اور کہہ دیجئے کہ میں تو فلاں آدمی کو قتل کرنا چاہتا تھا لیکن غلطی سے فلاں کو لگی گئی لہٰذہ یہ قتل خطاء ہے۔ میں دیت ادا کروں گا۔ مجھے قصاص میں قتل نہیں کیا جاسکتا۔

شکار کی مثال صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ شکار پر گولی چلانا جرم نہیں ہے۔ اور کسی انسان پر عمداً گولی چلانا جرم ہے۔ شکار کی صورت میں گولی چلانے والے نے عمداً جرم کا ارتکاب نہیں کیا۔ وہ گولی کسی آدمی کو لگ گئی۔ تو مآل اور نتیجۃً جرم بالخطاء ہوا۔ لیکن صورت مذکورہ میں ارتکابِ جرم عمداً ہوا ہے۔ گولی کسی دوسرے کو لگ جانا امر دیگر ہے۔ فاعل (یعنی قاتل) قتل عمد کا مجرم ہوا ہے۔ البتہ مقتول (یعنی مفعول) قتل خطاء کا نشانہ بنا ہے۔ قاتل کو اپنے فعل کی سزا ملتی ہے اور ملنی چاہیے۔ کیونکہ مقتول بالخطاء کی وجہ سے قاتل بالعمد قاتل بالخطاء نہیں بن سکتا۔ فاعل کو اپنے فعل کی وجہ سے سزا ملتی ہے۔ مفعول کی وجہ سے نہیں۔

قصاص عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ

(تاریخ اسلام کا وہ ہنگامہ خیز قانونی مسئلہ جو خلیفہ سوم کے ۱۸ ذی الحجہ کو مظلومانہ قتل کے بعد پیش آیا)

تمام مہذب دنیا کا یہ اصول ہے اور مسلمہ اصول ہے کہ کسی بھی حکومت کے حسن و قبح کا معیار یہ ہے کہ اس کے دور میں قانون کو بالادستی حاصل تھی یا نہیں۔ اگر کسی حکومت کے عہد میں قانون کی حکمرانی تھی تو وہ ایک بہترین حکومت ہے اور اگر اس کے عہد میں قانون کو بالادستی حاصل نہیں تھی تو ایک بدترین حکومت کا مصداق ہو گی۔

اسلام جس بنیاد پر اپنی حکومت قائم کرتا ہے وہ بھی یہی ہے کہ شریعت سب پر بالا ہے۔ حکومت اور حکمران، راعی اور رعایا، بڑے اور چھوٹے، عوام اور خواص، سب اس کے تابع ہیں۔ کوئی اس سے آزاد یا مستثنیٰ نہیں۔ اور کسی کو اس سے ہٹ کر کام کرنے کا حق نہیں۔ دوست ہو یا دشمن، حربی کافر ہو یا معاہد، مسلم رعیت ہو یا غیر مسلم، مسلمان وفادار ہو یا باغی برسر جنگ، غرض جو بھی ہو۔ شریعت میں اس سے برتاؤ کرنے کا ایک طریقہ مقرر ہے جس سے کسی حال میں بھی انحراف یا تجاوز نہیں کیا جا سکتا۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۡ وَ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝

(المائدہ: ۸)

"اے پیروان دعوت ایمانی! تم اللہ کے لیے کاربر آر اور انصاف کے ساتھ نگراں بنو۔ تمہیں کسی قوم کی عداوت ناانصافی پر برانگیختہ نہ کرے۔ انصاف ہی کرو۔ یہی امر تقویٰ سے قریب تر ہے۔"

اور

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَ لَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۟ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَ اِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝ (النساء: ۱۳۵)

"اے پیروانِ دعوت ایمانی! تم انصاف کے ساتھ کاربر آر اور اللہ کے لیے نگراں بنو، خواہ یہ (نگرانی) خود تمہاری اپنی ذات یا والدین یا قریب ترین عزیزوں کے خلاف ہی کیوں نہ پڑے۔ اگر وہ مالدار یا فقیر ہے تو ان دونوں کا اللہ زیادہ خیر خواہ ہے۔ لیکن تم خواہش نفس کی پیروی نہ کرو کہ انصاف سے روگردانی کرنے لگو اگر تم زبان کو ملو گے یا اعراض کرو گے تو (جان لو کہ) جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی پوری پوری خبر ہے۔"

عدل و قسط کا یہی تقاضا ہے کہ ہر حال میں قانون کے تقاضوں کو پورا کیا جائے۔ انہی قوانین میں ایک قصاص کا حکم بھی ہے۔ قرآن کریم نے اس کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ فرمایا:

وَ لَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝

(البقرہ: ۱۷۹)

"عقل و شعور رکھنے والو! قصاص (بدلہ) چکانے ہی میں تمہاری حیات مضمر ہے اور یہ حکم اس لیے ہے کہ تم قانون الٰہی سے ہم آہنگ رہ سکو۔"

یوں تو قصاص (بدلہ چکانا) فریضہ الٰہی ہے جو قرآن کریم نے امت اسلامیہ پر فرض قرار دیا ہے۔ نہ صرف امت اسلامیہ پر بلکہ امم سابقہ پر بھی یہ اسی طرح فرض تھا:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَ الْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَ اَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ رَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ (البقرۃ: ۱۷۸)

"اے پیروانِ دعوت ایمانی! مقتولین کے بارے میں تم پر قصاص (بدلہ چکانا) فرض کیا گیا ہے۔ (قتل عمد میں) وہی آزاد آدمی اسی آزاد قاتل کے بدلے میں قتل کیا جائے گا اور وہی غلام اسی غلام قاتل کے بدلے میں اور وہی عورت اسی قاتل عورت کے بدلے قتل کی جائے گی۔ اور قتل خطاء میں (تو جو اسے اس کے بھائی نے کچھ معاف کر دیا ہو تو دستور کے مطابق (دیت یعنی خوں بہا وصول کرنے کے لیے) اس کا پیچھا کرنا ہوگا۔ اور حسن سلوک کے ساتھ اسے ادائیگی کرنی ہوگی (قتل خطاء میں) یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے۔ تو جو اس تخفیف کے بعد زیادتی (کرکے قاتل کو قتل) کرے گا تو اس کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔"

اور

وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَاۤ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَ الْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَ الْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَ الْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَ السِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَ الْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ؕ (المائدہ: ۴۵)

"اور ہم نے ان (بنی اسرائیل) پر اس (تورات) میں بھی فرض کیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور تمام زخموں کا قصاص (بدلہ چکانا) ضروری ہے۔"

علاوہ ان عام اصولی احکام کے حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کے سلسلہ میں قرآن کریم کی مزید تصریحات بھی موجود ہیں جن سے اس قصاص کی اہمیت اور فرضیت پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ ان تصریحات کا تذکرہ ہم آگے کریں گے۔ بہر حال قصاص صرف امتِ مسلمہ پر ہی نہیں بلکہ امم سابقہ پر بھی فرض تھا۔ شریعتِ اسلامیہ نے قتل کے سلسلہ میں یہی قانون مقرر کیا ہے کہ قاتل کو (اگر اس نے عمداً قتل کیا ہے تو اسے) قتل کیا جائے گا اور اگر یہ جرم اس سے غلطی سے سرزد ہو گیا ہے۔ اس کے قصد و ارادہ کا اس میں دخل نہیں تھا تو اسے دیت یعنی خون بہا ادا کرنا ہوگا۔

ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ (المائدہ: ۳۲)

"جو کسی شخص کو بغیر اس کے کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو یا زمین میں فساد پھیلایا ہو، قتل کر دے تو گویا اس نے پوری نوع انسانی کو قتل کر دیا اور جو کسی کو زندہ رہنے دے تو گویا اس نے پوری انسانیت کو حیاتِ نو عطا کر دی۔"

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی قوموں کے عروج و زوال کی اصل وجہ قانون ہی سے ان کے تعلق یا بے تعلقی کو بتایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

حدثنا سعید بن سلیمٰن قال حدثنا اللیث عن ابن شہاب عن عروۃ عن عائشۃ رضی اللہ عنہا ان قریشا اھتمھم المراۃ المخزومیۃ التی سرقت قالوا من یکلم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ومن یجترئ علیہ۔۔۔ فکلم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال اتشفع فی حد من حدود اللہ ثم قام فخطب فقال یا ایھا الناس انما ضل من قبلکم انھم کانوا اذا سرق الشریف ترکوہ واذا سرق الضعیف فیھم اقاموا علیہ الحد وایم اللہ لو ان فاطمۃ بنت محمد سرقت لقطع محمد یدھا

(بخاری کتاب الحدود ج ۲ ص ۱۰۰۳ مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی)

"سعید بن سلیمان نے (اپنی سند کے ساتھ) حضرت عائشہؓ سے حدیث بیان کی کہ قریش کو اس مخزومی عورت نے بڑی فکر میں ڈال دیا جس نے چوری کر لی تھی۔ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے (اس بارے میں) کون بات کر سکتا ہے۔ سوائے اسامہ ابن زیدؓ کے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑے محبوب ہیں اور کون جرأت کر سکتا ہے، چنانچہ (انہوں نے حضرت اسامہؓ سے درخواست کی اور) اسامہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کی تو آپ نے فرمایا: "کیا تم اللہ کی حدود میں سے ایک حد میں سفارش کر رہے ہو؟ پھر آپ کھڑے ہوئے اور آپ نے خطبہ دیا اور فرمایا اے لوگو! تم سے پچھلی امتوں کے لوگ اسی وجہ سے گمراہ ہو گئے کہ جب ان میں شریف آدمی چوری کرتا تو وہ اسے چھوڑ دیتے اور جب کوئی کمزور آدمی چوری کرتا تو اس پر حدیں قائم کر دیتے اور اللہ کی قسم اگر فاطمہ بنت محمد (اعاذھا اللہ من ذلک ورضی عنھا) چوری کرے تو محمد اس کا ہاتھ بھی کاٹ دے گا۔"

اس تمام صورت حال کے پیشِ نظر قصاص عثمان رضی اللہ عنہ کے مسئلے پر غور فرمایئے جو نہ صرف ایک انسان کا، ایک مسلمان کا، ایک صحابی کا، بلکہ صحابہ کرام کے سربراہ اور خلیفہ کا قتل ہے، بغیر کسی وجہ کے قتل ہے۔ مرکزِ اسلام مدینہ منورہ میں، روضہ رسول کے سایہ میں قتل ہے، قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہوئے روزہ دار کا قتل ہے، انتہائی وحشیانہ درندگی کے ساتھ قتل ہے۔ ان وجوہات سے خونِ عثمانؓ کے قصاص کی اہمیت کس قدر زیادہ ہو جاتی ہے۔ اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ تاریخ اسلام کا یہ سب سے پہلا خون ناحق ہے جس کا قصاص لینے میں ایک طبقے کی طرف سے کمزوری کا اظہار کیا گیا ہے۔ ورنہ اس وقت تک کبھی اس قسم کے معاملے میں ذرا سی بھی نرمی اختیار نہیں کی گئی تھی تو اس معاملے کی سنگینی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے اور تاریخ اسلام اس کی

گواہی دیتی ہے کہ یہی وہ کمزوری تھی جس کے نتیجہ میں ملت اسلامیہ انتشار کا شکار ہوئی اور اس کمزوری نے جسدِ اسلام میں جو زخم ڈالے وہ آج تک مندمل نہیں ہو سکے۔ اللہ اور اس کے رسول نے قصاص نہ لینے کے جو بد نتائج بتائے تھے وہ پوری طرح سامنے آئے اور آج تک مسلمان انہیں بھگت رہے ہیں اور جب تک وہ اس کمزوری کا اعتراف نہیں کریں گے اور آئندہ کے لیے اس بچنے کا مصمم ارادہ نہیں کریں گے اس وقت تک وہ ان بد نتائج کے اثرات میں مبتلا رہیں گے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے المناک ترین سانحہ فاجعہ کو ہمارے محدثین اور مورخین نے جس سبائی ذہنیت (مجوسیت، عیسائیت، یہودیت) کی منظم سازش کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر بیان کیا ہے اس پر جتنا ماتم بھی کیا جائے کم ہے۔ آپ کی سیرت طیبہ کو مسخ کرنے اور آپ کے فضائل کو چھپانے میں سبائیہ فرقہ کے مورخین نے یہاں تک تعصب اور بغض سے کام لیا ہے کہ آپ کی ازواج مطہرات حضرت سیدہ رقیہ اور سیدہ ام کلثوم رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے متعلق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چہیتی بیٹیاں ہونے تک سے انکار کرنے کی جسارت کر ڈالی۔ ان کو اس کا بھی پاس نہیں ہوا کہ قرآن مجید کے اس صریح ارشاد کی خلاف ورزی ہے جس میں اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیوں کا ذکر وبناتك (الاحزاب:۵۹) یعنی آپ کی بیٹیاں (بصیغہ جمع) کہہ کر فرمایا ہے جو ظاہر ہے کہ جمع کا صیغہ ہے اور ایک سے زیادہ صاحبزادیوں کے لیے بالکل واضح اور صریح ہے۔

ان کو اس کا بھی خیال نہیں ہوا کہ کل کو میدان حشر میں جب وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو پیش ہوں گے تو اس سفید جھوٹ کا کیا جواب دیں گے۔

ان دشمنانِ اسلام کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا لقب "ذو النورین" اتنا کھلتا ہے کہ وہ اس لقب کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے چھین تو نہیں سکے۔ لیکن اپنے پروپیگنڈے سے وہ اسے مشکوک بنا دینے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔

تمام صحابہ کرام کے فضائل و مناقب کے تذکرے کتب حدیث کی زینت ہیں، حدیث کی ان تمام کتابوں کو ضائع کر کے، ان کو دریا برد کر کے، انہیں جلا کر خاکستر کر کے ملیامیٹ کیا جا سکتا ہے مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے فضائل و مناقب کے وہ آثار بھی ہیں جنہیں مٹایا نہیں جا سکتا۔ مدینہ منورہ کا بئرِ رومہ، مدینہ منورہ کی مسجد نبوی، مکہ مکرمہ کی مسجد حرام، غزوہ تبوک، بیعت رضوان اور مصاحف عثمانی۔ جب تک اس دنیا کے صفحات ارضی پر موجود ہیں اور وہ انشاء اللہ تا قیامت باقی رہیں گے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مناقب و فضائل کی زندہ یادگاریں ثابت ہوں گے۔

بالخصوص جب تک اس دنیا میں قرآن کریم موجود ہے اور وہ انشاء اللہ ہمیشہ موجود رہے گا کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود حق تعالیٰ نے لیا ہے۔ اس میں سورہ فتح کی وہ آیات کریمہ جو بیعتِ رضوان کے بارے میں ہیں جب تک ان کی تلاوت ہوتی رہے گی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی فضیلت کی گواہی ہر فرد بشر، ہر جن و انس ہر کہ دمہ دیتا رہے گا۔

غضب تو یہ ہے کہ سیدنا عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے طلب قصاص کے واقعہ کو بھی خواہ مخواہ طالبانِ قصاص (ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا، حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ) اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ذاتی تنازعہ کا رنگ دے کر بیعت الرضوان کے واقعہ کو بھی مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔

بیعت الرضوان کے واقعہ کو علامہ شبلی نعمانی نے سیرت النبی میں اس طرح بیان کیا ہے:

"اسلام میں فضائل چہار گانہ میں حج کعبہ ایک رکن اعظم ہے۔ غرض مختلف اسباب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ کا ارادہ کیا اور اس غرض سے کہ قریش کو کوئی اور احتمال نہ ہو، عمرہ کا احرام باندھا اور قربانی کے اونٹ ساتھ لیے۔ یہ بھی حکم دیا کہ کوئی شخص ہتھیار باندھ کر نہ آئے۔ صرف تلوار جو عرب میں سفر کا ضروری آلہ سمجھی جاتی تھی پاس رکھ لی جائے۔ اس میں بھی یہ شرط ہے کہ نیام میں ہو۔"

چونکہ مہاجرین عموماً اور اکثر انصار اس سعادت کے منتظر تھے۔ ۱۴۰۰ شخص اس سفر میں ہم رکاب ہوئے۔ مقام ذوالحلیفہ میں پہنچ کر قربانی کی ابتدائی رسمیں ادا ہو گئیں۔ یعنی جو قربانی کے اونٹ ساتھ تھے ان کی گردنوں میں علامت کے طور پر لوہے کے نعل لگا دیئے گئے۔

احتیاط کے لیے قبیلہ خزاعہ کا ایک شخص جس کے اسلام لانے کا حال قریش کو معلوم نہ تھا پہلے بھیج دیا گیا کہ قریش کے ارادے کی خبر لائے۔ جب قافلہ عسفان کے قریب پہنچا اس نے آ کر خبر دی کہ قریش نے تمام قبائل (احابیش) کو یکجا کر کے کہہ دیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں کبھی نہیں آ سکتے۔

غرض قریش نے بڑے زور شور سے مقابلہ کی تیاری کی۔ قبائل متحدہ کے پاس پیغام بھیجا، وہ جمعیت عظیم لے کر آئے۔ مکہ کے باہر بلدح کے ایک مقام پر فوجیں فراہم ہوئیں۔

خالد ابن ولید جو اب تک اسلام نہیں لائے تھے دو سو سوار لے کر جن میں ابو جہل کے بیٹے عکرمہ بھی تھے مقدمۃ الجیش کے طور پر آگے بڑھے اور غمیم تک پہنچ گئے جو رابغ اور جحفہ کے درمیان ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قریش نے خالد کو طلیقہ بنا کر بھیجا ہے اور وہ مقام غمیم تک آ گئے ہیں اس لیے کترا کر داہنی طرف سے چلو۔ فوج

اسلام جب غمیم تک پہنچ گئی تو خالد کو گھوڑوں کی گرد اڑتی نظر آئی۔ وہ گھوڑا اڑاتے ہوئے گئے اور قریش کو خبر کی کہ لشکرِ اسلام غمیم تک آ گیا۔ آنحضرت ﷺ آگے بڑھے اور حدیبیہ میں پہنچ کر قیام کیا۔ یہاں پانی کی قلت تھی۔ ایک کنواں تھا وہ پہلے ہی آمد میں خالی ہو گیا۔ لیکن اعجاز نبوی سے اس میں اس قدر پانی آ گیا کہ سب سیر اب ہو گئے۔

قبیلہ خزاعہ نے اب تک اسلام نہیں قبول کیا تھا لیکن اسلام کے حلیف اور رازدار تھے۔ قریش اور عام کفار جو منصوبے اسلام کے خلاف کیا کرتے تھے وہ ہمیشہ آنحضرت ﷺ کو اس سے مطلع کر دیا کرتے تھے۔ اس قبیلہ کے رئیس اعظم بدیل بن ورقاء تھے (فتح مکہ میں اسلام لائے) ان کو آنحضرت ﷺ کا تشریف لانا معلوم ہوا تو چند آدمی ساتھ لے کر دربارِ نبوی میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ قریش کی فوجوں کا سیلاب آ رہا ہے۔ وہ آپ کو کعبہ میں نہ جانے دیں گے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ قریش سے جا کر کہہ دو کہ ہم عمرہ کی غرض سے آئے ہیں۔ لڑنا مقصود نہیں۔ جنگ نے قریش کی حالت زار کر دی ہے اور ان کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ ان کے لیے یہ بہتر ہے کہ معین مدت کے لیے معاہدہ صلح کر لیں اور مجھ کو عرب کے ہاتھ میں چھوڑ دیں۔ اس پر بھی وہ اگر راضی نہیں تو اس خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میں یہاں تک لڑوں گا کہ میری گردن الگ ہو جائے اور خدا کو جو فیصلہ کرنا ہو کر دے۔ بدیل نے جا کر قریش سے کہا کہ میں محمد ﷺ کے پاس سے پیغام لے کر آیا ہوں، اجازت ہو تو کہوں۔ چند شریر بول اٹھے کہ ہمیں محمد کا پیغام سننے کی ضرورت نہیں۔ لیکن سنجیدہ لوگوں نے اجازت دی۔ بدیل نے آنحضرت ﷺ کی شرطیں پیش کیں۔ عروہ بن مسعود ثقفی نے اٹھ کر کہا "کیوں قریش! کیا میں تمہارا باپ اور تم میرے بچے نہیں؟" بولے "ہاں" عروہ نے کہا "میری نسبت تمہیں کوئی بدگمانی تو نہیں؟" سب نے کہا: "نہیں" عروہ نے کہا: "اچھا تو مجھ کو اجازت دو۔ میں خود جا کر معاملہ طے کر لوں۔ محمد ﷺ نے معقول شرطیں پیش کی ہیں۔" غرض وہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئے....... چونکہ معاملہ ناتمام رہ گیا۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت خراش بن امیہؓ کو قریش کے پاس بھیجا۔ لیکن قریش نے ان کی سواری کے اونٹ کو جو خاص رسول اللہ علیہ وسلم کی سواری کا تھا مار ڈالا اور خود ان پر بھی یہی گذرنے والی تھی لیکن قبائل متحدہ کے لوگوں نے بچا لیا اور وہ کسی طرح اپنی جان بچا کر چلے آئے۔

اب قریش نے ایک دستہ بھیجا کہ مسلمانوں پر حملہ آور ہو لیکن یہ لوگ گرفتار کر لیے گئے۔ گو یہ سخت شرارت تھی۔ لیکن رحمت عالم (ﷺ) کا دامن عفو اس سے زیادہ وسیع تھا۔ آپ نے سب کو چھوڑ دیا اور معافی دیدی۔

قرآن مجید کی اس آیت میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

وَ هُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ؕ (الفتح:۲۴)

"اور اللہ ہی نے تو مکہ معظمہ میں تمہارے ہاتھوں کو ان سے اور ان کے ہاتھوں کو تم سے تمہیں ان پر کامیابی عطا فرما دینے کے بعد روک دیا تھا۔"

بالآخر آپ نے گفتگوئے صلح کے لیے حضرت عمرؓ[1] کا انتخاب کیا۔ لیکن انہوں نے معذرت کی کہ قریش میرے سخت دشمن ہیں اور مکہ میں میرے قبیلہ کا ایک شخص نہیں کہ مجھ کو بچا سکے لہٰذہ آپ نے حضرت عثمانؓ کو بھیجا[2] وہ اپنے ایک عزیز (ابان بن سعید) کی حمایت میں گئے۔ اور آنحضرت ﷺ کا پیغام سنایا قریش نے ان کو نظر بند کر لیا۔ لیکن عام طور پر یہ خبر مشہور ہو گئی کہ قتل کر ڈالے گئے۔ یہ خبر آنحضرت ﷺ کو پہنچی۔

تو آپ نے فرمایا کہ عثمانؓ کے خون کا قصاص لینا فرض ہے۔

یہ کہہ کر آپ نے ایک ببول کے درخت کے نیچے بیٹھ کر صحابہؓ سے جاں نثاری کی بیعت لی۔ تمام صحابہ جن میں زن و مرد دونوں شامل تھے ولولہ انگیز جوش کے ساتھ دست مبارک پر جاں نثاری کا عہد کیا۔ یہ تاریخ اسلام کا ایک مہتم بالشان واقعہ ہے۔ اس بیعت کا نام بیعت الرضوان ہے۔ سورۃ فتح میں اس واقعہ کا اور درخت کا ذکر موجود ہے:

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَ اَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ۙ۱۸
(الفتح:۱۸)

---

(1) حضرت عمرؓ کے متعلق جو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ پہلے ان کا انتخاب حضور ﷺ نے فرمایا تھا اور ان کے معذرت کرنے کے بعد حضرت عثمانؓ کا انتخاب عمل میں آیا تیسرے درجہ کی روایت ہے جس کا ذکر صحیحین میں نہیں ہے۔ یہ روایت نہ روایتاً صحیح ہے نہ درایۃً صحیح ہے۔ حضرت عثمانؓ کا انتخاب اس لیے کیا گیا تھا کہ مکہ مکرمہ میں ان کا خاندان ہی حکمران تھا اور وہی معزز ترین شخصیت تھے جیسا کہ آگے حضرت ابن عمرؓ کی روایت میں آ رہا ہے۔ یہ کسی شیعہ راوی کی شرارت معلوم ہوتی ہے جس سے اس کا مقصد حضرت عمرؓ کی توہین ہے اور ان کی بزدلی کا اظہار ہے۔ اگر کسی اور کو منتخب کرنا ہوتا تو حضرت علیؓ کو منتخب کیا جاتا جن کے خاندان کی اکثریت مکہ معظمہ میں موجود تھی مثلاً حضرت عباسؓ وغیرہ لیکن چونکہ حضرت علیؓ کی وہ عزت وعظمت نہیں تھی جو حضرت عثمانؓ کی تھی اس لیے انہیں نہیں بھیجا گیا۔ بخاری کی ابن عمرؓ والی روایت اس پر بالکل واضح ہے جو آگے آ رہی ہے۔ (مولف)

(2) یہ حضرت عثمانؓ کی سفارتی صلاحیتوں کی واضح دلیل ہے۔ آنحضرت ﷺ نے حبشہ کی طرف مسلمانوں کی جو اولین سفارت روانہ فرمائی تھی اس کے قائد بھی حضرت عثمان غنیؓ ہی تھے۔ حبشہ کی طرف دوسری سفارت کے قائد حضرت جعفر طیارؓ تھے۔ (مولف)

"اللہ مومنوں سے راضی ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے آپ سے جاں نثاری کی بیعت کر رہے تھے۔ اس نے جان لیا جو کچھ ان کے دلوں میں تھا اور اس نے مسلمانوں پر اپنا سکینہ نازل فرمایا اور انہیں ایک قریبی فتح عطا فرمائی۔" (سیرت النبی ج ۱ ص ۴۴۹ تا ۴۵۴ مطبوعہ مطبعہ معارف اعظم گڑھ انڈیا)

قریش نے آنحضرت ﷺ کی صلح کی پیشکش کو قبول نہیں کیا مگر حضرت عثمانؓ سے کہا کہ آپ خود طواف کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو اجازت ہے مگر محمد ﷺ کو اجازت نہیں دی جا سکتی۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا:

"یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا کہ حضور اکرم ﷺ تو روک دیئے جائیں اور میں خود طواف کر لوں۔" (حکایات صحابہ از حضرت مولانا محمد زکریا صاحب ص ۳۷۶ بحوالہ تاریخ خمیس)

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ:

لوکان احد اعزببطن مکة من عثمان رضی اللہ عنہ لبعثه مکانه فبعثه رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم۔

(صحیح بخاری کتاب بدء الخلق، باب مناقب عثمان)

"وادی مکہ میں اگر کوئی اور شخص حضرت عثمانؓ سے زیادہ معزز ہوتا تو آنحضرت ﷺ اسی کو بھیجتے لیکن آنحضرت ﷺ نے حضرت عثمانؓ ہی کو بھیجا۔"

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

کان عثمان رضی اللہ عنہ رسول رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم الی مکة فبایع الناس فقال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم ان عثمان فی حاجة الله وحاجة الرسول فضرب باحدیٰ یدیه علی الاخریٰ فکانت ید رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم لعثمان رضی اللہ عنہ خیرا من ایدیهم لانفسهم (ترمذی، مشکوٰۃ المصابیح باب مناقب عثمانؓ)

"عثمانؓ رسول اللہ ﷺ کے رسول (سفیر) کی حیثیت سے مکہ گئے ہوئے تھے۔ صحابہؓ نے بیعت کر لی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا در حقیقت عثمانؓ اللہ اور رسول کے کام سے گئے ہوئے ہیں۔ پھر آپ نے اپنا ایک ہاتھ (حضرت عثمانؓ کی طرف سے اپنے دوسرے ہاتھ پر مارا۔ پس حضرت عثمانؓ کے لیے رسول اللہ ﷺ کا دست مبارک لوگوں کے اپنے ہاتھوں سے جنہوں نے خود اپنی طرف سے بیعت کی تھی (ہزار درجہ) بہتر تھا۔

شانِ ید الٰہی

ملاحظہ فرمایئے کہ اِدھر تو حضور اکرم ﷺ اپنے دست مبارک کو حضرت عثمانؓ کا ہاتھ قرار دے رہے ہیں اور اُدھر حق تعالیٰ آنحضرت ﷺ کے دست مبارک کو خود اپنا ہاتھ قرار دے رہے ہیں۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:

یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ ۚ (فتح-۱۰)

حدیبیہ میں بیعت لیتے وقت اللہ تعالیٰ کا دستِ قدرت لوگوں کے ہاتھ کے اوپر تھا۔ اور حضور اکرم ﷺ کا جو دستِ رحمت اللہ کی طرف سے بیعت لے رہا تھا وہی دست رحمت عثمانؓ کی طرف سے بیعت کر رہا تھا تو ذاتِ اقدس واعظم کا جو دستِ رحمت "یَدُ اللّٰهِ" تھا، وہی "ید عثمان" تھا۔ اللہ اکبر! یہ شانِ عثمان کہ پروردگارِ عالم ان کے ہاتھ کو اپنا ہاتھ قرار دے رہا ہے اور "ید عثمانؓ" کو "یَدُ اللّٰهِ" قرار دے رہا ہے۔

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

پیغمبر انسانیت اور صحابہ کرام کے اس خوش آئند عمل بیعت سے مسرور ہو کر رب کائنات جل وعلا نے اپنی خوشنودی اور رضا کا اظہار سورہ فتح میں یوں فرمایا:۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ ؕ یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ ۚ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا یَنْكُثُ عَلٰی نَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ اَوْفٰی بِمَا عٰهَدَ عَلَیْهُ اللّٰهَ فَسَیُؤْتِیْهِ اَجْرًا عَظِیْمًا ﴿۱۰﴾ (الفتح:۱۰)

"اے پیغمبر! (قصاص عثمانؓ کے لیے) جو لوگ آپ سے بیعت کر رہے ہیں وہ در حقیقت اللہ سے بیعت کر رہے ہیں۔[1] ان کے ہاتھوں کے اوپر (آپ کا ہاتھ نہیں) اللہ کا ہاتھ ہے۔ تو (قصاص عثمانؓ کے معاملے میں) جو عہد شکنی کرے گا اس کی عہد شکنی کا وبال خود اسی پر پڑے گا اور جو اللہ سے کئے گئے عہد کو پورا کرے گا تو اللہ اسے بہت جلد بڑا اجر عطا فرمائے گا۔"

قصاص عثمانؓ کی پیشگوئی

اس بیعت کو حق تعالیٰ نے جو اہمیت عطا فرمائی ہے وہ قرآن کریم کے ان الفاظ سے واضح ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ ؕ کہ اے پیغمبر! جو لوگ آپ سے بیعت کر رہے ہیں وہ دراصل اللہ سے بیعت

---

(1) ایک خاص فرقہ کو قرآن کریم اور اقوال نبوی میں چونکہ تحریف سے شغف ہے اس لیے حیرت نہ ہونی چاہیے اگر وہ قرآن کریم کے خلاف ید اللہ کا خطاب حضور اکرم ﷺ یا حضرت عثمانؓ سے چھین کر حضرت علیؓ پر چسپاں کر دیں یا اسد اللہ کا خطاب جو جنگ بدر میں آنحضرت ﷺ نے حضرت حمزہ کو ان کے کارہائے نمایاں پر عطا فرمایا تھا۔ حضرت علیؓ پر چسپاں کر دیں یا سید الشہداء کا خطاب جو جنگ احد میں شہید ہونے پر حضرت حمزہؓ کو عطا فرمایا گیا تھا شہید کربلا حضرت حسینؓ پر چسپاں کر دیں۔ اس فرقہ کی یہ عادت رہی ہے۔ (مؤلف)

کر رہے ہیں اور اتنا ہی نہیں بلکہ یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ ۚ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے اور پھر مزید یہ بھی فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا یَنْكُثُ عَلٰی نَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ اَوْفٰی بِمَا عٰهَدَ عَلَیْهُ اللّٰهَ فَسَیُؤْتِیْهِ اَجْرًا عَظِیْمًا ﴿۱۰﴾ تو جو اس عہد کو توڑے گا تو اس کی عہد شکنی کا وبال خود اسی کی ذات پر پڑے گا اور جو اپنے اس عہد کو وفا کرے گا جو اس نے اللہ سے کیا ہے تو اللہ اسے بڑا اجر عطا فرمائے گا۔

یہ پوری آیت نہایت ہی غور طلب ہے۔ بیعت کی غیر معمولی اہمیت جتلانے کے بعد یہ فرمانا کہ جو اس عہد کو توڑے گا اس کی عہد شکنی کا وبال خود اس کی ذات پر پڑے گا اور جو اپنا عہد وفا کرے گا اسے حق تعالیٰ اجرِ عظیم عطا فرمائے گا اس اعتبار سے انتہائی غور طلب ہے کہ اس واقعہ حدیبیہ میں تو حضرت عثمانؓ کے متعلق یہ اطلاع کہ ان کو شہید کر دیا گیا ہے غلط تھی۔ ہو سکتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ کو اس خبر کا غلط ہونا معلوم ہی نہ ہو مگر اس عالم الغیب والشہادۃ کو تو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی جس نے یہ آیت نازل فرمائی تھی کہ یہ خبر غلط ہے۔ اس آیت کا تعلق صلح حدیبیہ کے موقع پر افواہ قتل سے ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر اس آیت کا تعلق واقعہ حدیبیہ کے افواہ قتل سے ہوتا تو حق تعالیٰ کا یہ ارشاد کبھی بھی ان الفاظ میں نہ ہوتا بلکہ اس کے بجائے ان الفاظ میں ہوتا کہ:

"اے پیغمبر اسلام! آپ خواہ مخواہ دلگیر نہ ہوں، آپ کا فرستادہ زندہ سلامت محفوظ ہے۔ ہم اس کے محافظ ہیں۔ لوگوں نے خفیہ تدابیر کی تھیں، ہم نے خفیہ تدابیر کیں اور ہم نے ان کی تدابیر کو ناکام بنا دیا۔ وہ بخیر و عافیت تھوڑے وقفہ سے آپ کی خدمت میں حاضر ہو جائیں گے۔ آپ اس سلسلہ میں کوئی بیعت نہ لیں۔"

لامحالہ اس واقعہ کا تعلق آئندہ پیش آنے والے واقعات ہی سے جو حق تعالیٰ کو خوب معلوم تھے کہ آئندہ چل کر اس قسم کے واقعات پیش آئیں گے کہ حضرت عثمانؓ واقعی دشمنانِ اسلام منافقین کے ہاتھوں شہید کر دیئے جائیں گے اور کچھ بہترین لوگ اپنے وعدہ کو وفا کریں گے اور قصاص عثمان کیلیے کھڑے ہوں گے جبکہ کچھ لوگ عہد شکنی کا ارتکاب کریں گے۔ یہ بیعت اس آئندہ قصاص عثمانؓ کے لیے ضروری ہے تو جو اس وقت اپنا عہد پورا کرے گا حق تعالیٰ اس کو اجر عظیم عطا فرمائیں گے اور جو اپنے اس عہد کو توڑے گا تو اس عہد شکنی کا وبال خود اس کی ذات کو بھگتنا پڑے گا۔

چونکہ حدیبیہ کے موجودہ واقعہ میں اس عہد کو نہ تو پورا کرنے کا سوال درپیش تھا اور نہ عہد شکنی کا۔ لہٰذہ باری تعالیٰ کا یہ ارشاد جو عالم الغیب والشہادۃ ہے، بے معنیٰ، بے فائدہ اور بے مطلب ہو جاتا ہے۔ لہٰذہ لامحالہ ان آیات کا تعلق آئندہ کے واقعہ شہادت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ہے جو پیش آنے والا تھا اور حق تعالیٰ کو جو عالم الغیب والشہادۃ ہے اس کا پورا پورا علم تھا اور اسی میں یہ صورت حال پیش آئی کہ کچھ حضرات نے اپنے اس عہد کو وفا کیا اور کچھ لوگوں نے عہد کو وفا کرنے میں کمزوری دکھائی۔ کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر عظیم کے مستحق ہوئے اور کچھ کمزوری دکھا کر اس کے نتیجے میں مصیبتوں میں مبتلا ہوئے جس کا وبال اُمت آج تک بھگت رہی ہے۔

بہرحال یہ آیات ایک طرح کی پیشن گوئی ہے جو آنے والے واقعات کی طرف واضح اشارہ کر رہی ہیں ورنہ بیعتِ رضوان کے موقعہ پر یہ تمام آیات بے معنیٰ، بے مصرف اور بے فائدہ قرار پاتی ہیں۔

دوسری پیشن گوئیاں

سورہ فتح ہی میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے واقعہ فاجعہ اور قصاص عثمان کی پیشگوئی کے علاوہ آئندہ پیش آنے والے دیگر واقعات کی طرف بھی واضح اشارات موجود ہیں۔ واقعہ صلح حدیبیہ کے ضمن میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

لَقَدْ رَضِیَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِیْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ عَلَیْهِمْ وَ اَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِیْبًا ﴿۱۸﴾ وَّ مَغَانِمَ كَثِیْرَةً یَّاْخُذُوْنَهَا ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِیْزًا حَكِیْمًا ﴿۱۹﴾ وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِیْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَ كَفَّ اَیْدِیَ النَّاسِ عَنْكُمْ ۚ وَ لِتَكُوْنَ اٰیَةً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ وَ یَهْدِیَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًا ﴿۲۰﴾ وَّ اُخْرٰی لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَیْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرًا ﴿۲۱﴾ (الفتح:۱۸تا۲۱)

"اللہ مومنوں سے راضی ہو چکا ہے۔ جب وہ (اے پیغمبر!) آپ سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے۔ اللہ نے جان لیا جو کچھ ان کے دلوں میں تھا۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے ان پر اپنا سکینہ نازل فرمایا اور انہیں قریبی فتح عطا فرمائی اور بہت سے اموال غنیمت عطا فرمائے جنہیں وہ حاصل کریں گے اور اللہ بڑے غلبہ اور حکمت والا ہے۔ اللہ نے تم سے کثیر اموال غنیمت کا وعدہ فرمایا ہے جنہیں تم حاصل کرو گے۔ یہ اس سے تمہیں جلد ہی دیدیا اور لوگوں کے ہاتھوں کو تم سے روک دیا تاکہ یہ مومنوں کے لیے ایک نشانی بن جائے اور وہ تمہیں سیدھی راہ کی طرف رہنمائی فرما دے اور اللہ نے تم سے ایک دوسری فتح کا بھی وعدہ فرمایا ہوا ہے جس پر تم قادر نہ ہو سکو گے۔ واقعۃً اللہ ہی نے اس کا احاطہ کیا ہوا ہو گا اور اللہ تو ہر چیز پر قدر رکھنے والا ہے۔

ان چار آیات میں متعدد پیشن گوئیاں فرمائی گئی ہیں:

1- پہلی آیت کریمہ (فتح:۱۰) میں بیعت رضوان کا بیان فرمانے کے بعد یہ بتا کر کہ حق تعالیٰ کو خوب معلوم تھا کہ مسلمانوں کے قلوب میں اس وقت کیا کچھ تھا اور یہ کہ حق تعالیٰ نے اس وقت مومنین کے قلوب پر اپنا سکینہ نازل فرمایا تھا پہلی پیشگوئی تو یہ فرمائی گئی ہے کہ ہم نے مسلمانوں کو ایک قریبی فتح عطا فرمائی ہے جس سے مراد متفقہ طور پر فتح مکہ ہے جس پر تمام علمائے مفسرین کا اتفاق ہے۔

2- اسی کے بعد دوسری آیت کریمہ میں ومغانم کثیرۃ یا خذونہا سے مراد فتح مکہ کے بعد فوراً ہی جنگ حنین میں اموال غنیمت کا بکثرت حاصل ہونا مراد ہے۔ یہ دوسری پیشگوئی ہے۔ چنانچہ علامہ شبلی نعمانیؒ اپنی سیرت النبی میں لکھتے ہیں کہ:

”طائف کا محاصرہ چھوڑ کر آپ جعرانہ تشریف لائے۔ غنیمت کا بے شمار ذخیرہ تھا، چھ ہزار اسیرانِ جنگ، چوبیس ہزار اونٹ، چالیس ہزار سے زیادہ بکریاں اور چار ہزار اوقیہ چاندی تھی۔ اسیرانِ جنگ کے متعلق آپ نے انتظار کیا کہ ان کے عزیز و اقارب آئیں تو ان سے گفتگو کی جائے۔ لیکن کئی دن گذرنے پر کوئی نہ آیا۔ غنیمت کے پانچ حصے کئے گئے۔ چار حصہ حسب قاعدہ فوج کو تقسیم کئے، خمس بیت المال اور غرباء و مساکین کے لیے رکھا گیا۔ (سیرت النبی ص ج ۱ ص ۵۴۲ مطبوعہ مطبعہ معارف اعظم گڑھ)

3- تیسری آیت کریمہ میں پھر ارشادِ الٰہی ہے:

وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَ كَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ ۚ وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝۲۰ (الفتح:۲۰)

”یعنی پھر اللہ نے کثیر تعداد میں اموالِ غنیمت کا وعدہ فرمایا ہے تو اللہ نے تمہیں جلد ہی (اسی دنیا میں) یہ اموال عطا فرما دیئے اور لوگوں کے ہاتھوں کو تم سے روک دیا تاکہ مسلمانوں کے لیے یہ ایک نشانی بن جائے اور تمہیں سیدھی راہ کی طرف رہنمائی عطا فرمائی۔

اس آیتِ کریمہ میں یقیناً ان فتوحاتِ عظیمہ اور مغانم کثیرہ کی پیشگوئی فرمائی گئی ہے جو حضرت فاروق اعظمؓ اور حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہما کے دورِ خلافت میں ایران، شام، مصر، افریقہ، خراسان، کابل اور قبرص کے مقامات پر حاصل ہوئیں اور کفار کو ہر مقام پر ہزیمت اٹھانی پڑی۔ وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ ۚ وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ”اور لوگوں کے ہاتھوں کو تم سے روک دیا۔ وہ تم پر فتحیاب نہ ہو سکے اور تاکہ یہ مسلمانوں کے لیے نشانی بن جائے۔“

مزید شہادت

(۴) اس کے بعد چوتھی آیت میں ارشاد الٰہی ہے: وَّ اُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا ؕ یعنی اللہ نے تم سے ایک دوسری فتح کا بھی وعدہ فرمایا ہوا ہے جس پر تم قادر نہ ہو سکو گے۔ اللہ ہی نے اس کا احاطہ کیا ہوا ہو گا۔ سوال یہ ہے کہ وہ دوسری فتح کون سی ہے جس کو حاصل کرنے سے مسلمان قاصر ہوں اور ان کی قوت انہیں اس سے عاجز کر دے اور اللہ کا غیر مرئی ہاتھ ہی کارسازی فرمائے۔ خود مسلمانوں کو (ان کی حکومت کو) اس پر کوئی قدرت نہ رہے۔ پھر اللہ ہی اس کا احاطہ فرمائے اور اللہ ہی اس کا فیصلہ فرمائے۔ وہ کونسی فتح و نصرت ہے جس کی پیشگوئی اس آیت کریمہ میں فرمائی گئی ہے۔

میرا خیال ہے کہ یہ دوسری فتح جس میں یہ صورت پیش آئی کہ مسلمان اسے حاصل کرنے پر قادر نہ ہو سکے اور بے بس ہو کر رہ گئے وہ واقعۂ فاجعہ شہادت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کا فتنۂ کبریٰ ہی تھا۔ ملت اسلامیہ کا خلیفہ جس کے نام سے قیصر و کسریٰ کے جسم پر کپکپی طاری ہو جایا کرتی تھی اسی ملت اسلامیہ کا چوتھا خلیفہ یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ:

”شورش برپا کرنے والے دو ہزار آدمیوں کی جمعیت مدینے میں موجود تھی کہ حضرات طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما چند دوسرے اصحاب کے ساتھ ان سے (حضرت علیؓ سے) ملے اور ان سے کہا کہ ہم نے اقامت حدود کی شرط پر آپ سے بیعت کی ہے۔ آپ ان لوگوں سے قصاص لیجئے جو حضرت عثمانؓ کے قتل میں شریک تھے۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا: ”بھائیو! جو کچھ آپ جانتے ہیں اس سے میں بھی ناواقف نہیں ہوں مگر ان لوگوں کو کیسے پکڑوں جو اس وقت ہم پر قابو یافتہ ہیں نہ کہ ہم ان پر۔ کیا آپ حضرات اس کام کی کوئی گنجائش دیکھ رہے ہیں جسے آپ کرنا چاہتے ہیں؟“ سب نے کہا: ”نہیں“ اس پر حضرت علیؓ نے فرمایا: ”خدا کی قسم میں بھی وہی خیال رکھتا ہوں جو آپ کا ہے۔ ذرا حالات سکون میں آجانے دیجئے تاکہ لوگوں کے حواس برجا ہو جائیں۔ خیالات کی پراگندگی دور ہو اور حقوق حاصل کرنا ممکن ہو جائے۔ (خلافت و ملوکیت مولانا ابو الاعلیٰ مودودی ص ۱۲۷ تا ۱۲۸) (بحوالہ طبرانی ج ۳ ص ۴۵۸، ابن الاثیر ج ۳ ص ۱۰۰ البدایہ والنہایہ ج ۷ ص ۲۲۷ تا ۲۲۸)

میں یہ سمجھتا ہوں کہ وَّ اُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا ؕ سے مراد یہی فتنۂ کبریٰ یعنی شہادت حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ ہے اور اس آیت میں اسی کی پیشگوئی فرمائی گئی ہے۔ ورنہ مجھے بتایا جائے کہ دورِ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی وہ دوسری جنگ اور کونسی ہے جسے اس آیت کریم کا مصداق سمجھا جائے کہ مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ (خلافت) یوں بے بس ہو گئی ہو اور اس کے دفعیہ پر انہیں قدرت نہ رہی ہو، وہ قاتلین و مجرمین کو کیفر کردار تک پہنچانے سے اپنے عجز و قصور کا یوں برملا اعتراف کرے اور حق تعالیٰ کے غیر مرئی ہاتھوں نے خود ہی اس کا احاطہ کر کے ایک ایک مجرم کو فی

النار والسقر کیا ہو۔ مجھے دور صحابہ میں (بلکہ اس کے بعد بھی) دوسری کوئی فتح ایسی نظر نہیں آتی جس کے مقابلہ سے مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ (خلافت) نے یوں اپنی بے بسی کا کھلم کھلا اعتراف کیا ہو اور صحابہ کرام واقعی بے بس ہوگئے ہوں۔ لیکن قدرت الٰہیہ ایک ہودج نشین خاتون خانہ صنف لطیف (صدیقہ کائنات محبوبہ رحمت للعٰلمین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا) سے وہ کام لے لے جس سے بڑے بڑے سورما اور شیر بیشہ اپنے عجز و قصور کا برملا اعتراف کر رہے ہوں۔ لہٰذہ میرے نزدیک یہ آیت کریمہ اسی واقعہ فاجعہ سے متعلق ہے۔

اس سے یہ استدلال کیا جاسکتا ہے کہ قرآن کریم کی ان آیات کا تعلق چونکہ حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کی ہونے والی شہادت کے واقعہ فاجعہ سے ہے۔ اس لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا قصاص لینا نہ صرف قرآن کریم کی آیت کریمہ کتب علیکم القصاص فی القتلی کی نص صریح کے مطابق فرض تھا بلکہ ان آیات کریمہ کا بھی منشا و مدلول تھا۔ لہٰذہ حضرات طلحہ وزبیر وام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم کے موقف کی مزید توثیق و تائید ہوجاتی ہے۔ جزاھم اللہ تعالیٰ خیر الجزاء عن سائر المسلمین والمسلمات

حضرت علیؓ کی پوزیشن

حضرت علی رضی اللہ عنہ طبعاً ایک فوجی سپاہی تھے۔ حرب وضرب ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ بنو ہاشم ویسے بھی عملی سیاست سے ہمیشہ یکسو رہے تھے۔ خانہ کعبہ کی تولیت کی وجہ سے جس پر بنو ہاشم نے قبضہ کرلیا تھا دینی ومذہبی ارکان حج کی ادائیگی کی ذمہ داری اور حرم کی مجاوری کی وجہ سے سیاست ملکی سے ان کا کوئی تعلق باقی نہیں رہا تھا اس لیے فطرۃً حضرت علیؓ ایک کامیاب حکمران نہیں تھے۔ انہیں اجتماعی سیاست نہیں آتی تھی۔ وہ میدانِ جنگ کے ہیرو تھے وہ میدان سیاست کے ہیرو نہیں تھے اور یہ ان کی کوئی منقصت نہیں تھی۔ کیونکہ کوئی شخص بھی بیک وقت تمام میدانوں کا ہیرو نہیں ہوتا اور نہیں ہوسکتا اس لیے سیاسی طور پر ان سے بہت سی فروگزاشتیں ہوئیں جو آگے چل کر ان کے خلاف پڑیں۔ بلکہ ان کے موافقین ومخالفین سب کے نزدیک یہ بھی ایک طے شدہ حقیقت سمجھی جاتی ہے کہ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد حضرت علیؓ اپنے آپ کو خلافت کا مستحق سمجھتے تھے۔ مولانا سید ابو الاعلیٰؒ مودودی جو حضرت علیؓ کی طرف سے سب سے بڑے وکیل صفائی کی پوزیشن اختیار کرچکے ہیں، خلافت وملوکیت میں رقم طراز ہیں کہ:

"سیدنا علیؓ کے متعلق اگر کوئی شخص زیادہ سے زیادہ کچھ کہہ سکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو خلافت کے لیے حق سمجھتے لیکن کسی قابل[1] اعتبار تاریخی روایت سے ان کے متعلق یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ انہوں نے خلافت حاصل کرنے کے لیے کبھی کسی درجہ میں کوئی ادنیٰ سی کوشش بھی کی ہو۔ لہٰذہ ان کا محض اپنے کو احق سمجھنا اس قاعدے کے خلاف قرار نہیں دیا جاسکتا کہ درحقیقت چاروں خلفاء اس معاملہ میں بالکل یکساں تھے کہ ان کی خلافت دی ہوئی خلافت تھی نہ کہ لی ہوئی خلافت۔" (خلافت وملوکیت ص ۱۵۸ مطبوعہ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ لاہور اشاعت اول اکتوبر ۱۹۶۶ء)

بخاری کی یہ مفصل روایات بھی ملاحظہ ہو:

حدثنا یحیی ابن بکیر قال حدثنا اللیث عن عقیل عن ابن شهاب عن عروة عن عائشة ان فاطمة بنت النبی ﷺ ارسلت الی ابی بکر تساله میراثها من رسول الله ﷺ مما افاء الله علیه بالمدینة وفدك و ما بقی من خمس خیبر فقال ابو بکر ان رسول الله ﷺ قال لا نورث ماترکنا صدقة انما یاکل آل محمد فی هذا المال وانی والله لا اغیر شیئاً من صدقة رسول الله ﷺ عن حالها التی کان علیها فی عهد رسول الله ﷺ ولا عملن فیها بما عمل به رسول الله ﷺ فابی ابوبکر رضی الله عنه ان یدفع الی فاطمة منها شیئًا فوجدت فاطمة علی ابی بکر فی ذلك فهجرته فلم تکلمه حتی توفیت وعاشت بعد النبی ﷺ ستة اشهر فلما توفیت دفنها زوجها علی رضی الله عنه لیلا ولم یوذن بها ابوبکر رضی الله عنه وصلی علیها وکان لعلی من الناس وجه حیاة فاطمة رضی الله عنها فلما توفیت استنکر علی رضی الله عنه وجوه الناس فالتمس مصالحة ابی بکر رضی الله عنه ومبایعته ولم یکن یبایع تلك الاشهر فارسل الی ابی بکر رضی الله عنه ان ائتنا ولا یاتنا احد معك کراهیة ان یحضر عمر رضی الله عنه فقال عمر رضی الله عنه والله لا تدخل علیهم وحدك فقال ابوبکر رضی الله عنه وماعسیتم ان یفعلوه بی والله لاتینهم فدخل علیهم ابوبکر رضی الله عنه فتشهد علی رضی الله عنه فقال انا قد عرفنا فضلك

---

(1) مودودی صاحب کا یہ کہنا درست نہیں کیونکہ جن تاریخی کتابوں یعنی تاریخ طبری وطبقات ابن سعد وغیرہ کی روایات پر اعتماد کرتے ہوئے انہوں نے حضرت عثمانؓ، حضرت معاویہؓ، طلحہؓ وزبیرؓ وام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہؓ اور ان کے طرفدار صحابہ کرام مثلاً حضرت مغیرہ بن شعبہؓ وعمرو بن العاصؓ وغیرہ پر الزامات لگائے ہیں، انہی کتابوں میں حضرت علیؓ کے متعلق واضح طور پر یہ بھی موجود ہے کہ حضرت علیؓ حضرت فاطمہؓ کو گدھے پر بٹھا کر انصار کے گھروں کا چکر کاٹتے رہے ہیں اور ان سے یہ اپیلیں کرتے رہے ہیں کہ وہ ابو بکرؓ کی بیعت توڑ کر مجھے خلیفہ بنالیں۔ بلکہ خود مودودی صاحب نے رسائل ومسائل حصہ اول میں حضرت علیؓ کی امیدواری خلافت کے عنوان کے تحت ان روایات کا وجود تسلیم کیا ہے۔

وما اعطاك الله ولم ننفس عليك خيرا ساقه الله اليك ولكنك استبددت علينا بالامر وكنا نرى لقرابتنا من رسول الله ﷺ نصيبا حتى فاضت عينا ابي بكر رضی اللہ عنہ فلما تكلم ابوبكر رضی اللہ عنہ قال والذي نفسي بيده لقرابة رسول الله ﷺ احب الي ان اصل من قرابتي واما الذي شجر بيني وبينكم من هذا الاموال فاني لم آل فيها عن الخير ولم اترك امرا رايت رسول الله ﷺ يصنعه فيها الا صنعته فقال علي رضی اللہ عنہ لابي بكر رضی اللہ عنہ موعدك العشية للبيعة فلما صلى ابو بكر رضی اللہ عنہ الظهر رقي على المنبر فتشهد وذكر شان علي رضی اللہ عنہ وتخلفه عن البيعة وعذره الذي اعتذر اليه ثم استغفر وتشهد علي رضی اللہ عنہ فعظم حق ابي بكر رضی اللہ عنہ وحدث انه لم يحمله على الذي صنع نفاسة على ابي بكر رضی اللہ عنہ ولا انكار للذي فضله الله به ولكنا كنا نرى لنا في هذا الامر نصيبا واستبد علينا فوجدنا في انفسنا فسر بذلك المسلمون وقالوا اصبت وكان المسلمون الى علي رضی اللہ عنہ قريبا حين راجع الامر بالمعروف۔

(صحیح بخاری ج۲ ص۶۰۹ کتاب المغازی باب غزوہ خیبر)

"ہم سے یحییٰ بن بکیر نے اور ان سے لیث نے حدیث بیان کی عن عقیل عن ابن شہاب عن عروہ عن عائشہ رضی اللہ عنہا کہ فاطمہؓ بنت نبی ﷺ نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس پیغام بھیجا اور رسول اللہ ﷺ سے اپنی میراث کا مطالبہ کیا جو اللہ نے آپ کو بطور فئے کے مدینہ منورہ، فدک اور خیبر کے خمس کے بقایا سے عطا فرمایا تھا۔ تو ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ ہمارا کوئی وارث نہیں ہوتا۔ جو کچھ ہم چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔ آل محمدؐ اس مال میں سے کھا سکتی ہے۔ اور میں اللہ کی قسم رسول اللہ کے صدقہ میں سے کسی چیز کو اس حال سے جس پر وہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں تھی کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا اور میں اسی طرح عمل کرتا رہوں گا جیسا کہ رسول اللہ ﷺ عمل فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اس میں سے کچھ بھی حضرت فاطمہؓ کو دینے سے انکار کر دیا۔ اس بارے میں حضرت فاطمہؓ، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے ناراض ہو گئیں چنانچہ انہوں نے حضرت ابو بکر سے قطع تعلق کر لیا اور بول چال بند کر دی حتی کہ ان کا انتقال ہو گیا اور وہ رسول اللہ ﷺ کے بعد چھ مہینے زندہ رہیں۔ تو جب ان کا انتقال ہو گیا تو ان کے شوہر حضرت علیؓ نے رات ہی کو انہیں دفن کر دیا اور ابو بکرؓ کو خبر بھی نہیں دی اور خود ہی جنازہ کی نماز پڑھا دی اور حضرت فاطمہؓ کی زندگی میں لوگوں کی طرف سے حضرت علیؓ کے لیے عزت و حرمت تھی۔ لیکن جب حضرت فاطمہؓ کا انتقال ہو گیا تو حضرت علیؓ نے لوگوں کے چہروں میں کافی تبدیلی محسوس کی۔ چنانچہ انہیں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے صلح کر لینے اور بیعت کر لینے کی خواہش پیدا ہوئی۔ ان تمام (چھ) مہینوں میں انہوں نے بیعت نہیں کی تھی۔ چنانچہ انہوں نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کو پیغام بھیجا کہ آپ ہمارے پاس تشریف لائیے لیکن آپ کے ساتھ کوئی دوسرا نہ آئے۔ وہ حضرت عمرؓ کے آنے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ تو حضرت عمرؓ نے ابو بکر صدیق سے کہا کہ نہیں۔ اللہ کی قسم آپ ان کے ہاں اکیلے نہیں جائیں گے۔ تو حضرت ابو بکرؓ فرمایا۔ تمہیں کیا توقع ہے وہ میرا کیا کر لیں گے؟ اللہ کی قسم میں ان کے ہاں ضرور جاؤں گا۔ چنانچہ ابو بکر رضی اللہ عنہ گئے۔ علیؓ نے خطبہ پڑھا اور کہا ہم آپ کی فضیلت کو اور جو کچھ اللہ نے آپ کو عطا فرمایا ہے خوب جانتے ہیں اور جو بھلائی اللہ نے آپ کو بخشی ہے اس پر ہم آپ سے حسد نہیں کرتے لیکن آپ نے ہمارے خلاف حکومت کے معاملے میں استبداد سے کام لیا ہے۔ ہم سمجھتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کی قرابت کی وجہ سے اس میں ہمارا حصہ ہے۔ چنانچہ ابو بکر رضی اللہ عنہ آبدیدہ ہو گئے۔ جب ابو بکرؓ نے بات کی تو فرمایا کہ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، رسول اللہ ﷺ کی قرابت صلہ رحمی کے لیے مجھے اپنی قرابت سے زیادہ محبوب ہے۔ جو کچھ میرے اور تمہارے درمیان ان اموال کے بارے میں اختلافات پیدا ہوئے تو یقیناً اس بارے میں میں نے نیکی کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ میں نے کسی ایسی بات کو نہیں چھوڑا جسے میں نے رسول اللہ ﷺ کو کرتے دیکھا تھا۔ چنانچہ میں نے ویسا ہی کیا۔ تو علیؓ نے ابو بکر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ بیعت کے لیے آپ سے شام کا وعدہ ہے۔ چنانچہ ابو بکرؓ نے ظہر کی نماز پڑھی تو وہ ممبر پر چڑھے، خطبہ پڑھا اور علیؓ کی بات کو بیان کیا اور بیعت میں پیچھے رہ جانے کا جو عذر انہوں نے بیان کیا تھا اس کا ذکر کیا۔ پھر علیؓ نے استغفار کیا اور خطبہ پڑھا اور ابو بکرؓ کے حق کی عظمت بیان کی اور کہا کہ جو کچھ انہوں نے کیا تھا اس کی وجہ نہ ابو بکر رضی اللہ عنہ سے حسد تھا اور نہ اس برتری کا انکار تھا جو اللہ نے انہیں عطا فرمائی ہے لیکن ہم امر حکومت میں اپنا حصہ اور حق سمجھتے تھے اور انہوں نے ہمارے خلاف استبداد سے کام لیا تو ہم اپنے دلوں میں ان سے ناراض ہو گئے تھے۔ مسلمان اس بات پر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ تم نے بہت اچھا کیا، اس طرح جب حضرت علیؓ نے حق کے مطابق اپنی پہلی روش سے رجوع کر لیا تو مسلمان ان سے پھر قریب ہو گئے۔"

مندرجہ بالا حدیث صحیح بخاری کی ہے۔ اس میں دو باتیں خاص طور پر قابل غور ہیں۔ اول تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا وراثت کا مطالبہ اس زمین کے متعلق جو اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو بطور فئے کے عطا فرمائی تھی۔ مال فئے وہ مال ہوتا ہے جو بغیر کسی جدوجہد کے مملکت کو حاصل ہو جائے آپ کے پاس اپنی کوئی ذاتی جائیداد نہیں تھی۔ جو کچھ تھا وہ مال فئے ہی تھا جو آپ کی تحویل میں تھا اور جس سے آپ اپنے اہل وعیال کی خبر گیری فرماتے تھے اور

عالم عرب کے مختلف علاقوں سے جو وفود آتے تھے ان کی میزبانی فرماتے تھے۔ نیز ضرورت مندوں کی حاجت روائی میں بھی اسی فنڈ سے خرچ کیا کرتے تھے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے جواب میں ارشاد نبوی پیش کیا کہ لانورث ماترکنا صدقة "ہمارے ترکہ میں وراثت جاری نہیں ہوتی۔ ہم جو کچھ چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔" لیکن حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بجائے اس ارشاد نبوی کا قائل ہونے یا اس کا انکار کرنے کے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے ناراض ہوگئیں اور ان سے قطع تعلق کرلیا اور بول چال بند کردی۔ اگر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اس کے خلاف کوئی ارشاد نبوی پیش فرماتیں یا حضرت صدیق اکبرؓ کی تکذیب ہی فرمادیتیں تو ان کا موقف قابل فہم ہوتا۔

مال فئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی ملکیت نہیں تھا۔ وہ مملکت کی ملکیت تھا البتہ سربراہ مملکت ہونے کی حیثیت سے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تحویل میں تھا۔ لہٰذہ اس میں وراثت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے خلیفہ اور جانشین کی تحویل میں جانا چاہیے تھا۔[1]

دوسری بات جو انتہائی حیرتناک ہے وہ یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے اور پھر مسجد نبوی میں مجمع عام کے اندر تمام صحابہ کے سامنے خلافت پر برملا اپنا حق جتا رہے ہیں جس کی وجہ قرابت نبوی بتا رہے ہیں۔ لکناك استبددت علینا بالامر وکنا نری لقرابتنا من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نصیبا "لیکن آپ نے ہمارے خلاف حکومت کے معاملہ میں استبداد سے کام لیا ہے اور ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت کی وجہ سے اس میں اپنا حصہ سمجھتے تھے (اور لکنا کنا نری فی ھذا الامر نصیبا واستبد علینا "ہم اس امر حکومت میں اپنا حصہ سمجھتے تھے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ہمارے خلاف استبداد سے کام لیا ہے" یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت کی بناء پر ہم اپنے آپ کو حکومت کا حقدار سمجھتے تھے۔ گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری عمر جو جدوجہد فرمائی تھی وہ معاذاللہ اپنے خاندان کی حکومت قائم کرنے کے لیے فرمائی تھی۔ رسالت اور نبوت کا تو محض ایک ڈھونگ تھا ورنہ آپ بھی (خاکم بدھن) ایک دنیادار سیاست داں تھے جو اپنی اور اپنے خاندان کی سیادت قائم کرنے کے لیے اٹھے تھے۔

حضرات انبیاء کرام جب کسی قوم کی طرف اس کی ہدایت کے لیے مبعوث کئے جاتے ہیں تو وہ قوم سے کسی اجر یا صلے کے طلبگار نہیں ہوتے۔ ان کی ساری تگ وتاز بلامزد معاوضہ ہوا کرتی ہے۔ ان کا اجر ان کو حق تعالیٰ کے ہاں سے ملتا ہے۔ وہ اپنے خاندان یا اپنی ذات کے لیے کسی شرف وفضیلت کے خواستگار نہیں ہوا کرتے۔ وہ حق تعالیٰ کی طرف سے رسول بن کر اس لیے نہیں آتے کہ اپنے لیے یا اپنے خاندان کیلیے بادشاہت حاصل کرلیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حق تعالیٰ نے بار بار یہ اعلان کرایا ہے کہ میں اپنی اس خدمت (ہدایت ورہنمائی) کا کوئی معاوضہ یا صلہ تم سے نہیں مانگتا۔ میرا اجر میرا پروردگار ہی مجھے دے گا۔ چنانچہ سورہ سبا میں ہے:۔

قُلۡ مَا سَاَلۡتُکُمۡ مِّنۡ اَجۡرٍ فَہُوَ لَکُمۡ ؕ اِنۡ اَجۡرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ ۚ وَ ہُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ شَہِیۡدٌ ﴿۴۷﴾ (السباء:۴۷)

(اے پیغمبر اسلام!) کہہ دیجئے کہ اگر میں نے تم سے (اپنی اس خدمت کا) کوئی صلہ مانگا ہو تو وہ تم اپنے پاس ہی رکھو (مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں) میرا صلہ تو صرف اللہ کے ذمہ ہے (میں صرف اسی سے لونگا) اور وہ ہر چیز پر گواہ ہے (چنانچہ اپنی اس بات پر بھی میں اسی کو گواہ بناتا ہو)۔

یہ اعلان اور بھی کئی جگہ کرایا گیا ہے۔ چنانچہ سورہ انعام (۹۰)، سورہ یوسف (۱۰۴)، سورہ فرقان (۵۷)، سورہ ص (۸۶)، سورہ طور (۴۰)، سورہ قلم (۴۶)۔ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی اعلانات کرائے گئے ہیں۔ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے نہیں بلکہ مختلف انبیاء کرام کے انہی اعلانات کو قرآن کریم نے بار بار نقل فرمایا ہے چنانچہ حضرت ہود علیہ السلام کا یہی اعلان سورہ ہود میں (۱۱) اور سورہ شعراء میں (۱۲۷) موجود ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کا یہی اعلان سورہ یونس (۷۲) اور سورہشعراء (۱۰۹) میں مذکور ہے۔ حضرت صالح علیہ السلام کا یہی اعلان سورہ شعراء (۱۴۵) میں اور حضرت لوط علیہ السلام کا یہی اعلان سورہ شعراء (۱۶۴) اور حضرت شعیب علیہ السلام کا یہی اعلان سورہ شعراء (۱۸۰) میں موجود ہے۔

ایک سنہری اصول

اللہ تعالیٰ نے جب اہل انطاکیہ کے پاس پیغام اسلام کے لیے یکے بعد دیگرے تین مستقل انبیاء کرام، حضرت یحییٰ علیہ السلام، حضرت یونس علیہ السلام اور

(1) برٹش قانون میں بھی جو آزادی سے پہلے ہندوستان میں رائج تھا (اور آج تک ہندوپاکستان مین رائج ہے (گورنر جنرل کو کسی جدوجہد کے بغیر تحائف کی شکل میں جو کچھ حاصل ہوتا تھا وہ حکومت ہی کی ملکیت ہوتا تھا اور خزانہ عامرہ میں جمع کردینا پڑتا تھا۔ چنانچہ مختلف ریاستوں کی طرف سے جو تحائف گورنر جنرل کو پیش کئے جاتے تھے ان کے سلسلہ میں نوابوں اور راجاؤں نے گورنر جنرل کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے یہ طریقہ اپنایا تھا کہ وہ تحائف گورنر جنرل کو پیش کرنے کے بجائے ان کی بیگم کو پیش کرنے لگے تھے۔ بہرحال یہ اصول برطانوی حکومت نے اسلام ہی کے اس اصول سے اخذ کیا ہے۔ حیرت ہے کہ جو بات غیر مسلم مغربی حکمرانوں کو سمجھ میں آگئی وہ بنت رسول اکرم حضرت فاطمۃ زہراء رضی اللہ عنہا کی سمجھ میں نہیں آسکی۔

بسوخت عقل زحیرت

حضرت شمعون علیہ السلام کو بھیجا اور اہل انطاکیہ نے ان تینوں انبیاء کا انکار کر دیا تو اقصائے شہر سے ایک مرد مومن نے انہیں آ کر نصیحت کی تو اس کے الفاظ بھی یہی تھے:

وَ جَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى قَالَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۰﴾ اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا وَّ هُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۲۱﴾

(یاسین ۲۰ تا ۲۲)

"اور اقصائے شہر سے ایک آدمی (مرد مومن) دوڑتا ہوا آیا۔ اس نے کہا۔ اے میری قوم! ان رسولوں کی پیروی کرو۔ ان لوگوں کی پیروی کرو جو تم سے کوئی صلہ نہیں مانگتے اور واقعی ہدایت یافتہ ہیں۔"

اس آیت کریمہ میں ایک سنہری اصول بیان فرما دیا گیا ہے کہ اتباع تو صرف ان کا کرنا چاہیے جو تم سے کسی صلے یا معاوضے کے طلب گار نہ ہوں۔ یعنی وہ پیشہ ور لیڈر یا پیشہ ور مصلح نہیں ہوں۔ بلکہ واقعی ہدایت یافتہ لوگ ہوں گے اگر وہ کسی صلے یا معاوضے کے طلبگار ہوتے تو اس کے یہ معنی ہوتے کہ وہ پیشہ ور لیڈر ہیں جو کسی اپنے ذاتی مفاد و منفعت کے لیے اپنی لیڈری کی دوکان چمکا رہے ہیں لیکن وہ ایسے نہیں ہیں۔ وہ تو اللہ کی طرف سے ہدایت یافتہ لوگ ہیں جو تم سے کسی صلے یا معاوضے کے طلب گار نہیں اور محض لوجہ اللہ تمہیں ہدایت دینا چاہتے ہیں۔ تم ان کا انکار کیوں کرتے ہو۔

بہر حال انبیاء کرام کبھی بھی اپنی یا اپنے خاندان کی سیادت و امارت قائم کرنے کے لیے نہیں آیا کرتے۔ صحیح بخاری کی اس روایت سے جو ثابت ہو رہا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ معاذ اللہ قرابت نبوی کی وجہ سے اپنے آپ کو خلافت کا حق دار سمجھے ہوئے تھے قرآنی تصریحات کے خلاف ہے۔ میں بارہا (فقہ القرآن کی چاروں سابقہ جلدوں میں) متنبہ کرتا آرہا ہوں کہ امام ابن شہاب زہریؒ پر شیعیت کا شبہ کیا جاتا رہا ہے اور شیعی اسماء رجال کی کتابوں نے ان کی شیعیت کا بھانڈا اچھی طرح پھوڑ دیا ہے۔ صحیح بخاری کی اس روایت میں بھی (سند میں نے دیدی ہے) یہی بزرگ تشریف فرما ہیں چونکہ شیعی نقطۂ نظر یہی ہے کہ خلافت حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حق تھا اور حضرات خلفائے ثلثہ معاذ اللہ غاصبانِ خلافت تھے اس لیے ہم اس روایت کو تسلیم نہیں کر سکتے۔ لیکن اس سے یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ ابن السوداء یعنی عبد اللہ بن سبا یہودی نے جو تحریک چلائی تھی اس کے ماتحت نو مسلمین عجم کے دماغوں میں یہ بات اچھی طرح پرورش پا چکی تھی اب تک جو کچھ ہوتا آرہا ہے وہ غلط ہے اور جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وصی حضرت ہارون علیہ السلام تھے اور انہی کا خاندان یہودیوں میں شاہی خاندان تھا ایسے ہی آنحضرت ﷺ کے وصی حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے اور ان کا اور ان کے خاندان ہی کا حق ہے کہ وہ حکومت کریں۔

سوچنے کی بات ہے کہ اگر ان روایات کو تسلیم کر لیا جائے کہ حضرت علیؓ اپنے آپ کو خلافت کے لیے دوسروں کے مقابلے میں احق سمجھتے تھے کیونکہ آپ حضور اکرم ﷺ کے چچازاد بھائی اور داماد تھے تو اس کا حاصل یہی نکلتا ہے کہ حضرت علیؓ معاذ اللہ خلافت کو محض خاندانی مسئلہ سمجھے ہوئے تھے انتخابی یا شورائی مسئلہ نہیں سمجھتے تھے۔ تو کیا یہ مان لیا جائے کہ حضرت علیؓ نے قرآن کریم کے صریحی حکم وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (شوریٰ:۳۸) کو سمجھا ہی نہیں تھا۔ اگر انہوں نے اس صریحی حکم کے ماله و ماعلیه کو اچھی طرح سمجھ لیا ہوتا تو وہ خلافت کو خاندانی مسئلہ (جسے مولانا مودودیؒ نے ملوکیت قرار دیا ہے) کیسے قرار دے سکتے تھے تو کیا قرآن کریم کو معاذ اللہ ثم معاذ اللہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اتنا بھی نہیں سمجھتے تھے جتنا ہمارے دور کے ایک عالم مولانا ابو الاعلیٰ مودودیؒ سمجھ رہے ہیں۔ پھر تو (خاکم بدہن) حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عقل و فہم اور بصیرت، مولانا مودودی اور ہماری عقل و فہم اور بصیرت سے بھی گئی گزری ثابت ہوئی!

سبائی تحریک

شہادت حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کے سلسلہ میں جو لوگ ملوث رہے ان کا پس منظر سمجھنے کے لیے ہمیں سبائی تحریک کی تاریخ سامنے رکھنی ہو گی جس کا مرکز یمن کے یہودی تھے۔

یہودیوں کی فطرت میں خود سری، احساس برتری اور نسلی غرور کے جراثیم ہر شخص دیکھ سکتا ہے۔ قرآن مجید اور بائبل میں ان کی جو تاریخ بیان کی گئی ہے وہ اس کا واضح ثبوت ہے۔ خود آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں مدینہ اور خیبر وغیرہ کے یہودیوں نے جو طرز عمل اختیار کیا، جنگ احد اور جنگ خندق میں وہ جس طرح مشرکین عرب کو مسلمانوں کے خلاف ورغلا کر لائے وہ بھی اس کی تائید کرتا ہے۔ یہاں آنحضرت ﷺ سے شکست کھا کر انہوں نے دوسرا محاذ کھولا اور وہ تھا عربوں کو صوبائی بنیاد پر باہم لڑانے کا۔ تاریخ عرب سے جن حضرات کو دلچسپی ہے وہ جانتے ہیں کہ مدینہ اور خیبر کے علاوہ عرب میں یہودیوں کا دوسرا بڑا مرکز یمن تھا، جہاں کی تجارت پر یہودی چھائے ہوئے تھے۔ یمن کے عرب قحطانی کہلاتے ہیں اور حجاز (جہاں مکہ اور مدینہ واقع ہیں) کے عرب عدنانی۔ دونوں ایک دوسرے کو حریفانہ نگاہوں سے دیکھنے کے عادی رہے ہیں۔ اصحابِ فیل کا واقعہ بھی اسی حریفانہ چشمک کا مظہر تھا۔ کیونکہ یمن کے حکمراں، ابراہہ نے خانہ کعبہ کی مرکزیت اور اہمیت کو ختم کرنے اور حجازی عربوں کو زک پہنچانے کی خاطر یمن کے دارالسلطنت، صنعاء میں ایک معبد تیار کیا تھا، جس کی اپنے مذہبی جوش میں ایک

حجازی عرب نے توہین کر دی۔ اس کا بدلہ لینے اور کعبہ کو ڈھانے کے عزم سے ابرہہ مکہ معظمہ پر حملہ آور ہوا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اسے ناکام و نامراد کیا، سورہ فیل میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔

بہر حال عربوں کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر، اپنی مدینہ اور خیبر کی شکستوں کا بدلہ لینے کے لیے یمن کے یہودیوں نے دو کام شروع کئے۔ ایک تو عربوں کی اسی علاقائی عصبیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں تین جھوٹے نبیوں کو لا کھڑا کیا۔ جن میں سب سے زیادہ شہرت مُسَیلمہ کذاب نے حاصل کی۔ اس کے متبعین کا جو فہیم طبقہ تھا وہ فی الحقیقت اسے نبی نہیں مانتا تھا۔ مگر وہ کہتے تھے کہ اپنے علاقہ کا جھوٹا نبی ہمیں حجاز کے سچے نبی سے زیادہ محبوب ہے۔ (طبری، ذکر مسیلمہ)

یہی وہ فتنہ ارتداد ہے جس کے خلاف کوئی عملی کارروائی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مرض الموت کی وجہ سے نہ کر سکے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے جانشین حضرت صدیق اکبرؓ نے پورے عزم و جرأت سے اس فتنہ کا قلع قمع کیا اور اس فتنہ کی پشت پناہ ایرانی شہنشاہیت اور رومن ایمپائر کے سامنے بھی ڈٹ گئے۔ اللہ نے ان کے عزم و حوصلے اور جرأت ایمانی کے نتیجہ میں وہی شاندار کامیابیاں عطا فرمائیں جن کی بنیاد پر حضرت عمر فاروق اعظمؓ اور ذوالنورین حضرت عثمان غنیؓ نے خلافت اسلامیہ کی وہ عظیم و جلیل عمارت تعمیر کی جس کی کوئی مثال تاریخ انسانیت میں نظر نہیں آتی۔

شہادت فاروق اعظمؓ

دشمنان اسلام کی یہ چالیں جو عہد نبوی کے آخر میں مدعیانِ نبوت کے پیکر میں ظاہر ہوئی تھیں اور جن کا خاتمہ حضرت صدیق اکبرؓ نے اپنے عہد مبارک میں کیا، انہی چالوں کا ایک اور مظہر فاروق اعظمؓ کی شہادت تھی جس میں یہودیوں کا مذہبی پیشوا کعب الاحبار، ایران کی قریب المرگ شہنشاہیت کے نمائندے ہرمُزان اور ابولؤلؤ فیروز اور عیسائی رومی سلطنت کا نمائندہ جفینہ شامل تھے۔ ان کی اس چال کا مقصد واضح تھا کہ اسلام کی مرکزی شخصیت کو اچانک ختم کر کے افرا تفری پیدا کر دی جائے اور جگہ جگہ بغاوتوں کی آگ بھڑکا کے مشرق میں ایرانی شہنشاہیت کو نئے سرے سے ابھرنے کا موقعہ فراہم کیا جائے اور مغرب میں رومن ایمپائر کو دنیائے اسلام پر کاری ضرب لگانے اور اپنے مفتوحہ علاقے واپس لینے کا موقع فراہم کیا جائے لیکن دشمنانِ اسلام کی بدقسمتی سے حضرت فاروق اعظمؓ نہایت سخت جان ثابت ہوئے اور اس خطرناک حملے اور تمام خون نکل جانے کے باوجود وہ اپنی قوت ارادی کے بل بوتے پر کئی دن زندہ رہے اور ریاست کے تمام اہم معاملات کو نمٹا کر یکم محرم الحرام کو منصب شہادت پر فائز ہوئے اور اس طرح مرتے مرتے بھی دشمنانِ اسلام کی سازشوں کو خاک میں ملا گئے۔

عہد عثمانیؓ

یہ اسلام اور مسلمانوں کی خوش قسمتی تھی کہ حضرت فاروق اعظمؓ کے بعد عثمان غنیؓ جیسے مدبر نے زمامِ حکومت سنبھالی جس نے شہادت حضرت فاروق اعظمؓ کے بعد ملّت اسلامیہ کو بھنور میں ڈوبنے سے بچایا اور قافلۂ اسلام کے شہسوار کرہ ارض کے بحر و بر پر اسی شان و عظمت سے پھر اپنے پھریرے اڑانے لگے جس طرح وہ عہد نبوی اور عہد صدیقی و فاروقی میں پرچم اسلام کو بلند کئے ہوئے تھے۔

دارالمصنفین اعظم گڑھ کے مورخ حاجی معین الدین ندوی مرحوم اپنی کتاب "خلفائے راشدین" میں، "عثمانی کارنامے" کے عنوان کے تحت حضرت غنیؓ کی اس عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"اس میں شک نہیں کہ حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنے حسن تدبیر اور غیر معمولی سیاسی قوتِ عمل سے روم و ایران کے دفتر الٹ دیئے اور ان کی دولت و مملکت زندانِ توحید کا ورثہ بن گئی۔ ایران کا بیشتر حصہ مسخر ہو گیا۔ شام، مصر، الجزائر نے بھی سپر ڈال دی لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ فاتح قوم کا ایک ہی سیلاب، مفتوح اقوام کے احساس خودی کو فنا کر دے؟ اور کیا تاریخ کوئی ایسی مثال پیش کر سکتی ہے کہ ایک ہی شکست نے کسی قوم کی حریت و آزادی کے جذبہ کو معدوم کر دیا ہو؟ اور اس کے قوائے عملی بے کار ہو گئے ہوں؟ سکندر نے تمام دنیا کو مسخر کر لیا لیکن اس کے جانشینوں نے کتنے دنوں تک حکومت قائم رکھی؟ چنگیز و تیمور نے بھی عالم کو تہ و بالا کر دیا۔ لیکن ان کی فتوحات کیوں نقش بر آب ثابت ہوئیں؟ درحقیقت یہ ایک تاریخی نکتہ ہے کہ جب اولوالعزم فاتح کا جانشین ویسا ہی اولوالعزم اور عالی حوصلہ نہیں ہوتا تو اس کی فتوحات اس تماشا گاہِ عالم میں صرف ایک وقتی نمائش ہوتی ہیں۔ اس بناء پر جانشین حضرت فاروق اعظمؓ کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ممالک مفتوحہ میں حکومت و سلطنت کی بنیاد مستحکم کی اور مفتوحہ اقوام کے جذبۂ خود سری کو رفتہ رفتہ اپنے حُسنِ تدبیر اور حسنِ عمل سے اس طرح ختم کیا کہ آئندہ مسلمانوں کی باہمی کشمکش کے موقعوں میں بھی انہیں سر تابی کی ہمت نہ ہوئی۔"

تم نے فتوحات کے سلسلہ میں پڑھا ہو گا کہ حضرت عثمانؓ کو نہایت کثرت کے ساتھ بغاوتیں فرو کرنا پڑیں، مصر میں بغاوت ہوئی، اہل آرمینیہ اور آذربائیجان نے خراج دینا بند کر دیا، اہل خراسان نے سرکشی اختیار کی۔ یہ تمام بغاوتیں درحقیقت اسی جذبہ کا نتیجہ تھیں جو مفتوح ہونے کے بعد بھی اقوام

کے جذبۂ آزادی کو برانگیختہ کرتا رہتا ہے۔ لیکن حضرت عثمانؓ نے تمام بغاوتوں کو نہایت دانائی کے ساتھ فرو کیا اور آہستہ آہستہ لطف و شدت کی ملی جلی حکمت عملی سے مفتوحہ ممالک کی عام رعایا کو اطاعت وانقیاد پر مجبور کر دیا(ص۲۳۸) صرف یہ بغاوتیں ہی فرو نہیں کی گئیں بلکہ فتوحات کا دائرہ بھی مزید وسیع ہوا۔

عثمانی فتوحات کی وسعت

عہد عثمانی میں ممالک محروسہ کا دائرہ بھی نہایت وسیع ہوا۔ افریقہ میں مراکش تک کا علاقہ مفتوح ہوا۔ ایران کی فتح تکمیل کو پہنچی۔ ایران کے متصلہ ملکوں میں افغانستان اور ترکستان کا ایک حصہ زیر نگیں ہوا۔ دوسری جانب اسلامی سرحد کوہ قاف تک پھیل گئی۔ اسی طرح ایشیائے کوچک کا ایک وسیع خطہ ملک شام میں شامل کر لیا گیا۔ (ص۲۳۹)

ایرانی شہنشاہیت کے خاتمہ کے بعد مسلمانوں کی سب سے بڑی دشمن رومن ایمپائر تھی جس کے تمام افریقی علاقے مسلمانوں نے اس سے آزاد کرا لیے تھے اور جس کی وجہ سے وہ ادھ مرے سانپ کی طرح نہایت پیچ و تاب کے عالم میں تھی۔ اور اپنی طاقتور بحریہ کے ذریعہ مسلمانوں کے ساحلی علاقوں پر مسلسل حملے کرتی رہتی تھی۔ حضرت عثمان غنیؓ نے امیر معاویہؓ کو امیر البحر بنا کر اس کے مقابلے کے لیے روانہ کیا۔ مسلمانوں نے حضرت معاویہؓ کی غیر معمولی قیادت میں قیصر روم کے بحری بیڑے کو جو پانچ سو جنگی جہازوں پر مشتمل تھا ایسی فاش شکست دی کہ پھر رومیوں کو اس جرأت کے ساتھ حملے کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ نہ صرف یہ بلکہ اسلام کے سب سے پہلے امیر البحر حضرت امیر معاویہؓ نے آگے بڑھ کر جزیرہ قبرص کو جو رومن ایمپائر کا سب سے بڑا بحری اڈہ تھا ان سے چھین کر اسلامی بحریہ کا مرکز بنا لیا۔ (طبری، عہد عثمان غنیؓ)

خلافت عثمانی میں قانون کی عظمت

عہد عثمانی میں اسلامی قانون کی عظمت و بالاتری کا یہ عالم تھا کہ حضرت عمرؓ کے قاتل ابولؤلؤ نے جن لوگوں (ہرمزان وجفینہ وغیرہ) کے ساتھ مل کر سازش تیار کی تھی، اس کے متعلق باوجودیکہ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ اور حضرت عبدالرحمن بن ابی بکرؓ کی شہادتیں مل گئی تھیں مگر چونکہ سرکاری طور پر ابھی اس کی تفتیش و تحقیق نہیں ہوئی تھی اور حضرت عمرؓ کے صاحبزادے عبیداللہ بن عمرؓ نے قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر حالت غضب میں ان دونوں کو ان کے گھروں پر جا کر قتل کر دیا تھا۔ حضرت عثمان غنیؓ نے خلیفہ ہوتے ہی عبیداللہ بن عمرؓ سے باز پرس کی۔ اس کی تفصیل ہرمزان کے بیٹے قماذبان کی زبانی سنیئے۔ وہ کہتا ہے:

"اہل عجم مدینہ میں ایک دوسرے سے ملتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ ابولؤلؤ فیروز میرے والد کے پاس سے گذرا۔ اس کے ہاتھ میں دو دھاری خنجر تھا۔ میرے والد نے اسے پکڑا اور پوچھا: تم اس ملک میں اس کا کیا کرو گے؟ وہ بولا: "میں اسے استعمال کروں گا" ایک آدمی نے اسے اس حال میں میرے والد سے باتیں کرتے دیکھا تھا۔ جب حضرت عمرؓ پر حملہ ہوا تو اس شخص نے کہا: "میں نے اس قاتل کو ہرمزان کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس نے یہ خنجر قاتل کو دیا تھا۔" لہٰذہ عبیداللہ بن عمرؓ نے آکر میرے والد کو قتل کر دیا۔ جب حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے مجھے بلایا اور مجھے عبیداللہ ابن عمرؓ کا مختار بنا دیا اور فرمایا: "بیٹے! یہ تمہارے باپ کا قاتل ہے اور تم ہم سے زیادہ اس کو قتل کرنے کا حق رکھتے ہو۔ جاؤ اور اسے قتل کر دو۔" اس کے بعد میں عبیداللہ ابن عمرؓ کو اپنے ساتھ قتل کے لیے لے چلا۔ اس وقت اہل مدینہ کا ہر شخص میرے ساتھ تھا۔ مگر وہ سب مجھ سے اس کے بارے میں سفارش کر رہے تھے کہ میں اسے چھوڑ دوں اور دیت (خون بہا) قبول کر لوں۔ میں نے ان سے پوچھا: "کیا میں اسے قتل کرنے کا حق رکھتا ہوں یا نہیں؟" وہ بولے: "ہاں حق رکھتے ہو" اور عبیداللہ بن عمرؓ کو برا بھلا کہا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ: "کیا تم اسے قتل کرنے سے منع کرتے ہو؟" وہ بولے "نہیں" انہوں نے پھر عبیداللہ بن عمر کو برا بھلا کہا لہٰذہ میں نے اپنے خدا کی خوشنودی کے واسطے اسے چھوڑ دیا اور ان لوگوں (مسلمانوں) کی خاطر میں نے اسے رہا کر دیا، اس کے بعد انہوں نے مجھے اوپر اٹھا لیا۔ بخدا میں لوگوں کے سروں اور ان کے ہاتھوں پر سوار ہو کر گھر پہنچا۔

(تاریخ طبری حصہ سوم ترجمہ اردو ص۳۱۷ مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی)

اس کے باوجود حضرت عثمانؓ نے مسلمانوں کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے یہ حکم دیا کہ مقتول کی دیت ادا کی جائے اور پھر اپنی جیب خاص سے ان کی دیت ادا کی۔ (تاریخ طبری حصہ سوم ص۳۱۱)

بہر حال یہ تھے ذوالنورین حضرت عثمان غنیؓ جو فاروق اعظمؓ کے ہر طرح صحیح جانشین ثابت ہوئے اور تاریخ اسلام میں جنہوں نے کتنے ہی سنہری ابواب کا اضافہ کیا۔

حضرت عثمانؓ کے خلاف تحریک

دشمنانِ اسلام نے یہ صورت سامنے پاکر اور اپنی تمناؤں اور آرزوؤں کا خون ہوتے دیکھ کر اپنی حکمت عملی میں پھر تبدیلی کی اور مدعیانِ نبوت کی چال کے بعد خلیفۂ اسلام کو اچانک قتل کرنے کی سازش میں بھی ناکامی کا سامنا کر کے اب تیسری پلاننگ کی۔ اور وہ یہ کہ بظاہر اسلام قبول

کر کے خود حجازی مسلمانوں میں جن میں اسلام نے جنم لیا اور پھلا پھولا، نسلی عصبیت کو ہوا دی جائے اور بنو ہاشم کو بھڑ کایا جائے کہ تمام دنیا کے اصول اور طریقہ کے مطابق بنو ہاشم شاہی خاندان ہے اور ان میں بھی خصوصاً حضرت علیؓ جو سربراہِ ریاست (حضرت محمد) کے چچازاد بھائی اور داماد ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں بچپن سے پالا ہے اور اس سے بھی پہلے ان کے والد ابو طالب (جن کا اصل نام عبد مناف تھا یعنی مناف بت کے پجاری، مگر اپنے بڑے بیٹے طالب کی وجہ سے ابو طالب کہلائے) عربوں کے مقدس مقام کعبہ کے پروہت تھے۔ لہٰذا رسول اللہ کے بعد آپ کی خلافت کے اصل مستحق علیؓ اور ان کی اولاد ہے۔

یہودیوں کی خفیہ تنظیم

یہودیوں کی خفیہ تنظیمیں عہد قدیم سے سرگرم عمل رہی ہیں ان کا ہمیشہ یہی کام رہا ہے کہ جن قوموں سے انہیں خطرہ ہو ان میں گھس کر ان کے عقائد و مزعومات کو تباہ کریں، انہیں آپس میں لڑائیں اور ان قوموں کو تباہ و برباد کر دیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے زمانہ سے بلکہ اس سے بھی پہلے ان کے ہاں اس قسم کی خفیہ تنظیموں کا سراغ ملتا ہے۔ قدیم زمانہ میں اس کا نام "القوۃ الخفیہ" تھا اور آج کل اس کا نام "فری میسنزی" یا "فری میسن" تحریک ہے۔ مسیح سے قبل ان کی ان خفیہ تحریکات کا حال معلوم کرنا ہو تو عہد نامہ عتیق (بائبل) کی کتاب "سفر حزقیال" کی انیسویں (۱۹) فصل ملاحظہ ہو حضرت مسیح کی آمد کے بعد ایک دشمن مسیح یہودی پال نے مسیحیت کو جس طرح مسخ کر کے تباہ کی اس کی تفصیلات کے لیے ڈاکٹر احسان الحق رانا کی کتاب "یہودیت و مسیحت" ملاحظہ ہو۔[1]

فری میسنزی تحریک اپنی نئی شکل میں عصر حاضر ہی میں ظاہر ہوئی ہے۔ اس سے قبل یہ القوۃ الخفیہ (خفیہ طاقت) کے نام سے بعثت اسلام کے وقت سے کام کر رہی ہے (اس زمانے میں اس کا مرکز یمن تھا) اور تمام خلافتوں اور اسلام سے خارج فرقوں کے نشو و نما پانے کے زمانوں میں اس کی ہم عصر رہی ہے۔ (ملاحظہ ہو کتاب الردہ محمد کاظم حبیب دمشقی مطبوعہ مکتبہ علمیہ لاہور)

جس طرح اس "خفیہ طاقت" نے خلافت عباسیہ کے دارالخلافہ بغداد کے سقوط پر ۶۵۶ھ میں خوشیاں منائی تھیں۔ اسی طرح ۱۹۰۷ء میں فری میسنزی نے عثمانی خلافت کے دارالخلافہ استنبول کے سقوط پر مسرت کے شادیانے بجائے تھے۔ (حوالہ بالا)

اگر دیکھا جائے تو فری میسنزی تمام خفیہ تنظیموں میں سب سے قدیم ہے۔ یہ "خفیہ قوت" کی بدلی ہوئی دوسری صورت ہے جو بیس صدیوں سے یعنی آغاز مسیحیت سے اندر ہی اندر اپنا کام کر رہی ہے۔ صیہونیت فری میسنزی کو فکری غذا مہیا کرتی ہے اور اس کے ارکان وہ یہود ہیں جو فری میسنزی کے مدارج میں سے ۳۰ سے اوپر مدارج طے کر چکے ہیں۔

اس تنظیم نے اپنے ہاتھ پاؤں اتنے پھیلا لیے ہیں کہ اب اس تنظیم کے دروازے مسلمانوں، مسیحیوں، مجوس، یہود اور مشرکین کے لیے یکساں کھلے ہوئے ہیں اور اس کی شاخیں دنیا کے تمام ممالک میں قائم ہیں اور وہ سیاست کا مرکز بنی ہوئی ہیں جہاں بڑے اہم امور کے حتمی فیصلے کئے جاتے ہیں۔ جہاں بادشاہوں، اور ملکوں کے سربراہوں کے عزل و نصب اور زوال و بقا کے فیصلے ہوتے ہیں۔ جہاں تباہ کن سازشوں اور خفیہ تحریکوں، اجتماعی اور سیاسی انقلابات اور ہنگاموں کے منصوبے بنائے جاتے ہیں۔ لہٰذہ یہ تنظیم سازشیں تیار کرنے اور انقلابات کے منصوبے بنانے کا مطبخ اور اخلاق کا مقبرہ ہے۔

جو لوگ اس تحریک کے ممبر بن جاتے ہیں سب سے پہلے ان کے ذہن نشین یہ بات کرائی جاتی ہے کہ دین اللہ کے لیے ہے اور وطن سب کے لیے۔ پھر یہ کہ یہود و نصاریٰ اور مجوس و مسلمان انسانیت، وطنیت اور قومیت کی رو سے بھائی بھائی ہیں۔ پھر ان پر یہ انکشاف کیا جاتا ہے کہ اگر انبیاء گمراہ کرنے والے رسول نہ ہوتے تو سب لوگ ایک امت ہوتے۔ ان میں دین و مذہب کی کوئی تفریق نہ ہوتی۔ نہ پیرو مرشد ہوتے نہ پادری۔ پھر وہ اپنے مقصد کی صراحت ان الفاظ میں کرتے ہیں۔ ہماری غرض و غایت مذہب کا وجود مٹا دینا ہے (۱۹۰۰ء کی عالمی فری میسنزی کانفرنس کی روداد) اور مذہب سے ان کی مراد یہودی مذہب نہیں ہے بلکہ یہودیت کے علاوہ دیگر تمام مذاہب ہیں۔ پھر یہ سبق پڑھاتے ہیں کہ "عنقریب اللہ کے سوا مقصود و مطلوب صرف انسانیت ہی ہو جائے گا۔" (مشرقی فرانس کی عظیم کانفرنس کی روداد ۱۹۱۳ء) اور ان ارکان پر لازم ہے کہ وہ معاشرے میں فساد اور لوگوں کے اخلاق میں بگاڑ پیدا کرنے کی سعی کریں، اور ان کے جماعتی نظم کا شیرازہ بکھیر دیں، اس ہدایت کے تحت کہ "لوگوں میں ایسا طبقہ پیدا کیا جائے جو اپنی پوشیدہ باتوں کے افشا ء پر بھی نہ شرمائے۔" (فری میسنزی کی حقیقت از ڈاکٹر زعبی)

یہ تو تھیں دین و اخلاق کے بارے میں ہدایات۔ سیاست کے میدان میں جو ہدایات ہیں ان میں سرفہرست سیاست کو دین سے علیحدہ کرنا ہے۔ "مذاہب کی مخالفت میں کمال ہم جب ہی حاصل کر سکتے ہیں، جب ہم سیاست کو مذہب سے جدا کر دیں۔" (فریمیزی کا ترجمہ مجلہ "کاسیا" ۱۹۰۳ء) اس مقصد کے حصول کے لیے فری مسنز کے مختلف گروہ، جماعتیں اور خفیہ

[1] ڈاکٹر صاحب ایم ایس سی، پی ایچ ڈی اور ایم ایس (کولمبیا) ہیں ان کی یہ کتاب مسلم اکادمی ۱۸۔ محمد نگر علامہ اقبال روڈ لاہور نے شائع کی ہے۔

مجلسیں تشکیل دی گئیں جو دینی تحریکوں کے مقابلے کے لیے سازشیں اور انقلابات کے منصوبے تیار کریں۔ لہٰذہ ۱۹۰۰ء میں پیرس میں منعقدہ فری میزی کی کانفرنس میں یہ قرار پایا کہ فری میزی کا نصب العین عالمی جمہوری لادینی حکومت کا قیام ہے۔(فری میزی کے اسرار از جنرل جواد رفعت) فری میزی کے وجود کی غرض وغایت ان دینی جمعیتوں کو تتر بتر کرنا ہے جو ماضی سے روشنی اور رہنمائی حاصل کرتی اس مقصد کے حصول کے لیے فری میزز صف اول میں قتال کرتے ہیں (فری میزی کے اسرار از جنرل جواد رفعت)

یہ تنظیم دنیا کی ام الانقلاب اور ام الاحزاب ہے یعنی دنیا کے انقلابات اور گروہ بندیوں کی خالق ہے اور ہلاکت خیز زیر زمین تحریکوں اور عالمی جنگوں کی محرک اور نگہبان ہے۔ اسی نے یورپ میں دو عظیم انقلاب برپا کیے ایک ۱۷۸۹ء میں اور دوسرے ۱۹۱۷ء میں اور دنیا میں دو عظیم جنگوں کی آگ بھڑکائی۔ ایک ۱۹۱۴ء اور دوسری ۱۹۳۹ء میں تاریخ اسلام کے دو بڑے انقلابات بھی اسی کے مرہون منت ہیں۔ ایک ۱۹۰۸ء کا انقلاب جس میں مسلمانوں کا آخری خلیفہ معزول کیا گیا اور دوسرا ۱۹۲۴ء کا جس میں تاریخ میں پہلی مرتبہ نظام خلافت کی بساط لپیٹی گئی۔ مسلمانوں کا اتحاد تسبیح کے دانوں کے طرح بکھر گیا۔ پارہ پارہ ہو گیا اور امت مسلمہ کئی چھوٹی چھوٹی کمزور قومیتوں اور مملکتوں میں بٹ گئی اور شریعت اسلامیہ کی جگہ خود ساختہ قوانین ودساتیر نے لے لی اور لوگ اس کفر صریح پر خاموش تماشائی بنے رہے۔ کچھ اس فعل میں ان کے معاون ومدد گار بنے۔ نتیجۃً وہ فوج در فوج، گروہ در گروہ ارتداد کے عمیق گڑھے میں گر پڑے لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اب بھی مسلمان ہیں۔

لاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم

مسلم اور غیر مسلم مفکرین، مورخین اور علم الاجناس اور ادیان کے محققین نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہودیوں کے بڑے بڑے علماء اور راہب مختلف ممالک اور مختلف عہد میں موجود فرقوں اور معاشروں میں ایک کمزور اقلیت کی حیثیت سے گھس جاتے اور بظاہر ان کے دین ومذہب کو بھی اختیار کر لیتے تاکہ ان کے دین میں خرابی، تحریف، کجی اور تغیر و تبدل پیدا کریں جن کے ذریعے عالمی یہودیت کے مفادات ومصالح کی خدمت انجام دی جا سکے اور اپنے آپ کو ان فرقوں کی دشمنی ومخالفت سے بھی محفوظ رکھیں۔ وہ ان میں اس طرح گھل مل کر واردات کرتے اور بڑے پرامن طریقے سے وہ اندرونی مہلک عداوت کے اسباب کا بھی سدباب کر لیتے کہ کسی کو پتہ بھی نہ چلتا کہ یہ مار آستین ہیں۔ بعثت مسیحؑ سے لے کر آج تک یہود نے جو بالفعل اس قسم کے جوہر دکھائے ہیں تو وہ مسیحیت کی آڑ میں عیسائیوں کا روپ دھار کر انجام دیئے ہیں۔ سب سے پہلے جس معاشرے میں انہوں نے اپنا یہ خبیث طریقہ نافذ کیا وہ ایرانی معاشرہ تھا کیونکہ بخت نصر کے حملے کے نتیجے میں یہ غلام بن کر ایران پہنچ چکے تھے اور عرصہ دراز تک وہ اسی حالت میں رہے بالآخر اپنی سازشی اور تخریبی ذہنیت کے زیر اثر یہ ان میں گھل مل گئے اور ان کا مذہب مجوسیت اختیار کر لیا۔ یہاں تک کہ ان کے بڑے کاہن اور مذہبی پیشوا بن گئے اور مکروفریب سے ایرانی درباروں میں اتنا اثرورسوخ پیدا کر لیا کہ ایرانی بادشاہوں کو تیسری صدی عیسوی کے عیسائیوں اور ان کے باغی افواج کی تباہی وہلاکت پر اکسانے لگے۔

ان معاشروں میں سے ایک یورپ کا وہ بت پرست معاشرہ ہے جس میں بہت سے یہودی شامل ہو گئے یہاں تک کہ وہ اصل بت پرستوں سے بھی زیادہ بت پرست بن گئے۔ اور ان کے یکے بعد دیگرے آنے والی حکومتوں میں اعلیٰ مراتب و مناصب تک جا پہنچے بلکہ خود بادشاہ بن بیٹھے جیسے نیرون۔ تاج وتخت پر قبضہ سے ان کے لیے یہ سہل ہو گیا کہ وہ بت پرست معاشرے کو عیسائیت سے لڑا دیں اور طرفین میں چکنا چور کرنے والی جنگوں کی ایسی آگ بھڑکا دیں، جس میں عیسائیت اور بت پرست اقوام کی طاقت وقوت جل کر بھسم ہو جائے اور یہود کی جس چال نے عیسائیوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا وہ یہ تھی کہ وہ دو دشمنوں میں گھر گئے۔ مشرقی جانب سے جو لشکر ان پر حملہ آور ہوا اس کی کمان عملاق مجوسی کر رہا تھا اور مغربی جانب سے حملہ آور لشکر کی کمان عملاق بت پرست کے ہاتھ میں تھی۔

جب شہنشاہ قسطنطین نے عیسائیت کا مذہب اختیار کر لیا تو عیسائیوں کو بڑا عروج حاصل ہوا چنانچہ مکار یہودیوں نے فوراً اپنا طریق واردات بدل ڈالا اور جلد ہی عیسائیت کے مذہب میں داخل ہو گئے اور اس کے معاشرے میں ایسے گھل مل گئے کہ وہ مذہبی پیشوائیت کے بڑے بڑے اعلیٰ مراتب تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ اور اس طرح انہوں نے باہم متصادم مذاہب اور آپس میں لڑنے جھگڑنے والے فرقوں پر غلبہ پا لیا۔ اس سے پہلے انہوں نے انجیل میں تحریف وتزییف کی اور اپنی خواہشات نفس کے مطابق ایسی ایسی تعبیریں وتفسیریں کیں جن سے ان کے مذموم مصالح ومقاصد پورے ہوتے تھے۔ یعنی وہ عیسائیت کو صفحہ ہستی سے مٹا دینا چاہتے تھے۔ لہٰذہ مختلف عیسائی فرقوں کے درمیان جنگ کی آگ بھڑک اٹھی اور بے شمار عیسائی اس فرقہ وارانہ فسادات کی بھینٹ چڑھ گئے۔ لیکن یہودی منافقوں کا ایک فرد بھی اس فساد کی لپیٹ میں نہیں آیا۔ اس طرح انہوں نے اپنا مقصد حاصل کر لیا کہ عیسائیوں کو آپس میں بھڑا کر ہلاک کر دیا جیسا کہ اس سے قبل عیسائیوں کو مجوسیوں اور بت پرستوں کے ہاتھوں تباہ وبرباد کیا تھا۔

اسلام کے خلاف یہودی تحریک

بعینہ یہی ٹیکنیک انہوں نے اسلام کے خلاف استعمال کی۔ چنانچہ علماء مورخین، ادیب اور اسلامی علوم کے ماہر خواہ وہ قدیم ہوں یا جدید اس بات پر متفق ہیں کہ اسلام سے خارج فرقوں کے خالق اپنے نفاق کی وجہ سے یہودی ہیں۔ ان جدید مورخین میں سے ایک شیخ محمد الخضری اپنی کتاب تاریخ الامم الاسلامیہ میں رقم طراز ہیں:

"مسلمان نبی ﷺ کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے تھے ان میں ایک شیطان عبد اللہ بن سبا پیدا ہوا جس نے تعظیم رسول اور اہل بیت کے سلسلے میں بہت غلو کیا اور حضرت علی ابن ابی طالب کو ان کا رئیس اعظم اور وصی رسول اللہ ﷺ قرار دیا جیسا کہ ہر نبی کا وصی ہوتا ہے اور کہا کہ یہ لازم ہے کہ حقدار کو صاحب امر بنایا جائے اور جس نے اس کا حق لیا وہ ظالم اور غاصب ہے۔ پھر اس نے حضرت علی ابن ابی طالب کی مدح سرائی میں اس قدر غلو کیا اور آپ کو اس درجہ (الوہیت) پر لے گیا جس کے حضرت علیؓ خود بھی طالب نہیں تھے۔ (ج ۲ ص ۴۴ طبع ہشتم)

صاحب "لوامع الانوار البہیہ" علامہ ابن تیمیہ کا رسالہ "الحمویۃ الکبریٰ" سے نقل کرتے ہیں:

"ابن سبا رافضی فرقے کا بانی منافق زندیق تھا۔ اس نے دین اسلام میں فساد برپا کرنے کا ارادہ کیا جس طرح دین مسیح کے خلاف پولوس نے کیا تھا جو ان رسائل کا مصنف ہے جو نصاریٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ پولوس نے مسیحیت کو بگاڑنے کے لیے عیسائیوں میں بدعتوں کو رواج دیا۔ وہ خود یہودی تھا۔ لیکن ان کی ملت میں فساد برپا کرنے کے لیے بظاہر نصرانی بن گیا۔ اسی طرح ابن سبا بھی یہودی تھا جس نے حضرت عثمانؓ کے قتل کی کوشش کی اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ حضرت عثمانؓ کو باغیوں کے ہاتھوں جامِ شہادت نوش کرنا پڑا۔ ابن سبا کی بدعتوں اور گمراہیوں کی چند جماعتوں نے پیروی کی۔ ان کا عقیدہ تھا کہ حضرت علیؓ شہید نہیں ہوئے بلکہ وہ بادلوں میں موجود ہیں اور کڑک ان کی آواز ہے اور بجلی کی چمک ان کا کوڑا ہے۔ وہ زمین پر نازل ہوں گے اور اسے عدل وانصاف سے بھر دیں گے۔ جب بھی گرج چمک ہوتی وہ کہتے وعلیک السلام یا امیر المومنین (شام کے پہاڑوں میں نصیریوں کا بھی یہی عقیدہ ہے، شام کا موجودہ حکمران حافظ الاسد اسی فرقہ سے تعلق رکھتا ہے) ان میں سے بعض عقیدہ تناسخ پر یقین رکھتے ہیں اور امامت کو نور تناسخ سمجھتے ہیں۔ (شام ولبنان کے دروزیوں کا یہی عقیدہ ہے) بعض کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انسانی صورت میں ہے اور اس کی روح نے حضرت علیؓ میں حلول کیا ہے۔ پھر ان کے فرزند ارجمند محمد بن الحنفیہ میں حلول کیا تھا۔ بعض یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ نوری انسان ہے اس کا قلب حکمت کا سرچشمہ ہے، نیز یہ کہ اس نے حضرت محمد صلی اللہ وسلم کو لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا اور آسمانوں، زمین اور پہاڑوں پر امانت (یعنی امامت) پیش کی تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس بار امانت سے ڈر گئے۔ لیکن انسان نے اسے اٹھالیا (یعنی حضرات ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما) بے شک وہ ظالم اور جاہل ہے۔ (نقل کفر کفر نہ باشد) بعض کا کہنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی روح انبیاء اور ائمہ میں حلول کرتی رہی حتیٰ کہ حضرت علیؓ اور آپ کی اولاد تک پہنچی۔ وہ محرمات کو حلال جانتے ہیں اور قیامت کے منکر ہیں۔ بعض نے یہ دعویٰ کیا کہ ان کے ائمہ انبیا ہیں۔ جنت دنیا کے آرام وراحت کا نام ہے اور جہنم دنیا کے مصائب وآلام ہیں۔ انہوں نے فرائض کو ترک کیا۔ ان کا دعویٰ یہ بھی ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت محمد ﷺ کو لوگوں کی طرف مبعوث کیا تا کہ لوگوں کو حضرت علیؓ کی طرف بلائیں لیکن آپ نے لوگوں کو اپنی طرف بلالیا۔ حضرت علیؓ، حسنؓ، حسینؓ اور فاطمہؓ کی طرف الوہیت منسوب کی وہ فاطمہ کے بجائے فاطم کہتے ہیں یعنی تانیث سے مبرا کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ حضرت جبریلؑ غلطی سے وحی حضرت علیؓ کے بجائے حضرت محمد ﷺ کی طرف لے جاتے رہے (مسلسل ۲۳ برس تک غلطی کرتے رہے)۔ اسماعیلیہ کہتے ہیں کہ قرآن کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن اور وہ باطن پر عمل پیرا ہیں۔ ان کی دعوت شریعت کے ابطال پر قائم ہے اور وہ اس کی ایسی تاویل کرتے ہیں جو جادۂ حق سے ہٹی ہوئی ہے۔ وہ اصل میں مجوسی ہیں جو اس وقت کی پیدوار ہیں جب اسلام میں فتنوں نے جنم لیا اور اختلاف رونما ہوا۔ اسلام کی شان وشوکت ماند پڑ گئی اور دین کا گریبان چاک کر دیا گیا۔ جب وہ اس کی کوئی وضاحت نہ کر سکے تو انہوں نے شریعت کی تاویل اس انداز سے کی جو ان کے مجوسی اسلاف کے قواعد سے جا ملتی تھی۔ ان کا سرغنہ حمدان قرمطی تھا۔ ان کے مذہب کی اصل صابی اور مجوسی مذہب سے ماخوذ ہے۔ ان کے مذہب کی اکثر باتیں بعد میں صوفیوں کے کلام میں شامل ہو گئیں۔ ان کی مثال رسائل اخوان الصفا کے مصنفین کی ہے جن کا اصل مذہب قرامطہ کا مذہب تھا۔ انہوں نے اپنے کلام کا اکثر حصہ امام جعفر صادقؒ سے غلط طور پر منسوب کیا ہے تا کہ اسے اہل بیت کی میراث ثابت کر سکیں۔ سلطنت عبیدیہ حاکمیہ جو اہل بیت کی طرف منسوب تھی اور فاطمیین کہلاتی تھی وہ اسی قسم کی تھی۔ ان کا ظاہر مذہب رافضی تھا۔ اور باطن انکارِ محض۔ ان میں سے ایک فرقہ دردزی ہے اور وہ لوگوں میں سب سے زیادہ انکار کرنے والے ہیں (مختصراً) شیعہ مذہب جیسا کہ امام ابن تیمیہؒ نے بتایا ہے۔ یہودیت، مجوسیت اور صابیت کا ملغوبہ ہے۔ لیکن ان پر سب سے زیادہ اثر یہودیت ہی کا ہے۔"

اس میں وصایت کا عقیدہ یہودیت ہی سے لیا گیا ہے کہ جس طرح ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وصی تھے ایسے ہی حضرت علیؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی ہیں۔ شیعی مذہب کا سب سے اہم مسئلہ شریعت محمدیہ کا منسوخ ہو جانا اور شریعت آل داؤد اور آل سلیمان علیہما السلام کا احیا ہے جو خالص یہودی تمناؤں اور آرزوؤں کا مظہر ہے۔

اصول کافی مولفہ کلینی شیعوں کے ہاں حدیث کی صحیح ترین کتاب مانی جاتی ہے۔ اس کا مرتبہ ان کے ہاں قرآن سے بھی بڑھ کر ہے کیونکہ یہی کتاب ان کے عقائد کا سب سے بڑا ماخذ ہے اور چوں کہ اس میں قرآن کی تحریف ثابت کرنے اور ائمہ شیعہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمسر ثابت کرنے کے متعلق نہ صرف چند احادیث ہیں بلکہ باقاعدہ ابواب ہیں۔ اس لیے شیعہ حضرات تحریف قرآن کو مانتے اور اپنے ائمہ کو انبیاء کی طرح معصوم سمجھتے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمسر سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کلمہ طیبہ میں شیعہ حضرات نے رسالت کی شہادت (محمد رسول اللہ) کے ساتھ اپنے پہلے امام حضرت علیؓ کی امامت پر ایمان رکھنے کو بھی ضروری قرار دیا ہے اور جس طرح وہ لا الہ الا اللہ کے ساتھ محمد رسول اللہ کہنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اسی طرح علی ولی اللہ کہنا بھی لازمی قرار دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ ہر اذان میں بھی توحید ورسالت کی شہادت کے ساتھ حضرت علیؓ کی امامت کی شہادت بھی دیتے ہیں اور اس طرح اپنے امام کے ہمسر محمد ہونے کا کھلم کھلا اعلان کرتے ہیں۔

غرض یہ کہ اصول کافی شیعہ حضرات کی وہ کتاب ہے جس پر ان کے عقائد کی بنیاد ہے اور جس کی روایات کو وہ قرآن سے بڑھ کر سمجھتے ہیں۔ اگر ایسا نہ سمجھتے تو اس کی بنیاد پر قرآن میں تحریف کے قائل نہ ہوتے بلکہ ان روایات ہی کو موضوع قرار دیتے۔

بہر حال اس اصول کافی میں اسلام کی بنیاد جن پانچ ارکان پر بتائی گئی ہے امام ابو جعفر سے مروی حدیث کے مطابق ان پانچ چیزوں پر ہے۔ (۱) صلوٰۃ۔ (۲) زکوٰۃ، (۳) صوم، (۴) حج، (۵) اور ولایت، یعنی اس حدیث میں لا الہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ کی شہادت کو ولایت یعنی ائمہ پر ایمان سے بدل دیا گیا ہے۔

(اصول کافی مطبوعہ تہران مع ترجمہ فارسی ج۳ ص۲۹)

کافی کلینی کی پہلی جلد کے چند ابواب کے عنوانات یہ ہیں۔

باب اس بات میں کہ آئمہ مخلوق الٰہی پر اللہ کے گواہ ہیں (ج ۱ ص ۲۷۰)

باب اس بات میں کہ ائمہ زمین پر اللہ کے خلفائے ہیں۔ (ج ۱ ص ۲۷۵)

باب اس بات میں کہ ائمہ اللہ عزوجل کا نور ہیں۔ (ج ۱ ص ۲۷۶)

باب اس بات میں کہ ائمہ زمین کے ارکان ہیں۔ (ج ۱ ص ۲۸۰)

باب اس بات میں کہ ائمہ کے پاس وہ تمام کتابیں موجود ہیں جو اللہ عزوجل کی طرف سے نازل ہوئیں چاہے وہ کسی زبان میں بھی ہوں۔ (ج ۱ ص ۳۲۹)

باب اس بات میں کہ ائمہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، تمام پچھلے انبیاء واوصیاً کے علم کے وارث ہیں۔ (ج ۱ ص ۳۲۴)

باب صحیفہ جفر، جامعہ اور مصحف فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ذکر میں (ج ۱ ص ۳۲۴)

اسی باب میں ابو بصیر سے روایت ہے کہ میں نے امام ابو عبد اللہ (جعفر صادق) سے پوچھا کہ مصحف فاطمہ رضی اللہ عنہا کیا ہے تو آپ نے فرمایا کہ وہ ایسا مصحف ہے جو تمہارے قرآن کے مقابلہ میں تین گنا بڑا ہے اور بخدا اس میں تمہارے قرآن کا ایک حرف بھی نہیں ہے۔

اصول کافی کے مزید چند عنوان یہ ہیں:

باب اس بارے میں کہ ائمہ، ملائکہ اور انبیا کا سارا علم جانتے ہیں۔ (ج ۱ ص ۳۷۵)

باب اس بارے میں کہ ائمہ جانتے ہیں کہ کب مریں گے (ج ۱ ص ۳۸۳)

باب اس بارے میں کہ ائمہ تمام ماکان اور مایکون (ماضی و مستقبل) کا علم رکھتے ہیں۔ (ج ۱ ص ۳۸۸)

باب اس بارے میں کہ ائمہ علیہم السلام کا جب ظہور ہو گا تو وہ داؤد اور آل داؤد علیہ السلام کے حکم کے مطابق حکومت کریں گے اور کسی کو ان سے دلیل پوچھنے کا حق نہیں ہو گا۔ (جلد دوم صل ۴۴۲)

اسی خطرناک آخری باب میں امام ابو عبد اللہ (جعفر صادق) سے روایت کی گئی ہے کہ جب آل محمد کا امام قائم (مہدی) ظاہر ہو گا تو وہ داؤد سلیمان علیہما السلام کی شریعت کے مطابق حکومت کریں گے اور ان سے اس کی دلیل یا وجہ نہیں پوچھی جا سکے گی۔ (حوالہ بالا)

اس سے واضح ہے کہ ان کا مہدی یہودی ہو گا، اور یہ بھی واضح ہے کہ ان روایات کے وضع کرنے میں کس کا ہاتھ ہے؟

اسی باب میں یہ روایت بھی ہے کہ عمار ساباطی سے مروی ہے کہ میں نے ابو عبد اللہ (امام جعفر صادق) سے پوچھا کہ جب آپ برسر اقتدار آئیں گے تو کس شریعت کے مطابق فیصلے کریں گے؟ تو انہوں نے فرمایا۔ اللہ اور داؤد کی شریعت کے مطابق۔ (کافی حوالہ بالا)

یہودی عہد نبوی میں

یہودیوں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو ختم کرنے کی کئی بار کوشش کی تھی۔ ایک دفعہ آپ ایک مکان کی دیوار کے زیر سایہ آرام فرما

رہے تھے کہ انہوں نے بھاری پتھر آپ پر گرانے کا منصوبہ بنایا (لیکن آپ کو بروقت اللہ تعالیٰ نے باخبر کر دیا آپ وہاں سے اٹھ گئے) ایک دوسرے موقعہ پر انہوں نے آپ کی یہودی پڑوسن کے ذریعہ آپ کو بکرے کے پکے ہوئے پائے ہدیہ کئے جن میں زہر ملایا گیا تھا۔ یہ سب باتیں کتب سیر میں موجود ہیں۔

یہودی اور خلافتِ صدیق اکبرؓ

آپؐ کی وفات کے بعد حضرت ابو بکر صدیقؓ سریر آرائے خلافت ہوئے تو یہودیوں نے ارتداد کا فتنہ برپا کیا اور لوگوں کو زکوۃ نہ دینے پر اکسایا۔ یہ فتنہ اتنا بڑھا کہ عام لوگوں نے سمجھ لیا کہ بس اسلام ختم ہو گیا۔ لیکن حق تعالیٰ نے حضرت صدیق اکبرؓ میں فتنوں کو فرو کرنے کی خصوصی صلاحیت اور سمجھ بوجھ رکھی تھی۔ انہوں نے ان تمام فتنوں کو مختصر عرصے میں ختم کر دیا۔ پھر ان ہی یہودیوں نے تین جھوٹے مدعیان نبوت کھڑے کر دیئے۔ حضرت صدیق اکبرؓ مختصر ترین عرصہ میں ان تمام فتنوں سے بھی عہدہ برآ ہو گئے، ان تمام فتنوں میں یہودیوں، مجوسیوں اور عیسائیوں اور خصوصاً یہودی منافقوں کا ہاتھ تھا۔ لہٰذہ اس کا سدباب کرنے کے لیے حضرت صدیق اکبرؓ کو کسریٰ اور قیصر روما سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ ورنہ اسلام امن و سلامتی کا مذہب ہے۔ وہ بلا وجہ کسی ملک پر فوج کشی کی اجازت نہیں دیتا۔ اسلام کی تمام جنگیں خواہ وہ حضور اکرم ﷺ کے عہد میں لڑی گئیں ہوں یا خلفائے راشدین کے عہد میں جارحیت کی جنگیں نہیں تھیں۔ مسلمانوں کی تمام جنگیں مدافعت میں لڑی گئی ہیں۔ یا تو کفار نے مسلمانوں پر حملہ کیا ہے یا کوئی اور فتنہ پردازی کی ہے جس کے سدباب کے لیے مسلمانوں کو تلوار اٹھانی پڑی ہے۔

یہودی اور شہادت عمرؓ

یہود آنحضرت ﷺ اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا تو بال بیکا نہ کر سکے لیکن دھوکے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے میں کامیاب ہو گئے جبکہ ابھی اسلامی سلطنت کو قائم ہوئے ایک ربع صدی بھی نہیں گزری تھی یہ اسلامی سلطنت کے سربراہ کا سب سے پہلا قتل تھا۔ پھر تو دینی اور سیاسی قتل ایک معمول بن گیا جو آج تک جاری ہے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس قتل کا منصوبہ بنانے والوں کا سرغنہ مکار یہودی کعب بن الاحبار تھا جس نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ خلیفہ عمر کے قتل کا اشارہ تورات میں موجود ہے لیکن حضرت عمر نے اس کے دعوے کو کبھی کوئی اہمیت نہیں دی۔ جب یہ سانحہ رونما ہو چکا تو کعب آپ کے پاس بڑے حزن و ملال کے عالم میں آیا اور کہا: "کیا میں نے آپ کو بتایا نہ تھا کہ محتاط رہیں؟

یہودی اور شہادتِ عثمان

اس طرح اسلامی سلطنت کے سربراہ کے قتل کے جرم میں تین طاقتیں (یہودی، مسیحی اور مجوسی) شریک تھیں۔ پھر خلیفہ سوم حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ان کے تیر ستم کا نشانہ بنے اور اس کے بعد خلیفہ چہارم حضرت علی ابن ابی طالب اور پھر تو خلفاء کا قتل ایک معمول بن گیا جو ایک خفیہ طاقت کا کرشمہ تھا جس کا مرکز جزیرۃ العرب کے قریب یمن میں تھا۔ اور کعب کا نام مکر و فریب کی ایک ضرب المثل بن گیا اور وہ مدرسہ بھی جس میں اس کے حواری مکر و فریب کی تعلیم پاتے تھے۔ پہلے منصوبے بناتے تھے پھر قتل کرتے، پھر مقتول کے جنازہ پر روتے پیٹتے۔ (یہ باب ہم نے اخوان المسلمون کے دمشقی لیڈر جناب محمد کاظم حبیب کی معرکۃ الآراء کتاب "کتاب الروہ بین الامس والیوم" سے مرتب کیا ہے اس کتاب کا اردو میں ترجمہ "ارتداد" کے نام سے ہو چکا ہے۔ اصل عربی کتاب مکتبہ علمیہ لاہور سے اردو ترجمہ دار العروبہ المنصورہ لاہور سے شائع ہو چکا ہے ہمیں افسوس ہے کہ مترجم نے اصل کتاب کا وہ حصہ (ص ۱۳۵ تا ۱۳۹) حذف کر دیا جس میں اس نے شیعہ فرقوں پر شیعہ کتب کی روشنی میں اظہار خیال کیا تھا اور شیعوں کی سب سے مستند کتاب اصول کافی کے اقتباسات اور یہودیوں کے افکار کا تقابلی مطالعہ اس نے جہاں کیا تھا۔ (ص ۱۵۳ تا ۱۵۸) اسے بھی حذف کر دیا) ہم نے اصل عربی کتاب سامنے رکھی ہے۔

قاتلینِ عثمان

سیاسی اور دینی قتل چودہ سو سال سے برابر ہوتے آرہے ہیں اور زیادہ تر مجرم اپنے کیفر کردار کو پہنچتے بھی رہے ہیں۔ لیکن یہ معمہ آج تک حل نہیں ہو سکا اور شاید کبھی بھی حل نہ ہو سکے کہ حضرت عثمان ابن عفان ذی النورین رضی اللہ عنہ کا یہ دردناک قتل، قصاص سے کیوں محروم رہ گیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسا خلیفہ راشد کیوں۔ باغیوں اور فتنہ پردازوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن گیا اور وہ ان سے قصاص لینے میں ناکام رہا۔ وہی حضرت علی جو بارہ سال گزر جانے، مقتول کے بیٹے کے خون کو معاف کر دینے، خلیفہ راشد کے اپنی جیب خاص سے دیت (خون بہا) ادا کر دینے کے باوجود عبید اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے ہرمزان کے قتل کا قصاص لینے میں اس قدر مستعدی دکھاتے ہیں کہ خلیفہ ہوتے ہی ان کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیتے ہیں، وہی خلیفہ حضرت عثمان ابن عفان رضی اللہ عنہ کے قصاص سے پہلو تہی کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ جیسا کہ حضرت علیؓ نے بیان فرمایا ہے قاتلین عثمان اتنے طاقتور ہوں کہ وہ ان سے قصاص لینے کی قدرت نہ رکھتے ہوں۔ لیکن زبیر بن العوام، حضرت طلحہ بن

عبید اللہ، حضرت سعید ابن العاص اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم جب فوجی طاقت بہم پہنچالیتے ہیں کہ قاتلین عثمان سے قصاص لیں تو بجائے ان کی تائید وحمایت کے ان سے نبرد آزما ہونے کے لیے پہنچ جاتے ہیں اور انہیں شکست سے ہمکنار کر دیتے ہیں۔ حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما جام شہادت نوش فرماتے ہیں اور ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا داغ شکست لے کر واپس آتی ہیں۔ اس کے بعد حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ ایک دوسری کوشش کرتے ہیں کہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے قصاص لیں۔ لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ پھر اس میں حارج ہوتے ہیں اور ان کی راہ میں اپنی افواج قاہرہ کی دیوار کھڑی کر دیتے ہیں۔ تاریخ نے ان حضرات میں سے کسی ایک کا بھی کوئی ایسا ایک فقرہ نقل نہیں کیا کہ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف اپنی خلافت کا دعویٰ کیا ہو یا اپنی طرف لوگوں کو دعوت دی ہو۔ وہ صرف قصاصِ عثمانؓ کے لیے کھڑے ہوئے تھے۔ جو لوگ ان سے مشورہ کرتے تھے کہ کس کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کریں تو سب متفقہ طور پر حضرت علیؓ ہی کا نام لیتے تھے بشرطیکہ وہ قصاصِ عثمان لینے میں سرگرمی دکھائیں۔

خلیفہ ہونے کی حیثیت سے شہید مظلوم حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کا قصاص لینا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذمہ داری تھی جو حضرات صحابہ قصاص عثمانؓ کے لیے عملی جدوجہد کر رہے تھے وہ دراصل حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایک فریضہ کی ادائیگی میں ان کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔ ان سے مقابلہ ومجادلہ کا کوئی جواز نہیں تھا۔ لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے اپنی مخالفت بلکہ بغاوت پر محمول کیا اور ان کی کوششوں میں ان کا ہاتھ بٹانے کے بجائے ان سے جنگ کرنے کی صورت اختیار فرمائی۔ نہ صرف یہ ہی کیا بلکہ قاتلان عثمانؓ ان کے دربار میں تقرب حاصل کرتے گئے اور ان کو بڑے بڑے عہدوں سے نوازا گیا۔ مالک بن الاشتر اور محمد بن ابی بکر کو اہم صوبوں کا گورنر بنایا گیا۔ یہ لوگ متفقہ طور پر قاتلین عثمانؓ میں شامل تھے۔ اور وہ ہر ملکی، قومی، شرعی، قانون کے مطابق گردن زدنی تھے لیکن انہیں قتل کرنے کے بجائے انہیں بڑے بڑے مناصب سے نوازنا ایک ایسا معمہ ہے جو اب تک حل نہیں ہو سکا اور شاید کبھی بھی حل نہ ہو سکے۔

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ جو حضرت علیؓ کے سب سے بڑے وکیل صفائی ہونے کی حیثیت سے شہرت حاصل کر چکے ہیں وہ بھی اس اعتراف پر مجبور ہیں کہ:

"حضرت علیؓ نے اس پورے فتنے کے زمانے میں جس طرح کام کیا وہ ٹھیک ٹھیک ایک خلیفہ راشد کے شایان شان تھا۔ البتہ صرف ایک چیز ایسی ہے جس کی مدافعت میں مشکل ہی سے کوئی بات کہی جا سکتی ہے۔ وہ یہ کہ جنگ جمل کے بعد انہوں نے قاتلینِ عثمانؓ کے بارے میں اپنا رویہ بدل دیا۔ جنگ جمل تک وہ ان لوگوں سے بیزار تھے، بادل ناخواستہ ان کو برداشت کر رہے تھے اور ان پر گرفت کرنے کے لیے موقع کے منتظر تھے۔ حضرت عائشہ اور حضرت طلحہؓ وزبیرؓ سے گفتگو کرنے کے لیے جب انہوں نے حضرت قعقاع بن عمرو کو بھیجا تھا تو ان کی نمائندگی کرتے ہوئے حضرت قعقاع نے کہا تھا کہ:

"حضرت علیؓ نے قاتلین عثمانؓ پر ہاتھ ڈالنے کو اس وقت تک موخر کر رکھا ہے جب تک وہ انہیں پکڑنے پر قادر نہ ہو جائیں، آپ لوگ بیعت کر لیں تو پھر خونِ عثمان کا بدلہ لینا آسان ہو جائے گا۔ (البدایہ ج ۷ ص ۳۲)

پھر جنگ سے عین پہلے جو گفتگو ان کے اور حضرت طلحہؓ وزبیرؓ کے درمیان ہوئی اس میں حضرت طلحہؓ نے ان پر الزام لگایا کہ آپ خون عثمان کے ذمہ دار ہیں اور انہوں نے جواب میں فرمایا لَعَنَ اللهُ مَنْ قَتَلَ عثمانَ (عثمانؓ کے قاتلوں پر اللہ کی لعنت) لیکن اس کے بعد بتدریج وہ لوگ ان کے دربار میں تقرب حاصل کرتے گئے جو حضرت عثمان کے خلاف شورش برپا کرنے اور بالآخر انہیں شہید کرنے کے ذمہ دار تھے۔ حتیٰ کہ انہوں نے مالک بن حارث الاشتر اور محمد بن ابی بکر کو گورنری کے عہدے تک دے دیئے۔ درآں حالیکہ قتلِ عثمانؓ میں ان دونوں کا جو حصہ تھا وہ سب کو معلوم ہے، حضرت علیؓ کے پورے زمانہ خلافت میں ہم کو صرف یہی ایک کام ایسا نظر آتا ہے کہ جس کو غلط کہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

(خلافت وملوکیت ص ۱۴۶ مطبوعہ اسلامک پبلیکیشنز لاہور اشاعت اول اکتوبر ۱۹۶۶ء)

اسی طرح حضرت عثمانؓ کی شہادت سے لے کر خود ان کی اپنی شہادت تک ایک ایک مرحلے پر ان کا جو رویہ رہا ہے اس کے ہر جز کا ایک صحیح محل میں نے تلاش کیا اور ان کے اپنے بیانات میں یا اس وقت کے حالات وواقعات میں وہ مجھے مل گیا مگر صرف ایک مالک الاشتر اور محمد بن ابی بکر کو گورنری کا عہدہ دینے کا فعل ایسا تھا جس کو کسی تاویل سے بھی حق بجانب قرار دینے کی گنجائش مجھے نہ مل سکی۔ اسی بناء پر میں نے اس کی مدافعت سے اپنی معذوری ظاہر کر دی۔ (ایضاً خلافت ملوکیت ۳۴۸)

سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قرآن کریم کے صریحی حکم۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى (البقرہ:۱۷۸)

"مقتولین کے بارے میں تم پر قصاص فرض کیا گیا ہے۔"

کی کیا تاویل کی ہو گی۔ پھر بیعت الرضوان میں جب چودہ سو یا چوبیس سو صحابہ کرام نے خون عثمانؓ کے قصاص پر آنحضرت ﷺ سے بیعت کی تھی اور جس میں خود حضرت علیؓ بھی شریک تھے۔ اس سے جان چھڑانے کے لیے حضرت علیؓ نے کیا جواب سوچا ہو گا۔

گزشتہ صفحات میں ہم نے تفصیل سے بتایا ہے کہ اسلام کے خلاف خود حضور اکرم ﷺ کے زمانے سے خفیہ یہودی طاقتیں کام کر رہی تھیں۔ ان کا لقب۔ "القوۃ الخفیہ" رکھا جائے یا "فری میزی" تحریک، لیکن ظاہر ہے کہ پانی وہیں مرتا ہے جہاں نشیب ہوتا ہے۔ فتنوں کی تخم ریزی کرنے والا کتنا ہی عیار اور مکار کیوں نہ ہو جب تک فتنوں کے لیے زمین ہموار نہ کر دی جائے اور حالات ساز گار نہ ہوں دشمنوں کی تخم ریزی برگ وبار نہیں لا سکتی اور ان کی کھیتی کبھی پروان نہیں چڑھ سکتی۔ بیرونی عوامل اسی وقت نتیجہ خیز ہو سکتے ہیں جب کہ اندرونی عوامل بھی ساتھ دیں۔ لٰہذہ سوچنے کی بات یہ ہے کہ وہ اندرونی عوامل کیا تھے جو بیرونی عوامل کے لیے مدد و معاون ثابت ہوئے۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ ابھی بقید حیات ہی تھے لیکن مرض میں مبتلا تھے کہ بنو ہاشم کو خلافت کی فکر دامن گیر ہو گئی تھی چنانچہ صحیح بخاری میں یہ روایت موجود ہے کہ:

حدثنی اسحق قال اخبرنا بشر بن شعیب ابن ابی حمزۃ قال حدثنی ابی عن الزھری قال اخبرنی عبداللہ بن کعب بن مالك الانصاری وکان کعب بن مالك احد الثلثۃ الذین تیب علیھم ان عبداللہ بن عباس اخبرہ ان علی ابن ابی طالب خرج من عند رسول اللہ ﷺ فی وجعه الذی توفی فیه فقال الناس یا ابا حسن کیف اصبح رسول اللہ ﷺ فقال اصبح بحمدہ بارئا فاخذہ بیدہ عباس بن عبد المطلب فقال له انت واللہ بعد ثلاث عبد العصا وانی واللہ لا رٰی رسول اللہ ﷺ سوف یتوفی من وجعه ھذا انی لا عرف وجوہ بنی عبد المطلب عند الموت اذھب بنا الی رسول اللہ ﷺ فلنسأله فیمن ھذا لا مر ان کان فینا علمنا ذالك وان کان فی غیرنا علمنا ہ فاوصیٰ بنا فقال علی رضی اللہ عنہ انا واللہ لئن سالنا ھا رسول اللہ ﷺ فمنعنا ھا لا یعطینا الناس بعد وانی واللہ لا اسالھا رسول اللہ ﷺ۔ (صحیح البخاری باب مرض النبی ﷺ ووفاتہ کتاب المغازی ج ۲ ص ۶۳۹ مطبوعہ مطبعہ مجتبائی دہلی)

"(امام بخاری کہتے ہیں کہ) مجھ سے اسحٰق نے حدیث بیان کی کہ مجھے بشر بن شعیب ابن ابی حمزہ نے خبر دی کہ مجھ سے میرے والد نے زہری سے حدیث بیان کی کہ مجھے عبداللہ بن مالک انصاری نے خبر دی اور کعب بن مالک نے جو ان تین آدمیوں میں سے تھے جن کی (غزوۂ تبوک میں شرکت نہ کرنے پر) توبہ قبول ہوئی تھی کہ انہیں عبداللہ بن عباسؓ نے خبر دی کہ علی بن ابی طالب مرض الوفات میں حضور اکرم ﷺ کے پاس سے نکلے تو لوگوں نے ان سے پوچھا کہ اے ابو حسن (حضرت علیؓ کی کنیت ہے) رسول اللہ ﷺ نے کس حال میں صبح فرمائی؟ تو حضرت علیؓ نے فرمایا الحمد للہ اچھی حالت میں صبح فرمائی (اب طبیعت ٹھیک ہے) تو عباس ابن عبد المطلب ان کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف لے گئے اور ان سے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی قسم تین دن بعد تم لاٹھی کے غلام ہو گے۔ اور اللہ کی قسم میں دیکھ رہا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ اپنی اس بیماری سے جلد ہی وفات پا جائیں گے۔ میں عبد المطلب کی اولاد کے چہرے موت سے پہلے کیسے ہوتے ہیں خوب پہنچانتا ہوں۔ ہمارے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے پاس چلو تو ہم آپؐ سے پوچھ لیں کہ یہ امر (حکومت آپ کے بعد) کن لوگوں میں ہو گا۔ اگر یہ ہم میں ہی ہوا تو ہمیں معلوم ہو جائے گا اور اگر ہمارے علاوہ غیروں میں ہوا تب بھی ہمیں معلوم ہو جائے گا۔ تو حضور اکرم ﷺ انہیں ہمارے بارے میں وصیت فرما دیں گے تو حضرت علیؓ نے کہا۔ اللہ کی قسم اگر ہم نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا اور آپ نے اس سے انکار کر دیا تو لوگ ہمیں (خلافت) کبھی بھی نہیں دیں گے اور اللہ کی قسم میں رسول اللہ ﷺ سے خلافت کا سوال نہیں کروں گا۔"

صحیح بخاری کی اس حدیث سے ظاہر ہے کہ حضور اکرم ﷺ ابھی بقید حیات ہی تھے کہ بنو ہاشم کو یہ فکر دامنگیر ہو گئی تھی کہ ریاست و مملکت کا سربراہ کون ہو گا۔

چنانچہ حضرت عباسؓ نے حضرت علیؓ سے یہ خواہش ظاہر فرمائی تھی کہ آنحضرت ﷺ سے اس کا فیصلہ کرا لیا جائے تا کہ ہمیں معلوم ہو جائے کہ حکومت کس کو ملے گی۔ اگر ہمیں ملتی ہے تو ہمیں معلوم ہو جائے گا اور اگر ہمیں نہ ملنی ہے بلکہ ہمارے علاوہ کسی اور کو ملنی ہے تو آنحضرت ﷺ سے درخواست کی جائے کہ وہ ہمارے بارے میں اسے وصیت کر جائیں کہ وہ ہمارا خیال رکھے۔ اسلامی حکومت قرآن کریم کی رو سے ایک شورائی نظام ہے جو مسئلہ مسلمانوں کو اپنے باہمی مشورہ سے اپنے وقت پر طے کرنا تھا اس کے متعلق آنحضرت ﷺ سے پیش از وقت دریافت کرنے کے کوئی معنے نہیں تھے۔ حضور اکرم ﷺ اس کے متعلق وقت سے پہلے کیا بتا سکتے تھے کہ مسلمان اپنے باہمی مشورہ سے اپنا سربراہ کسے بنائیں گے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے ذہن میں یہ مسئلہ صاف نہیں تھا اور وہ اسے شورائی مسئلہ نہیں سمجھ رہے تھے۔ اس کے جواب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی یہ نہیں فرماتے کہ یہ مسئلہ تو شورائی ہے۔ حضور ﷺ اس کے متعلق کیا بتا سکتے ہیں۔ وقت آنے پر مسلمان معلوم نہیں کیا طئے کریں اور کسے اپنا سربراہ بنائیں بلکہ وہ ان کے جواب میں فرماتے ہیں تو یہ فرماتے ہیں کہ میں اس کے متعلق حضور اکرم ﷺ سے اس لیے کوئی سوال نہیں کروں گا کہ اگر خدا نخواستہ آپ ﷺ نے بنو ہاشم کی سیادت و امارت سے انکار فرما دیا تو مسلمان آئندہ

کبھی بھی حکومت اور امارت ہمیں نہیں دیں گے۔ یہ ہمارے لیے ہمیشہ کے واسطے محرومی کا باعث بن جائے گا۔ اس جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ خلافت وامارت کا مسئلہ حضرت علیؓ کے ذہن میں بھی صاف نہیں تھا۔ وہ بھی اسے خالص شورائی مسئلہ نہیں سمجھ رہے تھے۔

علامہ عینی نے عمدۃ القاری شرح بخاری میں اسی حدیث کے ضمن میں شعبیؒ کی ایک مرسل روایت کا حوالہ بھی دیا ہے جس میں مذکور ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے اس مشورے پر حضرت علیؓ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ:

قا ل علی ضللهعنه وهل یطمع فی هذا الا مرغیر نا؟ فقال اظن واللہ سیکون، (ایضاً حوالہ مذکور)

"اور حضرت علیؓ نے کہا تھا کہ کیا ہمارے علاوہ کوئی اور بھی اس حکومت کی طمع کر سکتا ہے؟ تو حضرت عباسؓ نے کہا اللہ کی قسم میرا خیال ہے کہ ایسا ہو گا۔"

یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک یہ سوال ہی خارج از بحث تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ خلافت و حکومت تو ہمارا حق ہے ہی۔ اور کون اس کی طمع کر سکتا ہے؟ یعنی کوئی اور شخص اس کی طمع ہی نہیں کر سکتا۔ حضرت عباسؓ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ اللہ کی قسم ایسا ضرور ہو گا اور لوگ اس کی طمع کریں گے۔"

تاریخ طبری میں ہے کہ حضرت معاویہؓ نے حضرت علیؓ کے پاس گفتگوئے صلح کے لیے ایک وفد بھیجا جس میں حضرت شرجیل السمطؓ بھی تھے انہوں نے دوران گفتگو کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت عثمانؓ مظلوم شہید ہوئے۔ اس کے جواب میں حضرت علیؓ فرماتے ہیں:

فقال لهما انی لا اقول انه قتتل مظلوما ولا انه قتتل ظالما

"تو حضرت علیؓ نے ان دونوں ارکان سے کہا کہ میں نہ یہ کہتا ہوں کہ وہ مظلوم شہید ہوئے اور نہ یہ کہتا ہوں کہ وہ قتل ہونے کے وقت ظالم تھے۔"

اسی روایت میں یہ الفاظ بھی حضرت علیؓ کی طرف منسوب کئے گئے ہیں کہ:

"پھر لوگوں نے حضرت ابو بکرؓ کو خلیفہ بنالیا اور انہوں نے عمرؓ کو خلیفہ نامزد کر دیا۔ ان دونوں نے اگرچہ بہت اچھے کردار کا مظاہرہ کیا اور امت میں انصاف کیا مگر ہمیں ان پر غصہ یہ تھا کہ وہ لوگ ہمارے اوپر حاکم بن گئے۔ حالانکہ ہم آلِ رسول ہیں مگر ہم نے انہیں معاف کر دیا۔ ان کے بعد عثمانؓ خلیفہ بنائے گئے انہوں نے ایسی باتیں کیں جنہیں لوگوں نے معیوب جانا۔ (طبری حوادث ۳۷ھ)

ان روایات سے واضح ہے کہ شروع ہی سے بنو ہاشم کا یہ خیال تھا کہ خلافت وامارت ہمارا حق ہے ہمیں ہی ملنا چاہیے۔ صحیح بخاری کی ایک روایت اس سے پہلے پیش کی جا چکی ہے جس میں حضرت علی کی طرف سے واضح طور پر یہ فرمایا گیا تھا کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ہمارے خلاف استبداد سے کام لیا ہے۔ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت کی وجہ سے امر خلافت میں اپنا حصہ یا حق سمجھتے تھے۔ ان دونوں حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سبائی تحریک جس بنیاد پر اٹھائی گئی اس کے لیے زمین پہلے سے ساز گار تھی اور کچھ لوگوں کے ذہن اس نظریہ کے لیے پہلے ہی ہموار ہو چکے تھے۔

بخاری اس دوسری روایت میں بھی (سند میں نے دیدی ہے) امام زہریؒ موجود ہیں جن کے متعلق میں بار بار متنبہ کرتا آرہا ہوں کہ ان حضرت پر تشیع کا داغ ہے۔ چونکہ یہ حدیث ان کے مذہبی عقیدہ کے مطابق ہے۔ لہٰذہ محدثین کے اصول پر یہ حدیث قابل قبول معلوم نہیں ہوتی۔ اگرچہ امام بخاریؒ نے اسے اپنی صحیح میں درج کر لیا ہے۔

لیکن اگر یہ روایات صحیح ہیں اور ان میں جو مضامین بیان ہوئے ہیں ان کو تسلیم کر لیا جائے تو یہودیوں اور شیعوں کی طرف سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا صحابہ کی اکثریت اور خلفائے ثلاثہ کے خلاف جو رویہ بتایا جاتا ہے اس کی تصدیق ہوتی ہے یعنی حضرت علیؓ اپنے آپ کو خلافت کا حقدار سمجھتے تھے۔ لہٰذہ خلفائے ثلاثہ غاصب اور ظالم تھے جنہوں نے حضرت علیؓ کا حق غصب کر لیا تھا۔ لہٰذہ ان کو خلافت سے ہٹانا اور اپنا حق حاصل کرنا ان کے لیے قطعاً جائز تھا، وہ راضی خوشی اپنے منصب سے نہیں ہٹے تو ان کو قتل کرا کے اپنا حق حاصل کرنا بھی جائز تھا۔ اس لیے سبائیوں نے حضرت عمرؓ کو شہید کیا تو درست کیا۔ عبید اللہ بن عمر نے ہرمزان کو قتل کیا تو غلط کیا۔ کیونکہ ہرمزان نے صحیح سمت قدم اٹھایا تھا۔ لہٰذہ بارہ سال گزر جانے کے بعد بھی عبید اللہ بن عمرؓ سے ہرمزان کے قصاص لینے کا جواز تھا۔ سبائیوں نے اس کے بعد ایک تیسرے غاصب اور ظالم (حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ) کو شہید کر کے ایک حقدار کے لیے خلافت کا راستہ صاف کر دیا تو وہ بھی ایک صحیح اور جائز اقدام تھا، لہٰذہ حضرت عثمانؓ کے قصاص کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ حضرت علیؓ نے حضرت عثمان کا قصاص نہیں کیا تو انہوں نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔ سبائیوں نے ایک صحیح قدم اٹھایا تھا۔ انہوں نے ایک غاصب اور ظالم کو قتل کر کے حق دار کو اس کا حق دلایا لہٰذہ وہ ہر انعام واکرام کے مستحق تھے ان لوگوں کو خلیفہ ہونے کے بعد بڑے بڑے عہدے دیئے۔ یہ بھی ٹھیک تھا۔ وہ اسی کے مستحق تھے، انہوں نے مالک بن اشتر اور محمد بن ابی بکر کو گورنر بنایا تو کیا غلط کیا کیونکہ ان قاتلین عثمان نے صحیح اقدام کیا تھا اس لیے وہ بجا طور پر اس کے

مستحق تھے کہ انہیں بڑے بڑے منصب دے کر نواز اجائے۔ شیعی نقطہ نظر یہی ہے انہیں اسے تسلیم کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ چاہے اس سے رسول اللہ کی تربیت پر حرف آتا ہو اور اسلام کی ناکامی ظاہر ہوتی ہو۔

لیکن مشکل عام اہل سنت والجماعت کی ہے جو حضرات شیخین اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھی برحق خلیفہ سمجھتے ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی امام برحق تسلیم کرتے ہیں۔ ساتھ ہی بخاری و مسلم اور مؤرخین کی متضاد متناقص روایات پر بھی مکمل ایمان رکھتے ہیں اسی لیے انہیں دوراز کار تاویلات کا سہارا لینا پڑتا ہے جسے عقلِ سلیم تسلیم نہیں کرتی۔ ان کے لیے میرے نزدیک صحیح راہ عمل یہی ہے کہ وہ اس قسم کی متضاد روایات کا سرے سے انکار کریں اور کسی ایک روایت کو بھی تسلیم نہ کریں۔ ان روایات میں جو کچھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق کہا گیا ہے۔ ان کے متعلق یہ نقطۂ نظر اختیار کریں کہ وہ ان پر بہتان ہیں۔ جھوٹی تہمتیں ہیں اور قرآن کریم نے حضرات صحابہؓ کے باہمی تعلقات کے متعلق جو صراحتیں فرمائی ہیں ان کے سراسر خلاف ہیں۔ اب ہم قرآن کریم کے بیانات کو صحیح مانیں یا ان روایات کی ہرزہ سرائیوں کو؟ ہم قرآن کا تو انکار نہیں کرسکتے کیونکہ قرآن کا انکار کفر ہے۔ البتہ ان روایات کا انکار کرسکتے ہیں۔ رہا قصاص عثمانؓ لینے میں ان کا کمزور رویہ سو اس کی وجہ وہی وجہ ہے جس کا ذکر ہم نے اس مضمون کی ابتداء میں بعنوان "حضرت علی کی پوزیشن" کیا تھا یعنی چونکہ ان میں سیاسی صلاحیتوں کی کمی تھی اس لیے وہ صحیح فیصلے نہ کرپائے بلکہ پے درپے اس قسم کی سیاسی غلطیاں ان سے سرزد ہوئیں جن کے نتیجے میں وہ سبائی دشمنان اسلام کے جال میں پھنستے چلے گئے۔ اور باوجود قصاصِ عثمان کی آرزو کے اپنی پوری مدتِ خلافت میں کسی موقعہ پر بھی اس فرض کو ادا نہ کرسکے۔ اور ظاہر ہے اس عظیم فرض کی ادائیگی میں جو کمزوری ان سے ظاہر ہوئی الٰہی فرمان کے مطابق اس کے نتائج انہیں بھگتنے پڑے۔ اور جس جس نے بھی قصاص عثمانؓ میں کی گئی اس کمزوری پر اظہار ندامت اور اعتراف خطا کرنے کے بجائے ڈھٹائی دکھائی اور قرآنی قوانین کی بالاتری سے انکار کیا اس نے اس کی سزا پائی۔

اگر آج بھی ملت اسلامیہ اس واقعہ سے عبرت حاصل نہیں کرے گی اور قانون کی بالادستی پر اپنے ایمان میں پختگی پیدا نہیں کرے گی تو اس کا حشر بھی وہی ہوگا جو تاریخ کی اور بہت اقوام۔ جماعتوں اور اشخاص کا ہوا۔ کیونکہ:

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ﴿٦٢﴾ (الاحزاب:٦٢)

تحریک ابن سبا اور القوۃ الخفیہ:

گزشتہ صفحات میں ہم نے تاریخی حقائق سے ثابت کیا ہے کہ یہودیوں کی طرف سے خفیہ تنظیم جس کا نام عہد صحابہ میں القوۃ الخفیہ تھا اور آج کا اس کا نام فری میسن (FREE MESSON) ہے۔ یہی تنظیم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں سارے فتنہ کی ذمہ دار تھی۔ جس کا سرغنہ اس زمانہ میں عبد اللہ بن سبا تھا جسے ابن السوداء بھی کہتے ہیں کیونکہ اس کی ماں سیاہ رنگ کی تھی اور اس لیے بھی کہ وہ سیاہ تحریک چلا رہا تھا۔

آجکل سبائیوں کی طرف سے کوشش کی جاتی ہے عبد اللہ بن سبا یہودی کی شخصیت کو مشتبہ بنادیا جائے۔ اس کا شوشہ سب سے پہلے مصری ادیب ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے چھوڑا تھا جو خود بھی فری میسن کا ممبر تھا۔ یہود سے اس کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ یہودیوں کے پیشوا حاخام ناحوم آفندی کو عربی ادب کے ماہرین کا نگران مقرر کردیا۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین ہی کی زیر نگرانی قاہرہ یونیورسٹی کی آرٹس فیکلٹی (کلیہ الآداب) میں جو پہلا تحقیقی مقالہ پیش کیا گیا اس کا عنوان تھا۔ "عرب میں یہودی قبائل"۔ پیش کرنے والا طالب علم اسرائیل ولفنسون تھا جو آج کل تل ابیب کی ہاواسابو یونیورسٹی میں ڈین ہے۔[1]

ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے پہلے ایک کتاب "الشعر الجاہلی" کے نام سے لکھی تھی جس میں اس نے دعویٰ کیا کہ قرآن میں جن تاریخی قصص کا تذکرہ ہے وہ سب فرضی کہانیاں ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں اس پر عالم عرب میں ایک زلزلہ آگیا۔ اور طٰہٰ حسین پر کفر کے فتوے لگائے گئے، لیکن چونکہ انہیں فری میسن اور اس کے ممبر افسران کی پشت پناہی حاصل تھی اس لیے کوئی ان کا بال بیکا نہ کرسکا۔

اس کے بعد طٰہٰ حسین نے ایک اور کتاب "الفتنۃ الکبریٰ" کے نام سے لکھی جس میں شہادتِ عثمان پر اظہار خیال کیا ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے ابن سبا کے متعلق یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ ایک فرضی کیریکٹر ہے۔ واقعات کی دنیا میں اس کا کوئی وجود ہی نہیں۔ سبائی اسے لے اڑے اور اس پر مستقل تصانیف کرڈالیں۔ غالباً طٰہٰ حسین نے یہودیوں اور سبائیوں کو خوش کرنے کے لیے یہ شوشہ چھوڑا تھا۔ ورنہ تاریخ کا کوئی طالب علم بھی اس کی جرأت نہیں کرسکتا۔ سنی کتابوں کو چھوڑیئے خود شیعہ کتابوں میں جگہ جگہ اس کا تذکرہ موجود ہے۔ تاریخ طبری میں جو خود زیدی شیعہ ہونے کے علاوہ سبائی راویوں کی روایات کا سب سے زیادہ مستند مجموعہ ہے اس کا تذکرہ کئی مرتبہ آیا ہے۔ مثلاً ۳۵ھ کے احوال میں اس کا اور اسکے مشن کا تذکرہ موجود ہے۔ طبری کی اس

[1] یہ تمام تفاصیل ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے فکری متبع شیعہ ادیب مرتضی عسکری نے اپنی کتاب "مع رجال الفکر فی القاہرہ" مطبوعہ قاہرہ۔ ۱۹۴۷ء ص ۶۶۱ میں دی ہیں مرتضی عسکری نے طٰہٰ حسین کی تائید میں ابن سبا کے انکار پر تین جلدوں میں ایک کتاب مرتب کی ہے جو شیعوں میں بہت مقبول ہے۔

مفصل روایت سے شورش کی اصل بنیاد اور اسکے حقیقی سبب پر خوب روشنی پڑتی ہے چنانچہ طبری کا بیان ہے کہ:

"عبد اللہ بن سبا ایک یہودی تھا جس کا وطن صنعا (یمن کا ایک شہر) تھا اس کی ماں کالی کلوٹی تھی۔ وہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں (منافقانہ) مسلمان ہو گیا اور مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لیے مختلف اسلامی شہروں میں اس نے دورے شروع کر دیئے۔ پہلے حجاز آیا پھر بصرہ، کوفہ، اور شام گیا۔ شام میں اسے کوئی معاون نہ مل سکا۔ اور وہاں کے لوگوں نے اسے ملک بدر کر دیا تو وہ بھاگ کر مصر پہنچا۔"

اس نے ناواقف مسلمانوں میں جو عقائد باطلہ پھیلائے ان کا تذکرہ کرتے ہوئے طبری لکھتا ہے:

"ایک ہزار انبیاء گزرے ہیں۔ ہر نبی کا ایک وصی ہوتا ہے۔ آنحضور خاتم الانبیاء ہیں اور حضرت علی خاتم الاولیاء ہیں۔ اور اس شخص سے زیادہ کون ظالم ہو گا جس نے وصی رسول کے حق پر دست درازی کی۔"

پھر اس نے کہا کہ:

"عثمانؓ نے خلافت پر بغیر استحقاق کے قبضہ کر لیا ہے اور یہ یعنی حضرت علیؓ وصی رسول ہیں تو اس بارے میں تم لوگ اٹھ کھڑے ہو اور انہیں ہٹا دو۔ جس کی ابتداء اپنے امر (عمال عثمانی) پر طعن و تشنیع سے کرو اور امر بالمعروف اور نہی المنکر کرو۔"

پھر اس نے اپنے داعیوں کو مختلف اسلامی ممالک میں بھیجا جو خفیہ طور پر تو اس کی (بغاوت اور مندرجہ بالا عقیدہ فاسدہ کی) تبلیغ کرتے تھے اور ظاہر میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے تھے۔ (یعنی ظاہر میں مصلح اور مبلغ بنے ہوئے تھے)

اپنے مفسدانہ عزائم کی تکمیل کے لیے جو طریقہ انہوں نے استعمال کیا وہ یہ تھا:

"ہر شہر میں یہ مفسد دوسرے شہر کے مفسدوں کو خطوط لکھتے تھے جن میں اپنے امراء و حکام کی مذمت کرتے تھے۔" (تاریخ طبری جلد پنجم مطبوعہ مصر ص۹۸ احوال ۳۵ھ)

نیز اسی ۳۵ھ کے احوال میں جہاں مفسد اور باغیوں کی آمد مدینہ کا تذکرہ ہے وہاں پھر لکھتے ہیں کہ:

"اور ان کے ساتھ ابن السوداءؔ بھی تھا۔"

علامہ ابن کثیرؒ کی تاریخ البدایہ والنہایہ میں جنگ جمل کے موقعہ پر بھی اس کی موجودگی کا تذکرہ موجود ہے۔

تیسری صدی ہجری کے مشہور شیعہ عالم نوبختی اپنی کتاب "فرق الشیعہ" مطبوعہ نجف میں رقم طراز ہے:

وحکی جماعۃ من اھل العلم من اصحاب علی علیہ السلام ان عبداللہ بن سبا کان یھودیا فاسلم ووالی علیا علیہ السلام وکان یقول وھو علی یھودیتہ فی یوشع بن نون وصی بعد موسی علی نبینا والہ وعلیھما السلام بالغلو فقال فی اسلامہ بعد وفاۃ النبی ﷺ فی علی علیہ السلام بمثل ذالک وھو اول من شھر القول بغرض امامۃ علی علیہ السلام واظھر البراۃ من اعدائہ وکاشف مخالفیہ فمن ھنا قال من خالف الشیعۃ ان اصل الرفض ماخوذ من الیھود

(فرق الشیعہ ص۴۴)

"حضرت علیؓ کے رفقا میں سے اہل علم کی ایک جماعت کا بیان ہے کہ ابن سبا پہلے یہودی تھا پھر اسلام قبول کر کے حضرت علیؓ کے جاں نثاروں میں شامل ہو گیا۔ یہ اپنے دورِ یہودیت میں حضرت موسیٰ کے بعد یوشع بن نون کی امامت کا شدومد سے قائل تھا اسلام قبول کرنے کے بعد اس نے یہی نقطۂ نظر حضرت علی کے لیے اختیار کیا۔ اسی نے سب سے پہلے حضرت علیؓ کی امامت کی فرضیت کو شہرت دی اور حضرت علی کے مخالفین پر تبرا کہنے کی اور ان کے پول کھولنے کی جرات کی۔ یہی وجہ ہے کہ مخالفین شیعہ ان افکار کی بنا پر شیعیت کو یہودیت سے ماخوذ سمجھتے ہیں اسی کتاب میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ:

کان ممن اظھر الطعن علی ابی بکر وعمر وعثمان والصحابۃ تبرا منھم وقال ان علیا علیہ السلام امرہ بذالک (ص۴۴)

"اسی نے ابو بکر رضی اللہ عنہ و عمرؓ و عثمانؓ و صحابہ پر طعن و تشنیع کرنے کی ابتداء کی وہ کہا کرتا تھا کہ اس بات کا مجھے علی علیہ السلام نے حکم دیا ہے۔"

اس قدیم ترین شیعی مورخ کے بعد شیعہ اسماء الرجال کی سب سے قدیم اور سب سے مستند کتاب "رجال کشی" میں بھی جگہ جگہ ابن سباء اور اس کی جماعت کا تذکرہ موجود ہے اور اپنے ائمہ سے متعدد روایات بیان کر کے نوبختی کی تائید کی گئی ہے۔ (ملاحظہ ہو "رجال کشی" مطبوعہ کربلا، ص۹۸ تا ۱۰۱)

اس کے بعد آج تک کی تمام سنی تاریخوں اور شیعہ اسماء الرجال کی کتابوں میں ابن سبا اور اس کی پارٹی کا تذکرہ موجود ہے، اس سبائی پارٹی کے بعض افراد کو حضرت علیؓ کے حکم سے آگ میں جلائے جانے کی تائید سنیوں کی سب سے مستند کتاب صحیح بخاری سے بھی ہوتی ہے اور شیعوں کی تمام کتب رجال میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔

ان تصریحات کے بعد تمام مورخین کے بیان کردہ اس متواتر واقعے کا انکار عجیب دیدہ دلیری ہے اور یہ جرات وہی شخص اور طبقہ کر سکتا ہے جو قرآنی بیانات سے انکار کرنے میں بھی دریغ نہ کرے جیسا کہ طٰہٰ حسین نے قرآنی قصص کا انکار کر کے ڈھٹائی کا مظاہرہ کیا ہے اور شیعوں نے قرآنی ارشاد وَ بَنٰتِكَ کے باوجود سوائے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی باقی تین صاحبزادیوں کا انکار کر کے یہ دکھا دیا ہے کہ وہ روز روشن میں چمکتے ہوئے سورج کے انکار کی صلاحیت سے بھی بہرہ ور ہیں۔

ہر صاحبِ علم کے نزدیک طٰہٰ حسین اور اس کے متبع شیعوں کی طرف سے ابن سبا کے انکار کی وہی حیثیت ہے جو اردو کے مشہور ادیب و مورخ سوانح نگار و مترجم قرآن مرزا حیرت دہلوی کے واقعہ کربلا کے انکار کی ہے۔ مرزا صاحب نے کتاب شہادت کے نام سے چھ جلدیں جو تقریباً چار ہزار صفحات پر مشتمل ہیں، لکھی تھیں۔ اپنے رسالے کرزن گزٹ میں وہ اس موضوع پر سالہا سال لکھتے رہے کہ تاریخی طور پر واقعہ کربلا کا وجود ثابت نہیں کیونکہ ابتدائی دور کی حدیث و تاریخ کی کتابوں میں اس واقعہ کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ نہ موطأ امام مالکؒ میں اس کا ذکر ہے نہ موطا امام محمدؒ میں، نہ بخاری میں، نہ مسلم میں اور نہ طبقات ابن سعد، (اسماء الرجال اور تاریخ کی سب سے پہلی کتاب) میں نہ کسی اور قدیم کتاب میں۔ پہلی مرتبہ ابو مخنف شیعی نے اس موضوع پر مقتل حسینؓ کے نام سے کتاب لکھی جو سراسر افسانہ ہے اور اس شخص کے جھوٹے، کذاب اور افسانہ گو ہونے پر تمام محدثین کا اتفاق ہے۔ اسی ابو مخنف کے حوالہ سے طبری وغیرہ نے اپنی کتابوں اور تاریخوں میں یہ واقعہ نقل کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب اس کا پہلا راوی ہی نا قابل اعتبار ہے تو اس قصے کی کیا تاریخی حیثیت ہے۔[1]

---

(1) یہ کتاب شہادت مدت سے نایاب تھی اب حال ہی میں اس کی ایک جلد مکتبہ جاء الحق کراچی، جلد ۴/۱۶ ا۔ جے ناظم آباد کراچی سے شائع کی ہے اس کی پانچ جلدوں کا فوٹو سٹیٹ مشہور علم دوست خالد ایم اسحٰق ایڈوکیٹ کی لائبریری میں موجود ہے۔ چھٹی جلد کہیں دستیاب نہیں کیونکہ شیعہ حضرات نے مرزا حیرت کا پریس اور مکتبہ جلا دیا تھا جبکہ یہ آخری جلد زیر طبع تھی۔ پانچ مطبوعہ جلدیں ہمدرد لائبری اور کچھ دوسری پرائیویٹ لائبریریوں میں موجود ہیں۔

کتاب الدیات

ہمارے فقہاء کرام نے قتل کی پانچ قسمیں فرمائی ہیں،(۱) قتل عمد،(۲) قتل شبہ عمد،(۳) قتل خطاء فی القصد،(۴) قتل خطاء فی الفعل،(۵) قتل قائم مقام خطاء۔

ان سب کی تعریف جو کچھ فقہاء کرام نے فرمائی ہے اسے ہم تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

(۱) قتلِ عمد:

کسی کو ہتھیار سے مار ڈالنا یا کسی ایسی دھار چیز سے جو ہتھیار کے قائم مقائم ہو قتل کر دینا۔ مثلاً دھار دار لکڑی، بانس کا دھار دار پٹھا۔ پتھر کا دھار دار ٹکڑا، نیز آگ میں جلا دینا۔

(۲) قتلِ شبہ ٔ عمد:

بغیر کسی ہتھیار اور دھاردار چیز کے کسی کو قتل کر دینا، امام ابو حنیفہؒ کا مذہب یہی ہے۔ امام ابو یوسف، امام محمد اور امام شافعیؒ کے نزدیک بڑے پتھر یا بڑی لکڑی سے جس میں دھار نہ ہو مار ڈالنا بھی قتل عمد ہے۔ البتہ کسی ایسی چیز سے مار ڈالنا جس سے عموماً قتل نہ کیا جاتا ہو شبہ ٔ عمد کہلاتا ہے۔ مثلاً کسی چھوٹے ہتھیار سے مارنا کہ اس سے عموماً قتل کرنا مقصود نہیں ہوتا بلکہ تادیب اور تنبیہ کا ارادہ ہوتا ہے۔

(۳) قتلِ خطاء فی القصد:

یہ ہے کہ کسی نے فاصلہ سے ایک چیز کو شکار سمجھتے ہوئے اس پر گولی چلا دی لیکن وہ شکار کے بجائے آدمی تھا۔ گولی اسے لگی اور وہ مر گیا یا یہ گولی چلانے والے نے اسے حربی کافر سمجھ کر گولی چلائی تھی لیکن وہ مسلمان نکلا۔

(۴) قتلِ خطاء فی الفعل:

یہ ہے کہ گولی چلانے والے نے ایک نشانہ پر گولی چلائی تھی لیکن وہ اچانک کسی دوسرے آدمی کو لگ گئی۔

(۵) قتل قائم مقام خطاء:

یہ ہے کہ آدمی چھت پر سو رہا تھا جس پر منڈیر نہیں تھی۔ اس نے کروٹ لی اور نیچے کسی آدمی پر گر گیا اور جس پر وہ گرا وہ مر گیا۔ یا کسی نے ایسی زمین میں جو اس کی ملکیت نہیں تھی کنواں کھود لیا اس میں کوئی گر کر مر گیا۔

لیکن قرآن کریم نے قتل کی یہ پانچ قسمیں بیان نہیں فرمائیں۔ چونکہ ہمارے فقہاء نے ان پانچوں صورتوں کے احکام میں قیاسات یا روایات کی وجہ سے فرق فرمایا ہے اس لیے انہوں نے سہولت کی خاطر قتل کی پانچ قسمیں فرما دی ہیں۔ قرآن کریم نے قتل کی دو ہی قسمیں بیان فرمائی ہیں۔ قتل عمد اور قتل خطاء اور ان ہی کی سزائیں بیان فرمائی ہیں جو انتہائی اور آخری سزائیں ہیں۔ حالات و واقعات کی وجہ سے حاکم وقت کو ان میں تخفیف و تشدید کا حق ہوتا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ حالات و واقعات کے ماتحت تشدید و تخفیف کا حق حاکم وقت کو دیدینا مناسب ہے بجائے اس کے کہ اسے متعین کر کے حاکم کو ان کا پابند بنا دیا جائے۔

حضور اکرم ﷺ اور خلفائے راشدین نے حالات و واقعات کے ماتحت جو تشدید و تخفیف فرمائی تھی اس سے حاکمان وقت کو رہنمائی حاصل کرنی چاہیے لیکن ایسی پابندی ضروری نہیں کہ وہ اس سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر نہ ہو سکیں۔

قتل عمد کے سلسلہ میں ہم تفصیل سے بحث کر چکے ہیں کہ قتل عمد میں قَوَدْ (جان کے بدلے جان) واجب ہوتی ہے۔ شبہ ٔ عمد میں ہمارے فقہاء کرام

دیت اور کفارہ کے قائل ہیں۔ بہت سی ایسی صورتیں جنہیں ہمارے فقہاء کرام نے قتل عمد شمار نہیں کیا بلکہ شبہ عمد قرار دیا ہے۔ ہمارے خیال میں وہ شبہ عمد نہیں بلکہ قتل عمد ہی ہیں اور ان میں بجائے دیت کے قود ہی ہونی چاہیے۔ قتل عمد کی جو تعریف ہمارے فقہاء کرام نے فرمائی ہے وہ خود بھی اس پر قائم نہیں رہے۔ قتل عمد ان کے نزدیک یہ ہے کہ آلۂ قتل یا کسی دھار دار چیز سے قتل کیا جائے تو وہ قتل عمد ہوتا ہے لیکن اس تعریف کے باوجود اگر کوئی شخص کسی کو بڑے پتھر سے کچل کر مار ڈالے، پانی میں غرق کر کے مار ڈالے یا آگ میں کسی کو جلا دے تو ان صورتوں میں ہمارے فقہاء خود بھی دیت کے قائل نہیں بلکہ قود (جان کے بدلے جان) کے قائل ہیں حالانکہ یہ تمام چیزیں نہ لوہے کا آلۂ قتل ہیں اور نہ دھار دار چیزیں ہیں لہٰذہ ہمارے نزدیک قتل عمد کی تعریف یہ ہونی چاہیے کہ قاتل کسی کو قتل کر دے اور وہ عمداً ایسا کرے۔ اس کا ارادہ جان سے مار ڈالنے کا ہو وہ کسی غلطی کی بنا پر اس سے سرزد نہ ہوا ہو۔ یعنی نہ خطاء فی القصد ہو نہ خطاء فی الفعل ہو۔ باقی تینوں قسمیں جو قتل خطاء کی بیان کی گئی ہیں یعنی (۱) خطاء فی القصد (۲) خطاء فی الفعل، اور (۳) قائم مقام خطاء یہ سب قتل خطاء ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ جرم کی خفت اور شدت کے لحاظ سے تینوں میں یقیناً فرق ہے اور عدالت کو ان کی شدت اور خفت کو مد نظر رکھ کر کوئی فیصلہ کرنا چاہیے۔ نبی اکرم ﷺ اور خلفائے راشدین نے یقیناً جرائم کی شدت و خفت کو مدّ نظر رکھتے ہوئے سزا میں بھی اس کا لحاظ رکھا ہے۔

کہیں دیت مغلظہ اور کہیں دیت غیر مغلظہ، ہماری عدالتوں کو بھی جرائم کی شدت وخفت کا لحاظ رکھنا چاہیے اور سنت نبوی اور سنت خلفاء سے رہنمائی حاصل کرنی چاہیے۔

سب جرائم یکساں نہیں

تمام جرائم یکساں نہیں ہوتے۔ ان میں حالات و کوائف کے اعتبار سے بڑا فرق ہوتا ہے۔ شراب نوشی جرم ہے اور قابل تعزیر ہے۔ لیکن ایک شخص اپنے گھر میں بند کمرہ میں شراب پیتا ہے، دوسرا آدمی کسی پبلک مقام پر کھلم کھلا سب کے سامنے شراب نوشی کا جرم کرتا ہے، تیسرا آدمی مسجد میں بیٹھ کر شراب نوشی کرتا ہے، چوتھا آدمی حرم کعبہ میں اس جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔ شراب نوشی کے جرم کا ارتکاب چاروں نے کیا ہے لیکن جرم کی شناعت یکساں نہیں ہے۔ تو ظاہر ہے کہ ان چاروں کو یکساں سزا نہیں دی جا سکتی۔ جرائم کی شناعت وقباحت کو مد نظر رکھتے ہوئے سزا میں بھی خفت اور شدت اختیار کی جائے گی۔ شریعت نے اجماع صحابہؓ کے مطابق اس کے لیے تعزیراً اسی (۸۰) کوڑے مقرر کئے ہیں لیکن تمثیلاً مذکورہ چاروں صورتوں میں یکساں سزا نہیں دی جاسکتی جیسے جرائم شدید اور خفیف ہیں ایسے ہی ان کی سزا بھی مختلف ہونی لازمی ہے۔

جرم زنا کی سزا قرآن کریم نے سو کوڑے مقرر فرمائی ہے لیکن ایک زنا تو یہ ہے کہ تراضی طرفین سے زنا کا ارتکاب کیا جائے، دوسری زنا یہ ہے کہ زنا بالجبر کیا جائے۔ عورت روتی چلاتی رہی لیکن زبردستی اس کے ساتھ زنا کیا گیا۔ تیسری زنا یہ ہے کہ ایک نابالغ معصوم بچی کو زبردستی اپنی حیوانی ہوس کا نشانہ بنا لیا گیا۔ چوتھی زنا یہ ہے کہ زبردستی کسی نابالغ بچی کو کسی مقدس اور پاکیزہ مقام پر مثلاً کسی بزرگ کے مزار پر یا کسی مسجد یا خانقاہ میں اپنی ہوس کا نشانہ بنایا گیا اور یہ شنیع حرکت کی گئی۔ کہنے کو تو یہ سب صورتیں زنا ہی کی ہیں لیکن اپنے خصوصی حالات اور کوائف کو بھی مد نظر رکھا جائے تو جرم جرم میں بڑا فرق ہے۔ عدالت کا فرض ہے کہ ان حالات و کوائف کو بھی مد نظر رکھے اور ان کے مطابق سزا میں تخفیف و تشدید سے کام لے تمام مجرموں کو ایک ہی لاٹھی سے نہیں ہانکا جاسکتا۔

قتل خطاء کی ہمارے فقہانے تین صورتیں تجویز فرمائی ہیں۔ یقیناً ان سب میں شناعت وقباحت کے اعتبار سے فرق ہے اور اس فرق کو بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ مگر یہ سب قتل خطاء کی صورتیں ہیں اور ان کی سزا بھی قتل خطاء کی سزا یعنی کفارہ اور دیت ہے۔ کفارہ یہ ہے کہ ایک مومن غلام پاکیزہ کو آزاد کیا جائے اور دیت یہ ہے کہ خون کی قیمت ادا کی جائے جسے خون بہا کہتے ہیں۔ اگر غلام یا کنیز مسلمان آزاد کرنا ممکن نہ ہو جیسا کہ آج کل اس کا امکان نہیں ہے تو دو مہینے مسلسل اور متواتر روزے رکھے جائیں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَ مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّ دِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰۤى اَهْلِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ؕ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ؕ وَ اِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۭ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰۤى اَهْلِهٖ وَ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ؗ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۹۲﴾ (النساء:۹۲)

"اور دیکھو کسی مسلمان کو سزاوار نہیں کہ کسی مسلمان کو قتل کر ڈالے۔ مگر یہ کہ غلطی سے (اور شبہ میں) اس کے ہاتھ سے کوئی قتل ہو جائے اور جس کسی نے ایک مسلمان کو غلطی سے (اور شبہ میں) قتل کر دیا ہو تو چاہیے کہ ایک مسلمان غلام آزاد کرے اور مقتول کے وارثوں کو اس کا خون بہا ادا کرے۔ اگر مقتول کے

وارث خوں بہا معاف کر دیں تو ایسا کر سکتے ہیں۔ اگر مقتول اس قوم میں سے ہو جو تمہاری دشمن ہے (یعنی تم سے بر سر جنگ ہے) مگر مومن ہو (اور کسی نے یہ سمجھ کر کہ یہ بھی دشمنوں میں سے ہے اسے قتل کر دیا ہو) تو چاہیے کہ ایک مسلمان غلام آزاد کیا جائے (خوں بہا کا دلانا ضروری نہ ہو گا۔ کیونکہ اس کے وارثوں اور ساتھیوں سے مسلمانوں کی جنگ ہے) اور اگر مقتول ان لوگوں میں سے ہے جن کے ساتھ تمہارا معاہدہ صلح ہے (یعنی معاہدہ ہو) تو چاہیے کہ قاتل، مقتول کے وارثوں کو خوں بہا بھی دے اور ایک غلام بھی آزاد کرے جو مسلمان ہو، اور جو کوئی غلام نہ پائے (یعنی اس کا مقدور نہ رکھتا ہو کہ غلام کو مال کے بدلے حاصل کرے اور آزاد کرائے) تو اسے چاہیے کہ لگاتار دو مہینے روزے رکھے۔ اس لیے کہ اللہ کی طرف سے یہ (اس کے گناہ کی) توبہ ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا ہے اور (اپنے تمام احکام میں) حکمت رکھنے والا ہے۔"

عام کفاروں میں جہاں ایک غلام آزاد کرنے کا یا روزے رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اگر غلام دستیاب نہ ہو اور روزے نہ رکھ سکے، ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانے کی سہولت بھی دی گئی ہے۔ لیکن قتل خطاء کے سلسلہ میں قرآن کریم نے یہ رعایت نہیں دی، کیونکہ قرآن کریم نے اسے بیان نہیں کیا۔ اور مقادیر، قیاس سے متعین نہیں کی جا سکتیں اس کے لیے منصوص تصریح ضروری ہوتی ہے اس کی وجہ ہمارے فقہاء یہ بیان فرماتے ہیں کہ جزا پر جب "فا" آتی ہے تو اس کا مقصد ہی یہ بیان کرنا ہوتا ہے کہ فا کے بعد جس کا ذکر کیا جارہا ہے وہ پوری جزاء ہے اس کے علاوہ اور کچھ باقی نہیں ہے۔ اصول فقہ میں اس کی تفصیلات بیان کر دی گئی ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ موضع بیان میں کسی بات کو نہ بیان کرنا اس کی دلیل ہوا کرتی ہے کہ اس کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہے۔ یہاں کفارہ کا بیان ہو رہا ہے، قرآن کریم کو یہاں کفارہ کا پورا بیان کرنا لازم تھا۔ موضع بیان میں کھانا کھلانے کا بیان نہیں ہوا یہ اس کی دلیل ہے کہ کھانا کھلانا کفارہ ہے ہی نہیں۔ ہمیں ان دونوں اصولوں سے پورا پورا اتفاق ہے اور قتل خطأ کے کفارہ میں صرف دو چیزیں ہی کفارہ بن سکتی ہیں۔ یا تو وہ ایک مسلمان غلام کو آزاد کرے یا پھر لگاتار دو مہینے روزے رکھے۔ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانے سے گناہ کا کفارہ نہیں ہو گا۔

(ملاحظہ فرمایئے ہدایہ مع حواشی ج ۴ ص ۵۸۴ مطبوعہ کلام کمپنی کراچی)۔

ہمیں یہاں یہ بات دہرانے کی اجازت دیجئے کہ یہ دونوں اصول ہمارے فقہاء کرام کی نظروں سے جرم زنا کی سزا میں بالکل ہی اوجھل ہو گئے ہیں۔ وہاں بھی:

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ

(النور:۲)

"زناکار عورت اور زناکار مرد (زنا کے مرتکب ہوں) توان میں سے ہر ایک کو سو سو کوڑے مارو۔"

اس آیت کریمہ میں بھی جزا پر فا آرہی ہے جس کا تقاضا یہی ہے کہ اس کے بعد جو جزاء بیان کی جارہی ہے وہ پوری جزا ہے جزا کا ایک حصہ نہیں ہے۔ نیز موضع بیان میں کسی بات کو بیان نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ مقصود ہی نہیں ہے لیکن اس کے باوجود ہمارے فقہاء رجم کے قائل ہیں کہ اگر زناکار شادی شدہ ہوں تو انہیں سنگسار کیا جائے گا۔ خامہ انگشت بدنداں ہے۔(1)

شبہ عمد کی دیت کیا ہے

شبہ عمد میں دیت یعنی خون بہا امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک سو اونٹ ارباعاً ہونے چاہئیں یعنی چار طرح کے اونٹ ہوں۔ پچیس (۲۵) بنت مخاض یعنی جن کی عمر ایک سال ہو چکی ہو اور دوسرے سال میں لگ رہے ہوں اور پچیس (۲۵) بنت لبون ہوں یعنی دو سال کے پورے ہو چکے ہوں اور تیسرے سال میں لگ رہے ہوں۔ اور پچیس (۲۵) حقے ہوں یعنی جو تین سال کے ہو چکے ہوں اور چوتھے سال میں لگ رہے ہوں۔ پچیس (۲۵) جذعے ہوں یعنی جو چار سال کے ہو چکے ہوں اور پانچویں سال میں لگ رہے ہوں۔

امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ سو اونٹ اثلاثاً ہوں گے یعنی تین طرح کے ہونے چاہئیں۔ تیس جذعے (چار سالہ) تیس (۳۰) حقے (تین سالہ) اور چالیس (۴۰) ثنیے یعنی (پانچ سالہ) اور یہ چالیس کے چالیس حاملہ ہوں ان کے پیٹ میں بچے ہوں۔

قتل خطاء میں دیت

لیکن قتل خطاء میں دیت اخماساً ہونی چاہیے یعنی پانچ طرح کے اونٹ ہوں۔ بیس (۲۰) بنت مخاض (ایک سالہ اونٹنی) بیس (۲۰) بنت لبون (دو سالہ اونٹنی)، بیس ابن مخاض (ایک سالہ نر اونٹ) بیس (۲۰) حقے (تین سالہ اونٹ) بیس (۲۰) جذعے (چار سالہ اونٹ)

شبہ عمد کا جرم قتل خطاء کے مقابلہ میں شدید ہے اس لیے قتل شبہ عمد میں دیت بھی زیادہ شدید رکھی گئی ہے قتل خطاء میں چونکہ جرم خفیف ہے قاتل نے قصداً کسی کو قتل نہیں کیا بلکہ غلطی سے جرم سرزد ہوا ہے۔ اس میں

---

(1) اس کی تفصیل ہماری کتاب "رجم حد ہے یا تعزیر" میں گذر چکی ہے۔ اسے دیکھ لیا جائے۔

اتنا ہی ہے کہ گولی چلانے والے نے احتیاط سے کام نہیں لیا اس لیے اس کی دیت بھی خفیف رکھی گئی ہے۔

لیکن ہم تفصیل سے بتا چکے ہیں کہ قرآن کریم نے قتل عمد ہی کو بیان کیا ہے شبہ عمد کا کوئی تذکرہ نہیں فرمایا۔ لہٰذہ قتل عمد اور قتل شبہ عمد ایک ہی چیز ہے۔ قرآن کریم شبہ عمد کو قتل عمد ہی شمار کرتا ہے اور اس کیسزا بھی وہی ہے جو قتل عمد کی ہے یعنی سزائے موت۔ ان دونوں میں دیت نہیں ہے ان دونوں میں اولیا مقتول کو نہ معاف کرنے کا حق ہے نہ کسی مال پر صلح کر لینے کا۔ قتل عمد اور قتل شبہ عمد حق ورثا نہیں ہے بلکہ حق مملکت ہے، اس میں مدعی حکومت ہے مقتول کے ورثاء نہیں ہیں۔ لہٰذہ معافی یا صلح کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دیت یعنی خوں بہا صرف قتل خطاء میں عائد ہوتی ہے۔

دیت عاقلہ پر

احادیث میں دیت کے متعلق آتا ہے کہ قتل خطاء میں دیت عاقلہ پر یعنی قاتل کے خاندان پر واجب ہوگی اور کفارہ خود قاتل کو ادا کرنا ہوگا۔ لیکن ایسا کرنا عرب کے قبائلی نظام میں تو ممکن تھا۔ آج کے غیر قبائلی نظام میں ایسا کرنا ممکن نہیں ہے۔ یہ حکم ایسا ہی ہے جیسا کہ ہمارے ہاں خصوصی حالات میں اجتماعی جرمانہ عائد کیا جاتا ہے یعنی مثلاً جس محلہ یا قریہ میں کوئی جرم ہو اس کی پوری آبادی پر جرمانہ عائد کر دیا جاتا ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں اسے امداد باہمی کہا جاسکتا ہے کہ چونکہ دیت کی مقدار بہت زیادہ رکھی گئی تھی اور ایسا کرنا ناگزیر تھا۔ کیونکہ حضور اکرم ﷺ جب مبعوث ہوئے تو عرب میں قتل وغارت گری کا بازار بہت زیادہ گرم تھا اور اس سلسلہ کو بند کرنا ضروری تھا بغیر سخت سزا کی صدیوں کی پڑی ہوئی عادت کو چھڑانا ممکن ہی نہیں تھا۔ یہ مقدار اتنی تھی کہ کسی ایک آدمی کی استطاعت سے یقیناً باہر تھی اس لیے امداد باہمی کے ذریعہ اس کو پورا کرایا گیا۔ لیکن نہ وہ حالات ہیں نہ اس کی ضرورت ہے۔ ویسے یہ طریقے اسلام کے مسلمہ اصول کے خلاف بھی ہے لیکن خصوصی حالات میں اس کو نافذ کرنا ضروری تھا اور آج بھی اگر ویسے ہی خصوصی حالات پیدا ہو جائیں تو یہی طریقہ نافذ کیا جاسکتا ہے۔ قرآن کریم نے ہمیں جرائم کے سلسلہ میں جو عام اصول دیا ہے وہ یہی ہے کہ:

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ؕ (فاطر:۱۸)

"کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔"

یہ الفاظ سورۂ انعام۔ سورۂ اسراء۔ سورۂ فاطر، سورۂ زمر اور سورۂ النجم میں وارد ہوئے ہیں۔ یعنی پانچ جگہ اس کے علاوہ:

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ (البقرہ:۲۸۶)

"ہر نفس انسانی کو اسی کا فائدہ ہوگا جو اس نے کمایا اور اسی کا نقصان پہنچے گا جو اس سے سرزد ہوا۔"

اور

وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۵﴾

(آل عمران:۲۵)

"ہر نفس کو اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا جو اس نے کمایا اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔"

اور۔

ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾

(البقرہ:۲۸۱)

"پھر ہر نفس کو اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا جو اس نے کمایا اور لوگوں پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔"

اور۔

لِيَجْزِيَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ؕ (ابراہیم:۵۱)

"تاکہ اللہ ہر نفس کو اس کی جزا دے جو اس نے کمایا تھا۔"

اور

وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ﴿۳۰﴾ (الشوریٰ:۳۰)

"جو مصیبت تمہیں پہنچتی ہے تو وہ تمہارے ہی ہاتھوں کی کمائی ہوئی ہوتی ہے۔"

اور

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ﴿۳۸﴾ (الزمل:۳۸)

"ہر نفس اسی میں ماخوذ ہے جو اس نے کمایا۔"

اس مضمون کی آیات قرآن کریم میں بے شمار ہیں جن کا احصار بہت مشکل ہے ہم نے وہی آیات پیش کر دیں ہیں جو اس موضوع پر نہایت واضح اور صریح ہیں۔ ان تمام آیاتِ قرآنی کا ماحصل یہی ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کے جرم میں ماخوذ نہیں ہوتا بلکہ نہیں ہو سکتا۔

یہ حکم کہ قتل خطاء میں مجرم کا خاندان یا اس کا قبیلہ (عاقلہ) دیت کی سزا کو برداشت کرے۔ قرآن کریم کی ان واضح اور صریح آیات کے خلاف ہے۔

علامہ ابن رشد قرطبی فرماتے ہیں کہ:

واما على من تجب فلا خلاف بينهم ان دية الخطاء تجب على العاقلة وانه حكم مخصوص من عموم قوله تعالىٰ وَ لَا

تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ومن قوله عليه الصلوٰۃ والسلام لابی زمنة لولدہ لايجنی عليك ولا تجنی عليه۔

(بدایۃ المجتہد ج ۲ ص ۴۱۲ مطبوعہ مصر)

"رہ گئی یہ بات کہ دیت کس پر واجب ہو گی۔ تو فقہاء میں اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ وہ عاقلہ (خاندان) پر واجب ہوتی ہے اور یہ ایک ایسا حکم ہے جو حق تعالیٰ کے ارشاد وَ لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی "کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا" اور نبی اکرم الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد سے جو آپ نے ابو زمنہ سے اس کے بیٹے کے متعلق فرمایا تھا کہ نہ وہ تیری ذمہ داری پر کوئی جرم کر سکتا ہے نہ تو اس کی ذمہ داری پر کوئی جرم کر سکتا ہے، کے عام حکم سے مخصوص ہے۔

علامہ ابن رشدؒ نے اس کی کوئی وجہ نہیں بتائی کہ عاقلہ پر دیت کا واجب ہونا قرآنی نصوص صریحہ کے عموم اور ابو زمنہ رضی اللہ عنہ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی کے عموم سے کیوں مخصوص ہے؟ اصول میں یہ بات طے ہو چکی ہے کہ عام ہر حال میں اپنے عموم پر باقی رہتا ہے۔ اخبار آحاد سے اس کے عموم کو خاص نہیں کیا جا سکتا۔ علامہ کے بیان سے صراحۃً تو نہیں البتہ ایسا مترشح ہوتا ہے کہ چونکہ فقہاء میں اس مسئلہ پر کوئی اختلاف نہیں ہے اس لیے انہوں نے ایسا سمجھا ہے کہ فقہاء کا اس پر اجماع ہو گیا ہے اور اسی اجماع کی وجہ سے نصوص صریحہ کے عموم کو وہ خاص کر لینے کے حق میں ہیں۔ لیکن اجماع کی حقیقت کیا ہے اور اس کی حیثیت خود ائمہ فقہاء کے نزدیک کیا ہے اس پر ہم فقہ القرآن جلد چہارم کے حصہ "رجم اصل حد ہے یا تعزیر" میں تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔ اسے وہاں دیکھ لیا جائے۔ اختصار کے ساتھ ہم اس کا اعادہ کر دیتے ہیں۔ تفصیل ہماری محولہ بالا کتاب میں ملے گی۔ ہم نے وہاں بتایا تھا کہ:

صاحب نور انوار نے اجماع کو بحث شروع کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"اجماع لغت میں اتفاق کو کہتے ہیں۔ اور امت محمدیہ کے تمام صالح مجتہدین کا جو ایک زمانہ میں ہوں امر قولی یا امر فعلی پر اتفاق کر لینا اجماع کہلاتا ہے۔ یہ بنیادی چیز ہے۔ اجماع کی دو قسمیں ہیں اول تو عزیمت (یعنی حقیقی اور اصل اجماع) یعنی اگر وہ مسئلہ قول سے متعلق ہو تو سب کو کسی حکم کے متعلق زبان سے کہیں کہ ہم سب نے اس پر اتفاق کر لیا ہے اور اگر وہ مسئلہ عمل سے متعلق ہو تو ان سب نے کسی ایسے کام کو شروع کر دیا ہو اور متفقہ طور پر اس پر عمل پیرا ہوں۔ جیسا کہ تمام اہل اجتہاد نے بغیر کسی استثنا کے عملاً مضاربت یا مزارعت یا شرکت کا کاروبار شروع کر دیا تو یہ ان کے جائز اور مشروع ہونے پر ان کا اجماع کہلائے گا۔ اجماع کی دوسری قسم رخصت (یعنی مجازی اور غیر اصلی اجماع) کہلاتی ہے جس میں کچھ لوگ ایک مسئلہ کے متعلق کوئی بات کہتے ہیں یا عملاً کرتے ہیں اور باقی لوگ خاموش رہتے ہیں، اس کی تردید نہیں کرتے حتیٰ کہ غور و فکر کی مدت یعنی تین دن یا مجلس علم گزر جاتی ہے اسے اجماع سکوتی کہتے ہیں۔ اور یہ اجماع ہمارے ہاں مقبول ہے۔ اس میں امام شافعیؒ کا اختلاف ہے۔ کیونکہ سکوت جیسا موافقت کے لیے ہوتا ہے ایسے ہی کبھی رعب اور خوف کی وجہ سے بھی ہوتا ہے۔ لہٰذہ وہ رضامندی کی دلیل نہیں۔"

(نور انوار ص ۲۲۳)

نیز ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں کہ

"امام مالکؒ صرف اہل مدینہ کے کسی بات پر متفق ہو جانے کو اجماع کہتے ہیں۔ باقی مدینہ والوں کے علاوہ دوسرے لوگوں کے اتفاق کی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے۔ وہ جب عام اجماع حقیقی ہی کو تسلیم نہیں کرتے تو اجماع سکوتی کو تسلیم کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح شیعہ حضرات صرف اپنے اصطلاحی اہل بیت نبوی یا عترت نبوی کے اتفاق رائے کو اجماع کہتے ہیں ان لوگوں کے نزدیک بھی عام اجماع یا اجماع سکوتی کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔" (نور الانوار ص ۲۲۲)

علامہ شیخ ابو زہرہ مصری اپنی کتاب امام احمد ابن حنبلؒ میں رقم طراز ہیں کہ:

حافظ ابن قیمؒ نے فقہ حنبلی کے اصولوں میں اجماع کو شمار ہی نہیں کیا۔ بلکہ وہ امام احمدؒ سے یہاں تک روایت کرتے ہیں کہ: "جو کسی مسئلہ میں اجماع کا ادعاء کرتا ہے وہ جھوٹا ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اجماع کا وجود ثابت بھی ہو جائے تو اس کا علم بڑا مشکل امر ہے۔"

(امام احمد ابن حنبل ص ۳۶۵ مطبوعہ مطبعہ سلفیہ لاہور)

"امام شافعیؒ نے اپنی مشہور کتاب "اجماع العلم" میں مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی ہے اور اپنا ایک مناظرہ نقل فرمایا ہے اور مد مقابل کو اجماع کے خلاف دلائل سے ہر طرح زچ کر دیا ہے۔ بالآخر اس کے اس سوال پر کہ .... "پھر اجماع کوئی چیز ہے بھی؟" امام شافعی جواب دیتے ہیں کہ:

ہاں فرائض کا بہت بڑا حصہ ایسا ہے جس کے بارے میں کوئی شخص ناواقفیت کا اظہار نہیں کر سکتا۔ پس یہ ایسا اجماع ہے جس کے بارے میں تم کہہ سکتے ہو کہ تمام لوگوں نے ان مسائل پر اجماع کر لیا ہے اور کوئی شخص بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ نہیں یہ اجماع نہیں ہے۔ پس یہ ہے وہ طریقہ جس سے اجماع کی صداقت پر کھی جا سکتی ہے۔ (کتاب جماع العلم ص ۶۳ طبع معارف مصر)

نیز امام شافعیؒ ہی اپنی کتاب "اختلاف الحدیث" میں جو کتاب الام کے حاشیہ پر طبع ہوئی ہے تحریر فرماتے ہیں کہ:

"اصحاب رسول اللہ ﷺ اور تابعین اور تبع تابعین میں سے کسی شخص نے فرائض کے سوا جن کی پابندی کے سب لوگ مکلف ہیں کسی اور مسئلہ پر اجماع نہیں کیا۔ اور میرے علم میں اس زمین کی پشت پر ایسا کوئی عالم بھی نہیں ہے جس نے اس مسلک سے انحراف کیا ہو۔" (اختلاف الحدیث ص ۱۴۷)

اس پوری تفصیل کے بعد کہ امام احمد ابن حنبلؒ، امام شافعیؒ اور امام مالکؒ اس اصطلاحی اجماع کے قائل ہی نہیں جس کی دہائی ہمارے فقہاء ہر مسئلہ میں دیتے ہیں۔ کیا فقہائے حنفیہؒ اس کا ثبوت پیش فرما سکتے ہیں کہ صحابہ، و تابعین یا تبع تابعین نے کسی ایک مقام پر جمع ہو کر اس کا اعلان فرمایا ہو کہ ہم اس پر اتفاق کرتے ہیں کہ دیت عاقلہ (قبیلہ یا خاندان) پر واجب الاداء ہو گی؟ ہمارا خیال ہے کہ اس کا ثبوت بہم پہنچانا ممکن نہیں ہے۔ لہٰذہ اجماع کا دعویٰ ساقط ہو جاتا ہے۔ رہ گیا اجماع سکوتی تو عام فقہاء نے اس کو تسلیم ہی نہیں فرمایا صرف فقہائے حنفیہ رحمۃ اللہ علیہم اس کے قائل ہیں لیکن دلیل کے لحاظ سے ان کا موقف نہایت کمزور ہے۔

پھر یہ بات بھی غور طلب ہے کہ دلائل شرعیہ کی ترتیب یوں ہے۔ (۱) کتاب اللہ، (۲) سنت رسول اللہ، (۳) اجماع اور (۴) قیاس، اجماع کا درجہ دلائل میں تیسرا ہے۔ تو کیا تیسرے درجہ کی دلیل اس قابل ہے کہ وہ اول درجہ کی دلیل یعنی کتاب اللہ کو منسوخ کر دے؟ کتاب اللہ کے عموم کو خاص کر لینا نسخ ہی کی ایک قسم ہے اور ناسخ کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اسی درجہ کی دلیل ہو جس درجہ کی دلیل وہ ہے جسے منسوخ کیا جا رہا ہو۔ اجماع کی حیثیت یہ ہرگز نہیں ہے کہ وہ کتاب اللہ کو منسوخ کر دے۔ ناسخ کو منسوخ سے برتر یا اس کا ہم پلہ ہونا چاہیے لہٰذہ ہم اپنے قصور فہم کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں کہ ہماری سمجھ میں امام ابن رشد قرطبیؒ کی یہ دلیل نہیں آتی۔ خصوصیت سے اس وجہ سے بھی کہ وہ امام مالکؒ کے مکتبہ فکر سے منسلک ہونے کے مدعی ہیں۔

ان دلائل کی روشنی میں ہم سمجھتے ہیں کہ دیت عاقلہ (قبیلہ یا خاندان) پر نہیں بلکہ خود مجرم پر عائد ہونی چاہیے۔

دیت کی مقدار

عربوں میں دیت کی کوئی مقدار متعین نہیں تھی بلکہ ہر قبیلہ اپنی وجاہت و عزت کی بناء پر دیت مقرر کر لیتا تھا۔ جو قبیلہ زیادہ وجیہہ اور زیادہ طاقتور ہوتا تھا اس کے ہاں دیت کا نرخ اس کی وجاہت اور عزت کے پیمانے کے مطابق اتنا ہی زیادہ ہوتا تھا۔ جو قبیلہ کمزور اور ناتواں ہوتا تھا اس کے ہاں نرخ اسی اعتبار سے کم ہوا کرتا تھا۔ قریش کے خاندان میں ایک قریشی کی دیت دس اونٹ ہوا کرتی تھی۔

مولانا شبلیؒ اپنی سیرۃ النبی ﷺ میں لکھتے ہیں کہ:

"انہوں نے (یعنی عبد المطلب نے) منت مانی تھی کہ دس بیٹوں کو اپنے سامنے جوان دیکھ لیں گے تو ایک کو خدا کی راہ میں قربان کر دیں گے (عربوں میں انسانی قربانی کا رواج عام تھا) خدا نے یہ آرزو پوری کی، دسوں بیٹوں کو لے کر کعبہ میں آئے اور پجاری سے کہا کہ ان دسوں پر قرعہ ڈالو، دیکھو کس کے نام پر نکلتا ہے؟ اتفاق سے عبد اللہ کا نام نکلا یہ ان کو لے کر قربان گاہ کو چلے، عبد اللہ کی بہنیں جو ساتھ تھیں رونے لگیں۔ اور کہا کہ ان کے بدلے دس اونٹ قربان کیجئے، ان کو چھوڑ دیجئے، عبد المطلب نے پجاری سے کہا کہ عبد اللہ پر اور دس اونٹوں پر قرعہ ڈالو، اتفاق یہ کہ عبد اللہ ہی کے نام پر قرعہ نکلا، عبد المطلب نے اب دس کے بجائے بیس اونٹ کر دیئے۔ یہاں تک کہ بڑھاتے بڑھاتے سو اونٹ تک نوبت پہنچی تو اونٹوں پر قرعہ آیا۔ عبد المطلب نے سو اونٹ قربان کیے اور عبد اللہ بچ گئے۔ یہ واقدی کی روایت ہے۔ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ اونٹوں کے معاوضہ کی تدبیر روسائے قریش نے تجویز کی تھی۔ (سیرۃ النبی ج ا ص ۱۶۷ تا ۱۶۸ مطبوعہ مطبعہ معارف اعظم گڑھ، انڈیا)

معاوضہ کی یہ تدبیر عبد اللہ کی بہنوں نے پیش کی ہو یا روسائے قریش نے، اور پجاری نے اسے قبول کر لیا۔ ظاہر ہے کہ یہ اسی وجہ سے تھا کہ قبیلۂ قریش میں ایک انسانی خون کی قیمت دس اونٹ ہی ہوا کرتی تھی۔ اور یہ کوئی عجیب بات نہیں، جاہل، اجڈ قبائلی نظام میں انسانی خون کی کوئی زیادہ وقعت نہیں ہوا کرتی، آج بھی قبائل میں (جو عام طور پر مہذب، متمدن اور تعلیم سے آشنا نہیں ہوتے) بات بات پر گولیوں کا تبادلہ ہو جاتا ہے اور سینکڑوں آدمی مر جاتے ہیں اور زخمی ہو جاتے ہیں۔ سرحد اور بلوچستان کے قبائل میں اس کے نمونے دیکھے جا سکتے ہیں۔ اسلام سے پہلے عرب بھی تہذیب و تمدن سے ناآشناء اور علم و ہنر سے بہرہ یاب نہیں تھے، ان میں بھی بات بات پر تلواریں سونت لی جاتی تھیں۔ ان کی جہالت و بربریت کا نقشہ مولانا حالی مرحوم نے اپنی مسدس میں کچھ غلط نہیں کھینچا۔ ان کے ہاں نفس انسانی کی کیا قیمت تھی اور انسان کا خون کتنا ارزاں تھا اسی سے ظاہر ہے کہ عبد المطلب اپنے دس بیٹوں میں سے ایک بیٹے کو قربان کرنے کے لیے آ گئے تھے۔ یہ تو قریش کا حال تھا جو عرب کے دیگر قبائل کے مقابلہ میں تجارت پیشہ ہونے اور دیگر متمدن و مہذب اقوام سے تجارتی روابط کی وجہ سے بہت بہتر پوزیشن کے مالک تھے۔ دیگر قبائل کا حال تو اور بھی ابتر تھا۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ قریش کے علاوہ دوسرے قبائل میں خون انسانی کی ارزانی کا کیا حال ہو گا جبکہ قریشی خاندان کا ایک سردار اپنی منت پوری کرنے کے لیے دس بیٹوں میں سے ایک بیٹے کو قربان کرنے کے لیے

بے تکلف آجاتا ہے کہ دسوں بیٹوں میں سے قرعہ اندازی کر کے متعین کر دو مجھے کون سے بیٹے کو قربان کرنا ہو گا۔ یعنی ایک بیٹے کا خون بہا دینا اور اس کا خون قربان گاہ پر چڑھا دینا کوئی بڑی بات ہی نہیں تھی۔

یہ بات ضمناً آگئی۔ ہمیں بتانا یہ تھا کہ قریش میں ایک انسانی خون کی قیمت دس اونٹوں کے برابر تھی۔

قرآن کریم نے دیت (خون بہا) کی کوئی مقدار متعین نہیں فرمائی اس نے یہی فرمایا ہے کہ:

وَ مَنۡ قَتَلَ مُؤۡمِنًا خَطَـًٔا فَتَحۡرِیۡرُ رَقَبَۃٍ مُّؤۡمِنَۃٍ وَّ دِیَۃٌ مُّسَلَّمَۃٌ اِلٰۤی اَہۡلِہٖۤ اِلَّاۤ اَنۡ یَّصَّدَّقُوۡا ؕ (النساء:۹۲)

”جو کسی مسلمان آدمی کو غلطی یا شبہ سے قتل کر دے تو اسے ایک مسلمان کی گردن آزاد کرنی ہو گی اور مقتول کے ورثاء کو خون بہا حوالہ کرنا ہو گا بجز اس کے وہ معاف کر دیں۔“

خون بہا کی مقدار متعین کر کے بتا دینا حق تعالیٰ کے لیے کوئی مشکل بات نہیں تھی جبکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ خون بہا کے ساتھ ایک مسلمان گردن کو آزاد کرنے کا حکم بھی دیا جا رہا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ اگر ایک مسلمان گردن کو آزاد کرنا اگر دشوار ہو تو۔

فَمَنۡ لَّمۡ یَجِدۡ فَصِیَامُ شَہۡرَیۡنِ مُتَتَابِعَیۡنِ ۫ تَوۡبَۃً مِّنَ اللّٰہِ ؕ

”جو کوئی ایک مسلمان گردن کو آزاد کرانے کی (استطاعت نہ پائے تو اسے دو مہینے کے لگا تار روزے رکھنے ہوں گے۔ یہ اللہ کی طرف سے اس جرم کی توبہ ہے۔“ (النساء:۹۲)

یہاں روزوں کو مبہم نہیں چھوڑا گیا بلکہ صراحتًا بیان کر دیا کہ روزے دو ماہ کے رکھنے ہوں گے یعنی ساٹھ دن کے اور وہ بھی لگا تار۔ اتنی تصریح اور تفصیل کے ساتھ روزوں کا بیان فرمایا گیا ہے۔ تو اسی طرح صاف اور صراحت سے یہ بیان کر دینا بھی مشکل تھا کہ دیت میں دس اونٹ یا بیس اونٹ یا سو اونٹ دینے ہوں گے۔

چونکہ ہر زمانہ میں ہر معاشرے کے حالات یکساں نہیں ہو سکتے۔ خون کی قیمت بھی دنیا کی تمام چیزوں کی طرح گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ پھر ہر ملک میں اونٹ میسر نہیں ہو سکتے۔ اس لیے کسی طرح کا تعین امر دشوار تھا۔ اس سے قوم بڑی تنگی میں پڑ جاتی جو رحمت الٰہی کو منظور نہیں تھا۔ لہٰذہ اس نے خود متعین کر دینا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ پھر وہ ابد الآباد تک کے لیے ایک متعین قیمت ہو جاتی۔ لہٰذہ اس کو غیر متعین چھوڑنے سے مقصد ہی یہ تھا کہ ہر زمانہ کا ہر معاشرہ اپنے احوال و کوائف کو دیکھتے ہوئے یہ بات خود ہی طے کرے کہ ہمارے معاشرے کے ان حالات میں خونِ انسانی کی قیمت کیا ہونی چاہیے۔

چونکہ عرب معاشرے میں خونِ انسانی کی کوئی قدر و قیمت ہی نہیں سمجھی جاتی تھی اور قتل و غارت گری ایک بچوں کا کھیل بنا ہوا تھا۔ جسے روکنا انتہائی ضروری تھا۔ اور عربوں کو یہ احساس دلانے کی ضرورت تھی کہ خون مسلم انتہائی محترم چیز ہے۔ جانِ مسلم کا احترام مقصد اسلام بھی ہے اور امن وامان قائم کرنے کے لیے ایک جزو لاینفک بھی ہے۔ لہٰذہ آنحضرت ﷺ نے عرب معاشرے کے حالات کو دیکھتے ہوئے اور یہ دیکھتے ہوئے کہ ان کے ہاں اونٹ بکثرت ہوتے ہیں اور یہ ان کا لازمہ زندگی ہے۔ وہ اسی کا دودھ پیتے تھے۔ اسکی اون سے کپڑے بنا کر پہنتے تھے۔ اس کی کھالوں سے خیمے بناتے تھے۔ اسی کی مینگنیوں سے ایندھن کا کام لیتے تھے۔ اسی کا گوشت کاٹ کر کھاتے تھے۔ ان کے ہاں اونٹ ہی ان کی غذا، اونٹ ہی ان کا لباس اور اونٹ ہی ان کا مکان تھا۔ لہٰذہ وہ اونٹ بکثرت پالتے تھے۔ اور ایک ایک آدمی کے پاس انگنت اونٹوں کی قطاریں ہوتی تھیں۔ حتیٰ کہ عربی زبان میں مال کا لفظ ہی اونٹ کے لیے مخصوص ہو گیا تھا۔ اور یہ کوئی عرب کی امتیازی خصوصیت نہیں تھی۔ ہر ریگستانی علاقہ کی یہی صورت ہوتی ہے۔ لہٰذہ آپ نے اونٹ ہی کی صورت میں دیت یعنی خون بہا کی تعین مناسب سمجھی۔ اور چونکہ آپ یہ چاہتے تھے کہ قتل و غارت گری کی گرم بازاری ختم ہو اور لوگ امن وامان سے رہنا سہنا سیکھیں اس لیے آپ نے جو زیادہ سے زیادہ اس دور کے لحاظ سے قیمت ہو سکتی تھی وہی متعین فرمائی۔ یعنی سو اونٹ۔

پھر چونکہ قتل کر دینا ان کے ہاں ایک معمولی کھیل بن گیا تھا اور قبائل عصبیت کی شدت کی وجہ سے پورا قبیلہ مجرم کا پشت پناہ ہوا کرتا تھا۔ اور اپنے قبیلہ کی شہہ پر ہی لوگ دوسرے قبیلے کے لوگوں کو قتل کر ڈالتے تھے حتیٰ کہ اگر اس قتل کے نتیجہ میں کوئی جنگ چھڑ جاتی تو پورا قبیلہ ایک آواز پر جمع ہو جاتا اور دشمن سے نبرد آزما ہو جانے میں پس و پیش نہیں کرتا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ قبیلے والے یہ پوچھنے کی بھی زحمت گوارہ نہیں کرتے تھے کہ بات کیا ہے۔ دہائی دینے والے نے کیوں دہائی دی ہے۔ قصور کس کا ہے۔ خود دہائی دینے والے کا قصور ہے یا جس کے خلاف دہائی دی جا رہی ہے اس کا قصور ہے۔ صلح جوئی کا کوئی امکان ہے یا نہیں۔ انہیں ان تمام امور سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ صرف یہ دیکھتے تھے کہ پکارنے والے نے یا قریش یا تمیم، یا بنی ربیعہ اور یا بنی مخزوم کا نعرہ لگایا ہے اور اس نے اپنے خاندان کی دہائی دی ہے۔ اس لیے ہمارا فریضہ ہے کہ ہم اس کی اعانت کے لیے حاضر ہو جائیں اور دشمن کی گردنیں مارنی شروع کر دیں۔ لہٰذہ آپ نے مناسب سمجھا کہ ان حالات میں اجتماعی جرمانہ کی صورت میں سزا دی جائے۔ ویسے بھی ایک آدمی کے لیے سو اونٹ مہیا کرنا آسان نہیں تھا۔ اجتماعی جرمانے کی شکل ہی میں اسے بروئے کار

لایا جاسکتا تھا۔ اور قبائلی نظام میں یہ صورت اجتماعی جرمانے کے علاوہ امداد باہمی کی بھی ایک صورت تھی۔ ویسے ان حالات میں یقیناً ہر قبیلہ اپنے آدمی کے ساتھ اس اعتبار سے جرم میں شریک بھی ہوتا تھا کہ وہ کم از کم اسے معیوب نہیں سمجھتا تھا اور اس کی پشت پناہی اور نصرت کے لیے کمربستہ تھا۔ لہٰذہ ان پر بوجھ ڈالنا عین مناسب تھا۔

لیکن آج ہمارے ہاں وہ قبائلی نظام ہے، نہ وہ خاندانی عصبیت ہے، نہ اونٹوں کی وہ کثرت ہے، نہ خون انسانی کی وہ ارزانی ہے جو عربوں میں اس وقت موجود تھی۔ اس لیے ہماری قطعی رائے یہی ہے کہ اپنے احوال و کوائف کو دیکھتے ہوئے ہمارے ملک کی پارلیمنٹ خود طے کرے کہ انسانی خون قیمت کیا ہونی چاہیے۔ وہ مقدار نہ اتنی گراں ہو کہ اس کو مہیا کرنا ہی ناممکن ہو جائے اور نہ اتنی ارزاں ہو کہ اس سے خون انسانی کی حرمت اور اس کے تقدس کا کوئی تصور ہی نہ ابھر سکے۔

ھذا ما رائیتہ واللہ اعلم۔

امام ابن رشد قرطبی فرماتے ہیں کہ:

امام اهل الذهب والورق فانهم اختلفوا ايضا فيما يجب من ذالك عليهم فقال مالك على اهل الذهب الف دينار وعلى اهل الورق اثناعشرة الف درهم وقال اهل العراق على اهل الورق عشرة آلاف درهم وقال الشافعي بمصر لايوخذ من اهل الذهب ولا من اهل الورق الا قيمة الابل بالغة ما بلغت وقوله بالعراق مثل قول مالك وعمدة مالك ان تقوم عمر ابن الخطاب المائة من الابل على اهل الذهب باالف دينار وعلى اهل الورق با ثنى عشر الف درهم واجماعهم على تقويم المثقال بها في الزكوة واما الشافعي فيقول ان لا اصل في الدية انما هو مائة بعير وعمر انما جعل فيها الف دينار على اهل الذهب واثنى الف درهم على اهل الورق۔ لان ذالك كان قيمة الابل من الذهب والورق في زمانه والحجة له ما روى عن عمرو ابن شعيب عن ابيه عن جده انه قال كانت الديات على عهد رسول الله ﷺ ثمان مأة دينار وثمانية آلاف درهم ودية اهل الكتاب على النصف من دية المسلمين قال فكان ذلك حتى استخلف عمر فقام خطيبا فقال ان الابل قد غلت ففرضها عمر على اهل الورق اثنى عشر الف درهم وعلى اهل الذهب الف دينار وعلى اهل البقرة مأتى بقرة وعلى اهل الشاة الفى شاة وعلى اهل الحلل مأتى حلة وترك دية اهل الذمة لم يرفع فيها شيئا (**بداية المجتهد** ج۲ ص۴۱۱)

"رہ گئے سونے چاندی والے تو فقہاء نے اس میں بھی اختلاف کیا ہے کہ ان پر اس میں کیا واجب ہو گا؟ امام مالکؒ نے فرمایا ہے کہ سونے والوں پر ایک ہزار دینار اور چاندی والوں پر بارہ ہزار درہم واجب ہوں گے۔ اور اہل عراق نے کہا کہ چاندی والوں پر دس ہزار درہم واجب ہوں گے۔ امام شافعیؒ نے مصر میں جانے کے بعد فرمایا کہ سونے والوں سے اور ایسے ہی چاندی والوں سے وہی قیمت لی جائے گی جو سو اونٹوں کی قیمت ہو گی خواہ اس کی مقدار کتنی ہی کیوں نہ ہو اور جبتک وہ عراق میں رہے امام شافعیؒ کا قول بھی وہی تھا جو امام مالکؒ کا قول تھا۔ اور امام مالکؒ کی بہترین دلیل یہ ہے کہ حضرت عمر ابن الخطابؓ نے سو اونٹوں کی قیمت سونے والوں کے لیے ایک ہزار دینار اور چاندی والوں کے لیے بارہ ہزار درہم مقرر فرمائی تھی۔ اور زکوٰۃ کے سلسلہ میں مثقال کی قیمت اسی حساب سے لگانے پر تمام فقہاء نے اتفاق کیا ہے۔ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ دیت میں اصل سو اونٹ ہی ہیں اور حضرت عمرؓ نے اس میں سونے والوں پر ایک ہزار دینار اور چاندی والوں کے لیے بارہ ہزار درہم اسی لیے مقرر کی تھی کہ ان کے زمانہ میں اونٹوں کی قیمت سونے چاندی سے یہی ہو تیتھی اور ان کی دلیل وہ روایت ہے جو عمرو ابن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں دیتیں آٹھ ہزار دینار اور آٹھ ہزار درہم ہوا کرتی تھیں اور اہل کتاب کی دیت مسلمانوں کی دیت سے آدھی ہوا کرتی تھی، یہی مقدار اس وقت تک باقی رہی جب تک حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے، جب وہ خلیفہ ہوئے انہوں نے خطبہ دیا اور فرمایا کہ اونٹ اب گراں ہو گئے ہیں چنانچہ حضرت عمرؓ نے چاندی والوں پر بارہ ہزار درہم اور سونے والوں پر ایک ہزار دینار مقرر کر دیئے۔

نیز گائے والوں پر دو سو گائیں اور بکری والوں پر دو ہزار بکریاں اور کپڑے والوں پر دو سو حُلّے (جوڑے) مقرر فرما دیئے اور ذمیوں کی دیت اپنے حال پر باقی رکھی اس میں کوئی اضافہ نہیں فرمایا۔

امام ابن رشد قرطبی کے قول کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں چونکہ اونٹوں کی قیمت بڑھ گئی تھی اس لیے حضرت عمرؓ نے آٹھ ہزار درہم کے بجائے بارہ ہزار درہم مقرر فرمادی تھی۔ امام شافعیؒ نے اسی بات سے استدلال فرمایا کہ دیت میں اصل سو اونٹ ہیں۔

سونے چاندی وغیرہ سے اسی حساب سے دیت دی جائے گی جو اونٹوں کی قیمت بنتی ہو۔ حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں چونکہ سو اونٹ آٹھ ہزار درہم کے ہوا کرتے تھے۔ اس لیے دراہم میں دیت آٹھ ہزار تھی لیکن حضرت عمرؓ کے زمانہ میں سو اونٹ بارہ ہزار درہم کے ہو گئے تھے اس لیے انہوں نے دیت کی رقم بارہ ہزار درہم کر دی۔ امام شافعیؒ کا یہ استدلال ایک غلط فہمی پر مبنی ہے واقعہ یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے عہد میں مسلمانوں کا

کوئی اپنا سکہ نہیں تھا۔ دراہم و دنانیر ایران، عراق اور شام سے آتے تھے اور وہی عرب میں مستعمل تھے۔ ان کے اوزان مختلف ہوا کرتے تھے۔ بعض کم ہوتے تھے۔ چھوٹے درہم ایک دینار کے بارہ ہوتے تھے اور جن کا وزن زیادہ ہوتا تھا وہ ایک دینار کے دس آتے تھے۔

چنانچہ بلاذری نے اپنی فتوح البلدان میں لکھا ہے کہ:

"ہم سے حسین ابن الاسود نے بیان کیا، ان سے یحییٰ ابن آدم نے، ان سے حسن بن صالح نے کہ عجمیوں کے بنائے ہوئے درہم مختلف تھے، چھوٹے بھی، بڑے بھی چنانچہ وہ درہم ایک مثقال کا ڈھالتے تھے۔ اور وہ بیس قیراط کا ہوتا ہے اور کچھ درہم بارہ قیراط کے ڈھالتے تھے۔ اور دس (۱۰) قیراط کے درہم بھی ڈھالتے تھے اور یہ نصف مثقال کے ہوتے تھے۔ جب اللہ اسلام کو لایا اور زکوٰۃ ادا کرنے میں درمیانی درہموں کی ضرورت لاحق ہوئی تو انہوں بیس قیراط اور بارہ قیراط اور دس قیراط کو جمع کیا تو یہ کل بیالیس قیراط ہوئے تو انہوں نے اس کا تہائی نکالا اور وہ چودہ قیراط کا وزن ہوا چنانچہ عربی درہم انہوں نے چودہ قیراط کا بنایا۔ دینار عزیز کے قیراطوں سے تو ہر دس درہم کا وزن سات مثقال ہوا۔ یہ ایک سو چالیس قیراط ہوئے سبعہ (سات) کے وزن سے حسن ابن صالح کے علاوہ دوسرے لوگوں کا بیان ہے کہ عجمیوں کے دراہم ایسے بھی تھے جن میں سے دس کا وزن سات مثقال ہوا کرتا تھا اور ایسے بھی تھے کہ دس دراہم کا وزن پانچ مثقال ہوا کرتا تھا۔ ان سب کو جمع کیا گیا تو سب کا وزن اکیس مثقال ہوا تو انہوں نے اس مجموعہ کا تہائی لے لیا اور وہ سات مثقال ہوا چنانچہ عربوں نے ایسے درہم بنائے جن کے دس کا وزن سات مثقال تھا۔ دونوں اقوال کا مآل ایک ہی ہے۔ (فتوح البلدان ص ۴۷۱)

اس موضوع پر شیخ الاسلام علامہ ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب اعلاء السنن (ج ۱۸ ص ۱۳۱ تا ۱۴۰ مطبوعہ سپر آرٹ پریس فریر روڈ کراچی) میں سیر حاصل بحث فرمائی ہے اسے دیکھ لیا جائے۔

چنانچہ حضرت علامہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

اور یہ کہنا کہ دیت کی مقدار کا اختلاف اس وجہ سے تھا کہ اونٹوں کی قیمت میں اتار چڑھاؤ ہوتا تھا اس کی تردید اس بات سے ہو جاتی ہے کہ حضرت عمرؓ کی دونوں روایتوں میں یہ بات مشترک ہے کہ دیناروں سے انہوں نے دیت کی مقدار ایک ہزار دینار ہی بتائی ہے۔ اگر اونٹوں کی قیمت میں اختلاف کی وجہ سے دراہم کی مقدار میں کمی بیشی ہوئی تھی تو دیناروں سے فیصلہ کرنے میں کمی بیشی ہونی لازمی تھی۔ ایسے ہی اس سے بھی اس کی تردید ہو جاتی ہے کہ دو سو گائے، دو ہزار بکریاں، دو سو حُلّے (جوڑے) دونوں روایتوں میں مشترک ہیں، ان میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوئی۔ دیناروں کی قیمت میں اختلاف کا امکان نہیں ہے۔ اس کا بطلان ہم پہلے ہی کر چکے ہیں لہٰذہ یہ بات متعین ہے دراہم کے وزن اور قیمت میں اختلاف ہی کی وجہ سے تھا یہ اختلاف تھا کسی اور وجہ سے نہیں۔ (اعلاء السنن ج۱۸ ص ۱۳۴)

اس سے ہم یہ نتیجہ نکالنے میں غالباً حق بجانب ہیں کہ دیت کے معاملہ میں اونٹ کوئی مرکزی حیثیت کے مالک نہیں ہیں بلکہ عرب معاشرہ میں چونکہ اونٹ ہی مرکزی اہمیت رکھتے تھے اس لیے اونٹوں سے دیت مقرر کر دی گئی تھی۔

چونکہ عربوں میں اونٹ ہی مال کہلاتے تھے اس لیے ضروری نہیں کہ دوسرے معاشروں میں بھی جہاں اونٹوں کو مرکزی اہمیت حاصل نہیں ہے اونٹوں ہی کی پابندی کی جائے دوسرے معاشروں کے لیے دینار اور درہم، بکریاں اور گائیں اور حُلّے (کپڑوں کے جوڑے) بھی معیار بن سکتے ہیں۔ اور جب اونٹ گراں ہو گئے تو حضرت عمرؓ نے اونٹوں کے بجائے دینار و درہم کو دیت (خون بہا) کا بدل بنانے میں پس و پیش نہیں فرمایا۔ آج کل سونا اور چاندی بھی گراں ہو گیا ہے اور اس کے نرخ آسمان سے باتیں کر رہے ہیں اس لیے اس میں پھر تبدیلی ہونی چاہیے اور تبدیلی ہو سکتی ہے۔ لہٰذہ کچھ ضروری نہیں کہ آج بھی دینار و درہم کو معیار مان کر سونے اور چاندی کی قیمت لگا کر دیت کی مقدار کا تعین کرنے کی کوشش کی جائے۔ آج کل سونا اور چاندی معیار نہیں رہا بلکہ اس کی جگہ کرنسی نے لے لی ہے۔ لہٰذہ ہماری حکومت کو از سر نو دیت کی مقدار کا تعین کرنا چاہیے اور بتانا چاہیے کہ ہمارے اس دور میں انسانی خون اور انسانی جان کی قیمت کیا ہونی چاہیے۔

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ قتل خطاء میں دیت کا بار عاقلہ (قاتل کے خاندان) پر ڈالنا نہ صرف یہ کہ قرآنی اصول مسلمہ کے خلاف ہے بلکہ موجودہ غیر قبائلی نظام میں اس پر عمل پیرا ہونا بھی ممکن نہیں رہا ہے۔ لہٰذہ یہ بار خود قاتل پر ہی ڈالنا ہو گا۔ لہٰذہ حکومت اس نکتہ کو بھی ذہن میں رکھے کہ دیت (خون بہا) کی جو مقدار بھی مقرر کی جائے وہ لازماً اتنی ہو کہ ایک فرد واحد اسے ادا کر سکے۔ ہماری اسلامی نظریاتی کونسل نے اس ضمن میں جو سفارشات پیش کی ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ وہ اس معیار پر پوری نہیں اترتیں۔ دیت کی جو مقدار انہوں نے بتائی ہے وہ ایک فرد واحد کی استطاعت سے یقیناً زیادہ ہے۔ لہٰذہ اس پر مزید غور فکر کرنے کی ضرورت ہے۔

کفارہ

قتل خطاء میں قرآن کریم نے دو کفارے بتائے ہیں ایک تو یہ کہ کوئی غلام یا کنیز آزاد کی جائے۔ اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو دو مہینے کے متواتر

روزے رکھے جائیں حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ کفارے صرف یہ دو ہی ہو سکتے ہیں اس میں فقہاء کا کوئی اختلاف بھی نظر سے نہیں گزرا۔ موجودہ حالات میں جبکہ ایک غلام کو آزاد کرنا ممکن نہیں رہا۔ اگر کوئی شخص اتنا ضعیف ہے کہ وہ دو مہینے کے لگاتار روزے نہیں رکھ سکتا تو اسکے لیے کفارہ کی صورت کیا ہو۔

یہ مسئلہ قابل غور ہے۔ میرے خیال میں حضور اکرم ﷺ نے جنین کے بدلے میں جبکہ دو عورتوں میں لڑائی ہوئی تھی اور ایک عورت نے دوسری عورت کو پتھر مار دیا تھا جس سے ایک کا حمل ساقط ہو گیا تھا۔ حضور اکرم ﷺ نے ایک غلام یا کنیز آزاد کرنے کا حکم دیا تھا اور اس سلسلہ میں آپ نے پانچ سو درہم یا پچاس دینار ایک غلام کی قیمت ادا فرمانے کی اجازت دی تھی اس زمانہ میں جبکہ غلام دستیاب تھے ایک غلام کی قیمت بھی معلوم ہو جاتی ہے، لہٰذہ پانچ سو درہم کے بقدر موجودہ کرنسی میں غلام کی قیمت ادا کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ فقہاء نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ غلام کی قیمت دیت کا نصف عشر یعنی بیسواں حصّہ ہوتی ہے۔ لہٰذہ حکومت وقت دیت کی جو مقدار طے کرلے۔ اس کا بیسواں حصہ کفارہ کا بھی مقرر کر دے جو غرباء مساکین اور یتامیٰ کو دلوایا جائے کہ یہ انہیں کا حق ہے۔ دیت کی رقم مقتول کے ورثا کو دلائی جائے اور کفارہ کی رقم یتامیٰ، مساکین اور فقراء کو دلوائی جائے۔ واللہ اعلم

اس سلسلہ میں روایات کی تفصیل حضرت شیخ الاسلام علامہ ظفر احمد عثمانیؒ نے اعلاء السنن ج ۱۸ ص ۱۹۸ مطبوعہ سپر آرٹ پریس کراچی، میں بیان فرمادی ہے وہاں دیکھنی چاہیے۔

عورت کی دیت

ہمارے فقہاء عموماً اس کے قائل ہیں کہ اگر کسی کے ہاتھ سے غلطی یا شبہ سے کوئی عورت قتل ہو جائے تو قتل خطاء میں عورت کی دیت، مرد کی دیت (خون بہا) سے نصف ہو گی کیونکہ عورت کا حال مرد کے حال سے ناقص تر اور اس کی منفعت مرد کی منفعت سے کم تر ہے۔ یہ دلیل ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر عورت نہ ہو تو مرد کہاں سے پیدا ہوں۔ مردوں اور عورتوں دونوں کی پیدائش ہی عورت پر منحصر ہے لہٰذہ یہ کہنا کہ عورت کا حال مرد سے ناقص تر اور اس کی منفعت مرد سے کم تر ہے۔ ایسی بات ہے جسے عقل و بصیرت قبول نہیں کرتی۔ قرآن کریم نے عام حکم دیا ہے:

وَ مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّ دِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا (النساء:۹۲)

"اور جو کوئی کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے تو ایک مومن گردن کو آزاد کرنا ہو گا اور مقتول کے اہل (ورثہ) کو دیت ادا کرنی ہو گی بجز اس کے وہ صدقہ کر دیں یعنی دیت معاف کر دیں۔"

اس آیت کریمہ میں قرآن کریم نے مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں کیا دونوں کے لیے دیت ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ اخبار آحاد سے قرآن کریم کے عام حکم کو خاص نہیں کیا جا سکتا۔ علامہ شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ:

ابن قدامہ نے مغنی میں کہا ہے کہ ابن المنذر اور ابن عبد البر نے کہا ہے کہ اہل علم کا اس پر اتفاق ہے کہ عورت کی دیت مرد سے آدھی ہوتی ہے اور ان دونوں کے علاوہ دوسرے علماء نے بیان کیا ہے کہ ابن علیہ اور اصم دونوں کا قول یہ ہے کہ عورت کی دیت مرد کے برابر ہوتی ہے۔ کیونکہ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ ہر مومن جان میں سو اونٹ دیت کے ہوتے ہیں اور یہ قول شاذ ہے جو صحابہ کے اجماع اور سنت نبوی ﷺ کے خلاف ہے۔ کیونکہ عمرو ابن حزم کے نام خط میں یہ موجود ہے کہ عورت کی دیت مرد کی دیت سے آدھی ہوتی ہے۔ الخ (اعلاء السنن ج ۱۸ ص ۱۴۶ مطبوعہ سپر آرٹ پریس کراچی)

حضرت شیخ الاسلامؒ نے اعلاء السنن "باب دیت المرأۃ" میں تفصیل سے ان تمام روایات کو بیان کر دیا ہے جو اس باب میں پیش کی جاتی ہیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ ان میں سے کوئی ایک روایت بھی صحیح نہیں ہے۔ تمام روایات مجروح ہیں لے دے کر ایک وہی روایت رہ جاتی ہے جو حضور اکرم ﷺ کے اس نامہ مبارک کے نام سے پیش کی جاتی ہے جو آپ نے حضرت عمرو ابن حزم رضی اللہ عنہ کے نام لکھا تھا اور جس میں عورت کی دیت مرد کی دیت سے نصف بتائی گئی ہے۔ لیکن خطوط سے کوئی بات ثابت نہیں ہو سکتی جب تک دو شاہد اس کی بات کی شہادت نہ دیں کہ یہ خط ہمارے سامنے فلاں صاحب نے لکھا تھا اور ہمیں اس کا مضمون پڑھ کر سنا دیا تھا اور ہم نے اسے سمجھ لیا تھا اور کاتب نے ہمارے سامنے اس پر اپنی مہر ثبت کی تھی اور ہمارے حوالہ کر دیا تھا۔ چنانچہ ہدایہ میں "باب کتاب القاضی الی القاضی" کے تحت اس پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ مختصراً ہم اس کے چند فقرے نقل کرتے ہیں۔

"اور کوئی خط بغیر دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت کے قبول نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ خط، خط کے مشابہ ہو سکتا ہے۔ لہٰذہ حجت تامہ کے بغیر اس کا ثبوت مہیا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ خط بھی کسی بات کو لازم کرنے والا ہے تو حجت قائم ہونا ضروری ہے اور واجب ہے کہ خط کو دو گواہوں کے سامنے پڑھ دیا جائے تا کہ وہ سمجھ لیں کہ خط میں کیا ہے یا وہ انہیں بتائے کہ میں نے خط میں یہ کچھ لکھا ہے۔ کیونکہ علم کے بغیر شہادت نہیں ہو سکتی پھر وہ گواہوں کے سامنے (خط کو بند کر کے) اس پر مہر لگائے اور پھر ان کے حوالہ کرے۔ (ہدایہ ج ۳ ص ۱۳۹ مطبوعہ کلام کمپنی کراچی)

ہمیں افسوس ہے کہ عمرو ابن حزم رضی اللہ عنہ کے نام اس خط کے سلسلہ میں ایسی کوئی بات آج تک سامنے نہیں آئی کہ اس خط میں ان شرائط میں سے کوئی ایک شرط بھی موجود تھی۔ اس لیے اس خط سے کوئی استدلال کرنا صحیح نہیں ہے۔

کافر کی دیت

عجیب بات ہے کہ ذمی (اسلامی حکومت کے ماتحت رہنے والے کافر) کی دیت پوری ہوتی ہے اور مسلم اور غیر مسلم میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ حالانکہ قرآن کریم نے خصوصیت کے ساتھ

وَ مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِیْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّ دِیَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰۤى اَهْلِهٖۤ (النساء:۹۲)

فرمایا ہے، یعنی جو غلطی سے کسی مومن کو قتل کر دے تو ایک مومن گردن کو آزاد کرنا ہو گا اور مقتول کے گھر والوں (ورثاء) کو دیت حوالہ کرنا ہو گی۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایک ذمی کافر مومن ہوتا ہے اور ایک مومن عورت مومن نہیں ہوتی؟

ہم ذمی کافر کی دیت میں کسی کمی کے حق میں نہیں ہیں۔ ہمارے خیال میں اس کی دیت بھی پوری ہونی چاہیے اور ہم اس ضمن میں فقہائے حنیفہؒ کی تائید کرتے ہیں لیکن مومن عورت کے سلسلہ میں ہمیں اس سے اختلاف ہے اور ہم اس سلسلہ میں امام ابن علیہ اور امام ابو بکر الاصم کے قول کی تائید کرتے ہیں کیونکہ یہی قول ہمارے خیال میں قرآن کریم کے مطابق ہے واللہ اعلم۔

اس سلسلہ میں امام شافعیؒ سے منقول ہے کہ یہودی اور نصرانی کی دیت چار ہزار درہم ہونی چاہیے اور مجوسی کی دیت آٹھ سو درہم ہونی چاہیے۔ امام مالک کا ارشاد ہے کہ یہودی اور نصرانی کی دیت چھ ہزار درہم ہونی چاہیے اور امام مالکؒ نے عمرو ابن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے جو روایت آتی ہے اس سے استدلال فرمایا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ عقل الکافر نصف عقل المسلم یعنی کافر کی دیت مسلمان کی دیت سے آدھی ہوتی ہے اور مسلم کی دیت ان کے نزدیک بارہ ہزار درہم ہوتی ہے۔ امام شافعیؒ نے بھی عمرو ابن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند سے اس روایت سے استدلال فرمایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسلمان سے جس نے اہل کتاب کے ایک آدمی کو قتل کر دیا تھا چار ہزار درہم دلوائے تھے۔ اس روایت کو عبد الرزاق نے اپنی مصنف میں بیان کیا ہے۔ نیز امام شافعیؒ نے خود اپنی مسند میں عن فضیل ابن عیاض عن منصور عن ثابت عن سعید ابن المسیب عن عمر بن الخطابؓ کی سند سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے یہودی اور نصرانی کی دیت چار ہزار درہم اور مجوسی کی دیت آٹھ سو درہم دلوائی تھی (ملا علی قاری)

فقہائے حنفیہؒ کی دلیل وہ روایت ہے جو امام ابو داؤد نے اپنی سنن میں سعید ابن المسیب سے روایت فرمائی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

دیة کل ذی عھد فی عھدہ الف دینار

"یعنی ہر وہ شخص جس سے معاہدہ ہو چکا ہو معاہدہ کے دوران اس کی دیت ایک ہزار دینار ہو گی۔"

یہ روایت باوجودیکہ مرسل ہے لیکن چونکہ قرآن سے قریب تر ہے اس لیے قابل اعتماد ہے اور ہم اسی کو ترجیح دیتے ہیں۔

اعضاء میں دیت

غلطی سے اگر کسی نے کسی کے کسی عضو کو کاٹ دیا جس سے اس کی منفعت ختم ہو گئی تو پوری دیت واجب ہو گی۔ چنانچہ اگر کسی نے کسی کی ناک (بانسہ) کاٹ دیا، یا زبان کاٹ دی یا آلہ تناسل کاٹ دیا یا سر پر چوٹ ماری جس سے اس کی عقل زائل ہو گئی یا ایسی چوٹ ماری کہ اس کی بصارت، سماعت، سونگھنے یا چکھنے کی قوت زائل ہو گئی تو پوری دیت واجب ہو گی، نیز کسی نے کسی کی ڈاڑھی اس طرح مونڈ دی کہ وہ دوبارہ نہ اگ سکے یا اس طرح سر کے بال مونڈ دیئے کہ وہ دوبارہ پیدا نہ ہو سکیں تو پوری دیت واجب ہو گی۔

امام مالکؒ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ دونوں صورتوں میں دو معتبر آدمی جو کچھ فیصلہ کریں وہ مقدار دلوائی جائے گی، دیت واجب نہیں ہو گی۔

اگر کسی نے دوسرے کی مونچھیں مونڈ دیں تب بالاتفاق دو معتبر آدمیوں کے فیصلے پر عمل کیا جائے گا۔ ایسے ہی کسی نے کسی کی دونوں بھنویں مونڈ دیں تو پوری دیت دینی ہو گی۔ اگر ایک بھوں مونڈ دی ہے تو نصف دیت دینی ہو گی۔

اگر کسی نے غلطی سے کسی کی دونوں آنکھیں پھوڑ دیں یا دونوں ہاتھ کاٹ دیئے یا دونوں پاؤں کاٹ دیئے یا دونوں ہونٹ کاٹ دیئے یا دونوں کان کاٹ دیئے یا دونوں بیضے کاٹ دیئے تو پوری دیت واجب ہو گی۔ اگر ان میں سے کسی ایک عضو کو کاٹ دیا تو نصف دیت واجب ہو گی۔ اگر کسی نے کسی عورت کی دونوں چھاتیاں کاٹ دیں تو پوری دیت اور اگر کسی نے عورت کی چھاتی سے اس کے سر پستان کاٹ دیئے تو پوری دیت اور اگر ایک سر پستان کاٹ دیا تو نصف دیت واجب ہو گی۔

ایسے ہی اگر کسی نے دوسرے کی چاروں پلکیں کاٹ دیں تو پوری دیت دینی ہو گی۔ اگر صرف ایک پلک کاٹی ہے تو دیت کا چوتھائی دینا ہو گا۔ کیوں کہ ہر آدمی کی چار پلکیں ہوتی ہیں۔ اگر کسی نے دوسرے کی پلکیں تو نہیں کاٹیں لیکن پلکوں کے سارے بال کاٹ دیئے تو پوری دیت واجب ہو گی، اگر

صرف ایک پلک کے بال کاٹ دیئے ہیں تو دیت کا چوتھائی دینا ہو گا۔

اگر کسی نے ہاتھوں پیروں میں سے دوسرے کی ایک انگلی کاٹ دی تو دیت کا دسواں حصہ ادا کرنا ہو گا۔ کیونکہ انگلی کا صرف ایک پورا کاٹ دیا ہے تو دیت کے دسویں حصہ کا ایک تہائی ادا کرنا ہو گا۔

ایسے ہی اگر کسی نے غلطی سے کسی کا ایک دانت توڑ دیا تو پانچ اونٹ یا ان کی قیمت ادا کرنا ہو گی۔ اس میں دانت اور ڈاڑھیں سب کا حکم ایک ہی عضو کا ہے۔ اگر کسی نے کسی عضو پر ضرب لگا دی جس سے اس کی منفعت زائل ہو گئی۔ مثلاً ہاتھ پر چوٹ ماری جس سے وہ شل ہو گیا یا آنکھ پر چوٹ لگی اور اس کی بصارت زائل ہو گئی یا ریڑھ کی ہڈی پر ضرب لگائی کہ اس کے توالد و تناسل کی قوت زائل ہو گئی یا وہ اس ضرب سے کبڑا ہو گیا تو پوری دیت واجب ہو گی۔

زخموں کے بارے میں

اگر کسی نے دوسرے آدمی کو زخمی کر دیا ہے اور یہ جرم غلطی سے سرزد ہوا ہے تو ہمارے فقہاء نے زخموں کی دس قسمیں بیان کی ہیں جن کی تفصیل شرح اور ان کے احکام کتب فقہ میں تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں چونکہ ان کا تعلق قرآن کریم سے نہیں ہے بلکہ وہ ارشادات نبوی اور فقہاء کے اجتہادات پر مبنی ہیں اس لیے ہم ان سے صرفِ نظر کرتے ہیں ان کے احکام کتب فقہ میں دیکھ لیے جائیں۔

حمل ساقط کر دینا

کسی نے حاملہ عورت کو مار اپیٹا یا دو عورتوں کی آپس میں لڑائی ہوئی اس میں ایک عورت حاملہ تھی اور اس کا حمل ساقط ہو گیا۔ تو اگر عورت نے ایسا حمل ساقط کیا ہے کہ اس میں جان پڑ چکی تھی اور جنین زندہ ساقط ہوا تھا اور سقوط کے بعد مر گیا ہے تو پوری دیت واجب ہو گی اور اگر ابھی جان نہیں پڑی تھی تو آنحضرت ﷺ نے اس میں ایک غلام یا باندی آزاد کرنے کا فیصلہ فرمایا تھا یا دیت کا نصف عشر یعنی پانچ سو درہم ادا کرنے ہوں گے۔ یہ پانچ سو درہم غربا و مساکین کا حق ہو گا۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ نے چھ سو درہم مقرر کئے ہیں۔ حنفیہؒ نے یہ پانچ سو درہم عاقلہ پر ڈالے ہیں۔

اور امام مالکؒ نے خود اس شخص پر ڈالے ہیں جس نے جرم کیا ہے اس سلسلہ میں ہم دیت کے باب میں تفصیل سے بحث کر چکے ہیں ہمارے خیال میں عاقلہ پر دیت کا سوال آج کل خارج از بحث ہے، کیونکہ قبائلی نظام اب رائج نہیں ہے۔ البتہ اگر قبائلی نظام کہیں رائج ہو مثلاً صوبہ سرحد یا آزاد قبائلی علاقوں میں تو وہاں اس پر عمل کیا جا سکتا ہے۔

اگر حمل ساقط ہوا اور ماں بھی مر گئی

اگر ضرب شدید سے حمل بھی ساقط ہو گیا اور ماں بھی مر گئی تو اگر حمل پہلے ساقط ہوا تھا اور ماں بعد میں مری ہے تو مجرم پر دو دیتیں واجب ہوں گی۔ ایک حمل کی دیت یعنی پانچ سو درہم اور دوسری عورت کی دیت۔ اور اگر عورت پہلے مر گئی اور حمل موت کے بعد ساقط ہوا ہے۔ تو اگر حمل زندہ ساقط ہوا تھا اور وہ بعد میں مر گیا تو مجرم پر دو دیتیں کامل واجب ہوں گی کیونکہ وہ دو جانوں کا قاتل ہے اور اگر وہ مردہ ہی ساقط ہوا ہے تو حنفیہؒ فرماتے ہیں کہ اس پر ایک دیت ماں کی واجب ہو گی۔ بچہ کی کوئی دیت واجب نہیں ہو گی کیونکہ یہ ضروری نہیں ہے کہ مجرم کی ضرب ہی سے جنین کی موت واقع ہوئی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ مجرم کی ضرب سے ماں کی موت واقع ہوئی ہو اور ماں کی موت کی وجہ سے جنین کی موت واقع ہو گئی ہو۔ کیوں کہ وہ ماں کے سانس لینے ہی سے سانس لیتا ہے۔ ماں کی موت کی وجہ سے اس کا سانس گھٹ کر اس کی موت واقع ہو سکتی ہے۔ چونکہ شک واقع ہو گیا اس لیے دیت ساقط ہو جائے گی۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ جنین کی دیت بھی واجب ہو گی۔ کیونکہ ظاہر یہی ہے کہ ضرب ہی کی وجہ سے جنین کی موت واقع ہوئی ہے۔ ہم امام شافعیؒ کے ارشاد کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ جنین کی موت واقع ہوئی ہے۔ موت مجرم کی ضرب سے واقع ہوئی یا ماں کے مر جانے اور سانس گھٹنے سے موت واقع ہوئی اس سے نتیجہ میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دو جانوں کی موت واقع ہے اور مجرم دو جانوں کا قاتل ہے، جنین کا سانس گھٹ کر موت واقع ہو تب بھی مجرم بے قصور نہیں ہے۔ جنین کا سانس بھی تو اسی لیے گھٹا کہ مجرم نے اس کی ماں کو مار ڈالا لہٰذہ دونوں موتوں کا سبب وہی ضرب شدید ہے جس کا ارتکاب مجرم نے کیا ہے۔

یہ حکم اس وقت ہے جبکہ مجرم کا ارادہ عورت کو جان سے مار ڈالنے کا نہیں تھا۔ بلکہ قتل غلطی سے سرزد ہوا ہے اور حاکم وقت قتل خطاء کا فیصلہ کرے۔ اگر ارادۃً اس نے ایسا کیا تو دیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہو گا ہم نے شروع میں قتل عمد اور قتل خطاء پر جو بحث کی ہے اسے دوبارہ دیکھ لیں۔

باب البغاۃ

بُغَاۃٌ، بَاغِی کی جمع ہے جو بَغَاوَۃٌ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ اس کا مادہ بَغْیٌ ہے جس کے معنے درمیانہ روی کی حد سے بڑھ جانے کی خواہش (خواہ حد سے تجاوز کر سکے یا نہ کر سکے) کو کہتے ہیں، نیز بہت زیادہ بارش کو کہتے ہیں جو حد

سے بڑھ جائے بغت السماء بادل اپنی حد سے بڑھ گیا۔ بہت زیادہ برسا۔ یہ اس لفظ کے بنیادی معنے ہیں۔

مسلم عوام کی دو جماعتیں آپس میں کسی بات پر جھگڑا کریں اور حکومت اس میں فریق نہ ہو تو اس کو بغاوت نہیں کہا جاسکتا۔ یہ دونوں مسلم جماعتوں کا باہمی جھگڑا ہے۔ اس کے متعلق حکم یہ ہے کہ:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ (النساء:۵۹)

"اے پیروان دعوت ایمانی! اللہ کی اطاعت کرو رسول اور اپنے میں سے اہل حکومت کی اطاعت کرو، پھر اگر کسی چیز میں تم میں آپس میں جھگڑا ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو۔ اگر تم اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہو۔"

اگر حکام وقت سے کسی معاملہ میں جھگڑا ہو تب بھی حکم یہی ہے کہ آنحضرت ﷺ چونکہ حاکم اعلی (final authority) ہیں اس لیے ان سے رجوع کر کے فیصلہ کرالو، اور اپنا نزاع اس فیصلہ کے مطابق ختم کردو۔ آج آنحضرت ﷺ موجود نہیں ہیں تو جو مسلمانوں کی مرکزی قوت آنحضرت کی نائب ہو مثلاً خلیفۂ وقت، امیر ملّت اس سے رجوع کیا جائے مثلاً آج کل کی اصطلاح میں ہائی کورٹ، سپریم کورٹ وغیرہ موجود ہیں وہاں اپیل کی جائے اور متنازع مسئلہ کا فیصلہ کرالیا جائے۔

مسلمانوں کا آپس کا باہمی اختلاف بغاوت نہیں ہے یہ ایک معمولی نزاع ہے۔ بغاوت وہ ہے جس میں ایک فریق حکومت ہو اور دوسرا فریق رعایا کی کوئی جماعت ہو اور یہ جماعت حکومت کی اتھاریٹی کو تسلیم کرنے سے انکاری ہو۔

فقہ کی اصطلاح میں "بغاوت" کسی تاویل کی بنا پر ایک طاقتور جماعت کا خلیفہ (یا حکومت اسلامیہ) کے خلاف خروج (یعنی ایسی مسلح اور جارحانہ مخالفت) کا نام ہے جس کا مقصد خلیفہ (یا حکومت اسلامیہ کے سربراہ) کو اس کے منصب سے معزول کرنا یا اس کی رعیت بننے سے انکار کر دینا یا حکومت کے کسی ایسے حق کی ادائیگی سے انکار کر دینا جس کا ادا کرنا شرعاً اس پر واجب ہو۔

البتہ اگر سربراہ مملکت مرتد ہو جائے تو اس کے ارتداد کی وجہ سے اس کو معزول کر دینا واجب ہے۔ اس کے خلاف خروج اور مسلح جدوجہد کو بغاوت نہیں کہا جاسکتا۔

مملکت کا کوئی حصہ جو اس میں شامل ہے اور اب تک مرکز کی اطاعت کرتا رہا ہے اس سے علیحدہ ہونا چاہے اور مرکز کی اطاعت سے انکار کر دے۔ اگر وہ خود اپنی مستقل آزاد حکومت قائم کرنا چاہتا ہو جو مرکز کی ماتحتی میں نہ ہو تو یہ بغاوت ہے اور اگر وہ اپنا الحاق کسی دوسری اسلامی مملکت سے کرنا چاہتا ہو تب بھی یہ بغاوت ہے۔ کیونکہ وہ اب تک اول مملکت کی ماتحتی میں رہتا آیا ہے اور اب اس سے آزادی حاصل کر کے دوسری کسی اسلامی مملکت سے الحاق چاہتا ہے۔ اس طرح وہ عہد شکنی کا مرتکب ہو رہا ہے جو شرعاً ممنوع ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

وَ اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ﴿۳۴﴾ (الاسراء:۳۴)

"اور عہد کو پورا کرو۔ یقیناً عہد کے متعلق باز پرس ہونی ہے۔"

مملکت اسلامیہ کے باشندوں کا ایک گروہ خلیفہ (سربراہ مملکت) کی مخالفت اس بنا پر کرے کہ اس منصب پر اس کا تقرر یا اس کی بقاء احکام شرعیہ کے خلاف اور ازروئے شریعت ناجائز ہے اور یہ مخالفت اس حد تک بڑھے کہ وہ گروہ حکومت مذکورہ کو معزول کر کے ایک دوسری حکومت قائم کرنے کے لیے تلوار اٹھالے جبکہ خلیفۂ وقت اپنے تقرر یا بقاء کو احکام شرعیہ کے عین مطابق اور ازروئے شریعت جائز سمجھتا ہو تو عامۂ مسلمین کا فریضہ ہے کہ وہ دونوں فریقوں کے درمیان صلح کرادیں اور جس فریق کی غلطی دیکھیں اس کے شبہات و شکوک کو دور کردیں۔ اگر انہیں کوئی بجا شکایت ہو تو اس کا ازالہ کریں۔ اور ان دونوں جماعتوں کا فریضہ ہے کہ وہ عامۂ مسلمین کی ان کوششوں کے ساتھ پورا پورا تعاون کریں۔

لیکن اگر ایک فریق اپنے موقف سے ٹس سے مس نہ ہو اور وہ اپنے موقف پر جما رہے اور کسی مصالحت کو قبول نہ کرے تو جس فریق کی غلطی ثابت ہو جائے۔ وہی فریق اب یعنی مصالحت کی کوشش ناکام ہو جانے کے بعد باغی ہے اور عام مسلمانوں کو اس سے جنگ کرنا واجب ہے تا آنکہ وہ اپنی سرکشی سے باز آجائے اور مصالحت کو قبول کرلے۔

سورۂ حجرات میں ہے:

وَ اِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَ اَقْسِطُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴿۹﴾ (الحجرات:۹)

"اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں (ایک دوسرے سے) لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کرادو۔ پھر اگر ان میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے جنگ کرو، یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے تو وہ اگر وہ لوٹ آئے تو ان دونوں گروہوں کے درمیان انصاف کے ساتھ صلح

کرادو۔ اور (بہر حال) انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتے ہیں۔"

اس آیت کریمہ پر غور کرتے ہوئے مندرجہ ذیل نکات ذہن میں رکھئے کہ:

1- اول تو دونوں فریق، یعنی حکومت اور اس کی مخالفت کرنے والے افراد نہیں ہیں بلکہ ایک طائفہ یعنی ایک جماعت ہیں۔

2- اور دوسرے یہ کہ دونوں مومن ہیں یعنی ایمان کے تقاضوں کو پورا کرنے والے ہیں جو بغیر کسی دلیل شرعی کے کوئی ایسا اقدام نہیں کر سکتے۔

3- اور تیسرے یہ کہ اقتتلوا یعنی وہ دونوں جماعتیں مسلح تصادم یعنی قتال بھی کرتی ہیں لہٰذہ ان میں قتال اور جنگ کی صلاحیت بھی ہے اور وہ اس کا عملی مظاہرہ بھی کر رہی ہیں یہ وہی چیز ہے جسے ہمارے فقہائے کرام نے ذو منعة اور ذو شوكة کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے یعنی دونوں فریق قوت و شوکت کے مالک ہیں اور چونکہ دونوں ایمان کے تقاضوں پر پورے اترنے والے ہیں۔ لہٰذہ دونوں کے پاس شرعی دلائل موجود ہیں۔ یعنی وہ شرعاً اپنے آپ کو حق بجانب بھی سمجھتے ہیں۔

ایسے دونوں فریقوں میں آیت کا حکم یہ ہے کہ اول تو عام مسلمانوں کو صلح کی کوشش کرنی چاہیے اور فریقین کے شبہات کا ازالہ کرنا چاہیے لیکن اگر مصالحت کی کوشش اور شبہات کے ازالہ کے بعد بھی کوئی سا ایک فریق اپنی بات پر بضد رہے تو قرآن کریم اب اسے باغی کہتا ہے:

فَاِنۡۢ بَغَتۡ اِحۡدٰىهُمَا عَلَى الۡاُخۡرٰى

"تو اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرے۔"

تو اب اس باغی (زیادتی کرنے والے گروہ) سے جنگ کرنی ضروری ہے۔

نیز اگر حکومت اور اس کا مخالف گروہ، دونوں ہی اپنے اپنے موقف پر جمے ہوئے ہوں اور وہ صلح قبول نہیں کرتے اور جنگ بند نہیں کرتے تو دونوں گروہوں (حکومت اور حکومت کا مخالف گروہ) کو باغی کہا جائے گا اور دونوں سے جنگ کی جائے گی تا آنکہ وہ مصالحت پر آمادہ ہو جائیں۔ آیت مندرجہ بالا کے مخاطب عامۂ مسلمین ہیں۔ حکومت یا اس کا مخالف گروہ نہیں ہے۔

واضح رہے کہ اس آیت کریمہ میں عامہ مسلمین کو خطاب کر کے انہیں حکم دیا جا رہا ہے کہ فَاَصۡلِحُوۡا بَيۡنَهُمَا، (یعنی تم ان دونوں کے درمیان صلح کرادو) یہاں یہ حکم نہیں دیا جا رہا ہے کہ تم ان دونوں کے درمیان کوئی فیصلہ کر دو۔ بلکہ صلح کرانے کا حکم دیا جا رہا ہے اور ظاہر ہے کہ صلح اس کے بغیر تو نہیں ہو سکتی کہ فریقین کی بات سنی جائے۔ معلوم کیا جائے کہ ہر فریق کو دوسرے کے خلاف کیا شکایات اور شبہات ہیں، ہر فریق کے شبہات و شکایات کا ازالہ کیا جائے لہٰذہ شبہات و شکایات کا ازالہ کرنا ضروری ٹھہرا۔

دونوں فریقوں کا فرض ہوا کہ وہ مصالحت کنندہ جماعت سے پورا پورا تعاون کریں اور فریق مخالف کے شبہات و شکایات کو دور کریں تاکہ تصادم و تزاحم کی یہ فضا ختم ہو اور دونوں بھائی بھائی بن کر رہ سکیں۔

البتہ اگر بالفرض:

1- مملکت اسلامیہ کا کوئی حصہ خلیفہ المسلمین کے انتخاب کو ازروئے آئین اسلام صحیح ہی نہ سمجھتا ہو اور اس بناء پر اس کی خلافت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔

2- اسے خلیفہ تو تسلیم کرتا ہو مگر ہنگامی خلیفہ سمجھتا ہو جو کسی ہنگامی حالت (Emergncy) کی وجہ سے فوری طور پر بطور عبوری حکومت (Enterim- Governament) منتخب کر لیا گیا ہو۔ اس وجہ سے وہ دوبارہ انتخاب کا طالب ہو اور اس کی خلافت کے استمرار کو ناجائز سمجھتا ہو۔ یا۔

3- خلیفہ کے بعض احکام کی تعمیل سے اس بنا پر انکار کر دے کہ اس کے نزدیک اسے ازروئے آئین اسلامی ان کے احکام کے صادر کرنے کا اختیار اور حق ہی نہیں۔

4- کسی خاص حکم کی تعمیل اور اس کے بارے میں خلیفہ کی اطاعت مصالح دینیہ کے خلاف سمجھ کر اس کی اطاعت سے انکار کر دے۔

5- خلیفہ کو معزول نہ کرنا چاہتا ہو لیکن اس کے اور اپنے درمیان اختلافات طئے کرنے کے لیے ثالثی، ارباب حل وعقد کے اجتماعی فیصلے یا استصواب رائے عامہ کا مطالبہ پورا ہونے کے بعد تک استمرار حال (status quo) کا طالب ہو۔

ان سب صورتوں میں اگر اس گروہ نے خروج بالسیف نہیں کیا اور نہ اس کے عزم خروج کا کوئی واضح ثبوت ملا تو شرعاً اس گروہ کو باغی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ باغی کی تعریف اس پر صادق نہیں آتی۔

ان سب صورتوں میں یہ گروہ، پرامن، آئینی ذرائع اور شرعی طریقہ سے انقلاب چاہتا ہے۔ اور اس طرح کے مطالبہ کا حق، مملکت کے ہر مسلمان باشندے کو حاصل ہے، جس طرح انتخاب کے وقت ہر مسلمان نصب خلیفہ کے بارے میں اپنی رائے پیش کر سکتا ہے۔ اسی طرح اسے معزول کرنے کی تجویز بھی ارباب حل وعقد یا جمہور مسلمین کے سامنے رکھ سکتا ہے۔ اس بارے میں آزادانہ رائے دہی کا جو حق نصب خلیفہ کے بارے میں اسے حاصل

تھا اس کے عزل کے بارے میں بھی حاصل ہے۔ دونوں صورتوں میں فرق کی کوئی وجہ نہیں۔ مذکورہ بالا تمام صورتوں میں اس نے اپنے اسی حق سے کام لیا ہے اسے بغاوت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

لیکن اگر خلیفہ یا سربراہ مملکت فریقِ مخالف کے شبہ اور استدلال کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتا ہو۔ وہ فریق کو اس کے شبہات دور کر کے مطمئن کرنے کے بجائے اس کے خروج بالسیف یا عزم خروج کا انتظار کئے بغیر ہی اس کے خلاف پولیس ایکشن کرتا ہے تو فریق مخالف کے لیے اپنی مدافعت کرنا جائز ہے یا نہیں۔ یہ مسلح دفاعی جنگ حدود بغاوت میں داخل ہے یا نہیں؟

اس کا جواب ظاہر ہے کہ خلیفہ یا سربراہ مملکت کا فرض تھا کہ جب فریق مخالف کے پاس شرعی دلیل موجود ہے اور کسی شبہ اور شکایت کی بنا پر وہ خروج کر رہا ہے تو اولاً اس کے شبہات و شکایات کا ازالہ کرے، اس سے پہلے اس کو پولیس ایکشن کرنے کا حق نہیں تھا۔ لہٰذہ اس نے فریق مخالف کے خلاف شرعی اجازت کے بغیر فوج کشی کر دی ہے۔ لہٰذہ فریق مخالف کو مدافعت کا حق یقیناً حاصل ہو گا۔

ایک ضروری توضیح

شبہ یا شکایت و تاویل کے الفاظ کو اس قدر عام نہیں سمجھنا چاہیے جس قدر وہ اپنے لغوی مفہوم کے لحاظ سے نظر آتے ہیں۔ شرعی نقطہ نظر سے خروج کرنے والوں کا ہر شبہ معتبر نہیں ہے، نہ ان کی ہر تاویل قابل اعتبار ہے۔ اصولی طور پر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ صرف اس شبہ کا ازالہ اور اس کی تاویل کا ابطال خلیفہ اور جمہور مسلمین کے ذمہ ہے جو اجتہاد کی گنجائش رکھنے والے کسی مسئلہ میں پیدا ہوا ہو۔ مگر کسی ایسے مسئلے میں کسی شبہ یا تاویل کو قابل سماعت نہیں سمجھا جائے گا۔ جس میں اجتہاد و تاویل کی گنجائش نہ ہو اور وہ مسلمانوں کے مسلمات میں داخل ہو۔

اس کی روشن دلیل یہ ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں عرب کے بعض قبائل نے زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کر دیا تھا اور اس کے لیے وہ یہ تاویل کرتے تھے کہ زکوٰۃ مرکز کو ادا کرنا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک عہد میں ضروری تھا۔ اب جبکہ آنحضور علیہ الصلوٰۃ والسلام دنیا سے تشریف لے گئے، بیت المال میں زکوٰۃ کا مال جمع کرنا ضروری نہیں رہا۔ کیونکہ ہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں آپ کو زکوٰۃ اس لیے ادا کرتے تھے کہ آپ نبی تھے، ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نبی نہیں ہیں۔ اب ہم کیوں زکوٰۃ ادا کریں۔ لیکن حضرت ابو بکر صدیقؓ نے ان کی اس تاویل کو قابل اعتنا اور ان کے شبہ کو قابل ازالہ خیال نہیں فرمایا بلکہ ان سے جہاد کا فیصلہ فرمایا۔ اگرچہ پہلے عام طور پر صحابہ کرام نے حضرت صدیق اکبرؓ کی رائے سے اختلاف کیا۔ حتی کہ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ وغیرہ اکابر صحابہ نے بھی اختلاف کیا اور یہ خیال ظاہر کیا کہ مانعین زکوٰۃ سے قتال جائز نہیں۔ لیکن خلیفہ المسلمین حضرت صدیق اکبرؓ اپنی رائے پر قائم رہے اور ان کی مدلل تقریر کے بعد سب صحابہ ان سے متفق ہو گئے۔ بخاری و مسلم اور دیگر کتب صحاح میں یہ واقعہ تفصیل سے مذکور اور اہل علم میں مشہور ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد جیش اسامہؓ کو روانہ کرنے میں بھی یہی صورت پیش آئی کہ اکابر صحابہ نے مخالفت کی تھی مگر حضرت صدیق اکبرؓ نے انکی رائے نہیں مانی اور جیش اسامہ کو روانہ کرنے کا فیصلہ تنہا صدیق اکبرؓ نے اپنی رائے سے کیا تھا جس کو بعد میں تمام صحابہ نے صحیح تسلیم کیا۔

اس کے معنے یہ ہیں کہ اس قسم کے معاملات میں جن میں اجتہاد کی گنجائش نہ ہو اور جو امت مسلمہ کے مسلمات میں داخل ہوں کسی تاویل اور شبہ کو باجماع صحابہ قابل اعتناء نہیں سمجھا جائے گا اور ایسے گروہ کے شبہات و شکایات کو دور کرنا تو کجا انہیں سننے کی بھی ضرورت نہیں۔ ایسے لوگوں کو باغی سمجھ کر زور و قوت کے ذریعہ سے خلیفہ کی اطاعت پر مجبور کیا جائے گا۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ایسے لوگوں کے خلاف فوج کشی کر کے ان کو قتل کر دیا جائے بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ ان کے شبہات کو دور کرنے کی ضرورت نہیں، ان پر فوج کشی کی جائے۔ انہیں خلیفہ کی اطاعت کی دعوت دی جائے گی۔ انہیں غور و فکر کرنے اور باہمی مشورہ کی مہلت دی جائے گی اگر وہ پھر بھی اطاعت سے انکار کریں اور مقابلہ کے لیے تیار ہو جائیں تو ان سے قتال کرنا جائز ہو گا۔

خلیفہ کی ممانعت کے باوجود مفسدین سے قتال

بغاوت کی تعریف اور اطاعت خلیفہ کی شرعی حدود پر غور کرنے سے اس سوال کا جواب معلوم ہو سکتا ہے لیکن پہلے اس مجمل سوال کی تفصیل سمجھ لینا چاہیے، مسئلہ کی مندرجہ ذیل صورتیں نکلتی ہیں۔

اول: مملکت اسلامیہ کے شہریوں کا ایک گروہ خلیفہ سے بغاوت کرے اور خلیفہ کسی معذوری یا مصلحت کی وجہ سے اس کی سرکوبی کرنے پر تیار نہ ہو اور اس سے استمالت کا برتاؤ کرے۔ لیکن مملکت کے مسلم شہریوں کا ایک گروہ حکومت کی اس پالیسی کو دینی نقطہ نظر سے ملت یا مملکت کے لیے سخت مضر سمجھتا ہو اس وجہ سے وہ باوجود ممانعتِ خلیفہ اس سے جنگ کرے اور اس باغی گروہ کے مفسد اور واجب التعزیر ہونے پر حکومت اور اس سے اختلاف رکھنے والی جماعت دونوں کا اتفاق ہو۔

(دوم) گمراہ اور مبتدع افراد پر مشتمل ایک پارٹی قوت حاصل کر کے مسلح انقلاب کی کوشش کرے، امام وقت کو قتل کر کے کسی دوسرے شخص کو امام بنالے جو صحیح المذہب متقی اور امامت کا اہل اور جس کی خلافت وامامت پر اہل حق ارباب حل وعقد کی ایک معتد بہ جماعت کا بھی اتفاق ہو جائے مگر

(الف) اس نظام خلافت میں یہ فرقہ ضالہ باطلہ شریک ہو جائے۔

(ب) اس حکومت کے نظم ونسق اور اس کی پالیسی پر یہ گمراہ گروہ حاوی ہو جائے۔

(ج) یا اس پر حاوی تو نہ ہو مگر اسے حکومت کے نظام اور پالیسی پر موثر حیثیت حاصل ہو جائے اور اس کا یہ اثر معتد بہ ہو۔

اگرچہ اس فرقہ باطلہ ضالہ کے زیغ وضلال، بطلانِ افکار واعمال اور اس کے واجب التعزیر ہونے پر خلیفہ اور مسلمانوں کا یہ گروہ مخالف متفق ہوں، لیکن خلیفہ اور اس کے معاونین کسی مصلحت یا شرعی عذر کی وجہ سے ان سے استمالت کا برتاؤ کرتے ہوں اور ان کے خلاف ہتھیار اٹھانے یا انہیں حکومت سے بے دخل کرنے کے لیے کسی قسم کے تشدد کے مخالف ہوں۔

اس صورت میں مسلمانوں کی ایک جماعت خلیفہ کی رائے اور اس کی پالیسی کو ملت اسلامیہ یا مملکت اسلامیہ کے لیے دینی نقطہ نظر سے سخت نقصاندہ سمجھتی ہو اور اپنی اس رائے کی بنا پر ان اہل باطل پارٹی سے خلیفہ کی مرضی کے خلاف جنگ کرنا ضروری سمجھتی ہو اور وہ اپنی اس رائے کو عملی شکل دیدے۔

(سوم) (الف) مملکت اسلامیہ پر باہر سے کفار حملہ کر دیں۔ یا

(ب) مملکت میں رہنے والے ذمی اور معاہد غیر مسلم مسلح بغاوت کر دیں۔ یا

(ج) مسلمانوں کا ایک گروہ العیاذ باللہ مرتد ہو کر حکومت کی اطاعت سے انکار کر دے

اور مسلمانوں سب صورتوں میں حکومت باغیوں یا بیرونی حملہ آوروں سے جنگ نہ کرنا چاہتی ہو۔ مگر مسلمانوں کا ایک گروہ حکومت کی اس پالیسی کو غلط اور دین وملت کے لیے سخت مضر سمجھتا ہو اور خلیفہ کی رائے کے خلاف ان سے جنگ کرنا ضروری سمجھتا ہو اور وہ اس مفسد گروہ کے خلاف جنگ کرے۔

(چہارم) مملکت اسلامیہ کا کوئی گروہ کسی ایسے واجب شرعی کے متعلق اختلاف کی وجہ سے خلیفہ اور اس کی حکومت کا مخالفت ہو جائے اور اس کی اطاعت سے انکار کر دے جس میں کسی اجتہادی اختلاف کی گنجائش نہ ہو۔ گویا وہ صاف صاف حکم شرعی کو ماننے سے انکار کر دے اس موقع پر خلیفہ اور اس کی حکومت کا رویہ یہ ہو کہ اس کی استمالت کی جائے بخلاف اس کے مسلمانوں کی ایک جماعت اس کے لیے جنگ کرنا ضروری سمجھتی ہو اور اس ضروری سمجھنے کا سبب یہ ہو کہ:

(الف) اس کی رائے میں اس واجب شرعی اور حکم اسلامی پر عمل کرنے سے انکار کرنے والے کو اطاعت پر مجبور کرنا اور اگر ضرورت ہو تو اس سے قتال کرنا شرعاً جمہور مسلمین پر واجب علی الکفایہ ہو جو پہلے حکومت پر عائد ہوتا ہے اور اگر حکومت اسے ادا نہ کرے تو اس کے نزدیک یہ فریضہ جمہور مسلمین کا ہے۔ اس کے ساتھ قتال مذکور کے واجب علی الکفایہ ہونے پر خلیفہ اور زیر بحث جماعت کا اتفاق ہو۔

(ب) اس کی رائے میں زیر بحث منکر اطاعت کو مہلت دینا اور اس کی سرکشی پر اس کی سرکوبی سے گریز کرنا موجبِ فتنہ ومفسدہ اور دینی وملی مصلحت کے خلاف ہو اور اس جماعت منکرہ کی گمراہی اور فتنہ پردازی کے بارے میں خلیفہ اور اس کی پالیسی سے اختلاف کرنے والے متفق الرائے ہوں۔

مندرجہ بالا صورتوں میں سے ہر صورت کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس میں عامۃ المسلمین کا ایک گروہ اگر ان لوگوں سے جنگ کرے جنہوں نے خلیفہ کی اطاعت سے انکار کیا یا جنہوں نے غیر آئینی اور غیر شرعی طریقہ سے ایک منتخب خلیفہ کو معزول یا قتل کر کے دوسرا سربراہِ مملکت مقرر کر دیا جبکہ موجودہ خلیفہ اسے باز رہنے کا حکم دے رہا ہو تو اس گروہ کے اس فعل کو جو خروج عن الطاعۃ ہے شرعاً بغاوت اور اس کے مرتکبین کو ازروئے قوانین اسلام باغی کہہ سکتے ہیں یا نہیں۔

جواب یہ ہے کہ ان میں سے کسی صورت کو بھی شرعاً بغاوت نہیں کہا جاسکتا اور اس قسم کا اقدام کرنے والے ازروئے آئین اسلام باغی نہیں ہیں؟

بغاوت کا شبہ اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ اس جماعت نے خلیفہ کی اطاعت سے انکار کر دیا اور اس کے حکم کے خلاف ایک ایسے گروہ سے جنگ شروع کر دی جس سے جنگ کرنے کی وہ مخالفت کر رہا ہے اور جسے حکومت اسلامیہ نے قانونی تحفظ عطا کیا ہے گویا یہ جنگ خود خلیفہ اور حکومت کے خلاف ہے۔ یہ شبہ سطحی اندازِ فکر سے پیدا ہوتا ہے نظر غائر اسے غلط اور بے بنیاد قرار دیتی ہے۔

دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کیا زیر بحث گروہ حکومت کا تختہ الٹنا چاہتا ہے؟ یا اس کی یہ جنگ خلیفہ کو معزول کرنے کے لیے ہے؟ دونوں سوالات کا جواب نفی میں ہے، کیونکہ وہ قولاً عملاً ان دونوں باتوں میں سے کسی کا اظہار نہیں کرتا۔ رہا اطاعت سے انکار کا مسئلہ تو اس کے بارے میں تفصیل کے ساتھ

بتایا جا چکا ہے کہ مطلق اطاعت سے انکار اور خروج کو بغاوت نہیں کہتے بلکہ اطاعت واجبہ سے خروج کو بغاوت کہتے ہیں جبکہ دوسری شرائط بھی موجود ہوں۔ اس لیے زیر بحث مسئلہ میں جماعت مذکورہ کے اقدام مذکور کو بغاوت ثابت کرنے کے لیے یہ بھی ثابت کرنا پڑے گا کہ اس پر امام کے حکم مذکور کی اطاعت واجب تھی اور اس نے اطاعت واجبہ سے خروج کیا اور زیر بحث صورتوں میں سے کسی میں بھی یہ بات کسی دلیل شرعی سے ثابت نہیں ہوتی بخلاف اس کے صورت حال پر غور کرنے سے یہ بات عقل و فہم کو زیادہ متاثر کرتی ہے کہ اس جماعت کا یہ اقدام بالکل جائز بلکہ ادائے واجب علی الکفایہ کا ایک مصداق ہے۔ کیونکہ یہ واجب علی الکفایہ نھی عن المنکر کی ایک شکل اور دین و ملت کو ایک ضرور سے محفوظ رکھنے کی کوشش ہے۔ اس لیے اسے عملی صورت دینا چاہیے اور خلیفہ کی مخالفت کی پروا نہ کرنا چاہیے۔ گویا اس معاملے میں خلیفہ کی اطاعت جائز بھی نہیں چہ جائیکہ واجب ہو۔

زیر بحث جماعت جب ایک گروہ کی سرگرمی اور سرکشی کو ملت اسلامیہ کے لیے سخت مضر سمجھتی ہے تو اس کی سرکوبی سے احتراز اور اس کی استمالت کے بارے میں خلیفہ کا حکم کیسے مان سکتی ہے؟ شرعاً اس کے لیے جائز ہے کہ اس معاملے میں خلیفہ کی اطاعت سے انکار اور باغیوں سے جنگ کا آغاز کر دے۔ خصوصیت کے ساتھ جبکہ زیر بحث مفسد گروہ کی فساد انگیزی پر فر یقین یعنی حکومت اور اس سے اختلاف رکھنے والی جماعت متفق ہوں۔

مندرجہ بالا مسائل میں حکومت سے اختلاف کرنے والی جماعت مذکورہ کے اقدام مذکور پر بغاوت کی تعریف صادق نہیں آتی۔ کیونکہ زیر بحث صورتوں میں سے کسی میں بھی فریق مذکور کا مقصد حکومت کا تختہ الٹنا نہیں ہوتا اس لیے بغاوت کی حقیقت کا ان میں شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔ اس جماعت نے حکومت کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھائے بلکہ ایک دوسری جماعت کے خلاف اٹھائے ہیں جو خود حکومت کے مخالف ہے در حقیقت ان کی جنگ بالواسطہ مملکت کی مصلحت اور خلیفہ کی موافقت اور تقویت کے لیے ہے۔

اسے بغاوت کہنا روشنی کو ظلمت کہنا ہے قرآن کریم کا ارشاد ہے:

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۙ﴿۳۹﴾ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّاۤ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِيَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ؕ وَ لَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۴۰﴾

(الحج:۳۹،۴۰)

"جن سے جنگ کی جاتی ہے انہیں جنگ کرنے کی اجازت دی جاتی ہے کیونکہ ان پر ظلم کیا گیا ہے اور اللہ ان کی مدد کرنے پر قادر ہے، جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیئے گئے محض اس جرم میں کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے۔ اگر اللہ بعض لوگوں کو دوسرے بعض لوگوں کے ذریعہ سے دفع نہ کرتا رہتا تو صومعے گرجے، عبادت خانے اور مسجدیں جن میں کثرت سے اللہ کا نام لیا جاتا ہے، منہدم کر ڈالے گئے ہوتے۔ اللہ ان لوگوں کی ضرور مدد کرتا ہے جو اللہ کے (دین) کی مدد کرتے ہیں۔ اور اللہ بڑی قوت اور غلبہ والا ہے۔"

اس آیت کریمہ میں مسلمانوں کی جماعت کو اگر ان پر ناجائز طور پر ناحق حملہ کیا جائے تو مدافعت میں جنگ کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ یہ آیت کریمہ اگرچہ کفار کے متعلق ہے مگر اذن جنگ کی علت کفر نہیں بتائی گئی ہے بلکہ ظلم اور زیادتی (بانھم ظلمو) بتائی گئی ہے جس کا مآل یہ ہے کہ مسلمانوں پر جہاں بھی اور جو بھی ظلماً زیادتی کرے وہاں مسلمانوں کو مدافعت میں جنگ کرنے کی اجازت ہے بشرطیکہ مسلمانوں کی اس جماعت میں مدافعت کی قوت ہو اور کسی بڑے فتنہ اور فساد کا اندیشہ نہ ہو۔ چونکہ اذن جنگ کو کفر پر مبنی نہیں کیا گیا ہے بلکہ ظلم پر مبنی کی کیا گیا ہے اس لیے اگر مبتدع اور فتنہ پرور جماعت کی طرف سے مسلمانوں پر ظلم اور زیادتی ہو تو یہی حکم اس وقت بھی ہو گا۔

ظلم انفرادی بھی ہوتا اور اجتماعی بھی، حسی بھی ہوتا ہے اور معنوی بھی آیت میں لفظ ظلم عام ہے اور یہ سب اقسام اس کے تحت داخل ہیں۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ اگر کسی گروہ کی طرف سے کفر و ضلال کی ترویج کر کے دین اسلام کو نقصان پہنچانے یا اجتماع امت میں انتشار پیدا کرنے یا مملکت اسلامیہ کی قوت کمزور کرنے یا اسی طرح کا کوئی ایسا اجتماعی نقصان یا ایسی اجتماعی تکلیف واذیت پہنچانے کی کوشش کی جائے جو شرعاً معتد بہ نقصان یا اذیت سمجھا جاتا ہو تو مسلمانوں کی ہر ایسی جماعت کو جس کی تعداد معتد بہ ہو اور جو قتال کی استطاعت رکھتی ہو اس گروہ سے جو کافروں یا اہل بدعت وضلال کا گروہ ہو قتال کرنا جائز ہے اور آیت اسے اذن قتال دے رہی ہے۔

یہ اذنِ قتال عام مسلمانوں کو بشرائط مذکورہ دیا گیا ہے جس میں حکومت بھی شامل ہے۔ لیکن یہ اذن خلیفہ یا حکومت کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اصل مخاطب جمہور مسلمین ہیں۔

بغاوت کی مذکورہ بالا تفصیل کے بعد غالباً سمجھ میں آ گیا ہو گا کہ نہ مملکت کے خلاف ہر خروج بغاوت ہے اور نہ ہر خروج میں عامۃ المسلمین کو خروج کرنے والوں سے قتال جائز ہے بلکہ اگر مسلمانوں میں سے کچھ لوگ مسلمان ہونے کے باوجود خلیفۂ وقت کے خلاف خروج کریں (مذکروہ بالا شرائط ذہن میں رہیں) اور کسی شہر پر قبضہ جما لیں اور امام کی اطاعت سے

روگردانی کریں تو حکومت کو چاہیے کہ ان کو جماعت کا ساتھ دینے کی دعوت دے اور ان کے شبہات کے ازالہ کی کوشش کرے بغاوت فی نفسہ کفر کی موجب نہیں ہے وہ مسلمان ہیں اور کسی مسلمان کو بلاوجہ شرعی قتل کر دینا جائز نہیں ہے۔ البتہ اگر وہ جنگ پر آمادہ ہوں، جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہوں یا جنگ شروع کر دیں اور صلح وصفائی کی ہر کوشش کو ناکام بنادیں تو ان سے جنگ کی جائے اور ان کی جمعیت کو پراگندہ کر دیا جائے گا۔ اگر ان کی باقاعدہ جمعیت ہو تو زخمیوں کو قتل کر دیا جائے گا۔ جو شکست کھا کر بھاگ کھڑے ہوں ان کا تعاقب کیا جائے گا تاکہ وہ اپنی جمیعت کے ساتھ مل کر دوبارہ فتنہ وفساد کا باعث نہ بن سکیں۔ لیکن ان کے بچوں اور عورتوں کو گرفتار کرنے اور ان کے سازوسامان کو مال غنیمت سمجھ کر مسلمانوں میں تقسیم کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

سورۃ مائدہ میں ہے:

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ يَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَ اَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ؕ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۳۳﴾ (المائدہ:۳۳)

”جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں۔ ان کی سزا یہ ہے کہ انہیں خوب قتل کیا جائے، یا سولی پر لٹکایا جائے یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف جہت سے کاٹ دیئے جائیں یا سرزمین اسلام سے ملک بدر کر دیا جائے۔ اس جرم کی وجہ سے ان کے لیے دنیا میں رسوائی اور ذلت ہے اور آخرت میں بڑا عذاب ہے۔

اس آیت کریمہ میں اللہ اور اس کے رسول کے خلاف جنگ کرنے کی یہ سزائیں بیان کی گئی ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ اللہ اور اس کا رسول باطل پر نہیں ہو سکتے، لہٰذہ جس حکومت کے خلاف بغاوت کی یہ سزا ہے اس کا برحق اور مبنی بر عدل وانصاف ہونا ضروری ہے۔ اگر وہ کسی مسلمان مگر جابر وظالم حکومت کے خلاف بغاوت کا علم بلند کریں جو حدود اللہ کو قائم نہ کرتی ہو اور انتظام حکومت شرعی احکام کے خلاف چلا رہی ہو، مظلوم کی داد رسی اور ظالم کی سرکوبی کرنے کی اہلیت نہ رکھتی ہو، شعائر اسلامی کی توہین کی مرتکب ہو رہی ہو۔ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی کھلم کھلا مخالفت کا ارتکاب کر رہی ہو تو ایسی حکومت کے خلاف خروج کو بغاوت نہیں کہا جا سکتا۔ ایسی حکومت کے خلاف خروج کرنے والوں کی یہ سزا نہیں ہے۔

اللہ اور اس کے رسول (یعنی مبنی بر حق حکومت سے) جنگ اور قانون شکنی، سرزمین اسلام میں فتنہ وفساد پھیلانے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ ڈاکے ڈالے جائیں، تخریب کاری کی جائے، لوگوں کو قتل کیا جائے۔ اس کی سزا بھی قتل ہے تفصیل باب قطع الطریق میں گزر چکی ہے۔

باغیوں کی تحصیل ووصول

اگر کسی علاقے پر باغی قبضہ کر لیں اور وہاں لوگوں سے خراج، عشر، زکوٰۃ وصول کر لیں اور ان سے جنگ کرنے کے بعد اسلامی حکومت باغیوں کا استیصال کر کے پھر اس علاقے پر اقتدار حاصل کر لے تو اس علاقے کے لوگوں سے عشر خراج اور زکوٰۃ دوبارہ وصول نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ اسلامی حکومت کا یہ فریضہ تھا کہ وہاں کے باشندوں کی حمایت وحفاظت کرتی اور باغیوں کی زور زبردستی سے بچاتی، اسلامی حکومت اپنا واجب فریضہ ادا نہیں کر سکی اس کا قصور ہے، وہاں کے باشندے اس کی سزا کیوں بھگتیں۔ اگر باغیوں نے جو کچھ وصول کیا تھا اسے اس کے جائز مصارف میں صرف کیا ہے تو ظاہر ہے کہ لوگوں کا فریضہ صحیح طور پر ادا ہو گیا۔ اور اگر انہوں نے صحیح مصارف میں صرف نہیں کیا تو حکومت کو تو ان سے دوبارہ وصول کا حق نہیں۔ البتہ یہ اللہ اور ان کے درمیان کا ایک معاملہ ہے۔ اگر وہ چاہیں تو اپنا خراج، عشر اور زکوٰۃ کی رقوم صحیح مصارف میں دوبارہ خرچ کر دیں۔

باب الخوارج

عہد نبوی اور خلفائے راشدین کے
باغیوں کی تفصیل

(الخوارج) خارجة کی جمع ہے خرج سے اسم فاعل مونث کا صیغہ ہے خَرَجَ کے معنے نکلنے کے ہوتے ہیں۔ خرج علیہ اس نے اس کے خلاف خروج کیا یعنی بغاوت کی، خارجة کے معنے بغاوت کرنے والی جماعت کے ہیں جس کی جمع خوارج آتی ہے۔ الخارجیُ اس آدمی کو کہتے ہیں جو شاہی خاندان سے نہ ہو اور بادشاہ بن جائے۔ نیز اس گھوڑے کو کہتے ہیں جس کے ماں باپ تیز دوڑنے والے نہ ہوں مگر وہ ماں باپ کے خلاف تیز دوڑے۔ ایسے ہی اس شخص کو بھی کہتے ہیں جو سلطان یا جماعت کی مخالفت پر اتر آئے۔ نیز اس شخص کو بھی جو خارجی فرقوں کے عقائد کو اختیار کرے۔ چنانچہ اسلامی بڑے فرقوں میں سات فرقے خوارج کہلاتے ہیں جن کی تفصیل عقائد کی کتابوں میں موجود ہے۔ (المنجد ص ۱۶۹ و تاج العروس ومحیط المحیط)

تاریخ اسلام میں خوارج در اصل وہ لوگ ہیں جنہوں نے اسلامی

حکومت کے خلاف خروج اور بغاوت کی ہو اور وہ جماعت سے الگ ہو گئے ہوں۔ اسلام آیا تو تین قسم کی جماعتیں سامنے آئیں۔ ان تینوں کا تذکرہ قرآن کریم نے پہلے ہی پارے میں (پارہ آلمٓ) میں کر دیا ہے۔ ایک وہ جنہوں نے اسلام کی دعوت کو شرح صدر کے ساتھ قبول کر لیا۔ یہ مومنین ہیں۔ دوسرے وہ جنہوں نے شرح صدر کے ساتھ اسلامی دعوت کا انکار کر دیا۔ قرآن کریم نے انہیں کافر اور کفار کہا ہے۔ تیسرے وہ جو بظاہر حلقہ اسلام میں داخل ہو گئے لیکن وہ دل سے اسلام نہیں لائے انہیں منافقین کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ ان منافقین ہی میں دو قسم کے تھے ایک تو وہ جنہوں نے اسلام کو ظاہر میں قبول کر لیا اور انہیں کھلم کھلا اسلام کی مخالفت کی جرأت نہیں ہوئی لیکن وہ درپردہ مخالفینِ اسلام سے ساز باز کرتے رہے اور اسلام کے خلاف خفیہ سازشیں کرتے رہے یہ تو منافقین ہی کہلائے۔ انہی میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوئے کہ انہوں نے کبھی کچھ طاقت حاصل کر لی اور وہ اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے ہوئے بھی اسلامی حکومت اور اسلامی جمعیت کے خلاف مسلح مزاحمت اور مسلح بغاوت پر اتر آئے۔ یہ لوگ تھے تو منافقین ہی لیکن ان کو تاریخ اسلام نے خوارج کے لقب سے یاد کیا۔ بہر حال یہ منافقین جو اسلام کے خلاف مسلح جدوجہد کرنے پر اتر آئے خوارج کے لقب سے یاد کیے گئے۔ آگے چل کر انہی میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوئے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے۔ اور عام مسلمانوں کے عقائد کے بر خلاف انہوں نے چند عقائد میں ان سے اختلاف کیا اور اپنے لیے کچھ نئے عقائد کا پرچار کیا اور شدہ شدہ مسلمانوں سے ان مختلف مخصوص عقائد رکھنے والوں ہی کو خوارج کہا جانے لگا لیکن اپنی اصل کے اعتبار سے وہ ان منافقین ہی کا حصہ تھے جنہوں نے اسلامی حکومت اور اسلامی جماعت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا۔ یہ اس معنے میں بھی خارجی تھے کہ وہ اپنے آپ کو دوسرے مسلمانوں سے بہتر مسلمان ہونے کے مدعی تھے بلکہ وہ اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے تھے اور باقی مسلمانوں کو کافر سمجھتے تھے جیسا کہ عربوں میں خارجی اس گھوڑے کو کہتے جو اپنے آپ کو اپنے ماں باپ سے بہتر ثابت کرتا تھا کہ جس تیز رفتاری اور عمدگی کا ثبوت اس کے ماں باپ نہیں دے سکے تھے وہ اس کا ثبوت مہیا کرے اور ان سے بازی لے جائے۔

خوارج رسول اکرم

ان خوارج کا وجود ہر زمانہ میں رہا ہے۔ چنانچہ حضور اکرم ﷺ کے مبارک عہد میں بھی ان کا وجود ملتا ہے چنانچہ بخاریؒ نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے:

حدثنا عبداللہ بن محمد قال حدثنا ہشام قال اخبرنا معمر عن الزھری عن ابی سلمۃ عن ابی سعید قال بینا النبی ﷺ یقسم جاء عبداللہ ذوالخویصرۃ التمیمی فقال اعدل یا رسول اللہ قال ویلك من یعدل اذا لم اعدل قال عمر ابن الخطاب ائذن لی فاضرب عنقه قال دعه فان له اصحابا یحقر احدکم صلاته مع صلاته وصیامه مع صیامه یمرقون من الدین کما یمرق السهم من الرمیة ینظر فی نصله فلا یوجد فیه شئی ثم ینظر فی رصافه فلا یوجد فیه شی ثم ینظر فی نضیه فلا یوجد فیه شئی قد سبق الفرث والدم ایتهم رجل احدیٰ یدیه اوقال ثدییه مثل ثدی المراۃ اوقال مثل البضعة تدردر یخرجون علی حین فرقة من الناس۔ قال ابو سعید اشهد انی سمعت من النبی ﷺ واشهد ان علیا قتلهم وانا معه جئی بالرجل علی النعت الذی نعت النبی ﷺ قال فنزلت فیه ومنهم من یلمزك فی الصدقات۔ (صحیح بخاری باب من ترك قتال الخوارج للتالف والا ینفر الناس عنه۔ ج۲ ص ۱۰۲۴ مطبوعه مطبعه مجتبائی دهلی۔)

"عبد اللہ بن محمد نے (اپنی سند کے ساتھ) ہم سے ابو سعید خدریؓ سے حدیث بیان کی،

اس دوران میں جب رسول اللہ ﷺ (غنیمت کا مال) تقسیم فرما رہے تھے۔ عبد اللہ ذو الخویصرہ تمیمی آیا اور اس نے کہا: اے رسول اللہ! انصاف کیجئے تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: تیرا ناس ہو۔ اگر میں نے بھی انصاف نہیں کروں گا تو کون انصاف کرے گا؟ حضرت عمر بن الخطابؓ نے آنحضور سے عرض کیا: مجھے اجازت دیجئے میں اس کی گردن اڑادوں۔ آپ نے فرمایا اسے چھوڑ دو۔ اس کے ساتھی ایسے ہیں کہ تم ان کی نماز کے سامنے اپنی نماز کو، ان کے روزوں کے سامنے اپنے روزے کو حقیر سمجھو گے۔ لیکن وہ دین سے اس طرح نکل چکے ہوں گے جیسے کمان سے تیر نکل جاتا ہے کہ اس کے ریش کو دیکھا جائے تو اس میں کچھ نہ ملے، اس کے بھالے میں دیکھا جائے تو اس میں کچھ نہ ملے، اس کے بھالے کے نیچے عصب میں دیکھا جائے تو کچھ نہ ملے پھر اس کی لکڑی میں دیکھا جائے تو کچھ نہ ملے۔ وہ گوبر اور خون سے صاف نکل جائے ان کی نشانی ایک ایسا آدمی ہو گا کہ اس کا ایک ہاتھ عورت کے ہاتھ کی طرح ہو گا یا یوں فرمایا کہ اس کے سینہ کا ایک ابھار عورت کے پستان کی طرح ہو گا یا یوں فرمایا کہ گوشت کے ایک لوتھڑے کی طرح ہو گا جس میں ایک طرح کی لرزش اور کپکپی ہو گی۔ یہ لوگ مسلمانوں کے باہم اختلاف کے وقت نکلیں گے۔ ابو سعیدؓ نے کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے یہ بیشک رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت علیؓ نے ان لوگوں کو قتل کیا تھا۔ اور میں آپ کے ساتھ تھا۔ اس وصف کے مطابق جو حضور ﷺ نے بیان کیا تھا

ایک شخص کی نعش حضرت علیؓ کے سامنے لائی گئی تھی اسی سلسلہ میں یہ آیت نازل ہوئی تھی۔ "ان منافقوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو آپ کو صدقات کے بارے میں مطعون کرتے ہیں۔"

اس حدیث پر امام بخاری نے "من ترک قتال الخوارج للتالف" کا باب باندھا ہے یعنی "تالیف قلب کی خاطر خوارج سے قتال کرنے کو ترک کر دینا۔"

امام بخاریؒ ہی نے اس سے پہلے "باب قتال الخوارج والملحدین" کے تحت "یعنی خوارج اور ملحدین سے جنگ کرنا۔"

یہ حدیث نقل فرمائی ہے:

حدثنا عمر بن حفص عن غیاث قال حدثنا ابی قال حدثنا الاعمش قال حدثنا خیثمہ قال حدثنا سوید بن غفلة قال علی اذ حدثتکم عن رسول الله ﷺ فوالله لان اخر من السماء احب الی من ان اکذب علیه واذا فیما بینی وبینکم فان الحرب خدعة وانی سمعت رسول الله ﷺ یقول سیخرج قوم فی آخر الزمان حداث الاسنان سفهاء الاحلام یقولون من خیر قول البریة لا یجاوز ایمانهم حناجرهم یمرقون من الدین کما یمرق السهم من الرمیة فاینما لقیتموهم فاقتلوهم فان فی قتلهم اجراً لمن قتلهم یوم القیمة۔

(صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۰۲۴ مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی)

عمر بن حفص بن غیاث نے (اپنی سند سے) حدیث بیان کی کہ حضرت علیؓ نے فرمایا جب میں تم سے رسول اللہ ﷺ سے کوئی حدیث بیان کروں تو اللہ کی قسم مجھے آسمان سے گر پڑنا اس سے زیادہ پسند ہو گا کہ میں رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ بولوں اور جب میرے اور تمہارے درمیان کوئی بات ہو تو (یعنی آپس میں ہمارا کوئی جھگڑا ہو تو اس میں الزام تراشی یا غلط بیانی ہو سکتی ہے) کیونکہ جنگ تو یقیناً الزام تراشی اور فریب کا ہی دوسرا نام ہے۔ بہر حال میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ آخری زمانہ میں ایک قوم ایسی نکلے گی جو نو عمر ہوں گے۔ دانش میں پرلے درجے کے بیوقوف ہوں گے۔ منہ سے دنیا کی بہترین باتیں نکالیں گے۔ لیکن ان کا ایمان ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا۔ وہ دین سے ایسے باہر نکل جائیں گے جیسے تیر کمان سے باہر نکل جاتا ہے تم جہاں کہیں بھی ان سے ملو، ان کو قتل کرو۔ کیونکہ انہیں قتل کرنے میں قیامت کے دن بڑا اجر ملے گا۔"

ان دونوں حدیثوں پر امام بخاریؒ نے جو باب باندھے ہیں وہ خوارج ہی سے متعلق ہیں جس سے ہمارے اس موقف کی تائید ہوتی ہے کہ خوارج کا وجود حضور اکرم ﷺ کے مبارک عہد سے شروع ہو چکا تھا۔

یہ وہی منافقین اور خوارج تھے جنہوں نے قباء میں کفر پھیلانے اور مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے اور مخالفین اسلام کی سازشوں کے لیے ایک پناہ گاہ اور مرکز کے طور پر استعمال کرنے کے لیے مسجد ضرار بنائی تھی جس کا حق تعالیٰ نے سورۂ توبہ میں ان الفاظ کے ساتھ ذکر فرمایا ہے:

وَ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّ کُفْرًا وَّ تَفْرِیْقًۢا بَیْنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ اِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَ لَیَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا الْحُسْنٰی ؕ وَ اللّٰهُ یَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ لَا تَقُمْ فِیْهِ اَبَدًا ؕ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَی التَّقْوٰی مِنْ اَوَّلِ یَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِیْهِ ؕ فِیْهِ رِجَالٌ یُّحِبُّوْنَ اَنْ یَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَ اللّٰهُ یُحِبُّ الْمُطَّهِّرِیْنَ ﴿۱۰۸﴾ اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْیَانَهٗ عَلٰی تَقْوٰی مِنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانٍ خَیْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْیَانَهٗ عَلٰی شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۰۹﴾ لَا یَزَالُ بُنْیَانُهُمُ الَّذِیْ بَنَوْا رِیْبَةً فِیْ قُلُوْبِهِمْ اِلَّاۤ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ ﴿۱۱۰﴾ (التوبہ:۱۱۰)

"اور جن لوگوں نے اس مقصد سے ایک مسجد بنا کر کھڑی کر دی کہ وہ (اسلام کو) نقصان پہنچائیں، کفر کریں، مسلمانوں میں تفرقہ ڈالیں اور ان لوگوں کے لیے ایک کمین گاہ پیدا کریں جو اب سے پہلے اللہ اور اس کے رسول سے لڑ چکے ہیں۔ وہ ضرور قسمیں کھا کر کہیں گے کہ ہمارا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ (اسلام کی) بھلائی ہو۔ لیکن اللہ کی گواہی یہ ہے کہ وہ (اپنی قسموں میں بالکل جھوٹے ہیں (اے پیغمبر!) تم کبھی اس مسجد میں کھڑے نہ ہونا۔ اس بات کی کہ تم اس میں کھڑے ہو (اور بندگان الٰہی تمہارے پیچھے نماز پڑھیں) وہی مسجد حقدار ہے جس کی بنیاد اگلے دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے (یعنی مسجد قبا اور مسجد نبوی) اس میں ایسے لوگ آتے ہیں جو پاک صاف رہنے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ بھی پاک صاف رہنے والوں ہی کو پسند کرتا ہے کیا وہ شخص بہتر ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد اللہ کے خوف اور اس کی خوشنودی پر رکھی (جو کبھی ہلنے والی نہیں) یا وہ جس نے ایک کھائی کے گرتے ہوئے کنارے پر اپنی عمارت کی بنیاد رکھی اور وہ مع اپنے مکین کے آتش دوزخ (کے گڑھے) میں جا گری۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ انہیں (کامیابی و سعادت کی) راہ نہیں دکھاتا جو ظلم کا شیوہ اختیار کرتے ہیں۔

یہ عمارت جو انہوں نے بنائی (یعنی مسجد ضرار) ہمیشہ ان کے دلوں کو شک و شبہ سے مضطرب رکھے گی (یہ کانٹا نکلنے والا نہیں) مگر یہ کہ

ان کے دلوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں کیونکہ یہ ان کے نفاق کی بہت بڑی شرارت تھی جو چلی نہیں (اس لیے ہمیشہ اس کی وجہ سے خوف وہراس کی حالت میں رہیں گے (اور اللہ سب کا حال جاننے والا۔ اپنے تمام کاموں میں حکمت رکھنے والا ہے۔

پیغمبر اسلام جب مدینہ منورہ میں آئے تو پہلے قبا نامی مقام میں قیام فرمایا۔ یہاں آپ کے حکم سے ایک مسجد تعمیر ہوئی تھی جو عہد اسلام کی پہلی مسجد ہے۔ بعض منافقوں نے جن کی تعداد بعض روایات سے بارہ (۱۲) ثابت ہوتی ہے اسی مسجد کے پاس ایک نئی مسجد تعمیر کی۔ اور جب پیغمبر اسلام تبوک کے لیے نکل رہے تھے تو آپ کی خدمت میں آکر عرض کیا۔ ایک دن وہاں آ کر نماز پڑھا دیجئے۔ آپ نے فرمایا ابھی تو سفر در پیش ہے۔ واپسی پر دیکھا جائے گا۔ پھر جب آپ تبوک سے واپس ہوئے اور مدینہ کے بالکل قریب پہنچ گئے تو آیت نازل ہوئی اور اللہ نے بانیان مسجد کے منافقانہ مقاصد سے آپ کو مطلع کر دیا۔ آپ نے فوراً حکم دیا کہ یہ مسجد گرادی جائے چنانچہ قبل اس کے مدینہ پہنچیں مسجد مہندم کر دی گئی۔

اس آیت میں منافقوں کی مسجد کے چار مقصد بیان کیے گئے ہیں۔

(الف) ضِرارًا: یعنی اس کا مقصد یہ ہے کہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنا کر مخلص مومنوں کو نقصان پہنچائیں۔

(ب) وَكُفْرًا: کفر کے مقاصد پورے ہوں۔ معلوم ہوا کہ نیک کاموں کا نیک ہونا مقصد اور نیت پر موقوف ہے ورنہ مسجد بنانے جیسا نیک کام بھی کفر کے لیے ہو جاتا ہے۔

(ج) وَتَفْرِيقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ: مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کے لیے کیونکہ قبا کی تمام آبادی ایک ہی مسجد میں نماز پڑھتی تھی۔ اب بالکل اس کے پاس دوسری مسجد بنے گی، تو جماعت بٹ جائے گی، کچھ لوگ پچھلی مسجد میں جائیں گے کچھ نئی مسجد میں اور جب ایک جماعت نہ رہی تو مسلمانوں کے باہمی اجتماع و تعارف کا وہ مقصد بھی فوت ہو گیا جو قیام جماعت کے اہم ترین مقاصد میں سے ہے۔

(د) وَإِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ مِن قَبْلُ: اللہ اور اس کے رسول سے جن لوگوں نے جنگ کی ان کے لیے ایک کمین گاہ پیدا کر دی جائے۔ یا اس کے انتظار و توقع میں پہلے سے ایک محفوظ جگہ بنا دی جائے۔ یعنی دشمنان اسلام کے لیے جن سے یہ تو ساز باز رکھتے تھے ٹکنے کی ایک جگہ پیدا ہو جائے۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ میں قبیلہ خزرج کا ایک آدمی ابو عامر راہب تھا جو ظہور اسلام سے پہلے عیسائی ہو گیا تھا جب پیغمبر اسلام مدینہ تشریف لائے تو کلمۂ اسلام کا عروج اس پر شاق گزرا اور وہ اسلام کے خلاف سازشوں میں سرگرم ہو گیا۔ پہلے قریش مکہ کا ساتھ دیا۔ پھر شہنشاہ قسطنطنیہ کے پاس پہنچا اور اسے مسلمانوں پر حملے کی ترغیب دی، قبا کے بعض منافقین میں اور اس میں قدیم سے رسم وراہ تھی۔ یہ انہیں اسلام کے خلاف اکساتا رہتا اور رومیوں کے حملے کا یقین دلاتا یہاں لِّمَنْ حَارَبَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ (التوبہ: ۱۰۷) سے اسی طرف اشارہ ہے۔ (ترجمان القرآن مولانا ابوالکلام آزاد)

حافظ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ:

”بدر کی لڑائی میں بھی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو غالب رکھا تو ابو عامر پر یہ بات بہت شاق گزری اور کھلم کھلا عداوت ظاہر کرنے لگا اور مدینہ سے بھاگ کر کفار مکہ اور مشرکین قریش سے جاملا اور انہیں رسول اللہ ﷺ سے جنگ کرنے پر مائل کرتا تھا۔ اب عرب کے سارے قبیلے اکٹھے ہو گئے اور جنگ احد کے لیے پیش قدمی کی نتیجہ میں مسلمانوں کو ضرر پہنچا۔“

اس فاسق نے دونوں طرف کی صفوں کے درمیان کئی گڑھے کھود رکھے تھے۔ ان میں سے ایک میں رسول اللہ ﷺ گر پڑے آپ کو مضرت پہنچی۔ آپ کا چہرہ زخمی ہو گیا۔ نیچے کی طرف سے سامنے کے چار دانت آپ کے ٹوٹ گئے۔ سر بھی نبی کریم ﷺ کا زخمی ہو گیا.... اسلام بڑھتا چلا جا رہا تھا تو وہ ملک روم ہرقل کے پاس گیا اس سے نبی کریم ﷺ کے برخلاف مدد مانگی اس نے وعدہ کر لیا۔ اس نے اپنی امیدیں کامیاب ہوتی دیکھیں تو ہرقل کے پاس ٹھہر گیا اور اپنی قوم انصار میں سے ان لوگوں کو مدینہ بھیجا جو اہل نفاق تھے کہ لشکر لے کر آرہا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ سے خوب جنگ ہو گی۔ ان پر غالب آجاؤں گا اور انہیں اپنی اسلام سے پہلے کی سابقہ حالت پر آنا پڑے گا اور ان اہل نفاق کو حکم بھیجا کہ اس کے لیے پناہ کی جگہ بنائے رکھو اور میرے احکام اور مراسلے جو لے کر آیا کریں ان کے لیے قیام گاہ اور امن بنائے رکھو تاکہ اس کے بعد جب وہ خود آئے تو اسکے لیے کمین گاہ کا کام دے۔ چنانچہ ان منافقین نے مسجد قبا کے قریب ہی ایک اور مسجد بناڈالی۔ اس کی تعمیر کر دی اور اس کو پختہ کر دیا....... ابو عامر نے ان سے کہا کہ تم ایک مسجد بناؤ اور جس قدر بھی تم سے ممکن ہو اس میں ہتھیار اور سامان جنگ چھپائے رکھو۔ کیونکہ میں قیصر ملک روم کی طرف جا رہا ہوں۔ اُدھر سے لشکر لے کر آؤں گا۔ اور محمد اور ان کے اصحاب کو مدینے سے نکال دوں گا الخ۔

(تفسیر ابن کثیر پارہ ۱۱ ص ۱۳ مطبوعہ نور محمد کراچی)

تصریحات بالا سے آپ نے ملاحظہ فرمالیا کہ ”مسجد ضرار“ بنانے والے در اصل وہی منافقین تھے جو مسلح بغاوت کرنا چاہتے تھے، اور مملکت اسلامیہ کے خلاف خروج کی سوچ رہے تھے۔ انہوں نے بظاہر ایک مسجد بنائی تھی

لیکن ان کا اصل مقصد اسلام کے خلاف اپنی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے لیے ایک مرکز، ایک کمین گاہ اور ایک پناہ گاہ بنانا تھا جہاں ان کے اجتماعات ہو سکیں اور ابو عامر راہب کے گماشتے اور قاصد جو اس کے احکام اور پیغامات لے کر آتے تھے وہاں قیام کر سکیں اور جہاں مسلح جدوجہد کے لیے اسلحہ اور سامان جنگ کا ذخیرہ کر سکیں۔ لہٰذہ یہ مسجد در اصل خوارج (باغیوں) کا مرکز تھی جسے رسول اللہ ﷺ نے منہدم کرا کے اس میں آگ لگوا دی۔

خوارج صدیق اکبرؓ کے زمانہ میں

آنحضرت ﷺ کی وفات حسرت آیات کے بعد جب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا انتخاب بحیثیت خلیفہ رسول اللہ عمل میں آ گیا تو انہی خوارج (باغیوں) کے ٹولے نے حکومت اسلامیہ کے خلاف فتنہ ارتداد کی صورت میں خروج کیا۔ حضرت شیخ الاسلام علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اعلاء السنن میں فرماتے ہیں:

قال القاضی عیاض وغیرہ کان اہل الردۃ ثلثۃ اصناف۔ صنف عادوا الی عبادۃ الاوثان وصنف تبعوا مسیلمۃ والاسود العنسی فقاتلہم عمال النبی ﷺ فی خلافۃ ابی بکر اما مسیلمۃ فجہز الیہ ابو بکر الجیش وعلیہم خالد ابن ولید فقتلوہ۔ وصنف ثالث استمروا علی الاسلام لکنہم جحدوا الزکوٰۃ وتاولوا بانہا خاصۃ بزمن النبی ﷺ لقولہ تعالیٰ "خذ من اموالہم صدقۃ تطہرہم وتزکیہم بہا وصل علیہم ان صلوٰتک سکن" لہم فزعموا ان دفع الزکوٰۃ خاص بالنبی ﷺ لان غیرہ لا یطہرہم ولا یصلی علیہم فکیف تکون صلوٰتہ سکنا لہم۔ قلت وصنف رابع اقروا بوجوب الزکوٰۃ ولم یتاولوا کتاویل الصنف الثالث ولکنہم منعوا شحا باموالہم وکثروا سواد الجاھدین ونصبوا القتال المسلمین کما نصوا وہم الذین ناظر عمر ابا بکر فی قتالہم کما وقع فی حدیث الباب الخ۔

(اعلاء السنن ج ۱۲ ص ۴۵۸ مطبوعہ سپر آرٹ پریس کراچی۔)

"قاضی عیاضؒ وغیرہ نے کہا ہے کہ مرتدین کی تین اصناف (انواع) تھیں ایک صنف تو وہ تھی جو (اسلام سے مرتد ہو کر) بت پرستی کی طرف لوٹ گئی تھی۔ اور ایک قسم وہ تھی جنہوں نے مسیلمہ کذاب اور اسود عنسی کا اتباع کر لیا تھا۔ ان سے حضور اکرم ﷺ کے گورنروں نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانہ میں جنگ کی اور مسیلمہ کذاب کی طرف تو حضرت صدیق اکبرؓ نے باقاعدہ فوج کشی کی تھی جن کے سردار حضرت خالد بن ولیدؓ تھے۔ چنانچہ انہوں نے اسے قتل کر دیا۔ اور تیسری نوع وہ تھی جو بظاہر اسلام پر تو مستقیم رہی لیکن انہوں نے زکوٰۃ کا انکار کر دیا اور اس کی تاویل یہ کی کہ یہ نبی اکرم ﷺ کے زمانہ کے ساتھ خاص تھا۔ کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: "اے پیغمبر! (ان کے اموال سے صدقہ وصول کرو، اس طرح انہیں پاک کر دو اور ان کی نشوونما کی سامان بہم پہنچاؤ اور ان کے لیے دعا کرو۔ یقیناً آپ کی دعا ان کے لیے باعث سکون ہے" انہوں نے کہا کہ زکوٰۃ دینا نبی اکرم ﷺ کے ساتھ خاص تھا۔ کیونکہ حضور ﷺ کے علاوہ اور کوئی نہ تو انہیں پاک کر سکتا تھا اور نہ ان کے لیے ویسی دعا کر سکتا تھا تو ان کی دعا ان کے لیے کیسے باعث سکون ہو سکتی تھی۔ میں کہتا ہوں کہ ایک چوتھی قسم بھی تھی جو وجوب زکوٰۃ کا اقرار کرتے تھے اور تیسری قسم کی طرح کوئی تاویل بھی نہیں کرتے تھے لیکن انہوں نے اپنے اموال پر حرص کی وجہ سے زکوٰۃ روک لی تھی اور وہ منکرین کی جماعت کی کثرت کا باعث بنے تھے۔ اور مسلمانوں سے جنگ کے لیے اسی طرح آمادہ ہو گئے تھے جیسے دوسرے منکرین۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق حضرت عمرؓ نے حضرت ابو بکرؓ سے ان سے جنگ کرنے کے بارے میں بحث کی تھی جیسا کہ ان باب کی حدیث میں آیا ہے۔"

یہ چاروں گروہ مسلح بغاوت پر آمادہ تھے۔ آمادہ ہی نہیں تھے بلکہ عملی اقدام کر چکے تھے۔ جیسا کہ ہم نے "احکام مرتد" کے باب میں تاریخ طبری سے نقل کیا ہے:

ان الارض کافرۃ وقد رای وفدھم منکم قلۃ، وانکم لا تدرون لیلاً تؤتون ام نہاراً۔ وادناھم منکم علی برید وکان القوم یاملون ان نقبل منہم وانوا عدھم وقد ابینا علیہم ونبذنا الیہم وعھدھم فاستعدوا واعدوا انما البثوا الا ثلاثا حتی طرقوا المدینۃ غارۃ مع اللیل وخلفوا بعضہم بذی حسیٰ لیکونوا لہم ردءً۔ (تاریخ طبری ج ۴ ص ۱۸۷۴ مطبوعہ یورپ)

"ساری سرزمین (عرب) کفر کے آغوش میں چلی گئی ہے اور ان کے وفد نے تمہاری قلّتِ تعداد دیکھ لی ہے۔ تمہیں کچھ پتہ نہیں وہ تم پر رات کو چڑھ دوڑیں یا دن کو۔ اور ان کا قریب ترین لشکر تم سے ایک برید (منزل یعنی بارہ میل) کے فاصلہ پر ہے۔ اور ان لوگوں کو یہ توقع تھی کہ ہم ان کے مطالبات مان لیں گے۔ اور ان سے معاہدہ کر لیں گے مگر ہم نے انکار کر دیا اور ان کا عہد ان کی طرف لوٹا دیا۔ وہ جنگ کے لیے تیار ہو گئے۔ لہٰذہ تم بھی تیاری کرو۔ پھر تین دن ہی گزرے تھے کہ انہوں نے مدینہ منورہ پر رات کے وقت ہلّہ بول دیا اور اپنی ایک جمعیت کو ذی حسیٰ کے مقام پر اپنی پشت پر چھوڑ دیا تاکہ وہ ان کے پشت پناہ ثابت ہوں۔"

چنانچہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ابتداء عہد خلافت میں ایسا نہیں ہے کہ ان خارجیوں کا گروہ ناپید ہو گیا ہو۔ بلکہ آنحضرت ﷺ کی وفات

حسرتِ آیات کے بعد ان کی سرگرمیاں تیز سے تیز تر ہو گئی تھیں۔ انہوں نے یہ سمجھا تھا اور کچھ غلط نہیں سمجھا تھا کہ جن تحریکوں کا مدار شخصیتوں پر ہوتا ہے وہ تحریک کے سربراہ کے بعد ختم ہو جایا کرتی ہیں۔ اسلامی تحریک کا مدار بھی آنحضرت ﷺ کی ذاتی شخصیت پر ہی تھا۔ اور دینی تحریکات کا مدار تو نبی اور رسول کی شخصیت پر ہی ہوتا ہے۔ لہٰذہ نبی اور رسول کی شخصیت او جھل ہو جانے کے بعد اسے ختم کر دینا آسان ہو گا۔ عرب جو صدیوں سے قبائلی نظام کے خوگر چلے آ رہے تھے، ان کے قدیم نظریات نے نبی اکرم ﷺ کی آنکھیں بند ہوتے ہی انگڑائیاں لینی شروع کر دیں۔ اور قبائلی تصورات پھر جاگ اٹھے۔ انہیں یہ چیز انتہائی ناگوار تھی کہ کوئی قبیلہ دوسرے قبیلہ کا محکوم اور تابع فرمان ہو۔ وہ فطری اور جبلی طور پر آزاد چلے آ رہے تھے اور ایک واحد نظام مملکت کے ماتحت زندگی گزارنا انہیں گوارہ نہیں تھا۔ لیکن حضور اکرم ﷺ کی شخصیت اتنی بلند و بالا تھی کہ ان کے طبعی اور جبلی تصورات کو پر پرزے نکالنے کا آپ کی حیات طیبہ میں موقعہ نہیں مل سکتا تھا اور نہیں ملا۔ انہیں اس کا اندازہ نہیں تھا کہ اسلام کا مدار کسی ایک شخصیت پر نہیں ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اپنی عظیم تربیت سے ایک ایسی ملت کی تشکیل فرما دی ہے جو آپ کے بعد بھی اس تحریک کو ارتقاء سے ہمکنار کر سکتی ہے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے خطبہ سے جو ہم نے اوپر نقل کیا ہے واضح ہے کہ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد فتنہ ارتداد اتنا ہمہ گیر تھا کہ اکثر سرزمین عرب کفر کے آغوش میں جا چکی تھی۔ ان میں سے کچھ لوگ تو ایسے تھے جو اپنے آبائی دین، یعنی کفر و شرک اور اصنام پرستی کی طرف لوٹ گئے تھے۔ عرب جاہلیت کی تاریخ شاہد ہے کہ عرب کے ہر قبیلہ کا ایک بت ہوتا تھا اور کوئی قبیلہ اپنے بت کو چھوڑ کر کسی دوسرے قبیلے کے بت کے سامنے سرنگوں ہونا اپنے قبیلہ کی توہین سمجھتا تھا۔ اسلام لانے کے بعد ان کی یہ قبائلی عصبیت چند روز میں ختم نہیں ہو سکتی تھی اور نہیں ہوئی تھی۔ یہ ایک حقیقت تھی کہ حضور اکرم ﷺ کا تعلق قریش کے خاندان سے تھا۔ قریش کے ایک فرد نے "اللہ لا الہ الا ھو"۔ کی آواز بلند کی تھی۔ لہٰذہ ان کی نگاہوں میں یہ ایک قریشی پیغمبر کا دین تھا غیر قریش اس کی پیروی کیوں کریں۔ لہٰذہ ہر قبیلہ کو اپنے اپنے قبیلہ کا بت یاد آنے لگا۔ اور انہوں نے اپنی قبائلی عصبیت کی تسکین اسی میں پائی کہ وہ اپنے قبائلی بت کی پرستش شروع کر دیں۔

اُدھر کچھ طالع آزماؤں نے دیکھا کہ محمد قریشی نے ایک نئے دین کی بنیاد ڈالی اور تھوڑے ہی عرصہ میں سارے عرب سے اپنے اس دین کو منوا لیا اور سب اس کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ انہوں نے سوچا کہ کل جدید لذیذ (ہر نئی چیز مزیدار ہوتی ہے) کے مطابق عوام ہمیشہ ہر نئی چیز کی طرف لپکتے ہیں۔ محمد عربی ایک انسان ہی تو تھے اگر وہ اپنے مشن میں اس قدر کامیاب ہو سکتے ہیں تو ہم کیوں کامیاب نہیں ہو سکتے چنانچہ متعدد مدعیان نبوت نے مذہب سازی کا کاروبار شروع کر دیا۔ ان میں سے مسیلمہ کذاب، اسود عنسی، سجاح وغیرہ خاص طور پر مشہور ہیں۔ ان کے قبیلوں نے ان کی آواز پر لبیک کہا اور ان کی متابعت شروع کر دی۔ قبیلہ پرستی کی انتہاء یہ تھی کہ مسیلمہ کذاب کو اس کے ماننے والے خود بھی جھوٹا نبی سمجھتے تھے لیکن بغیر کسی جھجک کے وہ علانیہ کہتے تھے۔

كذاب ربيعة احب الينا من صادق مضر (صدیق اکبر ص ۲۶۱)

"(ہمارے قبیلے) ربیعہ کا کاذب ترین (نبی) ہمیں قبیلۂ مضر کے صادق (نبی محمد رسول اللہ ﷺ) سے زیادہ پسند ہے۔"

مسیلمہ کذاب محض دنیوی اقتدار و حکومت کا بھوکا تھا۔ امام بخاریؒ نے ایک مفصل روایت میں مسیلمہ کذاب کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

فجعل يقول: ان جعل لی محمد من بعده تبعته

"مسیلمہ کہنے لگا کہ اگر محمد (ﷺ) اپنے بعد حکومت میرے لیے کر دیں تو میں محمد (ﷺ) کی پیروی کر لوں گا۔"

لیکن حضور اکرم ﷺ نے اس کی یہ خواہش پوری نہیں کی۔ چنانچہ اس کے بعد ہے:

وقدمها في بشر كثير من قومه نا قبل اليه رسول الله ﷺ ومعه ثابت بن قيس بن شماس وفي يد رسول الله ﷺ قطعة جريد حتى وقف على مسيلمة في اصحابه فقال لو سألتني هذه القطعة ما اعطيتكها۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۲۸ مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی)

"وہ اپنی قوم کے بہت سے آدمیوں کے ساتھ مدینہ میں آیا تھا تو رسول اللہ ﷺ اس کے پاس تشریف لے گئے اور آپ کے ساتھ حضرت ثابت بن قیس بن شماسؓ (خطیب انصار) بھی تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے دست مبارک میں کھجور کی ٹہنی کا ایک ٹکڑا تھا۔ آپ مسیلمہ کے پاس کھڑے ہوئے۔ وہ اپنے ساتھیوں میں بیٹھا تھا۔ تو آپ نے اس سے فرمایا کہ اگر تو مجھ سے یہ ٹہنی کا ٹکڑا بھی مانگے تو میں اسے تجھے نہیں دوں گا۔"

چنانچہ مسیلمہ ناکام و نامراد واپس ہوا اور اپنے قبیلہ میں جا کر اس نے نبوت کا دعویٰ کیا اور اپنی ایک حکومت قائم کر لی۔ وہ خود کو آنحضرت ﷺ کا خلیفہ کہتا تھا اور خلیفہ رسول کے لیے پیغمبرانہ خصوصیات کا حامل امام ہونا ضروری سمجھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے نبی ہونے کے ساتھ وہ اپنے لیے خلافت کا لقب بھی استعمال کرتا تھا اور اپنے آپ کو امیر المومنین کہلواتا تھا۔ چنانچہ امام بخاریؒ نے حضرت ابن عمرؓ کا یہ قول مسیلمہ کذاب کے قتل کے

سلسلہ میں نقل کیا ہے:

فاخبرنی سلیمان بن یسار انہ سمع عبداللہ بن عمرؓ یقول فقالت جاریة علی ظهر بیت امیر المومنین قتله العبد الاسود۔

(بخاری کتاب المغازی باب قتل حمزہؓ ج ۲ ص ۳۸۵)

"تو مجھے سلیمان بن یسار نے بتایا کہ انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو فرماتے ہوئے سنا تو مکان کی چھت پر چڑھ کر ایک کنیز نے یہ اعلان کیا کہ امیر المومنین کو ایک حبشی غلام (وحشی) نے قتل کر دیا ہے۔"

مسیلمہ آنحضرت ﷺ کی رسالت کا منکر نہیں تھا۔ اسی لیے اپنی اذان میں اشهد ان محمد رسول الله کہلواتا تھا۔ لیکن ساتھ ہی اپنے لیے نبی کی برابری کا مدعی تھا۔ اس لیے اس کے بعد اشهد ان مسیلمة رسول الله۔ بھی کہلواتا تھا۔ (ملاحظہ ہو تاریخ طبری)

مسیلمہ کذاب کا قبیلہ نہایت شجاع، زور اور اور جنگجو واقع ہوا تھا۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کی سرکردگی میں ایک جرار لشکر سے اس سے یمامہ کے مقام پر جنگ کی اور بڑے گھمسان کی جنگ ہوئی، کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ اگرچہ اسلامی لشکر کامران و کامیاب ہوا لیکن بے شمار آدمیوں سے اسے بھی ہاتھ دھونے پڑے۔ یہ جنگ یمامہ ہی تھی جس میں قرآن کریم کے حفاظ اور قرا کی بہت بڑی تعداد شہید ہوگئی اور حضرت عمرؓ کو یہ فکر دامن گیر ہوگئی کہ قرآن کریم کے حفاظ و قراء یونہی شہید ہوتے رہے تو قرآن پڑھانے والے ختم ہو جائیں گے اور انہوں نے حضرت صدیق اکبرؓ سے اصرار کیا کہ قرآن کریم کے تحریر کردہ نسخے زیادہ سے زیادہ تیار کیے جائیں۔

تیسرا گروہ منکرین زکوٰۃ کا تھا جو کہتے تھے کہ زکوٰۃ حضور اکرم ﷺ کے زمانہ کے ساتھ خاص تھی۔ زکوٰۃ کے علاوہ وہ دوسرے احکام اسلامی کے منکر نہیں تھے۔ وہ حق تعالیٰ کی وحدانیت اور نبی اکرم ﷺ کی رسالت پر ایمان رکھتے تھے۔ اجتماعاتِ صلوٰۃ کے منکر نہیں تھے۔ حج بھی کرتے تھے اور باقی تمام احکام پر عمل پیرا تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ حق تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو خطاب کرکے فرمایا ہے:

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۳﴾ (التوبۃ:۱۰۳)

"اے پیغمبر! ان کے اموال سے صدقہ (زکوٰۃ) وصول کرو۔ انہیں پاک کرو، اور اس کے ذریعہ سے ان کی نشوونما کا سامان کرو اور ان کے لیے دعاء کرو یقیناً ان کے لیے آپ کا دعا فرمانا سکون کا باعث ہے۔"

اس آیت کریمہ میں خطاب آنحضرت ﷺ کو ہے۔ کسی اور کو نہیں ہے۔ آپ اللہ کے نبی اور رسول تھے۔ آپ اس کے ذریعہ سے ہمیں پاک کرتے تھے۔ ہماری نشوونما اور بالیدگی کا سامان کرتے تھے۔ ہمارے لیے دعائیں فرماتے تھے۔ آپ کی دعائیں ہمارے لیے باعث سکون تھیں۔ نبی کے علاوہ دوسرے لوگ نہ تو ہمیں پاک کرسکتے ہیں، نہ ہماری روحانی بالیدگی کا کوئی سامان کرسکتے ہیں۔ نہ ان کی دعاؤں میں وہ تاثیر ہے جو آپ کی دعاؤں میں ہوا کرتی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ ہمارے لیے باعثِ سکون ہوا کرتی تھیں۔ یہ تمام خصوصیات نبی اکرم ﷺ ہی میں تھیں۔ اب جو لوگ بھی سربراہ مملکت چنے جائیں وہ نبی اور رسول نہیں ہیں نہ خصائص نبوی کے حامل ہیں۔ لہٰذہ وہ زکوٰۃ کا انسٹی ٹیوشن جو آنحضرت ﷺ کے عہد میں قائم تھا، خود بخود آنحضرت صلی اللہ کی وفات کے ساتھ ختم ہوگیا۔

چوتھا گروہ ان لوگوں کا تھا جو زکوٰۃ کی فرضیت کا منکر نہیں تھا۔ لیکن جاہلیت کے تصور کے مطابق ایک قبیلہ اگر کسی دوسرے قبیلے کو کچھ مقررہ رقم ادا کرتا تھا تو دراصل یہ جنگ کے بعد اپنی ہزیمت اور مغلوبیت کا ایک تاوان ہوتا تھا۔ چنانچہ یہ محکومیت اور تابع فرمان ہونے کی دلیل سمجھی جاتی تھی۔ جس قبیلہ کو یہ رقم ادا کی جاتی تھی وہ قبیلہ غالب اور حاکم ہوتا تھا جسے یہ تاوان ادا کیا جاتا تھا۔ عرب قبائلی عصبیت کے ماتحت ہر قبیلہ اس میں اپنی ذلت سمجھتا تھا کہ وہ کسی دوسرے قبیلے کو کسی قسم کا تاوان ادا کرے۔ زکوٰۃ جو الٰہی فریضہ تھا اور جس کا مقصد ہی یہ تھا کہ جس قبیلے سے صدقات وزکوٰۃ کی کچھ رقم وصول کی جائے وہ اسی قبیلے کے نادار اور غریب طبقے کی امداد پر خرچ کی جائے۔ یہ بات اس سرمایہ داروں کی سمجھ میں نہیں آتی تھی ان کو یہ اندیشہ تھا کہ اس طرح تو پسماندہ طبقات ہمارے برابر ہو جائیں گے۔ پھر ہم ان سے اپنی مرضی کے مطابق کس طرح خدمت لے سکیں گے۔ حق تعالیٰ نے غریب اور نادار طبقہ کو پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ وہ مالدار اور سرمایہ دار طبقہ کی خدمت کریں۔ اور سرمایہ دار طبقہ ان سے خدمت لے سکے۔ معیشت کا کاروبار ہی اس طرح چلتا ہے کہ کچھ لوگ خدمت کریں اور کچھ لوگ مخدوم ہوں۔ اگر سب کے سب برابر ہوگئے تو سرمایہ داری کا سارا نظام ہی چوپٹ ہو جائے گا۔ ان کا قول یہ تھا جو حق تعالیٰ نے سورۃ یٰسین میں نقل فرمایا ہے:

قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَاۗءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ ڰ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۴۷﴾ (یاسین ۴۷)

"کیا ہم ان لوگوں کو کھلائیں جنہیں (اللہ ہی نے نہیں کھلایا۔ جنہیں) اللہ اگر چاہتا تو خود کھلا سکتا تھا (کہ ان کو بھی ہماری طرح دولت مند بنا دیتا) تم لوگ تو کھلی گمراہی میں مبتلا ہو۔"

ایک طرف مال کی محبت اور دوسری طرف اسلامی حکومت کے سربراہ کو جو ان کے قبیلے کے بجائے کسی دوسرے قبیلے کا آدمی تھا زکوٰۃ کی رقوم ادا کرنا

ان کے خیال میں تاوان تھا جو وہ حاکم قبیلے کو ادا کریں۔ یہ ان کے قبائلی شعور کی توہین تھی۔ اس لیے وہ مملکت کو زکوٰۃ یا صدقات کی صورت میں کچھ بھی ادا کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس چوتھے گروہ کے خلاف فوجی کاروائی سے حضرت عمرؓ کو اختلاف تھا۔

مملکت اسلامیہ کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے عرب کے یہ چار گروہ تھے جن کے نظریات اور مطمح نظر ایک دوسرے سے اگرچہ مختلف تھے۔ لیکن چونکہ چاروں گروہوں کو اسلامی مملکت کے خلاف جدوجہد کرنی تھی اور اس مقصد میں سب متحد و متفق تھے اس لیے چاروں گروہوں نے اس مقصد کے لیے ایک متحدہ محاذ بنالیا تھا اور سب ایک دوسرے کے مدد معاون بن گئے تھے اور مسلح تصادم کے لیے آمادہ پیکار تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خیال تھا کہ فی الحال تیسرے اور چوتھے گروہ کے خلاف فوجی کاروائی نہ کی جائے۔ وہ توحید و رسالت کی شہادت دے رہے ہیں۔ کسی اسلامی فریضے کے منکر نہیں ہیں۔ لیکن حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرؓ کی تجویز رد فرمادی اور ان کو بطور سرزنش کے فرمایا:

اجبار فی الجاھلیۃ وخوار فی الاسلام

"جاہلیت کے زمانہ میں تو بڑے سورما بنتے تھے اسلام میں بزدل بنے جا رہے ہو۔"

وہ عربوں کے اس اقدام اور اس سے پیدا ہونے والے دوررس نتائج سے بخوبی آگاہ تھے اس لیے آپ نے فرمایا کہ جو بھی صلوٰۃ اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا میں اس سے جہاد کروں گا۔ آپ کی اس بصیرت قلبی پر صحابہ کرامؓ کا اجماع ہو گیا اور سب نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی رائے سے اتفاق کر لیا۔

حضور اکرم ﷺ کی وفات کے بعد مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ، طائف اور مزید ایک آدھ جگہ کے علاوہ سارا عرب اس فتنہ میں مبتلا ہو چکا تھا۔ یہ اسلام کے لیے نازک ترین لمحہ تھا جس میں اسلام اپنی موت وحیات کی کشمکش میں گرفتار تھا۔ اسلام کی نیا بیچ منجدھار میں ڈول رہی تھی کہ اب غرقاب ہوئی کہ تب غرقاب ہوئی۔ یہ مسلمانوں کی خوش نصیبی تھی کہ انہیں ایسے وقت میں ایک ایسا قائد میسر آگیا تھا۔ جس کے عزم واستقلال اور ثبات قدمی کے آگے حضرت عمرؓ جیسا کوہ آسا ہمت وحوصلہ کا مالک بھی پانی بھرتا نظر آتا ہے۔ یہ وہ وقت تھا کہ بقول تاریخ نگاروں کے اسلام کی حالت اس بکری کی سی ہو گئی تھی جو موسم سرما کی بارش میں کھڑی بھیگ رہی ہو اور جسے سر چھپانے کی کوئی جگہ نہ ملے۔[1] (تاریخ طبری ج ۲ ص ۴۶۱)

بہر حال یہ زبردست خارجی (باغیانہ) تحریک تھی جس کا مقصد اسلامی مملکت کا تختہ الٹنا ہی نہیں تھا کہ بلکہ خود اسلام کو صفحہ ہستی سے مٹادینا تھا۔ اس کے کرتا دھرتا وہی منافقین تھے جو خود عہد رسالت مآب میں بھی پوری طرح سرگرم عمل تھے۔ حضور اکرم ﷺ کو ان منافقین سے جنگ کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ چنانچہ سورہ توبہ میں ارشاد الٰہی ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۭ

(التوبہ: ۷۳)

"اے پیغمبر! کفار اور منافقین سے جہاد کیجئے اور ان کے خلاف سختی کیجئے۔"

چنانچہ منافقین کے خلاف جنگ حضور اکرم ﷺ کے عہد میں شروع ہو چکی تھی جس کی تکمیل حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ہوئی اور مسلمانوں نے متحد و متفق ہو کر ان کا زور بڑی حد تک توڑ دیا اور اسلامی مملکت کو ثبات واستحکام عطا کر دیا جس کی بنیاد پر آگے چل کر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے شاندار حکومت کی تعمیر فرمائی۔ یہ منافقین جنہوں نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد میں زبردست بغاوت کا علم بلند کیا تھا خوارج ہی تھے۔

خوارج ایک مخصوص عقائد کے پیرو ہونے کی حیثیت سے تو بعد میں چل کر روشناس ہوئے۔ لیکن شروع میں وہ منافقین جو حکومت کے خلاف مسلح خروج کرتے تھے وہی خوارج کہلاتے تھے۔ چنانچہ یہ سب خوارج ہی تھے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا زمانۂ خلافت کچھ طویل عرصہ پر محیط نہیں ہے وہ صرف اڑھائی سال کا مختصر ترین عرصہ ہے لیکن اس مختصر ترین عرصہ میں انہوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں ان کے تصور سے بھی حیرت ہوتی ہے۔ سارا عرب فتنہ ارتداد کی گرفت میں آچکا تھا۔ ان سے نمٹنا آسان کام نہیں تھا۔ ان کے چار بڑے بڑے گروہ تھے۔ کچھ تو اپنے آبائی دین کی طرف لوٹ گئے تھے، کچھ جھوٹے مدعیان نبوت کے پھندے میں پھنس چکے تھے۔ کچھ زکوٰۃ سے انکار کر رہے تھے، کچھ زکوٰۃ کی فرضیت کے تو منکر نہیں

---

[1] ماتم کیجئے ان بصیرت راویوں کی دین ودانش کا جو اس قسم کی روایات نقل کرتے ہیں کہ اسلام کے ایسے نازک وقت میں جبکہ اسے اپنی بقا اور فنا کا سوال درپیش تھا بنو ہاشم کے سر برآوردہ حضرات اسلامی مملکت کے متزلزل کھنڈرات کی بنیاد پر اپنی خلافت کا محل تعمیر کرنے کے درپئے تھے۔ اور حضرت علیؓ۔ حضرت عباسؓ، اور حضرت فاطمہؓ زہرا رضی اللہ عنہم اپنے وفات یافتہ خسر، بھتیجے اور باپ کی وراثت کے دعوے لے کر کھڑے ہو گئے تھے۔ تاکہ مسلمانوں کو بیرونی خطرات کے ساتھ ساتھ اندرونی خلفشار میں بھی مبتلا کر دیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ہمارے خیال میں یہ ساری روایتیں جعلی اور بناوٹی ہیں جو ان صحابہ کرام پر بہت بڑا بہتان ہیں اس وقت یہ تمام حضرات تو اسلام کی نیا کو چاروں طرف سے ہجوم کر کے آنے والے متلاطم طوفانوں سے بچا کر کنارے پر لگانے میں مصروف تھے۔ اس وقت انہیں ان پیش پا افتادہ ذاتی مفادات سے نہ کوئی سروکار ہو سکتا تھا نہ تھا۔

تھے مگر مرکز حکومت کو زکوٰۃ ادا کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اور ہر ایک گروہ کے متبعین کثیر تعداد پر مشتمل تھے۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ چند مقامات کو چھوڑ کر اکثر جزیرۃ العرب اس کی گرفت میں آ چکا تھا۔ خوارج (باغیوں) کے اس زبردست فتنہ کو فرو کرنا اور اس کے ساتھ ہی ان فتنوں کو بھڑکانے والی ایران اور روم کی صدیوں پرانی مستحکم حکومتوں سے بھی نبرد آزمائی کی ابتداء کر دینا بڑے ہی دل گردے کا کام تھا۔ (واضح رہے کہ اسلام خواہ مخواہ دوسرے غیر مسلم ممالک پر حملہ کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ خوارج کی اس شورہ پستی کی امداد و اعانت ایران و روم کی حکومتوں کی طرف سے مسلسل ہو رہی تھی اور اس قسم کی اطلاعات مسلسل مل رہی تھیں کہ ایرانی اور بازنطینی حکومتیں اسلام کے خلاف حملے کی تیاریوں میں مصروف ہیں اور ان کی طرف سے مدینہ منورہ پر حملہ ہوا چاہتا ہے جس کی روک تھام کے لیے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو عملی اقدام کرنا پڑا تھا) اور ان تمام محاذوں پر پیہم کامیابیاں حاصل کرتے چلا جانا حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی بے مثال شجاعت، بصیرت، دور اندیشی، اور فراست ایمانی کی دلیل ہے۔ یہ حق تعالیٰ کا بڑا ہی احسان تھا کہ ایسے وقت میں حق تعالیٰ نے ملت اسلامیہ کو ایسا سربراہ عطا کر دیا ورنہ میں نہیں سمجھ سکتا کہ اگر اس جلیل القدر منصب پر کوئی اور شخص فائز ہوتا تو وہ ان تمام مشکلات سے اس قلیل ترین عرصے میں عہدہ برآ ہو سکتا تھا۔ یہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی بے پناہ صلاحیت کا ثبوت ہے۔

خوارج فاروق اعظمؓ کے دور میں

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حضرت فاروق اعظم عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے۔ ان کا دور خلافت بظاہر نہایت کامیاب رہا اور روز افزوں فتوحات و غنائم سے مسلمان ایک عظیم طاقت بنتے چلے گئے۔ ہر طرف خوش حالی اور فارغ البالی کا دور دورہ ہو گیا۔ بظاہر خوارج (باغیوں) کے فتنہ نے ان کے عہد میں سر نہیں اُبھارا لیکن زیر زمین سازشیں اور ریشہ دوانیاں ان کے دور میں بھی ہوتی رہیں۔ لیکن خوارج (باغیوں) کو کھل کر سامنے آنے کی جرأت نہیں ہو سکی۔ موطا امام محمدؒ میں حضرت سالم بن عبد اللہ بن عمرؓ کی یہ روایت موجود ہے:

عن سالم بن عبد اللہ قال قال عمر رضی اللہ عنہ لو علمت ان احدا اقویٰ هذا الا مرمنی لکان ان اقدم فیضرب عنقی اهون علی فمن ولی الا مر بعدی فیعلم ان سیردہ عنه القریب والبعید وایم اللہ ان کنت لا قاتل الناس عن نفسی۔ (موطا امام محمدؒ باب النوادر ص ۴۰۰)

"حضرت سالم بن عبد اللہ (حضرت عمرؓ کے پوتے) فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ اگر میں اپنے سے زیادہ کسی شخص میں اس امر (خلافت) کی زیادہ قوت و صلاحیت دیکھتا تو میرے لیے اپنی گردن کٹوا دینا اس منصب کو قبول کرنے سے زیادہ آسان ہوتا لہٰذا جو شخص میرے بعد اس منصب پر فائز ہوا اسے سمجھ لینا چاہیے کہ اسے نزدیک اور دور کے سب لوگ ہی اس منصب سے ہٹانے کی کوشش کریں گے اور مجھے بھی اپنے نفس کی طرف سے لوگوں سے نبرد آزما رہنا پڑا ہے۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس بیان سے دو باتیں واضح ہیں۔ اول تو یہ کہ حضرت عمرؓ منصبِ خلافت کے ہرگز خواہشمند نہیں تھے۔ بلکہ انہوں نے اس منصب کو اس مجبوری سے قبول کیا تھا کہ ملت اسلامیہ میں اس وقت کے حالات کے پیش نظر کوئی زیادہ باصلاحیت اور قوی تر شخص موجود نہیں تھا۔ اگر حضرت عمرؓ اس منصب کو قبول نہ فرماتے تو مسلمانوں کو نہ معلوم کس قدر مشکلات سے گزرنا پڑتا۔ یہ ایسی حقیقت ہے کہ یہ صرف حضرت عمرؓ کا ارشاد ہی نہیں ہے بلکہ تمام اہل الرائے حضرات۔ (دور اول سے آج تک) اس کے اعتراف پر مجبور ہیں۔ وہ اسلام کے دوست ہوں یا دشمن سب اس پر متفق ہیں کہ حضرت عمرؓ کا ثانی آج تک پیدا نہیں ہوا اور ان کا انتخاب بالکل صائب اور صحیح تھا۔

دوسری بات جو حضرت عمرؓ نے فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ اس کے باوجود انہیں بھی مخالفتوں اور مزاحمتوں کا سامنا رہا ہے اور انہیں بھی اپنے نفس کی طرف سے شورش پسندوں سے نبرد آزما رہنا پڑا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے بعد ہونے والے خلیفہ کو یہ انتباہ فرما رہے ہیں کہ دور اور نزدیک کے سب لوگ اس کے رد کرنے کی کوشش کریں گے لہٰذا اسے برابر چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔

بہر حال موطا امام محمدؒ کی اس روایت سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں بھی ان کے خلاف مسلسل سازشیں ہوتی رہی ہیں۔ لیکن ہمارے مورخین نے ان سازشوں کی کوئی تفصیل نہیں دی جس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ حضرت عمرؓ کا دور خلافت انتہائی کامیاب رہا تھا۔ ان کی کامرانیوں اور کامیابیوں کے سامنے ان سازشوں اور درپردہ ریشہ دوانیوں کی کوئی بڑی اہمیت نہیں تھی۔ دوسری بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ جب تدوین و تصنیف کا دور آیا تو قلم ان ہی مصنفین یعنی عجمیوں کے ہاتھ میں تھا جو خود ان سازشوں کے بانی مبانی تھے تو وہ اپنی پردہ دری کیوں کرتے لیکن پھر بھی ہمیں ان کی تصانیف میں اس کے کچھ اشارے مل جاتے ہیں۔ مثلاً صحیح بخاری میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک طویل خطبہ ملتا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ:

ثم انه بلغنی ان قائلا منکم یقول واللہ لو مات عمر بایعت فلانا فلا

یغترن امرو ان یقول انما کانت بیعۃ ابی بکر فلتۃ وتمت الا وانھا قد کانت کذالک ولکن اللہ وقی شرھا ولیس منکم تقطع الاعناق الیہ مثل ابی بکر من بایع رجلا من غیر مشورۃ من المسلمین فلا یتابع ھو ولا الذی تابعہ تغرۃ ان یقتلا وانہ کان من خیر ناحین توفی اللہ نبیہ ﷺ۔ (صحیح بخاری ج۲ص۱۰۰۹ (مطبوعہ مطبعہ مجتبائی دہلی)

"پھر مجھے یہ خبر ملی ہے کہ تم میں سے کوئی آدمی یہ کہتا ہے کہ اگر عمرؓ مر گئے تو میں فلاں شخص کی بیعت کر لوں گا۔ اور خبردار کوئی شخص اس فریب میں نہ رہے کہ حضرت ابو بکرؓ کی بیعت بھی یوں ہی (بغیر مشورہ کے) یکبارگی ہو گئی تھی اور اس کا انجام بخیر ہوا (لہٰذہ بغیر مشورہ کے ہماری اس بیعت کا انجام بھی بخیر ہو جائے گا) بیشک ابو بکرؓ کی بیعت یکا یک ہو گئی تھی۔ لیکن اللہ نے اس کے شر سے (سب کو) بچا لیا۔ لیکن تم میں کوئی اور ایسا نہیں ہے جس میں ابو بکرؓ جیسی فضلیت ہو۔ اب جس کسی شخص نے مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر کسی شخص کی بیعت کر لی تو اس کی اور اس کے متبع کی بیعت نہ کی جاسکے گی بلکہ اندیشہ ہے کہ دونوں ہی قتل کر دیئے جائیں۔ اور یقیناً ابو بکرؓ تو ہم سب سے بہتر تھے جب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو اٹھا لیا۔

یہ اطلاع حضرت عمرؓ کو ان کے آخری حج کے موقعہ پر منیٰ میں دی گئی تھی۔ پلان یہ تھا کہ حضرت عمرؓ کا انتقال ہو جائے تو یکبارگی اپنی مرضی کے آدمی کی بیعت کر لی جائے۔ حضرت صدیق اکبرؓ کی بیعت بھی یوں ہی یکبارگی ہو گئی تھی اور پھر امت نے اسے قبول کر ہی لیا تھا۔ ایسے ہی ہم اگر یکبارگی اپنی مرضی کے شخص سے بیعت کر لیں گے تو امت اسے بھی تسلیم کر لے گی۔ یہ سب خوارج تھے یعنی حکومتِ وقت کے مخالفین ہی تھے جو اس قسم کی پلاننگ کر رہے تھے اور ان کی یہ پلاننگ مدینہ منورہ میں خوب مشتہر تھی۔ چنانچہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ خدانخواستہ اگر ایسا ہو گیا تو ایک نیا فتنہ کھڑا ہو جائے گا۔ لہٰذہ یہی بہتر ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی حیات ہی میں اس کا فیصلہ کر دیں کہ ان کے بعد خلیفہ کون ہو گا۔ چنانچہ صحیح مسلم میں یہ وہ خطبہ نقل کیا گیا ہے جو حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنی وفات سے چند روز پہلے دیا تھا۔ حضرت معدانؓ فرماتے ہیں کہ:

"وفات سے چند دن پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جمعہ کے دن خطبہ دیا۔ اس میں رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابو بکر صدیقؓ کا ذکر کیا۔ پھر فرمایا: "میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ ایک مرغ نے میرے تین ٹھونگیں ماریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری موت قریب آگئی ہے۔ بعض لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ آپ اپنا خلیفہ نامزد کر دیجئے (میں کہتا ہوں کہ) اللہ تعالیٰ اپنے دین اور خلافت اور اس چیز کو جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو مبعوث کیا تھا (یعنی قرآن) ضائع نہیں کرے گا۔ اگر میری موت جلد واقع ہو جائے تو مشورہ کرنے کے بعد خلافت ان چھ آدمیوں میں رہے گی جن سے رسول اللہ ﷺ اپنی وفات تک راضی رہے (یعنی حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت طلحہ، حضرت زبیرؓ، حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ) اور میں سمجھتا ہوں کہ بعض لوگ جن کو میں نے اپنے ہاتھ سے مارا ہے (یعنی ایرانی، رومی اور خوارج) اس کام میں اسلام پر طعن کرتے ہیں، اگر انہوں نے پھر ایسا کیا تو وہ اللہ کے دشمن اور گمراہ کافر ہیں۔ (صحیح مسلم کتاب المساجد باب نہی من اکل ثوما عن معدانؓ)

اپنی اسکیم کو روبہ عمل لانے کے لیے یہ خوارج (باغی) زیادہ دیر تک صبر نہیں کر سکے چنانچہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طبعی وفات کا انتظار بھی نہیں کر سکے۔ انہوں نے سازش تیار کی کہ حضرت عمرؓ کو قتل ہی کر دیا جائے۔ چنانچہ ابو لؤلؤ فیروز ہرمزان جفینہ اور کعب الاحبار وغیرہ نے مل کر حضرت عمرؓ کو راستہ سے ہٹانے کی اسکیم تیار کی۔ اس سکیم میں جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں ایرانی، رومی، یمنی یہودی اور منافقین شریک تھے اور ایک دن فجر میں حضرت عمرؓ پر ابو لؤلؤ فیروز نے خنجر سے حملہ کر دیا۔ اسکیم تو یہی تھی کہ حضرت عمرؓ کو شہید کر کے یکبارگی طور پر اپنی مرضی کے آدمی سے بیعت کر لی جائے۔ پھر سب لوگ اس بیعت کو تسلیم کر ہی لیں گے۔ لیکن حضرت عمرؓ بہت سخت جان ثابت ہوئے اور وہ حملے کے بعد تین دن تک زندہ رہ گئے اور تمام معاملات حسن وخوبی کے ساتھ طے کر کے یکم محرم کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ (ایک اور روایت کے مطابق ان کا یوم شہادت سات یا دس محرم ہے۔ ملاحظہ ہو ہیکل کی "سوانح عمرؓ")

جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات سے چند روز پیشتر اعلان فرمایا دیا تھا کہ اگر میری موت جلد واقع ہو جائے تو مشورہ کرنے کے بعد خلافت ان چھ آدمیوں میں رہے گی۔ جن سے رسول اللہ ﷺ اپنی وفات تک خوش رہے (مسلم کی حدیث جو اوپر درج ہو چکی ہے) چنانچہ آپ نے اسی کے مطابق خلافت کے فیصلے کے لیے انہی چھ آدمیوں کی ایک کمیٹی بنادی جو تین دن تک باہم فیصلہ کر لیں کہ ان میں سے کون خلیفہ ہو گا اور جس پر اتفاق ہو جائے اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی جائے۔ چنانچہ ان چھ حضرات کی کمیٹی نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں فیصلہ کیا اور ان کے دست مبارک پر خلافت کی بیعت کر لی گئی۔ اور خوارج نے جو اسکیم بنائی تھی وہ کامیاب نہ ہو سکی۔

خوارج عثمان ذوالنورینؓ

لیکن خوارج (باغیوں) کا یہ ٹولہ اپنی سازشوں میں برابر مصروف رہا اور

وہی ٹیکنیک انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف پھر استعمال کی جو وہ حضرت عمرؓ کے خلاف استعمال کر کے ناکام رہے تھے۔ لیکن اس مرتبہ انہیں اپنی اسکیم کو بروئے کار لانے میں بارہ سال کا عرصہ لگ گیا۔ اور اس مرتبہ وہ کامیاب ہو گئے۔ یعنی حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کو شہید کر کے یکبارگی طور پر اپنی مرضی کے آدمی یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن ان کی یہ کامیابی دیرپا ثابت نہ سکی اور اکابر صحابہ نے اس کے خلاف شدید ردعمل کا اظہار فرمایا جس کے نتیجہ میں جنگ جمل اور جنگ صفین کے حوادث فاجعہ پیش آئے۔ اس طرح خوارج (باغیوں) کی وہ سازش طشت ازبام ہو گئی جو وہ عرصہ دراز سے زیرِ زمین تیار کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنی مرضی کا خلیفہ تو منتخب کر لیا۔ لیکن جب یہ خود پسند کردہ خلیفہ بھی ان کے اشارہ ابرو پر نہ چلا تو بالآخر اسے بھی شہید کر دیا۔

خوارج کون تھے؟

جیسا کہ آپ صفحات گزشتہ میں ملاحظہ فرماتے آرہے ہیں کہ یہ خوارج دراصل وہ منافقین تھے جو بظاہر مسلمان ہو گئے تھے۔ لیکن وہ درپردہ وہ اسلام کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ ان میں سرفہرست یہودی تھے، کچھ ایرانی اور رومی تھے، لیکن ان کے ساتھ ہی کچھ عرب بھی تھے اور عربوں میں اکثریت قبیلہ بنو تمیم کے افراد کی تھی، آپ کو یاد ہوگا کہ ہم نے عہد رسالت مآب میں خوارج کی ابتداء بتاتے ہوئے صحیح بخاری کی ایک روایت نقل کی تھی جس میں عبداللہ ذوالخویصرہ تمیمی نے آنحضرت ﷺ پر اموال غنیمت کی تقسیم میں انصاف نہ فرمانے کا الزام لگایا تھا۔ یہ عبداللہ ذوالخویصرہ بھی قبیلہ بنو تمیم ہی سے تعلق رکھتا تھا۔

خوارج حضرت علی

اس کے بعد قبیلہ بنو تمیم ہی کے لوگ خوارج میں کثرت سے شامل تھے۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد میں جنگ صفین کے بعد جو خوارج سامنے آئے ان میں بھی اسی قبیلے کی اکثریت ملتی ہے۔

پروفیسر احمد امین مصری خوارج کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وبعد جدال وتردد قبل علی التحکیم، واختار معاویة عمرو بن العاص لیمثله، واختار اصحاب علی ابا موسیٰ الاشعری، اذذاك ظهر قوم من جند علی اکثرهم من قبیلة تمیم نفروا من ان یحکم احد فی کتاب الله وراوا ان التحکیم خطا لان حکم الله فی الامر واضح جلی۔

(فجر الاسلام ص ۲۵۶ مطبوعہ مصر)

"باہمی بحث وتردد کے بعد حضرت علیؓ نے تحکیم کو قبول کر لیا اور حضرت معاویہؓ نے اپنی نمائندگی کے لیے حضرت عمرو بن العاصؓ کو منتخب کیا اور اصحاب علیؓ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو منتخب کیا، اس وقت حضرت علیؓ کے لشکر میں سے ایک جماعت ظاہر ہوئی جن کی اکثریت قبیلہ بنو تمیم سے تھی وہ اس بات سے بدکے کہ کوئی شخص کتاب اللہ میں حُکَم بنایا جائے۔ ان کی رائے یہ تھی کہ تحکیم غلط ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم اس معاملہ میں بالکل واضح اور ظاہر ہے۔

نیز پروفیسر احمد امین مصری دوسری جگہ لکھتے ہیں:

ولقد کان اکثر من اعتنق المذهب الخارجی فی اول مرعربا سکنوا البصرة والکوفة بعد فتوح عمر، وکان تغلب علی اکثرهم البداوة، وکان کثیر منهم من بنی تمیم ثم راینا ان بعض الموالی دخل فی عقیدتهم ولعل السبب فی دخولهم انهم اشترکوا مع الخوارج فی بعض الاموبین اعتقادهم بعدم صلاحیتهم، ووجوب الخووج علیهم حتی تزول دولتهم، (ضحی الاسلام ج۳ ص۳۳۳ مطبوعہ مصر)

"شروع میں حضرت عمرؓ کی فتوحات کے بعد جن لوگوں نے خارجی مذہب کا قلاوہ اپنی گردن میں ڈالا وہ بصرہ اور کوفہ کے رہنے والے تھے اور ان میں اکثر پر بدوی پن غالب تھا اور ان میں سے زیادہ تر بنو تمیم کے قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ بعض موالی (ایرانی اور رومی آزاد کردہ غلام) بھی ان کے عقیدے میں داخل ہو گئے۔ اور غالباً ان کے داخلے کا سبب خوارج کے ساتھ بنو امیہ سے بعض میں اشتراک تھا اور بنو امیہ کے خلافت کے حق دار نہ ہونے کا اعتقاد تھا۔ اور یہ عقیدہ بھی جبتک ان کی حکومت بالکلیہ ختم نہ ہو جائے ان کے خلاف خروج واجب ہے۔"

پروفیسر احمد امین مصری نے بتایا ہے کہ خارجی فرقے میں ایرانی اور رومی موالی کے علاوہ بصرہ اور کوفہ کے دیہاتی لوگ بھی شامل تھے جن کا تعلق قبیلہ بنو تمیم سے تھا۔ عرب قبائل کے دوسرے لوگ بھی ان کے ساتھ شامل تھے۔ لیکن اکثریت بنو تمیم ہی کی تھی۔

جنگ جمل میں بھی جن لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے خلاف بھرپور جنگ میں حصہ لیا تھا ان میں بھی ہمیں قبیلہ بنو تمیم کا خصوصیت کے ساتھ تذکرہ ملتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج میں اس قبیلے کے لوگ اس کثرت سے شامل تھے کہ صرف ایک قبیلہ کے مقتولین کی تعداد پانچ سو کے لگ بھگ تھی۔ (الاغانی ج۱۴ ص۴)

یعنی ایک طرف صدیق اکبرؓ کے عہد میں فتنہ ارتداد میں بنو تمیم پیش پیش تھے۔ پھر قاتلین عثمانؓ میں بنو تمیم کی اکثریت تھی اس لیے قصاص عثمانؓ کا علم بلند کرنے والوں (یعنی حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ اور ام المومنین عائشہ

صدیقہ رضی اللہ عنہم) کے مقابلے کے لیے جنگ جمل کے موقعہ پر حضرت علیؓ کے لشکر میں اسی بنو تمیم کے قبیلے کی اکثریت تھی کہ صرف ان کے پانچ سو آدمی جنگ جمل میں کام آئے اور دوسری طرف تحکیم کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف اجتماع کر کے ان سے الگ ہو جانے والوں میں بھی اکثریت انہی بنو تمیم کی تھی۔

پھر کربلا کے مقام پر حضرت حسین ابن علی رضی اللہ عنہ سے جنگ کرنے والوں میں بھی یہی بنو تمیم کے لوگ پیش پیش تھے۔ چنانچہ جناب عمر کھالہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

وتعد تمیم من القبائل التی قاتلت والحسین وشیعته فجاءت بسبعة عشر راسامنهم (معجم قبائل عرب مطبوعہ دار العلوم للملائین بیروت ص ۱۳۱)

"اور بنو تمیم کا شمار ان قبائل میں کیا جاتا ہے جنہوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے شیعوں سے جنگ کی۔ چنانچہ جنگ کے بعد بنو تمیم قبیلے کے افراد حسینی قافلے کے سترہ سر لائے گئے۔"

قبائل کے علاوہ نمایاں شخصیتوں کو دیکھا جائے تو وہاں بھی یہی صورت نظر آتی ہے کہ جو ارتداد میں پیش پیش تھے وہی حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی شہادت نیز حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین ابن علی رضی اللہ عنہ کی شہادت میں بھی آگے نظر آتے ہیں۔ مثلاً قاتلین حضرت حسین رضی اللہ عنہ میں ایک شخصیت شبث بن ربعی بہت مشہور ہے اس کے بارے میں حافظ ابن حجر عسقلانیؒ تحریر فرماتے ہیں کہ:

ادرك النبی صلی اللہ علیہ وسلم ولم یصحبه كان موذن سجاح ثم واسلم وكان یبغض عثمان ویوابی علیا رضی اللہ عنہ ثم صار خارجیا وقاتل الحسین بكربلا

(الاصابہ فی اسماء الصحابہ لابن حجر عسقلانی ج ۲ ص ۲۶۱ طبع مصر)

"شیث بن ربعی نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا تھا مگر شرف صحبت حاصل نہیں کر سکا وہ سجاح (مدعیہ نبوت) کا موذن تھا۔ پھر اس نے توبہ کی اور مسلمان ہو گیا۔ وہ حضرت عثمان سے بغض رکھتا تھا اور حضرت علی سے موالات رکھتا تھا۔ پھر حضرت علی کا بھی مخالف ہو کر خارجی بن گیا اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے کربلا میں نبرد آزما رہا۔"

ایسے ہی بے شمار لوگ ہیں جن میں سے بعض کا تذکرہ ہمارے مورخین نے کر دیا ہے اور بہت سوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔

بہر حال یہ سب خوارج یعنی حکومت وقت کے خلاف مسلح بغاوت اور خروج کرنے والے ہیں۔ جنہوں نے وقتاً فوقتاً اپنے عہد کی حکومتوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ سربراہان مملکت کو قتل اور شہید کیا اور ان کی حکومتوں کا تختہ الٹا۔

یہ سب منافقین تھے جو بظاہر مسلمان ہو گئے تھے لیکن بہ باطن کافر تھے ان میں سے جو لوگ اپنے ذاتی مفادات حاصل کرنے کے لیے بظاہر اسلام لے آئے تھے یا اسلامی حکومت میں کفر کی وجہ سے انہیں جو نقصانات پہنچ سکتے تھے ان سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی خاطر انہوں نے اسلام کا لبادہ اوڑھ لیا تھا وہ مسلمانوں کی تاریخ میں منافقین کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں اور جن لوگوں نے کچھ طاقت حاصل کرنے کے بعد مسلمان حکومتوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور اسلامی مملکت کے خلاف خروج کیا وہ خوارج کے لقب سے یاد کئے گئے۔ لیکن اپنی اصل کے اعتبار سے یہ سب منافق ہیں جن کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا تھا کہ:

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ اغْلُظْ عَلَيْهِمْ ؕ وَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝۷۳ (التوبہ:۷۳)

"اے پیغمبر اسلام! کفار اور منافقین سے جہاد کیجئے اور ان پر سختی کیجئے۔"

آج بھی ایسے خفیہ منافقوں اور کھل کر سامنے آجانے والے باغیوں سے جہاد فرض ہے اور انہیں کیفر کردار کو پہنچانا امت مسلمہ کا فریضہ ہے۔

کتاب التعزیر

تعزیر فقہاء کی اصطلاح میں وہ سزائیں کہلاتی ہیں جو قرآن کریم سے ثابت نہیں ہیں بلکہ امام یا قاضی اپنی صوابدید سے مختلف جرائم میں جاری کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے چند انتہائی جرائم کی انتہائی سزائیں مقرر کر دی ہیں اور باقی جرائم کو مسلمانوں کی اجتماعی رائے پر چھوڑ دیا ہے۔ جرائم چار طرح کے ہیں۔ دوسرے کی عزت سے کھیلنا۔ دوسرے کی عزت و آبرو پر حملہ کرنا۔ کسی کے مال پر حملہ کرنا، کسی کی جان لینے کی کوشش کرنا۔ ان میں انتہائی جرائم کی انتہائی سزائیں۔ قتل کرنے کی سزا، خون کے بدلے خون۔ یعنی قصاص، اعضاء کو ناکارہ کر دینا یا کاٹ ڈالنا تو وہاں بھی قصاص لازم ہے، آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت، کان کے بدلے کان، ہاتھ کے بدلے ہاتھ علی ہذا القیاس۔

(۲) کسی کی عزت سے کھیلنا، کسی سے زنا کرنا اس کی سزا سو (۱۰۰) کوڑے مارنا۔

(۳) کسی کی عزت و آبرو پر حملہ کرنا یعنی زنا کی تہمت لگانا، اس کی سزا اسی (۸۰) کوڑے مارنا۔

(۴) کسی کا مال چرانا اس کی سزا ہاتھ کاٹ دینا لیکن ایسے جرائم بے شمار ہیں جو انہیں کے ذیل میں آتے ہیں لیکن ان انتہاؤں کو نہیں پہنچتے مثلاً کسی کو مارنا اور ضرب پہنچانا جس میں کوئی انسانی عضو بیکار نہیں ہوتا۔ ضائع نہیں ہوتا یا کسی سے زنا تو نہیں کیا مگر کسی کا بوسہ لے لیا ہے۔ کسی سے چھیڑ چھاڑ کی ہے، اس پر آوازے کسے ہیں۔ کسی پر زنا کی تہمت تو نہیں لگائی لیکن کوئی دوسری تہمت لگائی ہے کسی کا مال تو نہیں چرایا مگر کوئی ایسی تدبیر کی ہے کہ اس کے مال پر ناجائز قبضہ ہو جائے۔ تو ایسی صورتوں میں بھی جو ان جرائم کے ذیل میں نہیں آتے لیکن وہ جرم ہیں مثلاً بھنگ، افیون، چرس، وغیرہ فروخت کرنا تو اس صورت میں ایسے مجرموں کو سزا دینا ضروری ہے تاکہ ان جرائم کا سد باب ہو سکے، لیکن ان جرائم کی قرآن کریم نے کوئی سزا مقرر نہیں فرمائی تو امام یا قاضی ایسے مجرموں کو اپنے اجتہاد سے کوئی سزا دے گا۔ ایسی سزاؤں کو تعزیر کہتے ہیں۔ مثلاً سورہ نساء میں ہے:

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا ﴿۱۵﴾ وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا ﴿۱۶﴾ (النساء:۱۵تا۱۶)

”اور تمہاری عورتوں میں سے جو عورتیں بے حیائی کی مرتکب ہوں تو ان پر تم اپنے میں سے چار گواہ بنالو۔ پس اگر چار گواہ گواہی دیدیں تو انہیں گھروں میں روکے رکھو حتیٰ کہ انہیں موت ہی آجائے یا خدا ان کے لیے کوئی راستہ نکال دے۔ اور جو مرد عورت تم میں سے اس بے حیائی کے مرتکب ہوں تو ان کو ستاؤ۔ پھر اگر وہ توبہ کرلیں اور اپنی اصلاح کرلیں تو ان سے درگزر کرو، یقیناً اللہ بھی توبہ قبول کرنے والا رحم فرمانے والا ہے۔“

ان آیات میں الفاحشۃ (بے حیائی) سے مراد ایسے ہی جرائم ہیں جو زنا کی حد تک تو نہیں پہنچتے البتہ زنا کے ذیل میں آجاتے ہیں یعنی کسی عورت کا بوسہ لے لینا، اس کی چھاتیوں کو چھونا اور لمس کرنا، اس سے گندی باتیں کرنا، اسے چھیڑنا، اس پر آوازے کسنا تو ایسے جرائم کے لیے قرآن کریم نے ایذا رسانی کا حکم دیا ہے اس ایذا رسانی کی کوئی حد مقرر نہیں فرمائی۔ یہی حال دوسرے ان تمام جرائم کا بھی ہے جو قرآن کی رو سے جرم ہیں، لیکن قرآن نے ان کی کوئی سزا مقرر نہیں کی تو حکومت وقت ایسے تمام جرائم کی تعزیرات مقرر کر سکتی ہے۔ اور اگر حکومت مقرر نہ کرے تو امام یا قاضی اپنی صوابدید کے مطابق مناسب سزا دے سکتا ہے۔ البتہ یہ سزائیں قرآنی حدود سے عام حالات میں تجاوز نہ کرنی چاہئیں۔ چنانچہ فقہاء نے کہا ہے کہ تعزیر میں کم سے کم تین

کوڑے اور زیادہ سے زیادہ انتالیس کوڑے مارے جاسکتے ہیں۔ کیونکہ غلاموں کے لیے قذف کی مشروع حد چالیس کوڑے ہے۔ لہٰذہ اس سے ایک کم انتالیس کوڑے مارے جاسکتے ہیں۔ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ اصل حد احرار کے متعلق اسی (۸۰) کوڑے ہے لہٰذہ اس سے کم پچھتر کوڑے مارے جاسکتے ہیں، امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ اناسی کوڑے مارنے چاہیں امام ابو یوسفؒ سے بھی ایک روایت امام زفرؒ کے مطابق ہے۔ کم سے کم تین کوڑے اس لیے رکھے گئے ہیں کہ اس سے کم کوئی مقصد ہی حاصل نہیں ہوتا۔ اگر امام چاہے تو کوڑے کے ساتھ قید کی سزا بھی دے سکتا ہے۔

ہمارے نزدیک بہتر یہ ہے کہ حکومت وقت اہل حل وعقد (پارلیمنٹ کے ممبران) کی رائے سے مختلف جرائم کے لیے ان کی نوعیت کے پیش نظر جرائم کی شدت وخفت کو مد نظر رکھتے ہوئے نیز مملکت کے حالات وکوائف کے پیش نظر سزائیں مقرر کر دے اور ان کے لیے ایک ضابطہ تعزیرات مدون کرے تاکہ پوری مملکت میں سزائیں دینے میں یکسانیت پیدا ہوسکے۔

شراب کی تعزیر

شراب خوری کی سزا بیان کرنے سے پہلے چند امور پر بحث کر لینا ضروری ہے۔ یعنی پہلے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ قرآن کریم کی رو سے "خمرؔ" یعنی شراب کیا ہوتی ہے۔ اور قرآن کریم نے شراب کے متعلق کیا حکم صادر فرمایا ہے اور کیا قرآن کریم نے اس کی کوئی حد مقرر فرمائی ہے۔ اگر کی ہے تو وہ کیا ہے:

قرآن کریم نے شراب کے لیے "خمرؔ" کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ شراب کے متعلق ہمیں قرآن کریم میں تین قسم کی آیات ملتی ہیں سب سے پہلے آیت سورۂ بقرہ کی ہے جس میں فرمایا گیا ہے:

یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَیْسِرِ ؕ قُلْ فِیْهِمَاۤ اِثْمٌ كَبِیْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ ٘ وَ اِثْمُهُمَاۤ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ (البقرہ:۲۱۹)

"اور اے پیغمبر اسلام! لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے متعلق دریافت کرتے ہیں۔ آپ انہیں بتادیجئے کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے ان میں کچھ منفعتیں بھی ہیں اور ان کا گناہ ان کی منفعتوں سے زیادہ بڑا ہے۔"

دوسری آیت سورۂ نساء میں ہے جس میں فرمایا گیا ہے:

لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ

(النساء:۴۳)

"نماز کے قریب بھی نہ جاؤ دراں حالیکہ تم مدہوش ہو تا آنکہ تم سمجھ سکو کہ کیا کہہ رہے ہو۔"

تیسری آیت سورۂ مائدہ کی ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَیْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۹۰﴾ اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَ الْمَیْسِرِ وَ یَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ عَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴿۹۱﴾ وَ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ احْذَرُوْا ۚ فَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ﴿۹۲﴾

(المائدہ:۹۰تا۹۲)

"اے پیروان دعوت ایمانی! بات یہی ہے کہ شراب، جوا، بت اور پانسے سب گندی چیزیں اور شیطانی کام ہیں لہٰذہ ان سے بچو، توقع ہے کہ (اس طرح) تم فلاح پاجاؤگے۔ شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ تمہارے آپس میں شراب اور جوئے کے ذریعہ بغض اور عداوت کا بیج بودے اور تمہیں خدا کی یاد سے یعنی نماز سے روک دے تو کیا تم ان چیزوں سے باز آرہے ہو۔ (یا نہیں) اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور ڈرتے رہو۔ تو اگر تم نے اطاعت سے منہ موڑا تو اچھی طرح سمجھ لو کہ ہمارے رسول کے ذمہ صرف صاف صاف وضاحت سے پہنچادینا ہے۔"

ان آیات کریمہ میں بنیادی لفظ "خمرؔ" ہے جس سے ممانعت فرمائی گئی ہے۔ لہٰذ "خمرؔ" کے لفظ کو سمجھ لینا ضروری ہے خمر کے معنے کسی چیز کو ڈھانپ دینے اور چھپا دینے کے ہوتے ہیں۔ "خمرٗ الشئی یخمرہ" اس کو چھپادیا ڈھانپ دیا۔ "خمر فلانٌ الشہادۃ" فلاں نے گواہی کو چھپادیا الخمر ہر نشہ آور چیز کیونکہ وہ عقل کو ڈھانپ دیتی ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا ہے کہ "الخمر ما خامر العقل" یعنی خمر اسے کہتے ہیں جو عقل میں فتور اور اضمحلال پیدا کر دے۔ بعض علمائے لغت نے کہا ہے کہ: لا نہا تخمر العقل "یعنی شراب کو "خمرؔ" اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ عقل کو ڈھانپ لیتی ہے۔ عرب عام طور پر شیرۂ انگور سے شراب تیار کرتے تھے اوا سے "خمرؔ" کہتے تھے ویسے ان کے ہاں انگور کو بھی "خمرؔ" کہتے ہیں تَخْمِیْرٌ کے معنے خمیر اٹھانے کے ہیں۔

شراب کا حکم

تمام فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ شراب جو شیرۂ انگور سے تیار کی جائے وہ مطلقاً حرام ہے۔ خواہ تھوڑی پی جائے یا بہت پی جائے۔ اس سے نشہ کی کیفیت پیدا ہو یا نہ ہو۔ وہ ہر حال میں حرام ہے۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ جو شراب

شیرۂ انگور کے علاوہ دوسری چیزوں سے بنائی جائے مثلاً شہد، گیہوں، جو، چاول، کھجور وغیرہ سے تیار کی جائے اس کے متعلق جمہور محدثین اور فقہاء حجاز تو اس کے قائل ہیں کہ شراب کسی چیز سے بھی بنائی جائے وہ حرام ہے۔ تھوڑی سی بھی جس سے نشہ نہ ہو حرام ہے اور زیادہ بھی جس سے نشہ ہو جائے شراب کا ایک قطرہ بھی حرام ہے۔ لیکن فقہائے عراق مثلاً نخعیؒ، سفیان ثوریؒ، ابن ابی لیلیؒ، شریک، ابن شبرمہؒ، امام ابو حنیفہؒ اور تمام فقہاء کوفہ اور اکثر فقہائے بصرہ اس کے قائل ہیں کہ شیرہ انگور کے علاوہ دوسری شرابیں صرف نشہ کی صورت میں حرام نہیں۔ اگر تھوڑی سی چکھ لی جائیں کہ ان سے نشہ نہ ہو تو وہ حرام نہیں ہیں۔ البتہ اگر اتنی پی لی جائیں کہ ان سے نشہ ہو جائے تو وہ حرام ہیں، عرب کے لوگ چونکہ شیرہ انگور سے شراب تیار کرتے تھے اور اس کو "خمر" کہتے تھے اور قرآن کریم نے "خمر" کو حرام قرار دیا ہے اس لیے اس کا ایک قطرہ بھی حرام ہے۔ شیرۂ انگور سے جو شراب تیار کی جائے اس کے پینے سے نشے ہو یا نہ ہو، تھوڑی سی چکھی جائے یا بہت پی جائے ہر حالت میں حرام ہے۔

فقہائے عراق فرماتے ہیں کہ قرآن کریم نے شراب کی حرمت کے ساتھ ساتھ اس کی علت بھی بتادی ہے اور وہ علت یہ ہے کہ خمر اور میسرہ کے ذریعہ شیطان تمہارے درمیان بغض اور عداوت ڈال دینا چاہتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ تمہیں ذکر الٰہی سے یعنی صلوٰۃ سے روک دے تو کیا تم اس سے باز آتے ہو یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ باہمی بغض اور عداوت ڈال دینا نیز ذکر الٰہی یعنی صلوٰۃ سے روک دینا اسی وقت ممکن ہے جب نشہ ہو جائے اگر تھوڑی سی شراب چکھ لی جائے جس سے نشہ نہ ہو تو یہ کیفیتیں پیدا نہیں ہوتیں۔ لہٰذہ وہ قرآن کی رو سے ممنوع بھی نہیں ہوں گی۔

اس میں شک نہیں کی دلیل کی رو سے فقہائے عراق کا قول زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جو شخص تھوڑی شراب پیتا ہے جس سے نشہ نہ ہو اس کے متعلق یہ اندیشہ موجود ہے کہ تھوڑی شراب پیتے پیتے وہ بالآخر زیادہ شراب بھی پینے لگے گا۔ لہٰذہ احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ شراب کو مطلقاً حرام قرار دیا جائے۔ البتہ بعض دوائیں اس قسم کی ہوتی ہیں جن کی تیاری میں الکوحل شامل کرنی پڑتی ہے تاکہ وہ خراب نہ ہو جائیں مثلاً بعض شربت الکوحل کے بغیر تیار نہیں ہو سکتے یا ہومیو پیتھک دوائیں جو الکوحل ہی میں تیار کی جاتی ہیں لیکن وہ قطرات کی صورت میں استعمال ہوتی ہیں اور ان سے نشہ وغیرہ کا احتمال نہیں ہوتا ان کو حرام نہیں کہا جائے گا۔

کیا شراب حرام ہے

آج کل بعض حضرات کی طرف سے عجیب وغریب سوالات اٹھائے جارہے ہیں۔ مثلاً بعض لوگ یہ کہتے ہوئے سنے جاتے ہیں کہ قرآن کریم نے شراب کو حرام نہیں کہا۔ قرآن کریم نے صرف چار چیزیں حرام قرار دی ہیں۔

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَ الدَّمَ وَ لَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَ مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ (البقرہ:۱۷۳)

"اللہ نے تو تم پر صرف مردار، تازہ خون، سور کا گوشت اور جن پر ذبح کرتے وقت غیر اللہ کا نام پکارا جائے (ان کا گوشت) حرام قرار دیا ہے۔"

تو شراب کو حرام کیوں کہا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اسلام میں حرام کے معنے کیا ہیں؟ اس کا مادہ اشتقاق حَرُمَ ہے جس کے بنیادی معنے کسی چیز سے شدت کے ساتھ روک دینے اور ممانعت کر دینے کے ہیں (ابن فارس) الحرام تمام وہ چیزیں جن کی ممانعت کر دی گئی ہو جن کے کرنے سے روک دیا گیا ہو۔ یہ الحلال کی ضد ہے جس کے معنے ہیں رسیاں کھول کر رکاوٹ اور بندش کا دور کر دینا۔ اَحْرَمَ الحَاجُّ حاجی اس حالت میں پہنچ گیا جہاں اس پر کئی ایک چیزیں ممنوع ہو گئیں ہیں جنہیں وہ پہلے کر سکتا تھا اسی کو حالتِ احرام کہتے ہیں (کتاب الحج میں بحث تفصیل کے ساتھ گزر چکی ہے) لہٰذہ حرام ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس سے شدت کے ساتھ روک دیا گیا اور ممانعت کر دی گئی ہو۔ اور فقہاء کی اصطلاح میں وہ چیزیں جو کتاب الٰہی کی رو سے ممنوع ہوں حرام کہلاتی ہیں اور جو اخبار آحاد یعنی احادیث کی رو سے ممنوع ہوں وہ ناپسندیدہ اور مکروہ کہلاتی ہیں۔ اس کے برعکس جو چیزیں کتاب الٰہی کی رو سے مامور بہا ہوں وہ فرض کہلاتی ہیں اور جو چیزیں اخبار آحاد یعنی احادیث کی رو سے مامور بہا ہوں وہ واجب یا سنت کہلاتی ہیں۔ اب آپ دیکھئے کہ آیات محولہ بالا میں شراب سے شدت کے ساتھ روکا اور منع کیا گیا ہے یا نہیں؟ آپ دیکھ چکے ہیں کہ شراب کو قرآن کریم رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ (المائدہ:۹۰) "گندی چیز اور شیطانی کام فرمانے کے ساتھ ساتھ "فَاجْتَنِبُوْهُ" (لہٰذہ اس سے بچو، اس سے الگ رہو کے حکم ساتھ آگے پھر مزید تاکید فرمانے کے لیے "فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ" (المائدہ:۹۱) (پھر تم اس سے باز رہتے ہو یا نہیں) کی تہدید بھی فرمائی گئی ہے۔ یہ ساری چیزیں ممانعت ہیں یا اجازت ہیں ظاہر ہے کہ یہ ممانعت ہی ہے اور بڑی ہی سخت قسم کی ممانعت ہے جو چار چیزیں اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ (النحل:۱۱۵) (خدا نے تو تم پر صرف یہ چیزیں حرام کی ہیں) کے لفظ سے بیان فرمائی ہیں۔ اس قدر شدت کے ساتھ ممانعت تو ان کی بھی نہیں فرمائی گئی۔ ہم بتا چکے ہیں کہ کسی چیز کی ممانعت شدت کے ساتھ کی جائے تو اس کو حرام کہتے ہیں۔ حرام اسی کو نہیں کہتے

جسے حرام کے لفظ سے بیان کیا جائے فقہاء کرام کی اصطلاح کے مطابق بھی چونکہ شراب کی ممانعت کتاب الٰہی سے ثابت ہے اس لیے فقہی اصطلاح میں بھی اس کو حرام ہی کہا جائے گا۔ لہٰذ حرام کے لفظ پر اصرار کرنا بے معنی بات ہے۔ تاہم چونکہ عام طور پر لوگ حرام کے لفظ پر ہی مصر ہیں اس لیے ان کی تسلی کے لیے عرض ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے سلسلہ میں سورۃ اعراف میں یہ اوصاف بیان ہوئے ہیں:

الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ ۚ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۚ (الاعراف:۱۵۷)

"جو رسول نبی امی کی پیروی کرتے ہیں جسے وہ اپنے پاس تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ جو انہیں دستور کے مطابق اچھی باتوں کا حکم دیتا ہے اور بری باتوں سے روکتا ہے اور سب پاکیزہ چیزوں کو ان کے لیے حرام کرتا ہے اور ان سے ان کے اس بوجھ اور ان بیڑیوں کو اتار دیتا ہے جو ان پر پڑی ہوئی تھیں۔"

اس آیت کریمہ کے ساتھ سورۂ مائدہ کی اس آیت کریمہ کو ملا لیجئے جس میں شراب کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ وہ گندی چیز ہے شیطانی عمل ہے اس سے بچو پھر تم اس سے باز رہتے ہو یا نہیں؟ اب سوال یہ ہے کہ سورۃ مائدہ کی ان تصریحات کی روشنی میں شراب کو طیبات (پاکیزہ چیزوں) کی فہرست میں شامل کیا جائے گا یا خبائث (ناپاک چیزوں) کی فہرست میں؟ اگر شراب ناپاک چیزوں کی فہرست میں شامل ہے اور یقیناً ہے۔ تو سورۃ اعراف کی اس آیت کی رو سے وہ حرام بھی ہے یہاں یحرم علیھم (وہ ان پر حرام کرتا ہے) لفظ موجود ہے جو ایسے لوگوں کی تسلی کے لیے کافی ہے جو قرآن کریم سے حرام ہی کا لفظ سننا چاہتے ہیں۔

شراب نوشی پر حد:

تیسرا سوال یہ تھا کہ کیا قرآن کریم نے شراب نوشی کے لیے کوئی حد (سزا) مقرر فرمائی ہے۔ اس کا مختصر اًجواب یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ اور حق تعالیٰ نے اس کی کوئی حد (سزا) مقرر نہیں فرمائی قرآن کریم میں اس کی کوئی سزا بیان نہیں ہوئی۔ حضور اکرم ﷺ نے بھی اس کی کوئی متعین سزا مقرر نہیں فرمائی۔ چنانچہ بخاری و مسلم، ابو داؤد اور ترمذی میں حضرت انسؓ سے روایت بیان کی گئی ہے کہ:

ان النبی ﷺ اتی برجل قد شرب الخمر فجلدہ بجرید نحوا ربعین وفعلہ ابوبکر فلما کان عمرؓ استشار الناس فقال عبدالرحمن اخف الحدود ثمانون فامر بہ عمرؓ

"یعنی حضور ﷺ کی خدمت میں ایک شخص لایا گیا جس نے شراب پی تھی۔ حضور ﷺ نے اسے کھجور کی چھڑی سے کوئی چالیس ضربیں لگوائی، حضرت ابو بکرؓ نے بھی یہی سزا دی لیکن جب دور فاروقی آیا تو حضرت عمرؓ نے لوگوں سے مشورہ کیا عبد الرحمن بن عوفؓ نے کہا کہ حد کی سب سے کم مقدار اسّی (۸۰) کوڑے ہیں (بہتان زنا لگانے والے کے لیے) چنانچہ حضرت عمرؓ نے اسی کو نافذ کر دیا۔"

امام مالکؒ کی روایت میں جو ثور بن زید سے مروی ہے کہ حضرت علیؓ نے بھی اسی کوڑے ہی کی تائید فرمائی تھی اور وجہ یہ بتائی تھی کہ:

فانہ اذا شرب سکر واذا سکر ھذیٰ واذا ھذیٰ افتریٰ فجلد عمر ثمانین

"یعنی جو شراب پیئے گا بدمست ہو گا جو بدمست ہو گا بکواس کرے گا۔ جو بکواس کرے گا وہ بہتان طرازی بھی کرے گا، لہٰذا حضرت عمرؓ نے قذف کی حد ہی قائم کر دی۔"

لیکن مسلم اور ابوداؤد میں حصین بن منذرؓ سے روایت ہے کہ حضرت عثمان نے ولید کو صرف چالیس کوڑے لگوائے تھے۔ اور فرمایا تھا کہ:

جلد النبی ﷺ وابوبکر اربعین وعمر ثمانین وکل سنۃ وھذا احب الی۔

"یعنی حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اور ابو بکر نے چالیس کوڑے لگوائے تھے اور عمرؓ نے اسی (۸۰) کوڑے لگوائے۔ دونوں ہی سنت ہیں، مگر مجھے چالیس ہی پسند ہیں۔"

بخاری اور ابو داؤد کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے جو حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے ایک شرابی کی سزا کے سلسلہ میں صحابہ سے فرمایا اضربوہ (اسے مارو) اس کے بعد:

فمنا الضارب بیدہ ومنا الضارب بنعلہ ومنا الضارب بثوبہ ثم قال النا بکتوہ فاقبلنا علیہ نقول اما اتقیت اللہ ﷻ اما خشیت اللہ ﷻ اما استحیث من رسول اللہ ﷺ۔

"تو ہم میں سے کسی نے اسے اپنے ہاتھ سے مارا اور کسی نے اپنے جوتے سے مارا، کسی نے اسے اپنے کپڑے (کا کوڑا بنا کر اس) سے مارا، پھر حضور ﷺ نے ہم سے فرمایا، اسے شرمندہ کرو، تو ہم نے کہنا شروع کیا کہ تو اللہ سے نہیں ڈرتا، تجھے خوف الٰہی نہیں ہے۔ تجھے

رسول اللہ ﷺ سے شرم نہیں آتی؟

ان تمام روایتوں سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ مے خواری کی کوئی تعزیر (سزا) مقرر نہیں ہے۔ ہر دور میں یہ سزا مناسب ترمیم قبول کر سکتی ہے مطلب تو عادت چھڑانے سے ہے۔ سزا کی کسی مقدار کو باقی رکھنے سے نہیں ہے، کسی سوسائٹی میں کم سے کم سزا موثر ہو سکتی ہے تو وہ بھی دی جا سکتی ہے اور اگر اسی (۸۰) کوڑوں سے بھی کام نہ چلے تو زیادہ میں بھی کوئی شرعی قباحت نہیں ہے، سب کچھ حالات پر منحصر ہے۔

تعزیر کا مقصد

یہاں ایک نکتہ پر غور کرنا ضروری ہے اور وہ یہ کہ مے خواری کی سزا اگر اسّی درّے ہی مان لی جائے تو اس کا مقصد پھر بھی مجرم کو جان سے مار ڈالنا نہیں ہے۔ عہد نبوی نیز خلافت راشدہ میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ کسی شرابی کو سزا دیتے دیتے اس کی جان لے لی گئی ہو، یہی صورت تہمتِ زنا کی حد میں بھی ہے لہٰذہ یہ بات آسانی سے سمجھی جا سکتی ہے کہ زنا کی حد میں صرف بیس کوڑوں کا اضافہ کر کے زانی کو سو درّے لگانے کی غرض بھی اسے جان سے مار ڈالنا نہیں ہے جان صرف اس صورت میں لی جا سکتی ہے، جب جرم کی نوعیت اپنی سنگینی کی وجہ سے اس کا مطالبہ کرتی ہو۔ اس وقت جان سے مار ڈالنا کچھ زنا ہی کے ساتھ مخصوص نہیں۔ ہر اس جرم پر سزائے موت دی جا سکتی ہے جو اپنی سنگینی کی وجہ سے سبوتاژ کی حد تک پہنچتا ہو۔

نسائی اور ابو داؤد میں حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

ایک انصاری اس قدر بیمار تھے کہ ہڈی چمڑا ایک ہو گیا تھا۔ اسی دوران ایک عورت کو دیکھ کر ولولۂ شباب عود کر آیا اور وہ حد شرعی کے مستحق ہو گئے۔ اس کے بعد جذبہ ایمانی کے تقاضے ابھرے اور انہوں نے حضور ﷺ کے پاس کچھ لوگوں کو بھیج کر اپنے لیے حکم دریافت کرایا۔ لوگوں نے حضور ﷺ کو بتایا کہ وہ اس قدر بیمار ہیں کہ یہاں تک آنا بھی ان کے لیے سخت دشوار ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ان کی ناتوانی پر رحم فرماتے ہوئے یہ سزا تجویز فرمائی کہ سو کوڑوں کے بجائے سو نرم ٹہنیوں کا مٹھا لے کر اس سے ان کو ایک ضرب لگا دو۔

غور کرنے کا مقام ہے کہ اگر جان سے مار ڈالنا مقصود ہوتا تو ان بیمار انصاری کو تو سو تنکے مارنے کی بجائے چند کوڑوں ہی سے ختم کیا جا سکتا تھا۔

سنن ابو داؤد میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

ان النبی ﷺ لم یقت فی الخمر حدا وقال شرب رجل فسکر فلقی یمیل فی الفج فانطلق به الی النبی ﷺ فلما حاذی بدار العباس انفلت فدخل علی العباس فالتزمه فذکروا ذلك للنبی ﷺ فضحك وقال افعلها ولم یامر فیه بشئی۔

"یعنی حضور اکرم ﷺ نے مے خواری کی کوئی حد مقرر نہیں فرمائی تھی۔ ایک شخص شراب پی کر بد مست ہو گیا اور گلی میں لڑکھڑاتا ہوا پایا گیا۔ اسے پکڑ کر حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں لایا جانے لگا، جب وہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے مکان کے سامنے پہنچا تو لوگوں کے ہاتھ سے چھوٹ کر حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے مکان میں گھس گیا اور وہاں جا کر حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے چمٹ گیا۔ لوگوں نے حضور ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو حضور ﷺ ہنس دیئے اور فرمایا کہ کیا واقعی اس نے یہ حرکت کی؟ لیکن اسے کسی سزا کا حکم نہیں دیا۔"

امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے کتاب الخراج میں حضرت ابو محجن ثقفی رضی اللہ عنہ کا واقعہ نقل فرمایا ہے کہ:

قادسیہ کا میدان جنگ گرم ہے۔ ابو محجن کو حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے شراب نوشی کے جرم میں قید کر رکھا ہے۔ قید خانہ کے دریچے سے جھانک کر ابو محجن نظارہ جنگ دیکھ رہے ہیں اور جذبہ جہاد اندر سے بے چین کر رہا ہے۔ ابو محجن سعد کی بیوی سلمہ سے التجا کرتے ہیں کہ میری بیڑیاں کھول دو۔ اگر میں زندہ رہ گیا تو واپس آ کر خود ہی بیڑیاں پہن لوں گا۔ انہوں نے انکار کیا۔ لیکن بار بار کے اصرار سے انہوں نے بیڑیاں کھول دیں۔ ابو محجن نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا گھوڑا لے کر نیزہ بازی کے وہ وہ جوہر دکھائے کہ دشمن کی صفیں درہم برہم ہو گئیں اور پھر واپس آ کر خود ہی بیڑیاں پہن لیں۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو ان کے کارنامے معلوم ہوئے تو انہیں بغیر کسی تعزیر کے رہا فرما دیا اور کہا کہ: "بخدا میں ایسے شخص کو شراب نوشی کی سزا نہیں دے سکتا جو اہل اسلام کی حمایت اور جاں نثاری کے نشہ سے اتنا سرشار ہو۔ ابو محجن بھی غیر و حمیت کا پتلا تھا۔ اس نے قسم کھالی آج سے شراب نہیں چکھوں گا۔ (کتاب الخراج لابی یوسف)

حضرت سعد بن ابی وقاص عشرہ مبشرہ میں سے ہیں حضور اکرم ﷺ کے ماموں ہیں اور سنت رسول کی اطاعت و محبت میں ہیرا پھیری کی ان سے کوئی نسبت ہی نہیں ہو سکتی۔ ان کے طرز عمل نے یہ بتا دیا کہ شراب نوشی کی کوئی تعزیر اور سزا مخصوص نہیں۔ اگر ہوتی تو وہ چالیس یا اسی کوڑے مارتے اور ابو محجن کو قید میں نہ ڈالتے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہ موقعہ جہاد کا تھا جہاں تعزیزات و حدود کا قانون عام حالات سے مختلف ہو جاتا ہے۔ بلکہ یہاں حدود بھی ساقط ہو جاتی ہیں چہ جائیکہ تعزیرات۔ علاوہ ازیں بہ فحوائے اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ (ہود:۱۱۴) (نیکیاں برائیوں کو

ختم کر دیتی ہیں) اور یا قاضی کو اختیار ہے کہ اعلی کارگزاری کے عوض تعزیر کو معاف کر دے۔

مے خواری اگرچہ ام الخبائث ہے لیکن بفحوائے:

وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا (البقرہ:۲۱۹)

"اس کے نقصانات اس کے نفع سے زیادہ ہیں۔"

اس کے دوسرے پہلوؤں پر بھی نظر رکھنی چاہیے

عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو

(شراب کی تو تمام برائیاں تو ذکر کر چکا کچھ اس کی اچھائیاں بھی تو بیان کر!)

علامہ صبحی محمصانی نے بدایۃ المجتہد کے حوالہ سے لکھا ہے کہ:

وكذالك ماجوزه بعض الفقهاء من شرب الخمر للتداوى،

(فلسفہ التشریع الاسلامی)

"اور اسی رخصت دینے کے ذیل میں یہ چیز بھی آتی ہے کہ بعض فقہاء نے دوا کے طور پر شراب کے استعمال کو جائز کہا ہے۔"

یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ رسول اکرم ﷺ نے قبیلہ عرینہ کے لوگوں کو اونٹوں کے البان اور ابوال بطور علاج کے استعمال کو جائز فرمایا تھا حالانکہ بول حرام ہے اور نجس بھی۔

الغرض مے خواری چوں کہ اپنے اندر ایک روشن پہلو بھی رکھتی ہے اس لیے اس کی تعزیر میں بھی زیادہ شدت نہیں ہے۔ اور صرف اسی ایک جرم کی وجہ سے کسی کی دوسری خوبیاں خاک میں نہیں ملائی جاسکتیں۔ حضور اکرم ﷺ کے عہد میں عبد اللہ نامی (الملقب بہ حمار) ایک صحابی تھے جو اپنی خوش کلامی اور بذلہ سنجی سے حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھی کبھی کبھی ہنسایا کرتے تھے۔ انہیں کئی بار شراب نوشی کے جرم میں تعزیر کی گئی مگر

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

ایک بار پھر اسی جرم میں ماخوذ ہوئے اور سزا دی گئی۔ بعض صحابہ کی زبان سے نکل گیا اللهم العنه ما اكثر مايوتى به، (اس پر اللہ کی لعنت ہو۔ بار بار یہ اسی جرم میں ماخوذ ہوتا ہے۔) حضور اکرم ﷺ نے یہ سن لیا تو فرمایا۔

لا تلعنوه فوالله ما علمت الا انه يحب الله ورسوله۔

(بخاری عن عمر ابن الخطاب)

"اس پر لعنت نہ کرو، بخدا میں تو یہی جانتا ہوں کہ یہ (باوجود شرابی ہونے کے) اللہ اور اس کے رسول سے محبت ہی رکھتا ہے۔"

یہ حدیث بڑی معنی خیز ہے۔ اس کا مفاد یہ ہے کہ صرف اسی ایک برائی کو دیکھ کر یہ نہ سمجھو کہ اسے اسلام سے کوئی دلچسپی نہیں۔ کسی میں ایک برائی کے ساتھ ایسی دس خوبیاں بھی ہو سکتی ہیں جو دوسروں میں موجود نہ ہوں۔ اگرچہ اس برائی سے پاک ہوں۔ بسا اوقات اس قسم کے مجرم وہ کام کر جاتے ہیں جو بے گناہ متقیوں سے نہیں ہوتے۔ کسی کے نیک و بد ہونے کا فیصلہ اس کے اچھے برے سب کاموں کو سامنے رکھ کر کرنا چاہیے۔ آپ کو زندگی میں بیسوں سابقے ایسے ہوئے ہوں گے کہ ایک فاسق نے مظلوم کی حمایت میں اپنی جان لڑا دی اور متقی خاموش بیٹھے رہے۔ گناہ گار نے اپنی پونجی کسی اعلی مقصد کے لیے دے دی اور پرہیز گار خزانہ کا سانپ بنے رہے۔ جاہل نے اپنی اسلامی خودی کو ہر قیمت پر باقی رکھا اور عالم کفر کے ہاتھوں بک گیا۔ پس انسان دراصل اپنے مجموعی کردار سے اپنا مقام متعین کرتا ہے نہ کہ صرف بادی النظر میں نظر آنے والے چند اعمال سے۔

حد نہیں بلکہ تعزیر ہے

اس سے معلوم ہو گیا کہ شراب نوشی پر کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ بلکہ حاکم وقت کو اس پر تعزیر جاری کرنے کا حق ہے۔ حدود میں یہ نہیں ہوتا کہ آج ایک سزا دی جارہی ہے کل دوسری سزا دی جارہی ہے یہ شان تعزیر کی ہوتی ہے کہ حاکم وقت حالات اور ضرورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو سزا مناسب سمجھے دیدے یا سربراہ مملکت اپنے اہل شوریٰ سے مشورہ کر کے کوئی ایک سزا مقرر کر دے تاکہ اس کے قلم رو میں سزاؤں میں یکسانیت قائم رہے۔ یہ نہ ہو کہ ایک شہر کا حاکم ایک سزا دے رہا ہے اور دوسرے شہر کا حاکم دوسری سزا دے رہا ہے۔ لیکن شوریٰ کے ذریعے سے یہ مقرر کردہ سزا ہمیشہ کے لیے حتمی نہیں ہو گی کہ اس میں کوئی دوسرا سربراہ مملکت کوئی تبدیلی ہی نہ کر سکے۔ ہر زمانہ کے حالات اور مقتضیات کے ماتحت مختلف فیصلے کئے جاسکتے ہیں۔ بہر حال قرآن کریم نے اس کی کوئی سزا مقرر نہیں فرمائی جسے قرآنی حد کہا جا سکے اور جسے حتمی قرار دیا جاسکے۔ البتہ شراب نوشی کو ممنوع اور حرام قرار دیا جاسکتا ہے جس پر تعزیر ہونی چاہیے۔

احکام مرتد

آپ کسی چھوٹی یا بڑی مشین کو لے لیجئے اس میں ہر پرزہ کا اپنا کام ہوتا ہے۔ اگر ہر پرزہ اپنی محولہ ڈیوٹی انجام دے رہا ہے تو وہ مشین حرکت کرے گی ورنہ کھڑی ہو جائے گی۔ گھڑی کا ایک پرزہ، موٹر کا کوئی جزو اپنا کام چھوڑ دے تو نہ گھڑی چل سکے گی اور نہ موٹر حرکت کر سکے گی۔ یہی حال کائنات کا ہے اس کی کارگاہ میں بھی لاکھوں کروڑوں بلکہ اربوں چیزیں ہیں اور ہر چیز کا ایک مخصوص کام ہے جو وہ انجام دے رہی ہے۔ اگر کوئی چیز اپنا مفوضہ کام

انجام دینا چھوڑ دے تو کائنات کا تمام کارخانہ درہم برہم ہو جائے۔ اگر زمین اپنے راستہ سے ایک انچ ادھر اُدھر ہو جائے۔ اگر سورج اپنی رفتار میں ایک ثانیہ کی تبدیلی پیدا کرلے، اگر ہوائیں اپنے رخ کو ایک سکینڈ کے لیے خلاف قاعدہ بدلیں، اگر پانی بجائے نشیب کی طرف بہنے کے فراز کی طرف بہنے لگے۔ اگر آگ حرارت کی بجائے برودت دینے لگے، اگر لکڑی دریا اور سمندر میں تہ نشین ہونے لگے۔ غرض کہ کارگہہ عالم کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا پرزہ اپنے نظام اور قانون سے سرتابی اختیار کرے تو یہ عظیم الشان پوری کائنات کا کارخانہ ٹھپ ہو جائے۔

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (الحدید:۱)

"کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے وہ اللہ کے قانون کے مطابق سرگرم عمل ہے۔"

اور

وَ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا (الرعد:۱۵)

"کائنات کی بلندیوں اور پستیوں میں جتنی چیزیں ہیں وہ اللہ کے قانون کے سامنے خوشی اور ناخوشی سے سجدہ ریز ہیں۔"

اور

وَ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّ الْمَلٰٓىِٕكَةُ وَ هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۴۹﴾ (النحل:۴۹)

"اور کائنات کی بلندیوں اور پستیوں میں جتنے چلنے پھرنے والے جاندار ہیں، فرشتے ہیں وہ سب اللہ کے احکام کے سامنے سجدہ ریز ہیں اور سرتابی نہیں کرسکتے۔"

انہی چلنے پھرنے والی ہستیوں میں انسان بھی ہے۔ وہ قوانین الٰہی کے سامنے سجدہ ریز ہے اور سرمو ان سے انحراف نہیں کرسکتا۔ جتنے کچھ اس کے حیوانی تقاضے ہیں وہ ان میں قوانین فطرت سے ایک انچ ادھر ادھر نہیں ہو سکتا۔ البتہ اس کی زندگی کے چند محدود انسانی معاملات ہیں جو اس کی زندگی کا ۱/۴ بھی مشکل سے ہوں گے۔ ان میں حق تعالیٰ نے اسے اختیار وارادہ کی آزادی عطا فرمادی ہے وہ ان میں قانونِ قدرت سے انحراف کرنے کی طاقت رکھتا ہے قدرت کی طرف سے اسے یہ قدرت عطا فرمائی گئی ہے کہ وہ چاہے تو قوانین قدرت کی اتباع کرے اور چاہے تو ان سے انحراف کی صورت اختیار کرلے۔ یہ چند معاملات وہ ہیں جو انسانی شعور وادراک سے متعلق ہیں ان کے متعلق حق تعالیٰ نے آدم کو اس "دنیا" میں بھیجنے کے ساتھ ہی فرمادیا تھا کہ:

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾ (البقرہ:۳۸)

"تو اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئی تو جو میری ہدایت کا اتباع کرے گا تو انہیں نہ کسی قسم کا خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اور اس کے برعکس

وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَاۤ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۹﴾ (البقرہ:۳۹)

"اور جو لوگ (میری ہدایت کا) انکار کریں گے اور ہماری آیتوں کو جھٹلائیں گے تو یہی لوگ جہنمی ہوں گے اور وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔"

حق تعالیٰ نے ان دونوں راہوں کو بالکل واضح اور ممتاز کردیا ہے۔ ہر انسان اپنی مرضی سے جونسی چاہے راہ اختیار کرے۔ حق تعالیٰ کی طرف سے اس معاملہ میں کوئی جبر، اکراہ یا استبداد نہیں۔

وَ هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ﴿۱۰﴾ (البلد:۱۰)

"اور ہم نے انسان کو دونوں راستے دکھادیئے ہیں۔"

اس سے پہلے اس نے بتا دیا ہے کہ کیا ہم نے اسے دیکھنے کے لیے دو آنکھیں اور بولنے کے لیے ایک زبان اور دو ہونٹ عطا نہیں فرمادیئے؟

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ﴿۸﴾ وَ لِسَانًا وَّ شَفَتَيْنِ ﴿۹﴾ (البلد:۸تا۹)

"کیا ہم نے اسے دیکھنے کے لیے دو آنکھیں اور (بولنے کے لیے) ایک زبان اور دو ہونٹ عطا نہیں کردیئے؟"

اور ساتھ ہی گوش ہوش اور دیدہ حق نیوش بھی عطا فرمادیئے:

فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ﴿۲﴾ (الدھر:۲)

"اور ہم نے اسے شنوا و بینا بنادیا۔"

اور اچھی طرح راستہ دکھادیا تھا۔

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا ﴿۳﴾ (الدھر:۳)

"ہم نے اسے راستے دکھا دیا تھا (اس کے بعد) وہ جی چاہے تو شکر گزار بندہ بن جائے اور چاہے تو نافرمان منکر بن جائے۔"

بہرحال حق تعالیٰ نے انسان کو پورا پورا اختیار عطا فرما دیا ہے کہ وہ ایمان کی راہ اختیار کرے یا کفر کی راہ اختیار کرے، یعنی ایمان اور کفر کے بارے میں اس پر کسی قسم کی کوئی زبردستی نہیں۔

وَ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (الکھف:۲۹)

"اور اے پیغمبر اسلام! آپ اعلان کر دیجئے کہ حق تمہارے رب کی طرف سے آچکا ہے تو (اب) جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چا

ہے وہ انکار کی راہ اختیار کرے۔"

جو ایمان کی راہ اختیار کرے گا وہ اس کے فیوض و برکات سے بہرہ مند ہو گا اور جو کفر کی راہ اختیار کرے گا وہ اس کے عواقب و آلام سے حصہ پائے گا۔

فَمَنِ اهْتَدٰى فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَ مَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ﴿۴۱﴾ (الزمر:۴۱)

"تو جو ہدایت کی راہ اختیار کرے گا اس کا فائدہ اس کی ذات کو ہو گا۔ اور جو گمراہی کی راہ اختیار کرے گا تو اس کی گمراہی کا وبال بھی اس کی ذات کو بھگتنا پڑے گا۔"

وَ مَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ﴿۴۱﴾ (الزمر:۴۱)

"اور اے پیغمبر اسلام! آپ ان پر کوئی ذمہ دار نہیں ہیں۔"

اگر حق تعالیٰ کی مشیت یوں ہوتی کہ سب لوگ ایمان لے آئیں تو وہ انسان کو بھی دیگر اشیائے کائنات کی طرح ایک روشِ زندگی کا پابند بنا کر پیدا کر دیتا۔ کائنات میں اور بھی تو کروڑوں اربوں مخلوقات ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اختیار و ارادہ کی آزادی مرحمت نہیں فرمائی وہ کبھی اپنی مقرر روش سے سر مو انحراف نہیں کرتیں۔ آپ نے بھیڑ بکریوں کو کبھی گوشت کھاتے اور شیر اور چیتے کو گھاس کھاتے نہیں دیکھا ہو گا۔ ان کے لیے جو قانون اس نے مقرر کر دیا ہے وہ سر مو اس سے انحراف نہیں کرتے۔ ارشاد الٰہی ہے کہ انسان کو ہم نے شعوری امور میں ارادہ اور اختیار کی آزادی سے نوازا ہے اور اسے عقل و شعور عطا کر کے کائنات میں آزاد چھوڑا ہے۔ ہم اسے ان امور میں کسی ایک روش کا پابند بنانا نہیں چاہتے۔ ہماری مشیت کا تقاضا ہی یہ ہے۔

وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِى الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ؕ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۹﴾ (یونس:۹۹)

"اور اے پیغمبر اسلام! اگر تیرے پروردگار کی مشیت ہوتی تو روئے زمین پر جتنی آدمی بستے ہیں وہ سب کے سب ایمان لے آتے (مگر اللہ کی مشیت ہی یہ نہیں ہے) تو کیا آپ لوگوں پر زبردستی کرنا چاہتے ہیں کہ وہ سب کے سب ایمان لے آئیں۔"

یہ کیسے ممکن ہے کہ حق تعالیٰ انسان کو با اختیار اور با ارادہ بھی بنائے اور پھر اس کو مجبور بھی بنا دے۔ ارشاد ہے کہ اے پیغمبر اسلام! آپ صاف صاف اعلان کر دیجئے کہ:

قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ؕ وَ مَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ﴿۱۰۴﴾ (الانعام:۱۰۴)

"اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے روشن دلیلیں آ چکی ہیں، تو جو آنکھیں کھول کر چلے گا تو اس کا فائدہ اسی کو ہو گا اور جو آنکھیں بند کر کے اندھا بن کر چلے گا تو اس کا نقصان بھی اسی کو ہو گا اور میں تم پر کوئی نگران نہیں بنایا گیا ہوں۔"

اور۔

اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۰۶﴾ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا ؕ وَ مَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۚ وَ مَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ﴿۱۰۷﴾ (الانعام:۱۰۶تا۱۰۷)

"اے پیغمبر اسلام! آپ تو اس کی پیروی کیجئے جو آپ کی طرف آپ کے پروردگار کی طرف سے وحی کی جا رہی ہے، کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اور مشرکوں کی طرف سے کنارہ کیجئے۔ (ان کی فکر ہی نہ کیجئے) اور اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو وہ بھی مشرک نہ ہوتے۔ ہم نے تو آپ کو ان پر کوئی نگران نہیں بنایا اور نہ ہی آپ پر ان کی کوئی ذمہ داری ہے۔"

انسان اگرچہ اب عہد شعور کو پہنچ چکا ہے لیکن پھر بھی ان کی اکثریت ابھی تک طبیعت کے اعتبار سے بڑی کمزور واقع ہوئی ہے۔ کوئی مشکل کام نہیں تھا کہ چند خوارق عادت (معجزات) کی رو سے اسے ورطۂ حیرت میں ڈال کر سیدھی راہ پر لانے کی کوشش کی جاتی لیکن یہ بھی اکراہ (Mental compulsion) ہی کی ایک صورت ہوتی جو اختیار و ارادہ کی حریت کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی۔ لہٰذہ حق تعالیٰ نے اپنے آخری نبی کو کوئی حسی معجزہ بھی عطا نہیں فرمایا۔

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۳﴾ اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ ﴿۴﴾

(الشعراء:۳تا۴)

"اے پیغمبر اسلام! آپ تو شاید اپنے آپ کو اسی غم میں ہلاک کر ڈالیں کہ لوگ مومن کیوں نہیں ہو جاتے۔ اگر ہم (انہیں جبراً مومن بنانا) چاہتے تو ان پر آسمان سے کوئی نشانی (معجزہ) اتار دیتے کہ ان کی گردنیں اس کے آگے جھک جاتیں (لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا)۔"

چنانچہ حضور اکرم ﷺ سے واضح طور پر اعلان کرا دیا گیا کہ اب خوارق عادات کا دور ختم ہو گیا اب دلائل و براہین کا دور ہے اب اسلام کی دعوت علی وجہ البصیرت دی جائے گی۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ؔ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِيْ ؕ وَ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَ مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ (یوسف:۱۰۸)

"اے پیغمبر اسلام کہہ دیجئے کہ میرا راستہ تو یہ ہے۔ میں اور میرے پیرو کار علی وجہ البصیرت اللہ کی طرف دعوت دیتے ہیں۔"

ہماری دعوت غور و فکر اور تدبر و تفکر کی دعوت ہے۔ ہم فہم و فراست

اور عقل و بصیرت سے اپیل کرتے ہیں۔ سوچو، سمجھو، غور فکر کرو، اگر بات سمجھ میں آتی ہے تو مانو، نہیں سمجھ میں آتی ہے تو نہ مانو۔ ہماری دعوت جولا اکراہ یا زبردستی اور جبر کی دعوت نہیں ہے۔ ہم نے انسان کو شعوری معاملات میں اختیار وارادہ کی آزادی بخشی ہے۔ اب کسی قسم کا جبر و اکراہ کر کے اس کے اختیار وارادہ کی آزادی کو سلب کر لینا ہمارے فیصلہ کے خلاف کھلی ہوئی بغاوت اور شرف انسانیت کا سلب و نہب ہے۔ اگر تم مشرکین سے برسر جنگ بھی ہو، وہ تمہیں قتل کر رہے ہوں اور تم ان کو قتل کر رہے ہو۔ ایسی حالت میں کوئی مشرک تم سے اسلام کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے آئے تو بھی تم اس پر جبر نہ کرو۔

وَاِنۡ اَحَدٌ مِّنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ اسۡتَجَارَكَ فَاَجِرۡهُ حَتّٰى يَسۡمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبۡلِغۡهُ مَاۡمَنَهٗ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ قَوۡمٌ لَّا يَعۡلَمُوۡنَ ۝ (التوبہ:٦)

"اے پیغمبر اسلام! اگر مشرکین میں سے کوئی آدمی (عین حالت جنگ میں) تم سے پناہ چاہے تو اسے پناہ دیدو حتیٰ کہ وہ کلام الٰہی کو سن لے (اور اسلام کے متعلق معلومات حاصل کر لے) پھر اسے (اپنی حفاظت میں) اس کے امن کی جگہ تک پہنچادو۔ یہ حکم اس لیے دیا جاتا ہے کہ یہ لوگ حقیقت کا علم نہیں رکھتے۔"

اسے حالت جنگ میں بھی امان دیدو، اسے اللہ کا کلام سناؤ، اسلام کی تعلیمات سے آگاہ کرو۔ پھر اسے اس کے پڑاؤ تک جہاں وہ خود کو مامون و مصؤن سمجھتا ہو پہنچادو۔ اور اس طرح اسے مہلت دو کہ جو کچھ اس نے سنا ہے وہ اس پر تدبر و تفکر کر کے کسی نتیجہ تک پہنچ سکے۔ اگر اس کا دل مطمئن ہو جائے تو وہ اسلام کو قبول کرلے اور اگر اسے اطمینان حاصل نہ ہو سکے تو اسلام کو قبول نہ کرے۔ بغیر اطمینان قلبی کے ایمان لے آنے سے کچھ حاصل نہیں اس لیے کہ ایمان کا تعلق انسان کے دل سے ہے زبان سے نہیں۔ جب تک انسان کا دل ہی مطمئن نہ ہو وہ زبان سے لاکھ ایمان کے دعوے کرے اللہ تعالیٰ کے یہاں ایسے لوگوں کے ایمان کی کوئی قیمت نہیں۔ ایسے لوگ اللہ کی میزان میں منافق ہیں اور وہ کافروں سے بدتر ہیں۔

بہت سے لوگ زمانہ عہد نبوت میں مسلمانوں کی روز افزوں فتوحات سے مرعوب ہو کر ایمان لے آئے تھے۔ ان کا ایمان کچھ عقل و بصیرت پر مبنی نہ تھا۔ حق تعالیٰ نے ان سے واضح طور پر فرمادیا تھا۔

قَالَتِ الۡاَعۡرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلۡ لَّمۡ تُؤۡمِنُوۡا وَلٰـكِنۡ قُوۡلُوۡۤا اَسۡلَمۡنَا وَلَمَّا يَدۡخُلِ الۡاِيۡمَانُ فِىۡ قُلُوۡبِكُمۡ ؕ وَاِنۡ تُطِيۡعُوا اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ لَا يَلِتۡكُمۡ مِّنۡ اَعۡمَالِكُمۡ شَيۡـــًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ۝ اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ ثُمَّ لَمۡ يَرۡتَابُوۡا وَجٰهَدُوۡا بِاَمۡوَالِهِمۡ وَاَنۡفُسِهِمۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓـئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوۡنَ ۝
(الحجرات:۱۴تا۱۵)

"اعرابی کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان لے آئے ہیں۔ اے پیغمبر اسلام! کہہ دیجئے کہ تم لوگ ایمان نہیں لائے البتہ یوں کہو کہ ہم مطیع و فرماں بردار ہوگئے ہیں اور (یہ اس لیے کہ) ابھی ایمان تمہارے دلوں میں جاگزیں نہیں ہوا۔ مومن تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر (دل سے) ایمان لائیں پھر کسی شک وشبہ میں گرفتار نہ ہوں اور اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کریں۔ یہ لوگ سچے مومن ہیں۔"

جس کا دل مطمئن نہ ہوا اور وہ صرف زبان سے ایمان کا اقرار کر رہا ہو اس کا ایمان اللہ تعالیٰ کی میزان میں ایمان نہیں ہے۔ لیکن جس کا دل ایمان پر مطمئن ہوا اور وہ بمجبوری زبان سے کفر کا اقرار کر رہا اس کا ایمان اللہ تعالیٰ کی میزان میں صحیح ایمان ہے۔

مَنۡ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنۡۢ بَعۡدِ اِيۡمَانِهٖۤ اِلَّا مَنۡ اُكۡرِهَ وَقَلۡبُهٗ مُطۡمَـئِنٌّ ۢ بِالۡاِيۡمَانِ وَلٰـكِنۡ مَّنۡ شَرَحَ بِالۡكُفۡرِ صَدۡرًا (النحل:۱۰۶)

"جو لوگ اپنے ایمان لانے کے بعد اللہ کے ساتھ کفر کریں۔ بجز اس شخص کے جس پر جبر کیا گیا ہو اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو۔ اور کفر کے ساتھ اس کا شرح صدر ہو گیا ہو تو ایسے لوگوں پر اللہ کی طرف سے غضب نازل ہو گا۔ اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔"

اس سے ثابت ہوا کہ اللہ کے یہاں وہی ایمان معتبر ہے جو اعماق قلب سے اُبھرے، زبانی انکار واقرار کا کوئی اعتبار نہیں جس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو وہ مومن ہے خواہ وہ زبان سے کفریہ کلمات (کسی جبر واکراہ کی وجہ سے) کہہ رہا ہو۔ اور جس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن نہ ہو اور زبان سے ایمان کے بلند بانگ دعوے کر رہا ہو۔ اللہ کے ہاں اس کے ایمان کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ ایمان اور کفر کا مدار قلبی کیفیت پر ہے۔ زبانی دعووں پر نہیں ہے۔

لَاۤ اِكۡرَاهَ فِى الدِّيۡنِ:

قرآن کریم نے واشگاف الفاظ میں اعلان فرمادیا ہے۔

لَاۤ اِكۡرَاهَ فِى الدِّيۡنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشۡدُ مِنَ الۡغَىِّ ۚ (البقرہ:۲۵۶)

"دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔ ہدایت گمراہی سے واضح اور متمیز ہو چکی ہے۔"

اور

وَ قُلِ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّكُمۡ فَمَنۡ شَآءَ فَلۡيُؤۡمِنۡ وَّ مَنۡ شَآءَ فَلۡيَكۡفُرۡ

(الکھف:۲۹)

"اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے کہ حق تمہارے پروردگار کی طرف سے (آچکا ہے) تو جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے وہ انکار کردے۔"

اور

فَذَكِّرۡ ؕ اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مُذَكِّرٌ ﴿ؕ۲۱﴾ لَسۡتَ عَلَيۡهِمۡ بِمُصَيۡطِرٍ ﴿ۙ۲۲﴾

(الغاشیہ:۲۱تا۲۲)

"(اے پیغمبر!) آپ تو محض نصیحت کرنے والے ہیں آپ ان کے اوپر کوئی داروغہ نہیں ہیں۔"

آپ کا یہ کام ہی نہیں ہے کہ آپ انہیں زور اور زبردستی سے مسلمان بنائیں۔

ایک شخص جو مسلمان ہو اور اس کے بعد اس کا دل ایمان پر مطمئن نہ رہا اسے کسی دوسرے مذہب پر انشراح قلب ہو گیا ہے اور وہ اسلام کو چھوڑ دینا چاہتا ہے تو قرآن کی ہدایت کے مطابق اسے تبدیل دین کی اجازت نہ دینے اور تبدیل دین کے بعد اسے قتل کی سزا دینے کے معنے یہی تو ہیں کہ آپ اسے اسلام پر کاربند رہنے کے لیے مجبور کر رہے ہیں۔ آپ سوچئے تو سہی کہ دل میں ایمان نہیں مگر آپ زبردستی اسے مسلمان کہلوانے پر مجبور کرتے ہیں اور وہ موت کے خوف سے اپنے آپ کو مسلمان کہہ رہا ہے اور کہلوا رہا ہے۔ کیا آپ اسے مسلمان کہہ سکتے ہیں؟ اس طرح تو ہم اپنے حلقہ میں منافقین کا ایک طبقہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ قرآن کریم کی رو سے منافقین تو کفار اور مشرکین سے بھی بدتر ہیں۔

اِنَّ الۡمُنٰفِقِيۡنَ فِى الدَّرۡكِ الۡاَسۡفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنۡ تَجِدَ لَهُمۡ نَصِيۡرًا ﴿ۙ۱۴۵﴾ (النساء:۱۴۵)

"منافقین تو جہنم کے سب سے نچلے طبقہ میں ہوں گے اور اے پیغمبر آپ ان کے لیے کوئی مددگار نہیں پائیں گے۔"

ایسا آدمی جس کا دل اسلام پر مطمئن نہیں اور اسے کسی اور مذہب پر انشراح قلب ہو گیا ہے کیا اسلام کے لیے کسی درجہ میں بھی کچھ مفید ہو سکتا ہے؟ وہ یقینا مفید نہیں ہو سکتا۔ وہ آگے چل کر مارِ آستین ہی ثابت ہو گا۔ یقینا ایسے مسلمانوں کی اسلام کو ضرورت نہیں ہے۔

قرآن کریم کی عام تعلیمات کا مال یہی ہے کہ نہ کسی کو مسلمان بنانے کے لیے کسی قسم کا جبر واکراہ کیا جاسکتا ہے، نہ کسی کو مسلمان رہنے کے لیے کسی قسم کا جبر واکراہ جائز ہے۔

ویسے قرآن کریم نے اشارۃً بھی مرتد کے لیے کسی قسم کی سزا مقرر نہیں فرمائی۔ ملاحظہ فرمایئے سورۃ آل عمران میں ہے۔

وَ مَنۡ يَّبۡتَغِ غَيۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِيۡنًا فَلَنۡ يُّقۡبَلَ مِنۡهُ ۚ وَهُوَ فِى الۡاٰخِرَةِ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ﴿۸۵﴾ (الانعام:۸۵)

"اور جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کا خواہش مند ہو گا تو وہ اس سے کبھی بھی قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں ناکام ونامراد ہو گا۔"

یہ تو ان لوگوں کا بیان ہوا جو دین اسلام قبول نہیں کرتے بلکہ وہ شروع ہی سے کسی اور دین کے پیرو ہیں۔ وہ جس دین کے بھی پیرو ہوں حق تعالیٰ کے ہاں اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا دین قبول نہیں کیا جائے گا۔ اس کے بعد ان لوگوں کا بیان آرہا ہے جو اسلام قبول کرلیتے ہیں پھر اسلام سے پھر جاتے ہیں اور کفر اختیار کرلیتے ہیں یعنی مرتد ہو جاتے ہیں ان کے متعلق ارشاد ہے:

كَيۡفَ يَهۡدِى اللّٰهُ قَوۡمًا كَفَرُوۡا بَعۡدَ اِيۡمَانِهِمۡ وَ شَهِدُوۡۤا اَنَّ الرَّسُوۡلَ حَقٌّ وَّ جَآءَهُمُ الۡبَيِّنٰتُ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۸۶﴾ اُولٰٓـئِكَ جَزَآؤُهُمۡ اَنَّ عَلَيۡهِمۡ لَعۡنَةَ اللّٰهِ وَالۡمَلٰٓـئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجۡمَعِيۡنَ ﴿ۙ۸۷﴾ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنۡهُمُ الۡعَذَابُ وَلَا هُمۡ يُنۡظَرُوۡنَ ﴿ۙ۸۸﴾ (آل عمران:۸۶تا۸۸)

"اللہ ایسے لوگوں کو سیدھی راہ کیسے دکھا سکتا ہے جو ایمان لانے کے بعد کافر ہو جائیں۔ (یعنی مرتد ہو جائیں) حالانکہ وہ اس بات کی شہادت دے چکے تھے کہ رسول برحق ہے اور ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں آچکی تھیں۔ اور اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو سیدھی راہ نہیں دکھایا کرتے جو خود ہی اپنے نفسوں پر ظلم کرتے ہوں۔ ان لوگوں کا بدلہ یہی ہے کہ ان پر اللہ کی، فرشتوں کی، اور تمام لوگوں کی لعنت اور پھٹکار برستی رہے۔ وہ اس لعنت میں ہمیشہ ہمیشہ گرفتار رہیں اور اللہ کے عذاب میں ان سے کوئی تخفیف نہ کی جائے اور نہ ہی انہیں کوئی مہلت دی جائے بجز ان لوگوں کہ جو اس کے بعد توبہ کرلیں اور اپنے اعمال درست کرلیں تو یقینا حق تعالیٰ بڑے بخشنے والے اور بڑے مہربان ہیں۔"

قرآن کریم میں مرتدین کا بیان یہ ہے۔ اس بیان میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ حق تعالیٰ نے اشارۃً بھی نہیں فرمایا کہ ان لوگوں کو اس جرم کی پاداش میں قتل کردیا جائے۔ قرآن کریم نے ان کی سزا "اُولٰٓـئِكَ جَزَآؤُهُمۡ" صراحت کے ساتھ یہی بتائی ہے کہ ان پر اللہ، کی فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت اور پھٹکار برسے اور اس لعنت میں وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گرفتار رہیں۔ وہ عذاب

الٰہی میں گرفتار ہوں اور انہیں کوئی مہلت نہ دی جائے۔ یہ ساری اخروی سزائیں ہیں۔ اس کے بعد پھر یہ بھی تصریح ہے کہ اس کے بعد بھی ان لوگوں کے لیے توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اگر اس کے بعد توبہ کر لیں اور اپنے اعمال درست کر لیں تو اللہ تعالیٰ بڑے بخشنے والے اور بڑے مہربان ہیں۔ اس کے بعد والی آیت میں۔ وَاَصْلَحُوْا کا لفظ خاص طور پر قابل توجہ ہے یعنی تقیہ کے طور پر موت کے خوف سے مسلمان ہونا سودمند نہیں ہو گا۔ بلکہ وہ سچ مچ سچے دل سے مسلمان ہوں اور اپنے اعمال درست کریں تو حق تعالیٰ کی مغفرت اور رحمت انہیں قبول کرنے کے لیے اب بھی تیار ہے۔ اگلی آیات میں ایسے لوگوں کے طبعی موت سے مر جانے کا ذکر ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَ اَصْلَحُوْا ۫ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۸۹﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ ﴿۹۰﴾

(آل عمران: ۸۹ تا ۹۰)

"جن لوگوں نے اپنے ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کر لیا۔ پھر وہ کفر میں بڑھتے ہی چلے گئے تو ان کی توبہ ہرگز قبول نہیں کی جائے گی۔ یہی لوگ تو گمراہ ہیں۔ یقیناً جن لوگوں نے کفر کیا اور کفار ہونے کی حالت میں ہی وہ مر گئے تو اگر وہ زمین بھر سونا بھی اپنے فدیہ میں پیش کر دیں تو ہرگز ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔ یہی لوگ تو ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہو گا ان کے لیے کوئی بھی مددگار نہیں ہو گا۔"

غور فرمایئے اس آیت کریمہ میں بھی ایمان لانے کے بعد لوگوں کے کفر کرنے کا ذکر ہے۔ نہ صرف کفر کرنے کا بلکہ کفر میں بڑھتے چلے جانے کا۔ یہ لوگ مرتد بلکہ شدید درجہ کے مرتدین ہیں۔ ان کے متعلق قتل کرنے کے حکم کے بجائے یہی بتایا گیا ہے کہ ان کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی اور یہ لوگ گمراہ ہیں۔ پھر اگلی آیت میں ارتداد ہی کی حالت میں اپنی طبعی موت مر جانے کا بیان ہے اور ان کے لیے یہی بتایا گیا کہ ان کے لیے دردناک عذاب ہو گا اور انہیں کوئی مددگار نہیں ملے گا۔ انہیں کے متعلق یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اگر وہ عذابِ الٰہی سے چھوٹنے کے لیے زمین بھر سونا بھی فدیہ میں پیش کر دیں گے تو وہ ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔ ان آیات کریمہ میں ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا "پھر وہ کفر میں بڑھتے چلے گئے" کا ٹکڑا خصوصی توجہ کے لائق ہے۔ یعنی وہ مرتد ہونے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں کہ وہ کفر میں بڑھتے چلے جائیں۔ قتل کر کے ان کی زندگی ختم نہیں کر دی جاتی بلکہ وہ مرتد ہونے کے بعد اس قابل رہتے ہیں کہ وہ اپنے کفر میں اضافہ کرتے چلے جائیں۔ کیونکہ اگر وہ ارتداد کے بعد ہی قتل کر دیئے جاتے تو اپنے کفر میں اضافہ کرتے چلے جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔

اس کے بعد آگے بڑھیئے۔ سورہ نساء میں ارشاد الٰہی ہے:

"یقیناً جو لوگ ایمان لائے پھر کفر کیا (مرتد ہو گئے) پھر ایمان لائے اس کے بعد پھر کافر (مرتد) ہو گئے۔ اس کے بعد کفر میں بڑھتے ہی چلے گئے تو اللہ انہیں بخشنے والا نہیں اور نہ انہیں ہدایت کی راہ دکھانے والا ہے۔"

یہاں صرف ایک بار مرتد ہونے کا ذکر نہیں ہے بلکہ دوبار مرتد ہونے کا ذکر ہے کہ وہ ایک بار اسلام لائے اور مرتد ہو گئے اس کے بعد دوبارہ اسلام لائے اور پھر مرتد ہو گئے بلکہ اپنے کفر میں بڑھتے ہی چلے گئے۔ ان کا کفر شدید سے شدید تر ہوتا چلا گیا۔ ان کے متعلق بھی قرآن کریم نے یہ حکم نہیں دیا کہ انہیں ارتداد کی سزا میں قتل کر دو۔ بلکہ یہی ارشاد فرمایا ہے کہ ان کی بخشش نہیں ہو سکے گی اور اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت کی راہ نہیں دکھائے گا۔

اس کے بعد اور آگے بڑھیئے۔ سورۃ مائدہ میں حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۫ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۴﴾

(المائدہ: ۵۴)

"اے پیروان دعوت ایمانی! تم میں سے جو آدمی بھی اپنے دین سے پھر جائے گا (مرتد ہو جائے گا) تو ہو جائے حق تعالیٰ ایسے لوگوں کی جگہ ایسے لوگوں کو لے آئے گا جن سے اللہ بھی محبت کرتا ہو گا اور وہ اللہ سے محبت کرتے ہوں گے۔ وہ مومنوں کے لیے نہایت نرم خو ہوں گے اور کافروں کے لیے نہایت سخت ہوں گے۔ وہ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت گر کی ملامت کی پروا نہیں کریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے وہ جسے چاہے دیدے اور اللہ بڑی وسعتوں والا اور جاننے والا ہے۔"

اس آیت کریمہ میں تو مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ "تم میں سے جو اپنے دین سے پھر جائے" ارتداد کا لفظ ہی حق تعالیٰ نے استعمال فرما کر بات کو واضح سے واضح تر کر دیا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر تم میں سے کوئی مرتد ہو جاتا ہے تو مرتد ہو جائے وہ اسلام کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ ایسے لوگوں کی جگہ ہم ان لوگوں کو لے آئیں گے جو صحیح مومنانہ صفات کے پیکر ہوں گے۔ یعنی

مسلمانوں سے کہا جارہا ہے کہ کوئی مرتد ہوتا ہے تو ہو جانے دو۔ تم اس کی ذرا پروا نہ کرو۔ اس آیت میں بھی کہیں اشارۃً تک نہیں فرمایا گیا ہے کہ ایسے لوگوں کو قتل کردو۔ قتل کرنا تو درکنار یہاں تو صاف طریقہ سے مسلمانوں کو خطاب کرکے فرما دیا گیا ہے کہ کوئی مرتد ہوتا ہے تو اسے ہونے دو۔ اس کی بالکل پروا نہ کرو۔ ایسے لوگوں کی جگہ دوسرے صحیح لوگ آجائیں گے جو اسلام کے لیے مفید ہوں گے۔

اس کے بعد سورۃ نحل کی اس آیت کریمہ پر پھر غور فرمایئے جس کا ایک حصہ پہلے بھی گزر چکا ہے۔ کیونکہ بعض حضرات اس سے قتل مرتد پر استدلال کرتے ہیں۔ اس آیت میں فرمایا گیا تھا:

مَنۡ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنۡۢ بَعۡدِ اِيۡمَانِهٖۤ اِلَّا مَنۡ اُكۡرِهَ وَقَلۡبُهٗ مُطۡمَـئِنٌّ ۢ بِالۡاِيۡمَانِ وَلٰـكِنۡ مَّنۡ شَرَحَ بِالۡكُفۡرِ صَدۡرًا فَعَلَيۡهِمۡ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمۡ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ ﴿۱۰۶﴾ (النحل:۱۰۶)

"جو آدمی اپنے ایمان لے آنے کے بعد اللہ کے ساتھ کفر کرے (کافر اور مرتد ہو جائے) بجز اس آدمی کے جس کو کفر پر مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو (تو وہ مستثنیٰ ہے) لیکن (بات اس کی ہورہی ہے) جس کو کفر کے ساتھ شرح صدر ہو جائے تو ایسے لوگوں پر اللہ کا غضب نازل ہوگا ان کے لیے بڑا عذاب ہوگا۔"

اس آیت کریمہ میں ارتداد کی سزا (قتل نہیں بلکہ) غضب الٰہی کا نزول اور آخرت کا بڑا عذاب بتائی گئی ہے اس سے اگلی آیت میں بتایا گیا ہے کہ یہ سزا کیوں دی جائے گی۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسۡتَحَبُّوا الۡحَيٰوةَ الدُّنۡيَا عَلَى الۡاٰخِرَةِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۱۰۷﴾ (النحل:۱۰۷)

"یہ اس وجہ سے ہے کہ ان لوگوں نے آخرت کے مقابلے میں حیات دنیوی ہی کو پسند کر لیا ہے اور اللہ کافروں کی قوم کو سیدھی راہ نہیں دیکھایا کرتا۔"

اس آیت کریمہ میں ان لوگوں پر غضب الٰہی نازل ہونے اور آخرت میں سخت عذاب دیئے جانے کی وجہ حق تعالیٰ نے یہ بتائی ہے کہ ان لوگوں نے آخرت کے مقابلہ میں حیات دنیوی کو پسند کر لیا ہے یا مستقبل کی کامرانیوں کے بجائے جو نظر نہیں آتیں پیش پا افتادہ مفادات کو جو سامنے نظر آرہے ہیں اختیار کر لیا ہے۔ مگر یہ کیفیت انہی لوگوں کی انوکھی نہیں ہے جو ایمان لانے کے بعد کفر کرتے (مرتد ہو جاتے) ہیں بعینہ یہی کیفیت ان لوگوں کی بھی ہوتی ہے جو کفر پر پیدا ہوئے اور کفر پر ہی زندہ رہے اور کفر پر ہی مر گئے۔

چنانچہ سورۃ ابراہیم میں ہے:

وَوَيۡلٌ لِّـلۡكٰفِرِيۡنَ مِنۡ عَذَابٍ شَدِيۡدِۙ ﴿۲﴾ الَّذِيۡنَ يَسۡتَحِبُّوۡنَ الۡحَيٰوةَ الدُّنۡيَا عَلَى الۡاٰخِرَةِ وَيَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَيَبۡغُوۡنَهَا عِوَجًا ؕ اُولٰۤـئِكَ فِىۡ ضَلٰلٍۢ بَعِيۡدٍ ﴿۳﴾ (ابراہیم:۲تا۳)

"اور کفر کرنے والوں کے لیے سخت عذاب کی وجہ سے بڑی تباہی ہے جو حیات دنیوی کو آخرت کے مقابلے میں بہت پسند کرتے ہیں۔ لوگوں کو (اللہ کی) راہ سے روکتے ہیں اور اس میں کجی کو تلاش کرتے ہیں۔ یہی لوگ تو ہیں جو دور کی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔"

نیز سورۃ بقرہ میں یہود کی بد اعمالیوں کے سلسلہ میں حق تعالیٰ نے ان کے متعلق بھی فرمایا ہے۔

اُولٰۤـئِكَ الَّذِيۡنَ اشۡتَرَوُا الۡحَيٰوةَ الدُّنۡيَا بِالۡاٰخِرَةِ ۡ فَلَا يُخَفَّفُ عَنۡهُمُ الۡعَذَابُ وَلَا هُمۡ يُنۡصَرُوۡنَ ﴿۸۶﴾ (البقرہ:۸۶)

"یہی لوگ تو ہیں جنہوں نے آخرت کے بدلے میں حیات دنیوی کو خرید لیا (اختیار کر لیا) ہے تو ان سے عذاب میں تخفیف نہیں کی جائے گی اور نہ ان کی کوئی مدد کی جائے گی۔"

ان تمام آیات کریمہ سے ثابت ہے کہ بعینہ یہی کیفیت دوسرے کافروں کی بھی ہوتی ہے۔

اس کے بعد اگلی آیت میں ان لوگوں کی جو ایمان لانے کے بعد کفر کرتے ہیں یعنی مرتد ہو جاتے ہیں ایک دوسری خصوصیت یہ بیان فرمائی گئی ہے:

اُولٰۤـئِكَ الَّذِيۡنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ وَسَمۡعِهِمۡ وَاَبۡصَارِهِمۡ‌ ۚ وَاُولٰۤـئِكَ هُمُ الۡغٰفِلُوۡنَ ﴿۱۰۸﴾ (النحل:۱۰۸)

"یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر، جن کے کانوں اور آنکھوں پر اللہ نے مہر لگادی ہے (ان کی صلاحیت گم کر دی ہے) اور یہی لوگ تو غافل ہیں۔"

مگر یہ کیفیت بھی محض ایمان لانے کے بعد جو کافر (مرتد) ہو جائیں انہی کی نہیں ہوتی بلکہ تمام کفار کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ سورۃ بقرۃ میں ہے:

اِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا سَوَآءٌ عَلَيۡهِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡهُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۶﴾ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ وَعَلٰى سَمۡعِهِمۡ‌ؕ وَعَلٰىٓ اَبۡصَارِهِمۡ غِشَاوَةٌ ۡ وَّلَهُمۡ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ ﴿۷﴾ (البقرہ:۶تا۷)

"جو لوگ کافر ہیں وہ ایمان نہیں لائیں گے اے پیغمبر! آپ انہیں (ان کے کفر کے نتائج سے) ڈرائیں یا نہ ڈرائیں (وہ ایمان لانے والے نہیں) اللہ نے ان کو دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگادی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔"

قرآن کریم تو بتارہا ہے کہ شروع میں بھی اسلام سے انکار وہی لوگ

کرتے ہیں جن میں صحیح بصیرت نہیں ہوتی اور جو اپنی صلاحیتوں (دلوں، کانوں اور آنکھوں) کو مردہ کر لیتے ہیں اور اسلام لانے کے بعد اسلام سے بھی وہی لوگ پھر جاتے ہیں جنہوں نے اپنی انہی صلاحیتوں کو ختم کر لیا ہو۔ لہٰذہ اپنی خصوصیات کے لحاظ سے شروع ہی سے انکار (کفر) کرنے والوں اور اسلام لا نے کے بعد انکار (کفر) کرنے والوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ لہٰذہ جس طرح شروع ہی سے کفر کرنے والوں کو اسلام کے لیے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے ہی اسلام لا کر کفر کرنے والوں (مرتدوں) کو مسلمان رہنے کے لیے بھی مجبور کر نے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

قرآن کریم کی ان تصریحات کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر قتل مرتد کا نظریہ پیدا کیسے ہو گیا جبکہ قرآن کریم اس سلسلہ میں اس قدر واضح ہدایات دے رہا ہے اور حضور اکرم ﷺ اور خلفائے راشدین کے متعلق جو روایات میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ حضرات مرتدین کو قتل فرما دیا کرتے تھے تو اس کی حقیقت کیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ابتداء اسلام میں عرب میں مسلمان اور مشرکین کے دو متخالف کیمپ تھے۔ جو شخص اسلام سے پھرتا (مرتد ہوتا) تھا وہ فوراً مخالف کیمپ میں چلا جاتا تھا۔ یہ دونوں کیمپ متحارب کیمپوں میں شامل تھے۔ وہ مخالف کیمپ میں شامل ہو کر اسلام کے خلاف سرگرمیاں شروع کر دیتا تھا اور باغیانہ حرکات کا صدور اس سے ہوتا تھا۔ ارتداد اور بغاوت کے ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ اس زمانہ میں ارتداد محض نظریئے اور عقیدے کی تبدیلی کا نام نہیں تھا بلکہ نظریئے اور عقیدے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ تخریب کاری، قتل و غارت گری اور بغاوت بھی ہوتی تھی۔ چنانچہ ایسے مرتدین کو قتل کر دیا جاتا تھا۔

تمام صحاح ستہ کی کتابوں میں عہد رسالت مآب ﷺ میں ارتداد کا ایک واقعہ بیان ہوا ہے جو قبیلہ عکل اور عرینہ قبیلے کے آدمیوں سے تعلق رکھتا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ عکل اور عرینہ کے کچھ لوگ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے مسلمان ہونے کی باتیں کیں انہوں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! ہم جانور پالا کرتے تھے۔ کھیتی باڑی کے عادی نہیں ہیں۔ مدینہ کی آب و ہوا ہمیں راس نہیں آ رہی ہے۔ چنانچہ ان کو استسقاء کی بیماری ہو گئی تھی۔ تو آنحضرت ﷺ نے انہیں صدقہ کے اونٹ دیئے اور ایک چرواہا بھی ساتھ کر دیا اور فرمایا کہ ان اونٹوں کو لے جاؤ اور کسی جنگل میں رہائش اختیار کر لو اور ان اونٹوں کا دودھ اور ان کے پیشاب پیو (اس زمانہ میں استسقاء کی بیماری کا یہی علاج مشہور تھا) چنانچہ وہ مدینہ سے کچھ فاصلہ پر حرہ کے ایک کنارے پر فروکش ہو گئے۔ کچھ عرصہ وہیں قیام کیا اور تندرست ہو گئے اور اس کے بعد شیطان نے انہیں بہکایا چنانچہ وہ اسلام سے پھر گئے۔ آنحضرت ﷺ نے جو راعی ان کے ساتھ کیا تھا اسے قتل کیا، اس کی آنکھوں میں گرم سلائیں پھیریں، اس کے ہاتھ پاؤں کاٹے اور اونٹوں کو ہانک کر چلتے بنے۔ آنحضرت ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے ان کی تلاش کے لیے ایک دستہ بھیجا۔ وہ گرفتار کر کے لائے گئے تو آنحضرت ﷺ نے بھی ان کی آنکھوں میں گرم سلائیاں پھروائیں۔ ان کے ہاتھ پاؤں کاٹے گئے اور حرہ کے میدان میں انہیں چھوڑ دیا گیا حتیٰ کہ وہ اسی حال میں مر گئے۔

قتادہ کہتے ہیں کہ ابن سیرین نے مجھ سے بیان کیا کہ یہ واقعہ حدود کے احکام نازل ہونے سے پہلے کا ہے جبکہ مثلہ کرنے (صورت بگاڑنے) کی ممانعت نہیں تھی۔ اسی روایت میں دوسری سند سے یہ بھی آیا ہے کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کے چرواہے کے ساتھ یہی حرکات کی تھیں۔ ابو قلابہ فرماتے ہیں کہ ان لوگوں نے چوری، ڈاکہ، قتل اور کفر کا ارتکاب کیا تھا اور اللہ اور اس کے رسول کے خلاف جنگ کی تھی۔ قتادہ کہتے ہیں کہ ہم تک یہ بات پہنچی ہے کہ آنحضرت ﷺ اس واقعہ کے بعد صدقے کا حکم فرمایا کرتے اور مثلہ کرنے (صورتیں بگاڑنے) سے منع فرمایا کرتے تھے۔

(بخاری، مسلم و باقی صحاح ستہ و موطا امام مالکؒ بحوالہ جمع الفوائد ج ۱ ص ۲۸۴)

حضور اکرم ﷺ کی وفات کے بعد فتنہ ارتداد کا واقعہ بڑا مشہور ہے جس کو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے مسلح مزاحمت کے بعد بڑی تندہی کے ساتھ فرو فرمایا تھا۔ یہ بھی محض نظریئے اور عقیدے کی تبدیلی کا مسئلہ نہیں تھا بلکہ مسلح بغاوت و مزاحمت اور مرکز کو زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار پر مشتمل تھا اور خود مرتدین کی طرف سے اس کی ابتدا ہوئی تھی۔ اور مدینہ منورہ پر ان کے حملے شروع ہو گئے تھے۔ یہ بھی مسلح بغاوت تھی۔ یہ اتنی واضح بات ہے جس کے لیے کسی حوالہ دینے کی ضرورت نہیں۔ پھر بھی ہم حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا ایک خطبہ طبری سے نقل کئے دیتے ہیں۔ جس میں اس تمام صورت حال کی پوری نشان دہی کر دی گئی ہے۔ مرتدین کے وفود کے مدینے سے چلے جانے کے بعد اہل مدینہ سے خطاب کرتے ہوئے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا۔

ان الارض کافرۃ وقد رای وفد ھم منکم قلۃ وانکم لا تدرون لیلا تاتون ام نھارا۔ وادنا ھم منکم علی برید وکان القوم یاملون ان نقبل منھم ونوا عھم۔ وقد ابینا علیھم ونبذنا الیھم عھد ھم فاستعدوا واعدوا فما لبثوا الا ثلاثا حتی طرقوا المدینۃ غارۃ مع اللیل وخلفوا بعضھم بذی حسی لیکونوا لھم رداء۔

(تاریخ طبری ج ۴ ص ۱۸۷۴ مطبوعہ یورپ)

"ساری سرزمین (عرب) کافر ہو چکی ہے اور ان کے وفد نے تمہاری قلت تعداد دیکھ لی ہے تمہیں کچھ پتہ نہیں کہ وہ تم پر رات کو چڑھ دوڑیں یا دن کو اور ان کے قریب ترین لشکر تم سے ایک برید (منزل یعنی بارہ میل) کے فاصلے پر ہیں اور ان لوگوں کو یہ توقع تھی کہ ہم ان کے مطالبات مان لیں گے اور ان کے مطالبات تسلیم کر لیں گے۔ مگر ہم نے انکار کر دیا اور ان کا عہد ان کی طرف لوٹا دیا تو وہ جنگ کے لیے تیار ہو گئے۔ لہٰذہ تم بھی تیاری کرو۔ تو تین دن ہی گزرے تھے کہ انہوں نے مدینہ منورہ پر حملہ کر دیا اور رات ہوتے ہی ہلّہ بول دیا اور اپنی ایک جمعیت کو اپنے پیچھے ذی حسیٰ کے مقام پر تعینات کر دیا تا کہ وہ ان کی پشت پناہ ثابت ہوں۔"

اس پوری تفصیل سے یہ بات واضح ہے کہ ابتداء اسلام میں ارتداد اور بغاوت کچھ لازم وملزوم سے تھے۔ جو مرتد ہوتا تھا وہ بغاوت بھی کرتا تھا۔ وہ اسلامی مملکت میں تبدیلی دین کے بعد پر امن شہری کی حیثیت سے ذمی بن کر نہیں رہتا تھا بلکہ مسلح بغاوت کرتا تھا اور مخالف کیمپ میں چلا جاتا تھا۔ اس وقت کے حالات کو عام حالات پر قیاس کر لینا صحیح نہیں ہے، اس وقت اسلامی مملکت اپنے ابتدائی دور میں تھی۔ اور اسے مختلف قوموں سے نبرد آزمائی کرنی پڑ رہی تھی۔ اسلامی مملکت کی تمام سرحدوں پر جنگ وجدال کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اپنے ملک کے کسی آدمی کے مرتد ہو جانے کے معنے صرف یہی نہیں تھے کہ اس نے اپنا نظریہ اور عقیدہ تبدیل کر لیا۔ بلکہ وہ محارب گروہ سے مل جاتا اور اپنی مملکت کے بہت سے قیمتی راز اپنے ساتھ لے جاتا اور دشمن کو بتا دیتا تھا۔ بہت سے لوگ محض جاسوسی کرنے اور ہمارے دفاعی راز معلوم کرنے کے لیے آجاتے اور بظاہر مسلمان ہو جاتے تھے اور اپنا کام کر لینے کے بعد اپنے پرانے دین کی طرف لوٹ جاتے تھے۔ ان تمام باتوں کو سربراہ مملکت اور عمائدین سلطنت ہی سمجھتے تھے اور جیسا مناسب سمجھتے فیصلے کرتے تھے۔ اس وقت کے ہنگامی حالات میں جبکہ اسلامی مملکت ہر طرف سے دشمنوں کے نرغے میں تھی، عمال حکومت نے جو فیصلے کئے تھے انہیں آج کے پر امن حالات پر منطبق نہیں کیا جا سکتا۔ روایات کے ذریعہ سے ہم تک جو کچھ پہنچا ہے وہ اس وقت کے فیصلے ہی فیصلے ہیں۔ ان فیصلوں کا پس منظر اور اس وقت کے خصوصی حالات کو راویوں نے بیان نہیں کیا۔ اس لیے محض روایات کے ذریعے سے قرآن کریم سے بے نیاز ہو کر ہم کسی صحیح نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتے۔

ہمارے فقہائے کرام میں خصوصیت کے ساتھ سادات حنفیہ نے (شکر اللہ سعیہم) اس حقیقت کو سمجھا ہے اور انہوں نے مرتد عورت، مرتد نابینا، مرتد معذور، مرتد شیخ فانی کے سلسلہ میں گفتگو کرتے ہوئے صراحت فرما دی ہے کہ ان لوگوں کو قتل نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ارتداد میں قتل کی اصل علت ارتداد نہیں ہے بلکہ حرابہ (بغاوت اور مسلح جنگ) ہے چونکہ یہ لوگ بغاوت اور مسلح جنگ کی اہلیت نہیں رکھتے لہٰذہ ان کو قتل نہیں کیا جا سکتا چنانچہ ہدایہ میں اما المرتدۃ فلا تقتل "اور مرتد عورت قتل نہیں کی جائے گی" کے تحت میں لکھا ہے:

ولنا ان النبی ﷺ نہی عن قتل النساء لان الاصل تاخیر الاجزیۃ الی دار الاخرۃ اذ تعجیلھا یخل بمعنی الابتلاء وانما عدل عنہ دفعا لشر ناجز وھو الحراب ولا یتوجہ ذالك من النساء لعدم صلاحیۃ البنیۃ بخلاف الرجال فصارت المرتدۃ کالاصلیۃ۔

(ہدایہ ج۲ ص۲۰۱)

"اور ہماری دلیل یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے عورتوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا ہے اور کیونکہ سزاؤں میں اصول یہی ہے کہ انہیں دار آخرت تک موئخر کیا جائے کیونکہ۔ (دنیا ہی میں) جلد سزا دینا (بندوں کی) آزمائش وابتلاء کے مفہوم کو غلط کر دیتا ہے۔ کسی فوری شر کو دفع کرنے کے لیے ہی اس سے انحراف کیا جا سکتا ہے اور وہ مسلح جنگ ہے جو عورتوں کی طرف سے ممکن نہیں کیونکہ عورتوں کی جسمانی ساخت ہی اس کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ بخلاف مردوں کے۔ اس لیے مرتد ہو جانے والی عورت کا حکم اس کافر عورت ہی کی طرح ہو گا جو شروع سے (اصل میں) کافر ہی ہو۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے۔ صاحب ہدایہ بتا رہے ہیں کہ سزاؤں کے معاملہ میں اصل قانون یہی ہے کہ انہیں دار الجزاء تک موخر رکھا جائے البتہ کسی فوری شر کے دفعیہ کے لیے اس اصل سے انحراف کر کے اس دنیا میں سزا دی جا سکتی ہے جیسے وہ جرائم جن کا تعلق حقوق العباد سے ہو مثلاً چوری، زنا، قذف، وغیرہ ایسے ہی ارتداد میں مرتد کی طرف سے مسلح جنگ اور بغاوت۔ عورت اور معذور افراد میں چونکہ مسلح جنگ اور بغاوت کا امکان نہیں ہوتا اس لیے ان کو قتل بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بہرحال مرتد کا قتل ارتداد کی وجہ سے نہیں بلکہ حرابہ کی وجہ سے ہے۔

ہدایہ کے اس مسئلہ کے ذیل میں محقق ابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ:

وھذا ای قولہ نہی عن قتل النساء مطلق یعم الکافرۃ اصلیا وعارضا وثبت تعلیلہ ﷺ بالعلۃ المنصوصۃ فی الحدیث من عدم حرابھا بقولہ (ما کانت ھذہ لتقاتل) فکان مخصصاً لعموم ما رواہ الشافعی من قولہ ﷺ (من بدل دینہ فاقتلوہ (بعد ان عمومہ مخصص بمن بدل دینہ من الاسلام الی الکفر وایضا فان الاصل تاخیر الاجزیۃ الی دار الاخرۃ وانما عدل عنہ دفعا لشر ناجزا المصالح تعود الینا فی ھذہ الدار کالقصاص وحد القذف والشرب

والزنا و السرقة شرعت لحفظ النفوس والاعراض والعقول والانساب والاموال فكذا يجب في القتل في الردة ان يكون لدفع شر حرابة لاجزاءً على الكفر لان جزائه اعظم من ذالك عند الله تعالیٰ فيختص بمن يتاتی منه الحراب وهو الرجل ولهذا نهى النبي صلى الله عليه و سلم عن قتل النساء وعلله بانها لم تكن تقاتل عليها صح من الحديث ولهذا قلنا لو كانت المرتدة ذات رای وتبع تقتل لالردتها بل لانها تسعى في الارض بالفساد الخ۔ (فتح القدیر ج۴ص۳۸۹)

"حضور اکرم ﷺ کا یہ ارشاد کہ آپ نے عورتوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا ہے مطلق ہے جو اصلی کافر عورت کو اور اس عورت کو جو بعد میں کافر ہو گئی ہو شامل ہے اور آپ ﷺ کا اس کی یہ علّت بیان کرنا (جو حدیث میں منصوص علت ہے) یعنی اس کا جنگ نہ کرنا۔ چنانچہ آپ کا یہ ارشاد ہے کہ "یہ تو جنگ کرنے والی نہیں تھی" تو یہ ارشاد اس روایت کے عموم کو خاص کر دیتا ہے جو امام شافعیؒ نے بیان کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "جو اپنا دین بدل دے اسے قتل کر دو" ہماری اس بیان کردہ تخصیص سے پہلے بھی تمام حضرات کے نزدیک آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کا عموم اس شخص کے ساتھ مخصوص ہے جو اپنا دین اسلام سے کفر کی طرف تبدیل کرلے (یہ نہیں کہ اگر کوئی یہودی ہے اور وہ عیسائی ہونا چاہتا ہے تو اسے بھی دین تبدیل کرنے پر قتل کر دیا جائے) نیز یہ بات بھی ہے کہ اصل قانون جزاؤں میں ان کو دار آخرت کی طرف موخر کرنے کا ہے۔ اس سے انحراف کسی فوری شر کی مدافعت کے لیے ان مصلحتوں کی خاطر کیا جاتا ہے جو ہم بندوں کی طرف سے دنیا میں عائد ہوتی ہوں۔ مثلاً قصاص، حد قذف، حد شرب، حد زنا، حد سرقہ، نفوس، عزت و آبرو، دیات، انساب، اور اموال وغیرہ کی حفاظت کے لیے، تو ایسے ہی ارتداد کے اندر قتل میں بھی ضروری ہے کہ وہ بھی اس کے حرابہ (بغاوت وجنگ) کے شر کی مداخلت کے لیے ہو نہ کہ کفر کی جزا کے لیے کیونکہ کفر کی جزا تو اللہ کے نزدیک اس سے کہیں بڑی ہوگی۔ تو یہ جزا اس شخص کے ساتھ مخصوص ہوگی جس سے بغاوت اور جنگ صادر ہو سکے اور وہ مرد ہی ہو سکتا ہے اس لیے نبی اکرم ﷺ نے عورتوں کو قتل کرنے سے منع فرمادیا ہے اور اس کی وجہ یہی بیان فرمائی کہ یہ بیچاری کونسی جنگ کر رہی تھی۔ جیسا کہ حدیث نبوی سے صحیح طور پر ثابت ہو چکا ہے۔ اسی لیے ہم نے کہا ہے کہ اگر مرتد ہو نے والی عورت صاحب رائے واختیار ہو اور لوگ اس کا اتباع کرتے ہوں تو وہ قتل کر دی جائے گی لیکن اس کو اس کے مرتد ہونے کی وجہ سے قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ اس لیے قتل کیا جائے گا کہ وہ زمین میں فساد اور فتنہ پھیلانے کی کوشش کر رہی ہے۔"

اسی طرح صاحب ہدایہ کے اس قول پر کہ ولا تقتل الا بالحراب **(اور قتل نہیں کیا جاسکتا مگر بغاوت کے جرم میں) صاحب عنایہ (شرح ہدایہ) نے لکھا ہے۔**

فكان القتل ههنا مستلزما للحراب لان نفس الكفر ليس بمبيح للقتل حتى لا يقتل الاعمیٰ والمقعد والشيخ الفانی۔ وقد تحقق الملزوم بالاتفاق وهو كونه حربيا فمن يقتل فلا بد من كونه حربيا۔ (عنایہ برحاشیہ ہدایہ ج۲ص۶۰۱)

"تو اس سلسلہ میں قتل کی سزا جنگ اور بغاوت کی وجہ سے ہوتی ہے کیونکہ نفس کفر قتل کو حلال کرنے والا نہیں ہے۔ حتیٰ کہ نابینا آدمی، معذور آدمی، بوڑھا پھونس آدمی (اگر مرتد ہو جائیں) تو قتل نہیں کیے جاتے، جس امر پر قتل کرنا لازم آتا ہے وہ بالاتفاق متحقق ہو گیا ہے یعنی اس کا محارب ہونا تو جو شخص قتل کیا جائے گا اس کا محارب ہونا ضروری ہے۔"

صاحب ہدایہ اور ہدایہ کے شارح محقق ابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ نے معاملہ بالکل ہی صاف کر دیا ہے کہ:

اصل قانون سزاؤں میں ان کو دار آخرت تک موخر کرنے کا ہے۔ اس سے انحراف کسی فوری شر کے دفعیہ کے لیے ان مصلحتوں کی خاطر کیا جاتا ہے جن کا تعلق ہم بندوں سے ہوتا ہے۔ مثلاً قصاص، حد قذف، حد شرب، حد زنا، حد سرقہ، جو نفوس، عزت وآبرو، دیات، انساب واموال کی خفاظت کا باعث ہیں ایسے ہی ارتداد میں بھی ضروری ہے کہ قتل کی سزا اس کے حرابہ (بغاوت وجنگ) کے شر کے دفعیہ کے لیے ہو نہ کہ کفر کی سزا کے لیے کیونکہ کفر کی سزا تو اللہ کے نزدیک اس سے کہیں بڑی ہوگی۔

پھر صاحب عنایہ نے نابینا مرد، معذور مرد، شیخ فانی کی مثالیں دے کر بتا دیا ہے کہ صرف عورتوں ہی میں نہیں۔ مردوں میں بھی اگر ایسے کچھ لوگ ہوں جن سے حرابہ (جنگ اور بغاوت) کا احتمال نہ ہو تو وہاں بھی قتل نہیں کیا جاتا جس سے صاف معلوم ہو گیا کہ قتل ارتداد کی سزا نہیں ہے بلکہ حرابہ یعنی جنگ اور بغاوت کی سزا ہے۔

شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں اعلاء السنن میں یہ ایک روایت نقل فرمائی ہے:

عن عبد الرحمن بن محمد بن عبد الله بن عبد القاری عن ابيه عن عمر رضی اللہ عنہ انه قال الوفد قدموا عليه من بنی ثور هل من مغرب خبر قالوا نعم اخذنا رجلا من العرب كفر بعد اسلامه فقدمناه فضربنا عنقه قال هلا ادخلتموه جوف بيت فالقيتم اليه كل يوم رغيفا ثلثة ايام واستتبتموه لعله يتوب اويراجع امر الله۔ اللهم لم اشهد و لم آمر

ولم ارض اذبلغنی

(رواہ مالک فی الموطا (زیلعی ج۲ص۱۵۹) وابویوسف الامام فی الخراج ص ۲۱۲)

وھو مرسل و رواہ عبدالرزاق عن معمر وابن ابی شیبہ عن ابن عیینہ کلاھما عن محمد بن عبد الرحمن بن عبد القاری عن ابیہ فعلی ھذا ھو متصل لان عبد الرحمن بن عبد سمع عمر (الجوھر النقی ج۲ص۱۷۳) و رواہ البیقی عن انس قال لما نزلنا علی تستروفیہ فقدمنا علی عمر فقالیا انس مافعل الستة الرھط من بکر بن وائل الذین ارتدوا عن الاسلام فلحقوا بالمشرکین قالیا امیر المومنین۔ قتلوا فی المعرکة فاسترجع قلت وھل کان سبیلھم الا القتل قال نعم کنت اعرض علیھم الاسلام فان ابوا اودعتھم السجن ذکرہ الحافظ فی التلخیص (ج۲ص۳۵۰) وسکت عنه فھو حسن او صحیح واسندہ ابن حزم فیالمحلی (ج۱۱ص۱۹۱) حدثنا عبداللہ ابن ربیع ناعبداللہ بن محمد المنھال حدثنا حماد بن سلمة اخبرنا داؤد وھو ابن ابی ھند عن الشعبی عن انس بن مالک وصححه (اعلاء السنن ج۱۲ص۴۳۴)

"عبد الرحمن بن محمد عبد اللہ بن عبد قاری سے روایت ہے انہوں نے اپنے والد سے، انہوں نے حضرت عمرؓ سے نقل کیا کہ بنو ثور کا جب وفد عمرؓ کے پاس آیا تو انہوں نے ان سے پوچھا کہ مغرب کے متعلق کوئی خبر ہے؟ انہوں نے کہا ہاں! ہم نے ایک عرب کے آدمی کو پکڑا جو اسلام لانے کے بعد کافر ہو گیا تھا ہم نے اسے آگے بڑھایا اور اس کی گردن مار دی، حضرت عمرؓ نے فرمایا تم نے اسے کسی گھر کے اندر قید کیوں نہ کر دیا کہ تین دن تک روزانہ اس کی طرف ایک روٹی ڈال دیا کرتے اور اس سے توبہ کرانے کی کوشش کرتے شاید وہ توبہ کر لیتا یا اللہ کے حکم کی طرف مراجعت کر لیتا اے اللہ! میں نہ اس واقعہ میں موجود تھا نہ میں نے اس کا حکم دیا اور جب یہ بات مجھ تک پہنچی نہ اس پر راضی ہوا۔ اسے امام مالکؒ نے موطا میں بیان کیا ہے (زیلعی ج ۲ ص ۱۵۹) اور امام ابو یوسفؒ نے کتاب الخراج ص ۲۱۲) میں اور وہ مرسل ہے اسی کو عبد الرزاق نے معمر اور ابن ابی شیبہ سے نقل کیا انہوں نے ابن عیینہ سے، دونوں نے محمد بن عبد الرحمن بن عبد، قاری سے انہوں نے اپنے والد سے اور اس سند سے یہ متصل ہے کیونکہ عبد الرحمن بن عبد نے حضرت عمرؓ سے سنا ہے (الجواہر النقی ج ۲ص۱۷۳) اور اس کو بیہقی نے حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے کہ جب تستر (ایک مقام ہے) پر اترے اسی میں ہے تو ہم حضرت عمرؓ کے پاس گئے تو آپ نے فرمایا کہ بکر بن وائل کی ان چھ آدمیوں کی جماعت کا کیا ہوا جو اسلام سے مرتد ہو کر مشرکین سے جا ملے تھے تو حضرت انسؓ نے کہا کہ اے امیر المومنین! وہ معرکہ میں قتل ہو گئے تو آپ نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا۔ تو میں نے کہا کہ کیا قتل کے سوا ان کی کوئی اور بھی سبیل تھی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا ہاں میں تو ان پر اسلام پیش کرتا۔ اگر وہ انکار کر دیتے تو میں انہیں قید خانے میں بند کر دیتا۔ اسے حافظؒ نے التلخیص الحبیر (ج ۲ ص ۲۵۰) میں بیان کیا ہے اور اس سے سکوت فرمایا ہے۔ لہٰذہ یہ حدیث حسن یا صحیح ہے۔ اور اسے سند کے ساتھ ابن حزم نے محلیٰ (ج ۱ ص ۱۹۱) میں بیان کیا ہے کہ ہم سے عبد اللہ بن ربیع نے حدیث بیان کی انہوں نے کہا کہ ہم سے عبد اللہ بن محمد بن عثمان نے حدیث بیان کی کہ ہم سے علی بن عبد العزیز نے، انہوں نے کہا کہ ہم سے حجاج بن منہال نے کہ ہم سے حماد بن سلمہ نے حدیث بیان کی کہ ہمیں داؤد یعنی ابن ابی ہند نے شعبی سے خبر دی انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے اور اسی حدیث کو صحیح کہا ہے۔"

یہ ایک ہی واقعہ یا دو واقعے ہیں۔ حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ایک ہی واقعہ قرار دیا ہے۔ لیکن بظاہر یہ دو الگ الگ واقعے معلوم ہوتے ہیں۔ ایک واقعہ عبد اللہ بن عبد۔ قاری نے کسی ایک آدمی کا نقل کیا ہے اور دوسرا واقعہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بکر بن وائل کے چھ آدمیوں کا بیان کیا ہے۔ بہر حال یہ ایک ہی واقعہ ہو یا دو واقعے ہوں حضرت عمرؓ نے مرتد کو قتل کرنے کا انکار فرمایا ہے اور قید کرنے کا حکم بیان فرمایا ہے، چنانچہ اس حدیث کو نقل فرمانے کے بعد حضرت شیخ الاسلام علامہ ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

قلت استدل به بعض العلماء علی ان المرتد یستتاب ابدا ولا یقتل ویودع السجن لما ورد فی روایة البیھقی من قوله فان ابوا اودعتھم السجن ولا حجة لھم فیه فقد ورد فی مرسل محمد ابن عبداللہ القاری عند مالک تقیید الحبس بثلثة ایام والطرق یفسر بعضھا بعضا فعلیه یحمل مافی روایة انس عند البیھقی وغیرہ من اید اعھم السجن بالاطلاق فان المطلق یحمل علی المقید اذا کان مخرج الحدیث واحدا ومو اسیل مالک موصولة محتج بھا کما مرفی المقدمة۔ (اعلاء السنن ج ۱۲ ص ۴۳۴)

"میں کہتا ہوں کہ اس حدیث سے بعض علماء نے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ مرتد سے ہمیشہ توبہ ہی کرانے کی کوشش کی جائے گی اور اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔ اسے قید خانہ میں ڈال دیا جائے گا۔ کیونکہ بیہقی کی روایت میں آگیا ہے کہ اگر وہ انکار کرتے تو میں انہیں قید خانے میں ڈال دیتا۔ اور اس میں ان لوگوں کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے۔ کیونکہ محمد بن عبد اللہ عبد۔ قاری کی روایت میں جو امام مالکؒ نے نقل فرمائی ہے تین دن تک قید میں ڈال دینے کی قید آگئی ہے اور حدیث کے طریقے ایک دوسرے کی تفسیر کر دیتے ہیں تو بیہقی

وغیرہ میں جو حضرت انسؓ کی روایت آئی ہے یعنی مطلقاً قید خانے میں ڈال دینے کی روایت تو اسے مقید روایت یعنی تین دن تک قید میں ڈالنے والی روایت پر محمول کیا جائے گا۔ کیونکہ مطلق کو مقید پر محمول کیا جاتا ہے۔ جب احادیث کا مخرج ایک ہی ہو اور امام مالکؒ کی مراسیل موصول ہوتی ہیں اور ان سے احتجاج کیا جاتا ہے جیسا کہ ہم مقدمہ میں بیان کر چکے ہیں۔

افسوس ہے کہ میری سمجھ میں یہ تقریر بالکل نہیں آئی، اول تو دو طرح کی روایتوں کو ایک واقعہ سے متعلق قرار دینا خلاف ظاہر ہے۔ کیوں کہ محمد بن عبد اللہ بن عبد، قاری کی روایت میں جو واقعہ بیان کیا جا رہا ہے وہ عرب کے ایک آدمی کا ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں بنو وائل کے چھ آدمیوں کی جماعت کا واقعہ ہے جو ظاہر ہے کہ وہی واقعہ نہیں ہے جو محمد بن عبد اللہ بن عبد قاری نے بیان کیا تھا۔ اس کے بعد حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ارشاد بھی محل نظر ہے کہ چونکہ محمد بن عبد اللہ بن عبد کی روایت میں تین دن تک قید خانہ میں ڈال دینے کا بیان آ گیا ہے اور حضرت انسؓ کی روایت میں مطلقاً قید خانہ میں ڈال دینے کا بیان ہے لہٰذہ یہاں مطلق (حضرت انسؓ کی روایت) کو مقید (محمد بن عبد اللہ بن عبد۔ قاری) کی روایت پر محمول کیا جائے گا جس میں تین دن تک قید رکھنے کا ذکر ہے۔

یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کیونکہ مطلق روایت کو مقید روایت پر محمول کرنا شافعیہ کا مسلک تو ہے مگر حنفیہ کا مسلک نہیں ہے۔ اصول فقہ کی بنیادی درسی کتاب نور الانور میں ہے۔

والمطلق محمول علی المقید وان کا نا فی حادثتین عند الشا فعی ویعلم منه انهما ان کا نا فی حادثة واحدة فهو محمول علی المقید عنده۔ وعندنا لا یحمل المطلق علی المقید وان کا نا فی حادثة واحدة لا مکان العمل بهما اذلا تضاد ولا تنا فی بینهما فیکون فی الظهار الصیام والتحریر قبل التماس والطعام اعم من ان یکون قبل التماس او بعده واذ کان فی حادثة واحدة ففی الحادثتین بالطریق الاولی

(نور الانور ص ۱۵۸ تا ۱۵۹ مطبوعہ ایچ ایم سعید کمپنی کراچی)

"اور امام شافعیؒ کے نزدیک مطلق، مقید پر محمول ہو گا۔ اگرچہ وہ دونوں دو حادثوں کے متعلق ہوں اور اس سے معلوم ہو گیا کہ اگر دونوں ایک حادثہ کے متعلق ہوں تب بھی ان کے نزدیک مطلق۔ مقید پر ہی محمول ہو گا اور ہمارے نزدیک مطلق، مقید پر محمول نہیں ہوتا خواہ وہ دونوں ایک حادثے کے متعلق ہی کیوں نہ ہوں کیونکہ دونوں پر عمل ممکن ہے کیونکہ ان دونوں کے درمیان کوئی تضاد تنافی نہیں ہوتی۔ چنانچہ کفارہ ظہار میں روزے رکھنا اور غلام آزاد کرنا بیوی کو ہاتھ لگانے سے پہلے ضروری ہے اور کھانا کھلانے میں کوئی پابندی نہیں۔ وہ بیوی کو ہاتھ لگانے سے پہلے ہو سکتا ہے اور بعد میں بھی اور اگر مطلق اور مقید کا ایک حادثہ میں یہ حال ہے تو اگر وہ دو حادثوں میں واقع ہوں تو بطریق اولیٰ اسی پر عمل ہو گا۔

جبکہ فقہائے حنفیہؒ کا مسلک ہی یہ نہیں ہے کہ مطلق کو مقید پر محمول کیا جائے۔ چنانچہ کفارہ ظہار میں اگر روزے رکھ کر کفارہ ادا کرے یا غلام آزاد کر کے کفارہ ادا کرے تو اسے بیوی کو ہاتھ لگانے سے پہلے یہ کفارے ادا کرنے چاہئیں کیونکہ کفارہ کی آیت (المجادلہ: ۳ تا ۴) میں ان دونوں کفاروں کے ساتھ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ يَّتَمَآسَّا ؕ کی قید لگی ہوئی ہے اور مساکین کو کھانا کھلانے کے کفارہ میں (المجادلہ: ۴) یہ قید لگی ہوئی نہیں ہے بلکہ یہ حکم مطلق ہے۔ لہٰذہ اس کے خلاف حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کا یہ فرمانا کہ یہاں مطلق روایت کو مقید روایت پر محمول کر لیا جائے ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔

بہر حال امام مالکؒ کی روایت جو مرسل ہے وہ حضرت انسؓ کی روایت کا جو مسند ہے مقابلہ نہیں کر سکتی۔ حضرت انسؓ کی روایت کو ترجیح ہونی چاہیے۔ لہٰذہ بعض اہل علم کا استدلال کرنا ہمارے نزدیک صحیح ہے۔ حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے ان بعض اہل علم کا نام نہیں بتایا جنہوں نے یہ استدلال فرمایا ہے لیکن اجمالاً اتنا معلوم ہو گیا کہ سلف میں سے بعض اہل علم قتل مرتد کے قائل نہیں ہیں۔ وہ اسی کے قائل ہیں کہ مرتدین سے توبہ کرانے کی کوشش کی جائے گی ان کو قتل نہیں کیا جائے گا۔

حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ اسی سلسلہ میں آگے چل کر فرماتے ہیں کہ:

قال الموافق فی المغنی واجمع اهل العلم علی وجوب قتل المرتد روی ذالك عن ابی بکر وعمر وعثمان وعلی ومعاذ وابی موسیٰ وابن عباس وغیرهم ولم ینکر ذالك فکان اجماعاً وقال النخعی لیستتاب ابدا وهذا یفضی الی ان لا یقتل ابدا وهو مخالف للسنة والاجماع الخ۔

(ملخصاً ج ۱۰ ص ۷۴ تا ۷۷، اعلاء السنن ج ۱۲ ص ۴۳۴)

"موفق نے المغنی میں لکھا ہے کہ اہل علم نے مرتد کے قتل پر اجماع کیا ہے۔ چنانچہ حضرت ابو بکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، معاذ بن جبلؓ، ابو موسیٰ اشعریؓ، ابن عباسؓ وغیر ہم رضی اللہ عنہم سے ایسا ہی مروی ہے اور اس کا انکار نہیں کیا گیا تو یہ اجماع ہو گیا اور امام ابراہیم نخعیؒ نے فرمایا ہے کہ اس سے ہمیشہ توبہ کرائی جائے گی۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ مرتد کو کبھی بھی قتل نہیں کیا جا سکتا اور یہ قول سنت اور اجماع کے خلاف ہے۔"

صاحب مغنی اور دیگر فقہاء کا یہ ارشاد کہ اس مسئلہ پر کہ مرتد کو قتل کر دینا واجب ہے اجماع ہو چکا ہے محل نظر ہے جبکہ حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ

علیہ پہلے بعض اہل علم کا یہ قول نقل فرما چکے ہیں کہ مرتد سے ہمیشہ توبہ کرانے کی کوشش کی جائے گی اور اسے قتل نہیں کیا جا سکتا۔ نیز خود صاحب مغنی نے امام ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد نقل فرمایا ہے کہ وہ بھی توبہ کرانے کے قائل ہیں۔ قتل کر دینے کے قائل نہیں ہیں۔ حضرت امام ابراہیم نخعیؒ کبار تابعین میں سے ہیں اور حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ الاستاذ ہیں۔ کیونکہ امام ابو حنیفہ امام حماد کے شاگرد ہیں امام حماد، ابراہیم نخعیؒ کے شاگرد ہیں تو امام نخعیؒ جیسے امام اور فقیہ کے اس قول کے بعد اجماع کا دعویٰ کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔

ہم اس سے پہلے عرض کر چکے ہیں جو حضرات قتلِ مرتد کے قائل ہیں وہ اس مرتد کے قتل کے قائل ہیں جو محارب بھی ہو۔ لیکن جو محارب نہ ہو اس کو قتل کرنے کے قائل تو خود فقہائے حنفیہ بھی نہیں ہیں۔ چنانچہ ہم ہدایہ فتح القدیر اور عنایہ کے تصریحات سے پہلے بیان کر چکے ہیں کہ عورتوں، اندھوں کو، اپاہجوں کو، شیوخ فانی کو اگر وہ مرتد ہو جائیں خود فقہائے حنفیہ کے نزدیک بھی قتل نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس سے بغاوت اور محاربت کا اندیشہ ہی نہیں ہوتا۔

قتل مرتد کے سلسلہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت (بخاری) اور معاویہ بن حیدہ کی روایت (طبرانی کبیر) سے نقل کی جاتی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهٗ فَاقْتُلُوْهُ۔ (جو اپنا دین بدل دے اسے قتل کر دو) تو اس حدیث سے قتل مرتد پر استدلال کرنا صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس حدیث کا مآل تو یہ ہے کہ جو شخص بھی اپنا دین تبدیل کر لے اسے قتل کر دینا چاہیے۔ جو کفر و شرک سے توبہ کر کے مسلمان ہو جائے اسے بھی قتل کر دینا ضروری ہو۔ کیونکہ اپنا دین تو وہ بھی تبدیل کرتا ہے۔ جو یہودی یہودیت سے تائب ہو کر عیسائی ہو جائے اسے بھی قتل کر دو۔ کیونکہ وہ بھی اپنا دین تبدیل کر رہا ہے ظاہر ہے کہ حدیث نبوی کا یہ مقصد نہیں ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ دین کا لفظ عربی میں بہت سے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ازاں جملہ غلبہ، اقتدار، حکومت، مملکت، آئین، قانون، نظم ونسق، فیصلہ، ٹھوس نتیجہ، جزاء وسزا، بدلہ کے معنوں میں دوسری طرف یہ لفظ اطاعت اور فرماں برداری کے معنوں میں۔ بھی استعمال ہوتا ہے

(تاج العروس ومحیط المحیط)

قرآن کریم میں بھی دین کا لفظ ان تمام معنوں میں استعمال ہوا ہے حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں نظام معاشرہ، ضابطۂ زندگی، قانون حکومت، آئین مملکت، نظم اجتماعی، عدل وغیرہ کی مختلف اصطلاحات رائج ہیں۔ لیکن قرآن کریم نے ان سب کی جگہ ایک جامع اصطلاح دی ہے اور وہ ہے "الدین" یہی ہمارے معاشرہ کا نظام، ہماری زندگی کا ضابطہ، ہماری حکومت کا قانون اور ہماری مملکت کا آئین ہے۔

لہٰذہ جو فرد بھی ہمارے معاشرے کا نظام، ہماری زندگی کا ضابطہ، ہماری حکومت کا قانون اور ہماری مملکت کا آئین بدلنے کی کوشش کرے اور ملک میں بغاوت، انارکی اور فتنہ وفساد پھیلائے اس کی سزا قتل ہے اور یہ قرآن کریم کے عین مطابق ہے:

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ؕ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۳۳﴾ (المائدہ:۳۳)

"ان لوگوں کی جزاء جو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کریں اور زمین میں فساد پھیلانے کی کوشش کریں صرف یہی ہے کہ انہیں بری طرح قتل کیا جائے انہیں پھانسی دیدی جائے، ان کے ہاتھ پاؤں مخالف جہت سے کاٹ دیئے جائیں، انہیں سرزمین اسلام سے ملک بدر کر دیا جائے۔ ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور ان کے لیے آخرت میں بھی بڑا عذاب ہے۔"

لہٰذہ جو شخص اپنے دین کو اس معنی میں بدلنا چاہے یعنی اسلامی معاشری نظام، اسلامی ضابطہ زندگی، اسلامی قانون حکومت، اسلامی آئینِ مملکت کو بدلنے کی کوشش کرے اور ملک میں فتنہ وفساد پھیلا کر بغاوت کا ارتکاب کرے اس کو قتل کر دینا واجب ہے۔

اس حدیث کا یہ مطلب لینا اس لیے ضروری ہے کہ اسی طرح اس ارشاد نبوی کو (اگر یہ واقعی ارشاد نبوی ہے اور اس کا ارشاد نبوی ہونا ثابت ہو جائے) قرآن کریم کی تصریحات اور نصوص صریحہ سے جن کو ہم شروع باب میں بیان کر چکے ہیں تطبیق دی جا سکتی ہے اس کے علاوہ صحیحین (بخاری و مسلم) اور حدیث کی باقی کتابوں میں ایسی واضح احادیث بھی ملتی ہیں جن میں صرف دین بدل دینے کو تعزیری جرم قرار نہیں دیا بلکہ اسے محاربہ (بغاوت) کے ساتھ مشروط کیا ہے۔ اس کے لیے کہیں حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اور کہیں اَلْفَارِقَ لِلْجَمَاعَةِ (دشمن سے جا ملنے) کے۔ یہ احادیث بھی متعدد صحابہ وصحابیات سے مروی ہیں جو حضرت ابن عباس سے کہیں زیادہ بلند پایہ ہیں۔ ظاہر ہے ایک ہی موضوع سے متعلق روایات کو یکجا کر کے اور ان کے تمام الفاظ کو سامنے رکھ کر نتیجہ نکالنا چاہیے کیونکہ کوئی راوی کسی نکتہ کو چھوڑ دیتا ہے اور کسی راوی سے کوئی دوسری تفصیل رہ جاتی ہے۔ روایات قرآن مجید کی طرح لفظاً لفظاً تو محفوظ ہیں نہیں اس لیے حقیقت تک رسائی کے لیے تمام روایات پر نگاہ رکھنا نہایت ضروری ہے۔ بہر حال اب وہ

روایات ملاحظہ ہوں جن میں محاربہ کی شرط ہے۔

صحیح بخاری میں حضرت ابو قلابہ کی حدیث ہے۔

حدثنی سلمان ابورجاء مولی ابی قلابہ فقال (عمر بن عبد العزیز) ما تقولیا عبد اللہ بن زید قلت ما علمت نفسا حل قتلھا فی الاسلام الا رجل زنی بعد احصان اوقتل فسا بغیر نفس اوحارب اللہ ورسولہ ﷺ (بخاری کتاب التفسیر انما جزاء الذین یحاربون اللہ ج ۲ ص ۶۶۳ مطبوعہ نور محمد آرام باغ کراچی۔)

"مجھ سے سلمان ابورجاء ابو قلابہؓ کے آزاد کردہ غلام نے بیان کیا کہ ابو قلابہؓ سے عمرؒ بن عبد العزیز نے پوچھا کہ اے عبد اللہ بن زید تم کیا کہتے ہو تو میں نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں کہ اسلام میں کسی کی جان کو قتل کرنا جائز ہو بجز اس کے کہ کسی نے شادہ شدہ ہونے کے بعد زنا کیا ہو یا کسی جان کو بلا قصاص کے قتل کر دیا ہو یا اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے جنگ کی ہو۔"

نیز بخاری ہی میں حضرت ابو قلابہ کی حدیث ہے کہ:

حدثنی ابو قلابہ (فی حدیث طویل) فواللہ ما قتل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احدا الافی احدی ثلث خصال رجل قتل بجریرۃ نفسہ فقتل او رجل زنی بعد احصان، او رجل حارب اللہ ورسولہ وارتد من الاسلام، (بخاری کتاب الدیات، باب القسامۃ ج ۲ ص ۱۰۱۸)

"مجھ سے ابو قلابہ نے (ایک طویل حدیث میں) بیان کیا کہ اللہ کی قسم رسول اللہ ﷺ نے تین صورتوں کے علاوہ کسی کو قتل نہیں کیا۔ ایک تو آدمی جس نے اپنے ذاتی جرم سے کسی کو قتل کر دیا اور اس کے بدلے میں قتل کر دیا گیا یا کسی آدمی نے شادی شدہ ہونے کے بعد زنا کر لیا یا کسی شخص نے اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کی اور اسلام سے مرتد ہو گیا۔"

نیز حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ۔

عن عائشۃ قالت قال رسول اللہ ﷺ لا یحل دم امری مسلم یشھد ان لا الہ الا اللہ وان محمد رسول اللہ الا احدی ثلث رجل زنی بعد احصان فانہ یرحم ورجل خرج محاربا باللہ ورسول فانہ یقتل اویصلب اوینفی اویقتل نفسا فیقتل بھا۔

(ابو داؤد کتاب الحدود، باب الحکم فی من ارتد، ج ۲ ص ۵۹۸)

"حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کسی مسلمان آدمی کا خون حلال نہیں جو لا الہ اللہ اور محمد رسول اللہ کی شہادت دیتا ہو مگر تین صورتوں میں سے کسی ایک صورت میں کسی آدمی نے شادی شدہ ہونے کے بعد زنا کیا ہو تو اسے رجم کیا جائے گا۔ (دو) کسی نے اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرنے کے لیے خروج کیا ہو تو اسے قتل کیا جائے گا۔ یا سولی پر چڑھایا جائے گا یا ملک بدر کر دیا جائے گا (تین) کسی نفس کو قتل کر دیا ہو تو اسے اس کے بدلے میں قتل کر دیا جائے گا۔

نسائی میں اسی حضرت عائشہؓ کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

عن عائشۃ۔۔۔۔ اور جل یخرج من الاسلام فیحارب اللہ عز وجل ورسولہ فیقتل اویصلب اوینفی من الارض۔

(نسائی کتاب المحاربۃ باب الصلب ج ۲ ص ۱۶۱ مطبوعہ مطبعہ سلفیہ لاہور)

"حضرت عائشہؓ سے روایت ہے.... یا کوئی آدمی اسلام سے خارج (مرتد) ہو جائے اور اللہ عز وجل اس کے رسول سے جنگ کرے تو اسے قتل کیا جائے گا یا پھانسی دی جائے گی یا سرزمین اسلام سے ملک بدر کر دیا جائے گا۔"

نیز صحیح بخاری میں حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ:

عن عبد اللہ (بن مسعود رضی اللہ عنہ) قال قال رسول اللہ ﷺ لا یحل دم امری مسلم یشھد ان لا الہ الا اللہ وانی رسول اللہ الا باحدی ثلث النفس بالنفس والثیب الزانی والمفارق لدینہ التارك للجماعۃ۔

(بخاری کتاب الدیات باب قول اللہ ان النفس بالنفس ج ۲ ص ۱۰۱۶)

"حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کسی مسلمان آدمی کا خون حلال نہیں ہے جو اس بات کی شہادت دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں مگر تین وجہوں میں کسی وجہ میں ایک تو جان کے بدلے جان دوسرے شادی شدہ زناکار اور تیسرے اپنے دین کو چھوڑ دینے اور جماعت سے الگ ہو جانے والا۔"

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی یہ روایت مسلم کتاب القسامۃ والمحاربین والقصاص والدیات ص ۹۳ میں اور سنن ابو داؤد کتاب الحدود باب الحکم من ارتد میں ج ۲ ص ۵۹۸ اور جامع ترمذی ابوب الدیات باب ما جاء لایحل دم امری مسلم ج ۱ ص ۲۲۱ میں بھی ہے۔

حارب اللہ ورسولہ کے ذیل میں ہر شخص آجاتا ہے جو تلوار سے جنگ کرتا ہو۔ زبان سے اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کرتا ہو یا کوئی ایسی حرکت کرتا ہو جس کا مقصد اسلامی ریاست کی تخریب ہو مثلاً دوسروں کو جنگ پر اکسانا، مسجد ضرار بنانا، یا اس کی تیاری میں دشمن کی مدد کرنا، جاسوسی کرنا وغیرہ۔

بحث غالباً نامکمل رہ جائے گا اگر اس سلسلے میں ان دلائل پر بحث نہ کی جائے جو ہمارے بعض علمائے کرام نے اس موضوع پر قرآن کریم سے پیش فرمائے ہیں۔ عرصہ دراز ہوا مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے اپنے روزنامہ ہمدرد میں قتل مرتد کے خلاف مضامین لکھے تھے اور ثابت کیا تھا کہ قرآن نے قتل مرتد کا حکم کہیں نہیں دیا تو ہمارے محترم شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے ان کے جواب میں ایک کتابچہ تحریر فرمایا تھا، جس میں مولانا عثمانی مرحوم نے

قتل مرتد پر قرآن کی اس آیت کریمہ سے استدلال فرمایا تھا جو سورہ بقرہ میں بنی اسرائیل کی بداعمالیوں کے سلسلے میں وارد ہوئی ہے کہ:

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ؕ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۴﴾

(البقرہ:۵۴)

"اور یاد کرو! جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا تھا۔ اے میری قوم تم نے گوسالہ بنا کر اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے تو اپنے پیدا کرنے والے کے سامنے توبہ کرو، پھر اپنی جانوں کو قتل کرو، تمہارے پیدا کرنے والے کے نزدیک یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔ تو اللہ نے تم پر جو توجہ فرمائی (توبہ قبول کرلی) یقیناً وہ توبہ قبول کرنے والا بڑا مہربان ہے۔

حضرت مولانا شبیر احمد صاحب کا استدلال یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے گوسالہ پرستی کر کے کفر کا ارتکاب کیا تھا اور وہ مرتد ہو گئے تھے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو قتل کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ جن لوگوں نے گوسالہ پرستی نہیں کی وہ ان لوگوں کو قتل کریں جنہوں نے گوسالہ پرستی کی ہے۔ لہٰذہ مرتد کی سزا قتل ہوگئی۔

حق تعالیٰ مجھے اور حضرت مولانا مرحوم کو معاف فرمائیں۔ مولانا نے اس پر غور نہیں فرمایا کہ یہ حکم بنی اسرائیل کو دیا گیا تھا۔ مسلمانوں کو یہ حکم نہیں دیا گیا ہے۔ اس آیت کریمہ میں تو یہ فرمایا گیا ہے کہ یہ لوگ پہلے تو توبہ کریں اور پھر قتل کر دیئے جائیں۔ اسلام میں مرتد کے متعلق کوئی فقیہ بھی اس کا قائل نہیں ہے کہ مرتد پہلے توبہ بھی کرلے اور اس کے بعد اس کو قتل بھی کر دیا جائے۔ پوری امت کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ اگر مرتد توبہ کرے تو ارتداد کا گناہ معاف ہو جاتا ہے اور پھر اس کو قتل نہیں کیا جاسکتا۔

نیز اس کا ایک مطلب یہ بھی لیا گیا ہے کہ حق تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے ان لوگوں کے لیے جو گوسالہ پرستی کے مرتکب ہوئے تھے توبہ کی یہی صورت تجویز فرمائی تھی کہ وہ اپنی آپ کو قتل کے لیے پیش کریں اور آیت کا یہ ترجمہ ہے کہ "تم اپنے خالق کے سامنے توبہ کرو۔ لہٰذہ اپنے نفسوں کو قتل کرو۔" توبہ کی یہ صورت کہ لوگ اپنے جانوں کو قتل کریں اسلام میں نہیں ہے۔ ہمارے یہاں توبہ کی صرف یہ صورت ہے کہ آدمی نادم ہو جائے اور آئندہ کے لیے دوبارہ اس گناہ کا ارتکاب نہ کرنے کا عزم صمیم کرلے۔ اسلام میں توبہ کی یہ صورت نہیں جو بنی اسرائیل کے لیے تھی۔

بنی اسرائیل کے لیے حق تعالیٰ نے جہاں اور بہت سے سخت احکام نازل فرمائے تھے انہی میں سے ایک یہ حکم بھی تھا جو آج نافذ العمل نہیں ہے۔ لہٰذہ اس سے قتلِ مرتد کا حکم نکالنا ناقابل فہم ہے۔

اسی سلسلے میں مولانا ابو الاعلیٰ مودودی صاحب نے بھی ایک مستقل کتاب لکھی۔ "مرتد کی سزا اسلامی قانون میں" جس میں انہوں نے "قتل مرتد کا ثبوت قرآن سے" کا عنوان قائم فرما کر سورہ توبہ کی آیت (التوبہ:۱۲) اپنی دلیل میں پیش فرمائی ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس سلسلہ کی پوری آیتیں پیش کر دیں تاکہ ناظرین خود فیصلہ کر سکیں کہ مولانا مرحوم کا استدلال کس قدر خلاف واقعہ ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۷﴾ كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ؕ يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ ۚ وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۸﴾ اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹﴾ لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ ﴿۱۰﴾ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ؕ وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۱۱﴾ وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ﴿۱۲﴾ اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ اَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳﴾ (التوبہ:۷تا۱۳)

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ (ان) مشرکوں کا عہد اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک عہد ہو؟ ہاں جن لوگوں کے ساتھ تم نے مسجد حرام کے قریب (حدیبیہ میں) عہد وپیمان باندھا تھا (اور انہوں نے اسے نہیں توڑا) تو (ان کا عہد ضرور عہد ہے اور) جب تک تمہارے ساتھ (اپنے عہد پر) قائم رہیں تم بھی ان کے ساتھ (اپنے عہد پر) قائم رہو۔ اللہ انہیں دوست رکھتا ہے جو (اپنے تمام کاموں میں) متقی ہوتے ہیں، ان مشرکوں کا عہد کیونکر عہد ہو سکتا ہے جبکہ ان کا حال یہ ہے کہ اگر آج تم پر غلبہ پا جائیں تو نہ تو تمہارے لیے قرابت کا پاس کریں نہ کسی عہد وپیمان کا۔ وہ اپنی باتوں سے تمہیں راضی کرنا چاہتے ہیں مگر ان کے دلوں کا فیصلہ اس کے خلاف ہے اور ان میں زیادہ تر ایسے ہی لوگ ہیں جو فاسق ہیں (یعنی راستبازی کے تمام طریقوں اور پابندیوں سے باہر ہو چکے ہیں) ان لوگوں نے اللہ کی آیتیں ایک بہت ہی حقیر قیمت پر بیچ ڈالیں (یعنی ہوائے نفس کے

تابع ہوگئے اور اللہ کی آیتوں پر یقین نہیں کیا) پس اس کی راہ سے لوگوں کو روکنے لگے (افسوس ان پر) کیا ہی برا ہے جو یہ لوگ کرتے رہے ہیں! کسی مومن کے لیے نہ تو قرابت کا پاس کرتے ہیں نہ عہد و قرار کا، یہی لوگ ہیں کہ ظلم میں حد سے گزر گئے ہیں۔ بہر حال اگر یہ باز آئیں، نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں تو (پھر ان کے خلاف تمہارا ہاتھ نہیں اٹھنا چاہیے وہ) تمہارے دینی بھائی ہوگئے ان لوگوں کے لیے جو جاننے والے ہیں۔ ہم اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان کر دیتے ہیں۔ اور اگر یہ اپنے عہد و پیمان جو خود کر چکے ہیں توڑ ڈالیں اور تمہارے دین کو برا بھلا کہیں تو پھر اس کے سوا چارہ نہیں کہ ان کفر کے سرداروں سے جنگ کرو۔ یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کی سوگند سوگند نہیں (اور تمہیں جنگ اس لیے کرنی چاہیے) تا کہ یہ (ظلم و بد عہدی سے) باز آجائیں۔ (مسلمانوں!) کیا تم ایسے لوگوں سے جنگ نہیں کرتے جنہوں نے اپنے عہد و پیمان کی قسمیں توڑ ڈالیں جنہوں نے اللہ کے رسول کو اس کے وطن سے نکال باہر کرنے کے منصوبے کیے اور پھر تمہارے بر خلاف لڑائی میں پہل بھی انہی کی طرف سے ہوئی؟ کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ (اگر ڈرتے ہو تو تم مومن نہیں۔ کیونکہ) اگر مومن ہو تو اللہ اس بات کا زیادہ سزاوار ہے کہ اس کا ڈر تمہارے دلوں میں بسا ہو۔" (تفسیر ترجمان القرآن مولانا آزاد مرحوم ج۲ ص ۷۷)

ہم نے آیات مذکورہ بالا کا ترجمہ خود نہیں کیا بلکہ مولانا ابو الکلام آزاد کا ترجمہ پیش کیا ہے اس میں آپ ملاحظہ فرمائیں کہ بات مشرکین کی ہو رہی ہے اور ابتداء اس فقرہ سے ہوئی ہے کہ "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ان مشرکوں کا عہد اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک عہد ہو؟ ان مشرکین عرب میں تین طرح کے لوگ تھے۔ ایک وہ جن سے مسلمانوں کا کوئی معاہدہ نہیں تھا۔ دوسرے وہ جن سے مسلمانوں کا معاہدہ تھا اور انہوں نے عہد شکنی کا ارتکاب کیا تھا۔ ان دونوں جماعتوں کے متعلق حج کے موقعہ پر جب سارے مشرک قبائل کے نمائندے مکہ معظمہ میں جمع تھے اعلان کرایا گیا کہ ان لوگوں کو چار مہینے کی مہلت ہے وہ آزادی سے نقل و حمل کر سکتے ہیں اور امن کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ لیکن چار مہینے کے بعد مسلمان ان سے بر سر جنگ ہوں گے۔ تیسرا گروہ وہ تھا جن سے مسلمانوں کے معاہدے تھے اور انہوں نے کوئی عہد شکنی نہیں کی تھی۔ ان کے متعلق ارشاد ہوا کہ جب تک وہ اپنے معاہدوں پر قائم ہیں تم بھی قائم رہو۔ ان سے تمہاری کوئی جنگ نہیں ہے۔ لیکن اگر یہ لوگ بھی عہد شکنی کا ارتکاب کریں اور تمہارے دین میں طعن کریں تو کفر کے ان سرغنوں سے تمہیں جنگ کرنی چاہیے۔ انہی کے متعلق ارشاد فرمایا گیا ہے کہ تمہیں ان لوگوں سے جنگ کرنے میں کونسی چیز مانع ہے۔ یہی تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے معاہدوں کو توڑا ہے (واضح رہے کہ صلح حدیبیہ میں دس سال کے لیے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ ہوا تھا۔ بنو خزاعہ مسلمانوں کے حلیف تھے اور بنو بکر مشرکین قریش کے حلیف تھے۔ بنو بکر نے دو سال بعد ہی بنو خزاعہ پر حملہ کیا۔ بنو خزاعہ نے حرم میں پناہ لی مگر بنو بکر نے انہیں وہاں بھی قتل کر دیا اور قریش مکہ نے عہد نامے کے خلاف بنو بکر کی مدد کی جس کی وجہ سے آنحضرت ﷺ کو ۸ھ میں مکہ معظمہ پر لشکر کشی کرنی پڑی اور مکہ معظمہ فتح ہو گیا) اور اللہ کے رسول کو اس وطن سے نکالا ہے اور جنگ میں انہوں نے ہی پہل کی ہے۔

سورۂ توبہ کی ابتدائی تیس چالیس آیتیں انہیں مشرکین سے متعلق ہیں جس کا اعلان حضور اکرم ﷺ نے ۹ھ میں حج کے موقعہ پر امیر الحج حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے کرایا تھا اور یہ مشرکین عرب کے خلاف اعلانِ جنگ تھا جس کی ابتداء ان الفاظ سے ہوئی ہے:

(مسلمانو!) جن مشرکوں کے ساتھ تم نے صلح (وامن کا) معاہدہ کیا تھا۔ اب اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے بری الذمہ ہونے کا ان کے لیے اعلان ہے کہ چار مہینے تک ملک میں چلو پھرو (کوئی روک ٹوک نہیں) اس کے بعد جنگ کی حالت قائم ہو جائے گی۔ (التوبہ: ۱تا۲)

(ترجمان القرآن ج۲ ص ۴۷ مولانا آزاد)

اس پوری تفصیل سے آپ نے دیکھ لیا کہ آیات مذکورہ بالا کا تعلق مسئلہ ارتداد سے دور کا بھی نہیں ہے بلکہ یہ صراحتہً عرب کے مشرکین سے متعلق ہیں جنہوں نے عہد شکنی کا ارتکاب کیا تھا۔ لیکن مودودی صاحب اپنی کتاب "مرتد کی سزا اسلامی قانون میں" آیات (۱۱-۱۲) نقل فرما کر ان کا ترجمہ یوں فرماتے ہیں:

پھر اگر وہ (کفر سے) توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں۔ ہم اپنے احکام ان لوگوں کے لیے واضح طور پر بیان کر رہے ہیں جو جاننے والے ہیں لیکن اگر وہ عہد یعنی قبول اسلام کا عہد (کرنے کے بعد اپنی قسموں کو توڑ دیں اور تمہارے دین پر زبان طعن دراز کریں تو پھر کفر کے لیڈروں سے جنگ کرو۔ کیونکہ ان کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں شاید وہ اس طرح باز آجائیں۔

یہ ترجمہ فرمانے کے بعد مودودی صاحب اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ:

"یہ آیات سورہ توبہ میں جس سلسلے میں نازل ہوئی ہیں وہ یہ ہے کہ ۹ھ میں حج کے موقع پر اللہ تعالی نے اعلانِ برأت کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس اعلان کا

مفاد یہ تھا کہ جو لوگ اب تک خدا اور رسول سے لڑتے رہے ہیں اور ہر طرح کی زیادتیوں اور بدعہدیوں سے خدا کے دین کا راستہ روکنے کی کوشش کرتے رہے ہیں ان کو اب زیادہ سے زیادہ چار مہینے کی مہلت دی جاتی ہے۔ اس مدت میں وہ اپنے معاملے پر غور کر لیں۔ اسلام قبول کرنا ہو تو اسلام قبول کر لیں۔ معاف کر دیئے جائیں گے۔ ملک چھوڑ کر نکلنا چاہیں تو نکل جائیں، مدت مقررہ کے اندر ان سے تعرض نہیں کیا جائے گا اس کے بعد جو لوگ ایسے رہ جائیں گے جنہوں نے نہ اسلام قبول کیا ہو نہ ملک چھوڑا ہو ان کی خبر تلوار سے لی جائے گی۔ اس سلسلے میں فرمایا گیا کہ اگر وہ توبہ کر کے ادائے نماز و زکوٰۃ کے پابند ہو جائیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں۔ لیکن اگر اس کے بعد وہ پھر اپنا عہد توڑ دیں تو کفر کے لیڈروں سے جنگ کی جائیگی۔ یہاں عہد شکنی سے مراد کسی طرح بھی سیاسی معاہدات کی خلاف ورزی نہیں لی جا سکتی۔ بلکہ سیاق عبارت صریح طور پر اس کے معنے "اقرارِ اسلام سے پھر جانا" متعین کر دیتا ہے اور اس کے بعد فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ کے معنے اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتے کہ تحریک ارتداد کے لیڈروں سے جنگ کی جائے۔"

(مرتد کی سزا اسلامی قانون میں ص۹ تا ۱۰)

آیت مذکورہ بالا میں یہ الفاظ آئے تھے وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ "اور اگر وہ معاہدہ کے بعد اپنی قسموں کو توڑ دیں" مگر مودودی صاحب نے اس کا ترجمہ یوں فرمایا ہے "اگر وہ عہد (یعنی قبول اسلام کا عہد) کرنے کے بعد اپنی قسموں کو توڑ دیں" اس آیت کریمہ میں "عہد" سے مراد اگر قبول اسلام کا عہد تو نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ سے کیا مراد ہو گا؟ مولانا کو یہ بھی بتانا چاہیے تھا کہ اقرار اسلام کا عہد کرنے کے بعد دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے لیے قسمیں کھانا ضروری ہوتا ہے۔ نیز یہ کہ اگر قسمیں کھانا بھی ضروری ہے تو کتنی قسمیں کھانا ضروری ہیں؟ کیونکہ آیت کریمہ میں ایمانھم (جمع کے صیغے کے ساتھ آیا ہے) یہاں ایک قسم کو توڑنے کا ذکر نہیں ہے بلکہ متعدد قسموں کو توڑنے کا ذکر ہے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ صرف لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا اقرار ہی دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ اس کے بعد قسمیں کھانی بھی ضروری ہوتی ہیں۔ اگر ایسا ہے تو مولانا کو اس کا بیان کر دینا بھی ضروری تھا۔

اس کے بعد فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ کا فقرہ آیا ہے۔ اس میں فَقَاتِلُوْٓا باب مفاعلت سے امر کا صیغہ ہے جو مشارکت کو چاہتا ہے یعنی ایک دوسرے سے جنگ کرنا اور ایک دوسرے کو قتل کرنا لہٰذہ قاتلوا کے معنی تو یہ ہوں گے کہ ائمہ کفر بھی جنگ کریں گے اور مسلمان بھی جنگ کریں گے۔ دونوں ہی ایک دوسرے کو قتل کریں گے۔ اس کے معنے ائمہ کفر کو قتل کر دینے کے تو نہیں ہیں۔ اس کے معنے تو باہمی جنگ کرنے کے ہیں۔ جنگ میں دونوں فریق ایک دوسرے کو قتل کرتے ہیں۔ مرتدوں کو مسلمان قتل کریں اور مسلمانوں کو مرتد قتل کریں گے۔ تو مودودی صاحب کو یہ بھی بتانا چاہیے تھا کہ مرتد تو ارتداد کے جرم میں قتل ہوں گے مگر مسلمانوں کا وہ کونسا جرم ہو گا جس میں وہ قتل کئے جائیں گے۔

ساتھ ہی یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ اگر طرفین کی طرف سے جنگ ہو گی تو یہ مرتدین تو محاربین بن گئے اور محاربین کو تو قتل کرنے کے ہم بھی قائل ہیں۔ زیر بحث تو وہ مرتدین ہیں جو محاربین نہیں ہیں۔ یہ آیت کریمہ بجائے مودودی صاحب کی دلیل بننے کے خود ہماری دلیل بنی جا رہی ہے۔

پھر بقول مولانا "تحریک ارتداد کے لیڈروں سے جنگ کی جائے گی" تو کیا جو لوگ محض تحریک ارتداد کے ہمنوا یا متبع ہوں۔ لیڈر نہ ہوں تو کیا ان کا ارتداد اس قابل ہے کہ اس کا کوئی نوٹس نہ لیا جائے اور ان کو بالکل معاف کر دیا جائے؟

اس کے بعد قرآن کریم نے ان سے جنگ کرنے کی وجہ یہ بتائی تھی کہ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ (یعنی ان کے عہد و میثاق کا کوئی اعتبار نہیں۔) اگر ان کا جرم صرف ارتداد ہی تھا تو قرآن کریم کا یہ فرمانا کہ ان کے وعدوں کا کوئی اعتبار نہیں۔ بے معنی سی بات ہے کیونکہ جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں دائرہ اسلام سے خارج ہونے کا اگر یہاں تذکرہ ہوتا تو قرآن کریم اس کے بجائے اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ کے لَا اِيْمَانَ لَهُمْ فرماتا یعنی اب ان میں ایمان نہیں رہا۔ لیکن یہاں ایمان کا نہیں اَیمان (وعدوں) کا ذکر ہے۔

آخر میں قرآن کریم نے اس جنگ کا مقصد یہ بتایا تھا کہ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ (کہ شاید وہ اس طرح باز آجائیں) مولانا کے استدلال سے یہ نظر آرہا ہے کہ وہ جہاں لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ اور لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ میں فرق نہیں فرما رہے ہیں۔ ایسے ہی وہ فَقَاتِلُوْٓا اور فَاقْتُلُوْا میں بھی کوئی فرق نہیں سمجھ رہے لہٰذہ فَقَاتِلُوْٓا کے یہ معنے لیے جائیں کہ "مرتدین کو قتل کر دو" تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قتل کر دیئے جانے کے بعد ان کے باز آجانے کی توقع کے کیا معنے ہیں۔

پھر اس سے اگلی آیت میں دوبارہ وہی الفاظ آرہے ہیں۔ اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ (کیا تم ان لوگوں سے جنگ نہیں کرتے جنہوں اپنی قسمیں توڑ دیں ہیں) اس میں پھر وہی نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ کا لفظ رکھا ہوا ہے جس کے معنے مودودی صاحب نے اقرار اسلام یا قبول اسلام کے کئے ہیں۔ لیکن اس کے فوراً بعد وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ بھی آرہا ہے یعنی انہوں نے ہی تو رسول کو اس کے وطن سے باہر کرنے کے منصوبے کئے تھے۔ پھر انہوں نے ہی تمہارے خلاف لڑائی میں پہل کی تھی۔ یہاں مولانا کو یہ بھی

بتانا چاہیے تھا کہ مشرکین مکہ جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کو مکہ مکرمہ سے باہر کرنے کی منصوبہ بندی کی تھی اور جنہوں نے آپ سے جنگیں لڑنے میں پہل کی تھی وہ بھی (جیسا کہ آج تک سمجھا جاتا رہا ہے) مکہ کے مشرکین نہیں تھے۔ بلکہ وہ سب کے سب مسلمان ہو چکے تھے اور مسلمان ہو جانے کے بعد مرتد ہو گئے تھے۔ کیونکہ مولانا نَّکَثُوۡۤا اَیۡمَانَہُمۡ کا ترجمہ اس سے پچھلی آیات میں "عہد (یعنی قبول اسلام کا عہد) کرنے کے بعد اپنی قسموں کو توڑنے" یعنی مرتد ہو جانے" سے فرمایا ہے۔ ان الفاظ کا ترجمہ دونوں آیتوں میں وہی فرمانا چاہیے جو وہ ایک جگہ فرما چکے ہیں اور اگر وہ دونوں آیتوں میں اس لفظ کے ترجمہ میں فرق کرتے ہیں تو اس کی وجہ بھی بتانی چاہیے۔ اس آیت میں جن لوگوں کے متعلق یہ فرمایا گیا ہے کہ انہوں نے اپنی قسموں کو توڑ دیا ہے انہی کے متعلق دو اور جرائم بیان کئے گئے ہیں ایک تو یہ کہ انہوں نے اللہ کے رسول کو اس کے وطن سے نکال باہر کرنے کی منصوبہ بندی کی تھی اور دوسرے یہ کہ انہوں نے تمہارے ساتھ لڑائیوں میں پہل کی تھی۔ سوال یہ ہے کہ یہ لوگ جن کے متعلق قرآن کریم نے یہ تین جرائم شمار کرائے ہیں کیا اسلام لانے کے بعد مرتد ہو گئے تھے یا شروع سے مشرک ہی تھے؟ جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے وہ یہی ہے کہ یہ لوگ مشرکین مکہ تھے وہ ایک منٹ کے لیے کبھی مسلمان نہیں ہوئے تھے اگر مولانا کی تحقیق اس کے خلاف ہے تو مولانا کو اس تحقیق انیق کی پردہ کشائی بھی فرمادینی چاہیے تھی۔

باب الرجم

رجم اصل حد یا تعزیر؟

اس کے متعلق ہم نے ایک مستقل کتاب اسی نام سے اکتوبر ۱۹۸۱ء میں شائع کی ہے جس میں ہم نے تفصیل سے بتایا ہے کہ قرآن کریم سے کسی طرح بھی رجم کی سزا کا ثبوت نہیں ملتا۔ ہم نے اس میں سیر اور احادیث سے اسلام میں رجم کی تاریخ بیان کر کے بتایا ہے کہ زنا کے سلسلہ میں قرآن کریم میں سورہ نور کی ایک ہی آیت میں سزا کا بیان آیا ہے یعنی:

اَلزَّانِیَۃُ وَ الزَّانِیۡ فَاجۡلِدُوۡا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنۡہُمَا مِائَۃَ جَلۡدَۃٍ ۪ وَّ لَا تَاۡخُذۡکُمۡ بِہِمَا رَاۡفَۃٌ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اِنۡ کُنۡتُمۡ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ ۚ وَ لۡیَشۡہَدۡ عَذَابَہُمَا طَآئِفَۃٌ مِّنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۲﴾

(النور:۲)

"ہر زناکار عورت اور ہر زناکار مرد کو ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو۔"

اس آیت کریمہ میں الزانیۃ والزانی فقہائے حنفیہؒ کے اصول کے مطابق عام لفظ ہیں جو ہر زناکار کو شامل ہیں وہ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ، جوان ہو یا بوڑھا، عورت ہو یا مرد، آزاد ہو یا غلام، یہ الفاظ سب کو شامل ہیں اور کلمہ عام فقہائے حنفیہ کے نزدیک قطعی ہوتا ہے جس کی تخصیص کسی غیر قطعی نص سے نہیں کی جا سکتی۔ جو احادیث رجم کے ثبوت میں پیش کی جاتی ہیں وہ سب کی سب ظنی اور غیر قطعی ہیں ان کی وجہ سے سورۃ نور کی آیت کریمہ کو غیر شادی شدہ زانیوں کے لیے خاص نہیں کیا جا سکتا۔

چنانچہ علامہ ڈاکٹر محمد ادیب صالح تفسیر النصوص میں فرماتے ہیں کہ:

وبناء علی ھذا نقل الینا اجماعھم علی اجراء قولہ تعالی "اَلزَّانِیَۃُ وَ الزَّانِیۡ" (النور:۲) وَ السَّارِقُ وَ السَّارِقَۃُ (المائدہ:۳۸) "وَ مَنۡ قُتِلَ مَظۡلُوۡمًا (بنی اسرائیل:۳۳) وَ ذَرُوۡا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰۤوا (البقرہ:۲۷۸) "وَ لَا تَقۡتُلُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ ؕ" (النساء:۲۹) لَا تَقۡتُلُوا الصَّیۡدَ وَ اَنۡتُمۡ حُرُمٌ ؕ (المائدہ:۹۵) وقولہ علیہ الصلوٰۃ والسلام "لَا وَصِیَّۃَ لِوَارِثٍ" اور "مَنۡ اَلۡقَی السِّلَاحَ فَھُوَ اٰمِن.... الی غیر ذالك مما لا یحصیٰ علی العموم

(ج ۲ ص ۱۳۰ تفسیر النصوص)

"اسی بناء پر فقہاء کا اجماع ہمارے سامنے نقل کیا گیا ہے کہ آیات ذیل اَلزَّانِیَۃُ وَ الزَّانِیۡ" (النور:۲) وَ السَّارِقُ وَ السَّارِقَۃُ (المائدہ:۳۸) "وَ مَنۡ قُتِلَ مَظۡلُوۡمًا (بنی اسرائیل:۳۳) وَ ذَرُوۡا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰۤوا (البقرہ:۲۷۸) "وَ لَا تَقۡتُلُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ ؕ" (النساء:۲۹) لَا تَقۡتُلُوا الصَّیۡدَ وَ اَنۡتُمۡ حُرُمٌ ؕ (المائدہ:۹۵) اور نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد "لَا وَصِیَّۃَ لِوَارِثٍ" اور "مَنۡ اَلۡقَی السِّلَاحَ فَھُوَ اٰمِن وغیرہ وغیرہ بے شمار آیات واحادیث سب کو عموم پر منطبق کیا جائے گا۔

اس تصریح سے معلوم ہو گیا کہ تمام فقہائے کرام نے متفقہ طور پر اَلزَّانِیَۃُ وَ الزَّانِیۡ کو عام تسلیم کیا ہے کہ بلکہ اس پر ان کا اجماع ہے اور عام کے متعلق حکم یہی ہے کہ وہ قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت ہوتا ہے جس کی تخصیص ظنی دلائل سے نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ علامہ ڈاکٹر محمد ادیب صالح دمشقی آگے چل کر فرماتے ہیں کہ:

فالحنفیۃ لا یجیزون ھذا التخصیص، لان العام من الکتاب والسنۃ والمتواتر قطعی فی ثبوتہ وفی دلالتہ۔ والقطعی لا یصح تخصیصہ بالظنی قال عبد العزیز البخاری العام من الکتاب والسنۃ المتواترۃ لا یحتمل الخصوص ای لا یجوز تخصیصہ بخبر الواحد والقیاس لانھما ظنیان فلا یجوز تخصیص القطعی بھما۔ لان التخصیص بطریق المعارضۃ والظنی لا یعارض القطعی۔ (تفسیر النصوص ج ۲ ص ۲۶۶)

"تو حنفیہ اس تخصیص کو جائز نہیں رکھتے، کیونکہ کتاب اللہ اور سنت متواترہ کے عام کلمات اپنے ثبوت اور اپنی دلالت میں قطعی ہوتے ہیں اور دلیل ظنی کے ساتھ اس کی تخصیص صحیح نہیں ہو سکتی۔ امام عبد العزیز بخاریؒ کا ارشاد ہے کہ کتاب اللہ اور سنت متواترہ کا کلمۂ عام خصوصیت کا احتمال ہی نہیں رکھتا یعنی اس کی تخصیص نہیں ہو گی۔ کیوں کہ تخصیص خبر واحد اور قیاس سے جائز نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ خبر واحد اور قیاس دونوں ظنی ہوتے ہیں تو ان دونوں کے ذریعہ سے قطعی کی تخصیص بطور معارضہ کے ہو سکتی ہے اور ظنی۔ قطعی کا معارض نہیں ہو سکتا۔"

نیر علامہ محمد معروف دوالیبی فرماتے ہیں کہ:

وقال الاحناف: ان العام قطعی فی دلالته ای انه یوجب الحکم قطعا ویقینا فیما تناوله من الافراد وقال یقول الاحناف والامام الشاطبی من المالکیة واحتج الاحناف لذالك وقالوا: ان اللفظ متی وضع لمعنی کان ذالك المعنی عند اطلاقه واجبا۔ ای لازما وثابتا بذلك اللفظ حتی یقوم الدلیل علی خلافه وقالو بناءعلی ذالك "ان صیغة العموم" لما کانت موضوعة للدلالة علی العموم وهی فیه حقیقة کان معنی العموم " واجباو ثابتا بها قطعا حتی یقوم الدلیل علی خلافه (المدخل الی علم الاصول الفقہ ص ۱۵۵ تا ۱۵۶)

"فقہائے احناف نے کہا ہے کہ کلمہ عام اپنی دلالت میں قطعی ہوتا ہے یعنی وہ حکم کو قطعیت اور یقین کے ساتھ واجب کر دیتا ہے ان تمام افراد میں جن کو وہ شامل ہو۔ اور فقہائے احناف کے قول کے مطابق ہی مالکیہ میں سے امام شاطبیؒ نے بھی فرمایا ہے اور احناف نے اس کے لیے دلیل قائم کی ہے اور کہا ہے کہ لفظ جب کسی معنے کے لیے وضع کیا جائے تو اس کو بولنے کے وقت وہ معنی اس کے لیے واجب یعنی اس لفظ کے ساتھ لازم اور ثابت ہوتے ہیں جب تک اس کے خلاف کوئی دلیل ہی قائم نہ ہو جائے۔ اسی کو بنیاد بنا کر انہوں نے فرمایا ہے کہ عموم کا صیغہ جبکہ عموم پر دلالت کرنے کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ اور اس کے یہ معنے حقیقی ہیں تو عموم کے معنے اس کے ساتھ واجب اور ثابت ہوں گے حتیٰ کہ کوئی دلیل اس کے خلاف پر قائم ہو جائے۔"

ہمارے فقہائے حنفیہ رحمۃ اللہ علیہم نے اس سلسلہ میں فرمایا ہے کہ کتاب اللہ کے عام کی تخصیص خبر واحد سے تو نہیں ہو سکتی لیکن خبر مشہور سے ہو سکتی ہے اور رجم کی احادیث خبر واحد نہیں ہیں بلکہ خبر مشہور ہیں جس سے کتاب اللہ کے عام کو خاص کیا جا سکتا ہے بلکہ اس کے ذریعہ سے کتاب اللہ پر زیادتی بھی کی جا سکتی ہے۔ لیکن ہمیں افسوس ہے کہ ہم اس اصول کی تائید نہیں کر سکتے۔ کیونکہ خبر مشہور اپنی اصل کے اعتبار سے خبر واحد ہی ہوتی ہے بلکہ بعض اوقات وہ خبر واحد سے بھی کمتر ہوتی ہے۔

شیخ الاسلام علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

والمشهور ماله طرق محصورة باکثر من اثنین ولم یبلغ حد التواتر۔ ای لم یفد بمجرده العلم وهو المستفیض علی رای جماعة من ائمة الفقهاء وقیل المستفیض یکون طرفیه ووسطه سواءوالمشهور اعم من ذالك وقد یطلق المشهور علی ما اشتهر علی الالسنة مطلقاوان لم یکن له اسناد واحد۔ (من قفو الاثر ص ۵)

"مشہور وہ حدیث ہے جس کی دو سے زیادہ محدود سندیں ہوں اور تواتر کی حد تک نہ پہنچتی ہوں۔ یعنی محض اس سے علم کا فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ ائمہ فقہاء کی ایک جماعت کی رائے کے مطابق وہ مستفیض (جس کی دو سندیں ہوں) ہی ہوتی ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ مستفیض اس حدیث کو کہتے ہیں کہ جس کے طرفین اور درمیان برابر ہوں (یعنی جس کے ہر درجہ میں دوراوی ہوں) اور مشہور اس سے عام ہے اور کبھی مشہور کا اطلاق اس حدیث پر بھی کر دیا جاتا ہے جو لوگوں کی زبانوں پر مشہور ہو گئی ہو۔ خواہ اس کی ایک سند بھی نہ ہو۔" (قفو الاثر ص ۵)

درس نظامی میں داخل اصول فقہ کی مشہور کتاب نور الانوار میں ہے:

كالمشهور وهو ما کان من الاحاد فی الاصل ای فی القرن الاول وهو قرن الصحابة ثم انتشر حتی ینقله قوم لا یتوهم تواطوهم علی الکذب وهو القرن الثانی ومن بعدهم یعنی قرن التابعین وتبع التابعین والاعتبار للشهرة بعد ذالك فان عامة اخبار الاحاد قد اشتهرت فی هذا الزمان فلم یبق شئی منها آحادوانه یوجب علم طمانینة ای اطمینان یرجع الصدق فهو دون المتواتر وفوق الواحد

(نور الانوار ص ۱۷۶ تا ۱۷۷)

"مثلاً مشہور اور وہ دراصل اخبار احاد ہی میں سے ہوتی ہے یعنی قرنِ اول میں اور وہ صحابہؓ کا عہد ہے۔ پھر وہ پھیل جاتی ہے حتیٰ کہ اسے ایک قوم نقل کرنے لگتی ہے جن کے جھوٹ پر اتفاق کا وہم نہ کیا جا سکے۔ یہ شہرت قرن دوم اور اس کے بعد حاصل ہوتی ہے یعنی تابعین اور تبع تابعین کے عہد میں اور اس کے بعد کسی شہرت کا اعتبار نہیں کیونکہ اس زمانہ میں تو تمام احادیث ہی مشہور ہو چکی تھیں اور کوئی بھی حدیث تبع تابعین کے عہد کے بعد خبر واحد نہیں رہی ہے۔ اس قسم کی احادیث سے علم طمانینت حاصل ہوتا ہے یعنی ایک طرح کا اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔ جو جہت صدق کو ترجیح دے دیتا ہے۔ یہ خبر مشہور متواتر سے کم اور خبر واحد سے زیادہ ہوتی ہے۔"

اسی کے حاشیہ پر محشی نے ابن حجر عسقلانی کی کتاب نخبۃ الفکر اور شرح

نخبۃ الفکر سے نقل کیا ہے کہ:

وھو ما کان من الاحاد فی الاصل ای کان روایۃ من الصحابۃ اقل من عدد التواتر واحدا کان راویہ او اکثر۔ وھو علی رای الاصولیین واما علی رای اھل الحدیث فالسنۃ قسمان متواتر وھو ما یکون لہ اسانید کثیرۃ بلا حصر عدد معین والعادۃ احالت تواطوھم علی الکذب وخبر الواحد وھو ما لا یکون کذالك۔ (حاشیہ نور الانوار ص ۱۷۶)

"مشہور دراصل اخبار آحاد ہی میں سے ہوتی ہے یعنی اس کی صحابہ سے روایت عدد تواتر سے بہت کم ہوتی ہے۔ اس کا راوی ایک ہی ہوتا ہے یا زیادہ۔ مشہور حدیث کا وجود اہل اصول کی رائے پر ہے۔ لیکن اہل حدیث کی رائے کے مطابق سنت کی دو ہی قسمیں ہیں۔ ایک تو متواتر یعنی جس کی سندیں بہت ہوں۔ عدد معین کے حصر کے بغیر کہ عادت ان سب کے جھوٹ پر اتفاق کو ناممکن سمجھتی ہو۔ دوسرے خبر واحد۔ اور خبر واحد وہ ہے جو ایسی نہ ہو۔"

ان تصریحات سے آپ نے ملاحظہ فرمالیا کہ محدثین تو حدیث مشہور کا وجود ہی تسلیم نہیں فرماتے اور جو اہل اصول اور فقہائے حنفیہؒ مشہور حدیث کا وجود تسلیم فرمارہے ہیں وہ بھی اس کا اعتراف فرمارہے ہیں کہ حدیث مشہور در اصل خبر واحد ہی ہوتی ہے۔ لیکن وہ تابعین یا تبع تابعین کے عہد میں پھیل جاتی ہے۔ کسی بات کا پھیل جانا اور زبان زد عوام ہو جانا اس کی صحت کی دلیل نہیں ہے۔ موضوعات کی کتابوں میں آپ کو ہزاروں ایسی حدیثیں ملیں گی کہ وہ آج تک زبان زد عوام ہیں اور لوگ انہیں ارشاد نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام سمجھے ہوئے ہیں مگر وہ موضوع اور من گھڑت ہیں۔ حضرت شیخ الاسلام علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہم اوپر نقل کر چکے ہیں کہ بعض مرتبہ اس حدیث کو بھی مشہور شمار کر لیا جاتا ہے جو زبان زد عوام ہو گئی ہے اس کی ایک بھی سند نہیں ہے یعنی وہ خبر واحد سے بھی گئی گزری ہوتی ہے۔

اب آپ خود ہی انصاف فرمائیں کہ کیا ایسی حدیثوں سے قرآن کے عام کی تخصیص اور کتاب اللہ پر زیادتی جائز ہو سکتی ہے۔ ہمیں بڑا افسوس ہے کہ ہم اس کی تائید کرنے کی اپنے اندر جرأت نہیں پاتے۔ حضرات فقہائے حنفیہؒ شکر اللہ سعیہم کی جانب ایسی غلط بات کی نسبت ہمارے نزدیک درست نہیں۔

بہرحال ہم نے اپنی کتاب "رجم اصل ہے یا تعزیر"؟ میں ان تمام عنوانات پر تفصیل سے بحث کی ہے۔

ہم نے اس میں یہ بھی بتایا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جب تک قرآن کریم میں زنا کی سزا کا حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ تورات کی متابعت میں چند مجرموں (مثلاً ماعز اسلمی۔ غامدیہ اور جہینہ) کو رجم فرمایا تھا لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ سورہ نور کی آیت کے نازل ہونے کے بعد بھی آپ نے کسی کو رجم کیا ہے۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں بہ سند اسحاق خالد شیبانی کہ شیبانی نے کہا کہ میں نے عبد اللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کیا آنحضرت ﷺ نے کسی کو سنگسار فرمایا تھا۔ انہوں نے فرمایا "ہاں" میں نے پوچھا کہ کیا سورۃ النور کے نازل ہونے سے پہلے یا نازل ہونے کے بعد؟ آپ نے فرمایا یہ بات مجھے معلوم نہیں۔

ہم نے اس میں یہ بھی بتایا کہ ہمارے مفسرین نے مکی اور مدنی سورتوں کی جو ترتیب نزول تحریر فرمائی ہے وہ ہماری تمام بڑی بڑی تفسیروں میں مذکور ہے۔ اس کے مطابق مدنی سورتوں کی کل تعداد اکتیس ہے، ان کی ترتیب نزول میں اذا جاء نصر اللہ والفتح کا اٹھارھواں نمبر ہے، سورہ النور کا انیسواں نمبر ہے اور سورۃ الحج کا بیسواں نمبر ہے۔

(ملاحظہ ہو النظرات فی القرآن للشیخ محمد الغزالی ص ۲۵۸ تا ۲۵۹) (طبع دوم مصر اور الاتقان فی علوم القرآن ج ۱ ص ۱۹ تا ۲۰ اردو ترجمہ مطبوعہ نور محمد آرام باغ کراچی)

حج متفقہ طور پر ۹ھ میں فرض ہوا ہے۔ لہٰذہ سورۃ حج ۹ھ میں نازل ہوئی ہے اور اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَ الْفَتْحُ ۝ جس میں بقول حضرت عمرؓ وحضرت ابن عباسؓ آنحضرت ﷺ کی وفات کی اطلاع دی گئی ہے فتح مکہ کے بعد نازل ہوئی ہے۔ فتح مکہ ۸ھ میں ہوئی ہے ان دونوں کے درمیان میں سورۃ النور نازل ہوئی تھی۔ لہٰذہ اس کی تاریخ نزول لامحالہ ۸ھ کا آخر یا ۹ھ ہونا چاہیے۔ یہ آنحضرت ﷺ کی حیات کا آخری عہد ہے۔ جب تک یہ بات پایہ ثبوت کو نہ پہنچ جائے کہ ۹ھ میں سورۃ النور کی آیات نازل ہونے کے بعد بھی آپ نے کسی کو رجم کیا ہے اسوقت تک رجم کی سزا کو اسلامی سزا قرار دے لینا صریحاً زیادتی ہے۔ کیونکہ رجم میں ایک مسلمان کی جان لینے کا سوال ہے اور کسی ایسی دلیل سے جس میں ذرا بھی شک وشبہ کیا جاسکے ایک مسلمان کی جان نہیں لی جاسکتی۔ ویسے بھی حدود شبہات سے ساقط ہو جاتی ہیں۔ لہٰذہ روایات اور اخبار احاد سے ایک مسلمان کی جان سے کھیلنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

قرآن کریم میں زنا سے متعلق جتنی آیات کریمہ ہیں ان سب سے رجم کے ثبوت کے بجائے رجم کی نفی ہی کی طرف اشارات ملتے ہیں۔ تفصیل کے لیے اسی کتاب کا باب الزنا ملاحظہ ہو۔

آخر میں ہم اس باب کو علامہ محمد سلام مذکورہ استاد الشریعہ بکلیہ حقوق (القاہر) کے ایک اقتباس پر ختم کررہے ہیں جس سے اندازہ ہوسکے گا کہ ہمارے دور کے محقق علماء کا اس مسئلہ میں نقطۂ نظر کیا ہے۔ علامہ موصوف فرماتے ہیں:

کوڑوں کی سزا

یہ سزا عزت و آبرو پر زنا کے ساتھ زیادتی کرنے پر دی جاتی ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلزَّانِيَةُ وَ الزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ

(النور:۲)

"زنا کار عورت اور زنا کار مرد، ان میں سے ہر ایک کو سو (۱۰۰) کوڑے مارو۔"

خوارج کے علاوہ دوسرے لوگوں نے کہا ہے کہ یہ آیت غیر شادی شدہ زانیوں کے لیے مخصوص ہے۔ اور شادی شدہ زانیوں کو سزا سنگسار کرنا ہے حتیٰ کہ وہ مر جائیں۔ انہوں نے اس پر حضور اکرم ﷺ کے عمل اور قولی روایات سے استدلال کیا ہے۔ لیکن خوارج کی رائے یہ ہے کہ قرآنی نص عام ہے اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ زنا کی سزا سو کوڑے مارنا ہے اور شادی شدہ اور غیر شادی شدہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔[1]

انہوں نے اس پر ہر طرح کی دلیلوں سے استدلال کیا ہے۔ جنہیں امام فخر الدین رازیؒ نے اپنی تفسیر میں تفصیل سے بیان کر دیا ہے۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ غالباً حضور اکرم ﷺ کے مبارک عہد میں جو کچھ پیش آیا وہ بر سبیل سیاست اور از روئے تعزیر ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ کے لیے عام شرعی حکم نہیں تھا۔

پھر اخبار آحاد سے اس جیسی حدود قائم نہیں کی جا سکتیں اور یہ کہنا کہ قرآن کریم میں رجم کا حکم نازل ہوا تھا لیکن وہ آیت منسوخ ہو گئی مگر اس کا حکم باقی ہے قطعاً محل نظر ہونا چاہیے کیونکہ اس کے معنے یہ ہوں گے کہ آیت جو بذریعہ وحی نازل ہوئی تھی اللہ تعالیٰ نے تو اس کی تلاوت منسوخ کر دی مگر ہم اس آیت کا حکم برقرار رکھنے پر مُصر ہیں۔

(المدخل للفقہ الاسلامی لمحمد سلام مدکور ص ۳۶۷ تا ۳۷۷)

---

[1] اور ابو مسلم اصفہانی سے منقول ہے کہ آیت وَ الّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ (النساء:۱۵) اور جو عورتیں تم میں سے فاحشہ کی مرتکب ہوں، اسحاق (چپٹی) کے لیے مخصوص ہے جو دو عورتوں کے درمیان رونما ہو اور آیت وَ الَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا (النساء:۱۶) اور جو دو مرد تم میں سے اس کا ارتکاب کریں تو انہیں اذیت دو (لواطت کے ساتھ مخصوص ہے جس میں دو مرد ملوث ہوتے ہیں۔) اور آیت اَلزَّانِيَةُ وَ الزَّانِيْ (النور:۲) زنا کار عورت اور زنا کار مرد اس فعل زنا کے ساتھ مخصوص ہے جو ایک عورت اور ایک مرد کے درمیان ان کے اشتراک سے رونما ہو۔ اس طرح امام ابو مسلم اصفہانی کے نزدیک عزت و آبرو سے متعلق سزا مکمل ہو جاتی ہے اور تینوں صورتوں کا حکم واضح ہو جاتا ہے اسطرح یہ تینوں آیتیں محکم ہیں اور ان میں سے کوئی آیت منسوخ نہیں ہے۔